

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورة الفرقان —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

## جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	.....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	.....	از: جناب غلام احمد پرویز
ناشر	.....	بزم طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	.....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
ایڈیشن اول	.....	فون نمبر 5714546-5753666
مطبع	.....	نومبر 2007ء
	.....	باقرپرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

## رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب میں کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قدیل آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلب نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شام جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطربیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہیں منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محراب کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستارے گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں ایک ایسے عدیم النظر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمین انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیِ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ و رپکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر

بحق، دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

## اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ”اسوۂ حسنہ“ قرار دیا ہے۔ اس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رہبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو  
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام  
خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست  
رحمۃ للعالمین انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]



مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ  
نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ  
قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر  
انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا  
امکان ہے۔ لہذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ  
کو صحیح نظر آئے وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور  
جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے وہ میرے  
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔ معراجِ انسانیت)



## فہرست مشمولات سورۃ الفرقان

### مطالب القرآن فی دروس الفرقان

16	پیش لفظ	جماعت مومنین ہر آن صفت فرقان کی ایک نئی شان
36	پہلا باب: سورۃ الفرقان (آیت 1: تمہید)	سے مزین ہوتی ہے
37	لفظ برکت کا قرآنی مفہوم اور انسانی سوچ کی کیفیت	جنگ بدر میں عملی طور پر صفت فرقان کی ایک زندہ مثال
37	الفرقان کے لفظ کی بلاغت	دوقومی نظریہ کی مکمل محسوس تفسیر
39	بدلتے ہوئے حالات میں حق اور باطل کی تعریف	یہ مجاہدین اور مجاہزین سب کے سب مومن حقہ تھے
25	حق ہمیشہ حق ہوتا ہے	خدا تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کا بلند ترین مقام ”علیٰ عبدہ“
25	جھوٹ بولنے کی اجازت کا فتویٰ	کہہ کر متعین کر دیا ہے
26	جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں ارتکاب کا عمل	ذات خداوندی انسانوں کو ڈراتی نہیں بلکہ آگاہ کرتی ہے
27	ہر جرم کا ارتکاب ضرورت کارہین منت ہوتا ہے	خوف و حزن تو انسانی صفات کو جلا کر خاک کر دیتا ہے
27	الحق کے لیے وحی کی راہنمائی کی ضرورت لازم ہے	دوسرا باب: سورۃ الفرقان (آیت 2:)
29	آج الحق کی تلاش میں سائنکولوجسٹ فلاسفروں سے بہت آگے ہیں	دین صرف خدا کی طرف سے ملتا ہے کوئی رسول دین کا بانی نہیں ہوتا
29	دانش نورانی اور دانش برہانی میں بنیادی فرق ہے	ابن اللہ کا غلط تصور
31	وحی کی شکل میں قرآن حکیم کی تعلیم کا ماحصل	یہودیوں کے ہاں نبوت اور عزیر کے تصورات کی حقیقت
32	خدا تعالیٰ کی صفت قبہ کے مفہوم کی وضاحت	خدا کے صحیح تصور کی اہمیت
33	شبِ برات کی شرعی حیثیت	ہمارے ہاں پایا جانے والا تصور خدا اور اُس کے اثرات
35	روزِ محشر امتیازی نشان رکھنے والی قوم کی نشانی: بھوک اور محکومی؟	قرآن حکیم کی روشنی میں ہی خدا تعالیٰ کا حقیقی تصور ہے
35	اس دنیا میں مومن کی زندگی کے آثار	خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا تعلق اس کے مقرر کردہ قوانین سے ہوتا ہے

- 51 دو حصوں میں اقتدار کی تقسیم: عالمِ امر اور عالمِ خلق
- 52 کائنات کی ابتدا کے متعلق موجودہ تحقیق اور قرآنِ حکیم کا ارشاد
- عدم سے وجود میں لانے والی ہستی کسی Cause (سبب)
- 53 کی محتاج نہیں
- 54 بیج کی تقدیر
- 55 قرآنِ فہمی کے سلسلہ میں میرے لیے علامہ اقبالؒ کی راہنمائی
- 55 لغات القرآن، مطالب الفرقان اور تبویب القرآن کی افادیت
- 56 تقدیر کا قرآنی مفہوم
- 56 الذی خلق فسوی کا مفہوم
- 57 ذاتِ خداوندی اپنے آپ کو از خود پابند کرتی ہے
- 59 اقدار کے سلسلہ میں حضرت انسان کی عملی کیفیت
- 59 انسانی اعمال کے نتائج کو بدلنا انسان کے اختیارات سے باہر ہے
- 61 خدا تعالیٰ انسانی عمل کے ذریعے اپنی مدد کا متمنی ہے
- 62 لفظ تقدیر کی کیفیت اقبالؒ کی زبانی سنئے
- 63 تقدیر کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی مثال
- 64 بے عملی کی دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں
- 65 خدا اپنے اہل قوانین کو کبھی نہیں بدلتا
- 65 وجود کائنات کا یہ سارا سلسلہ تقدیر کے مستحکم ہونے پر ہی موقوف ہے
- 67 خدا تعالیٰ کا اس قسم کا تصور قرآنِ حکیم کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا
- تیسرا باب: سورة الفرقان (آیات 3 تا 10)**
- 69 قوانین خداوندی کی نتیجہ خیزی کا دوسرا نام ہی اقتدارِ خداوندی ہے
- 69 مذہب میں پرستش ہوتی ہے جبکہ دین میں اطاعت
- 70 لا الہ کے بعد لا الہ کا اقرار لازم ہے
- 71 انسانی صلاحیتوں کی کم مائیگی اور بے بسی کی کیفیت
- 71 سودو زیاں کا لالچ یا نقصان
- 72 دینِ خداوندی یا قانونِ خداوندی کا حاصل طبقات کی نفی ہے
- 73 مادیت کی دنیا میں انسان کی بے بسی کی محسوس مثال
- 73 مردہ بدست زندہ کی کیفیت
- 74 انسانیت کے بلند مقام سے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں کی جانب سفر
- 74 وحی خداوندی کے سلسلہ میں دنیا بھر کے انسانوں کو ایک کھلا چیلنج
- 76 آج کے دور میں قرآن کے متعلق رگب (Gibb) کا اعتراف
- 77 چودہ سو سال پہلے کائناتی حقائق کے متعلق مجیر العقول انکشافات
- 79 قرآنِ حکیم میں نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعارف
- 79 عقل و فکر سے ماوراء تو ہم پرستی اور کرامات کے قصے
- 80 جان نثاروں کی قربانیوں کا حاصل اور ہماری احسان فراموشی کا نتیجہ
- 81 سخاوت اور در ماندگی کے متضاد قصے
- 82 عقل انسانی کو قرآنِ حکیم کی روشنی ہی جلا بخش سکتی ہے
- 83 نبی اکرم ﷺ کی شخصیت بذاتِ خود ایک معجزہ تھی
- نوع انسانی کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت کا یہ
- 84 اصول قیامت تک کے لیے راہنمائی ہے
- 85 نبی اکرم ﷺ کو جادو زدہ کہنے والوں کو قرآن نے ظالم کہا ہے
- 85 جادو کے سلسلہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تفسیری بیان
- 86 قرآنِ حکیم کے ارشاد کے برعکس یہ روایات شہادت قرار پا گئیں
- 86 یہ بات عقیدت مندی کی نہیں بلکہ مفاد پرستی کی ہے
- 87 جمع شدہ روایات کی کیفیت

106	قریش کے تکبر کی کیفیت	مودودی صاحبؒ کے طرزِ عمل پر بعض
107	کسی کا مغلوب ہو جانا جہنم ہی کا دوسرا نام ہے	جید حضرات کا اعتراض اور علیحدگی
107	جہنم کا عذاب موت سے ختم نہیں ہوگا	اتباع سنت کے نام پر خود ساختہ عمل کی دو ایک مثالیں
108	محموم قوموں کے لیے تو پورا پورا ملک ہی جیل خانہ ہوتا ہے	مجھے تو تجھ سے گلہ ہے اے مسلمان! ان سے نہیں
109	قرآن کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہمارے تراجم نے کیا ہے	حدیث کو پرکھنے کا معیار
109	انا للہ وانا الیہ راجعون کا قرآنی مفہوم لفظ المصیر میں مضمر ہے	حدیث کے متعلق مودودی صاحبؒ کے تصورات اور
110	انسان کا بلند ترین مقام کا حاصل کر لینا المصیر جسے جنت کہا جائے گا	قرآن حکیم کی تعلیم کے نتائج
111	انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت اختیار و ارادہ کی وسعتیں ہیں	چوتھا باب: <b>سورة الفرقان</b> (آیات 11 تا 16)
112	انسانی چاہتوں سے بھی آگے کی منزل	سابقہ درس کی بازگشت نبی اکرمؐ کی معاشرتی زندگی
112	جنت میں انسان کی پیشانی کا نور مزید اگلے راستوں کو منور کرتا جائے گا	قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کو روزِ قیامت پر اٹھارکھنے کا نتیجہ
113	انسان خدا کے کیے گئے وعدہ کے متعلق بھی پوچھ سکتا ہے	انسان کی موجودہ زندگی نتائج کے لحاظ سے ایک کسوٹی ہے
پانچواں باب: <b>سورة الفرقان</b> (آیات 17 تا 18)		انقلاب، ملک عظیم اور زبانِ عربی
115	قرآن حکیم کی تعلیم کو نظروں سے اوجھل کر دینے کا نتیجہ	لفظ قیامت کا مفہوم
	قرآنی آیات کے موجودہ تراجم اور تفاسیر کے عمل نے	لفظ الساعة کا قرآنی مفہوم
116	قرآن کو کیا سے کیا بنا دیا	بنی اسرائیل کی داستان کے تفصیلی بیان میں لفظ الساعة کا استعمال
117	جہنم میں متبعین اور لیڈروں کے مابین باہمی مکالموں کا ذکر	اس کائنات کے اندر کوئی امریکہ بارگی نہیں ہوتا
119	اصل بات اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کرنا ہے	اس انقلاب کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟
120	قرآن حکیم نے سائنکولوجی کو بڑی اہمیت دی ہے	لفظ الملوک کے سلسلہ میں اقبالؒ کی بصیرت قرآنی کا اظہار
121	اپنے لیے خود کوئی فیصلہ کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے	مومن کے انقلاب کی پہچان: امن کا پیغام
122	لیڈر عوام کو اور عوام لیڈروں کو قصور وار ٹھہراتے ہیں	طلسم سامری کو توڑنے کا طریق حضور ﷺ کی عملی زندگی کا نمونہ ہے
123	قرآن حکیم احبار و رہبان دونوں کو مجرم قرار دیتا ہے	نبی اکرم ﷺ پر فرشتے بھیجتے ہیں
	اعمال کی نتیجہ خیزی کے وقت لیڈروں اور متبعین کے	اس انقلاب کی تکذیب کرنے کا نتیجہ
124	مابین باہمی چپقلش کا منظر	

143	فرشتوں کے متعلق ارشادِ خداوندی	124	لیڈروں کی قوت تو ہمیشہ عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے
143	انسان کا نامہ اعمال ساتھ ساتھ مکافاتِ عمل کے ترازو میں تولا جاتا ہے	125	آج کا جمہوری نظام اور اقبال کی نظم ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“
143	اعمال کے سلسلہ میں انسانی سوچ کا معیار	126	سب سے بڑا جرم قوم میں خوئے غلامی کا پیدا کرنا ہے
144	غلط اعمال کے سلسلہ میں ایک خوبصورت مثال		افلاطون کے فلسفہ کے مقابلے میں ارسطو کا Logic
145	دنیا میں خیر و شر کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے	127	(منطق) کا میاب ہے
145	خیر و شر کا معیار صرف وحی مقرر کرتی ہے		Logic (منطق) کے الفاظ کی الجھنوں کے جال کی
146	مستقر اور مستودع کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں	128	گرفت اور اس کا اثر
148	مستقر کا قرآنی مفہوم	128	یونان کی سوغات: تصوف کی خواب آور دنیا
149	مادی نظریہ حیات قرآن کی تعلیم کے برعکس ہے	129	تصوف کی تعلیم کا حاصل
150	مستقر کی ایک دوسری شکل مقیل بھی ہے	131	نبوتِ قادیاں اور جہاد
	قرآن حکیم کے یہ یوم تشقق السماء بالغمام کے	132	اس روشِ زندگی کا نتیجہ بھوک اور خوف کا عذاب ہے
150	الفاظ غور و فکر کے متقاضی ہیں	132	ایک تمثیلی بیان میں عذاب کی ایک دوسری شکل
151	یہ الفاظ آج ہمیں کیا سبق دیتے ہیں؟	133	قرآن حکیم کی روشنی میں افراطِ زر کی تعریف اور اس کی تباہ کاریاں
152	اس دور کی خصوصیت کبریٰ	134	افراطِ زر کا نتیجہ تباہ کن طبقاتی تفریق کی شکل میں نکلتا ہے
152	الرحمن یعنی صفتِ خداوندی کی عظمت پوری طرح کارفرما ہوگی		<b>چھٹا باب: سورة الفرقان (آیات 19 تا 26)</b>
153	اس سے بھی ایک قدم آگے یعنی وہ رحیم بھی ہے	137	معاشرتی نظام کی ذمہ داری ہر شخص پر عائد ہوتی ہے
153	رحمِ مادر میں بچے کی پرورش کی نوعیت اور ماں کی قربانی	137	قرآن حکیم کے نزدیک ظلم کا مفہوم
155	ماں کی طرف سے دودھ کی نہروں کے ساتھ شہد کی نہروں کا بھی مہیا کرنا	139	رسول کو مافوق الفطرت یا مافوق البشر سمجھنے یا بنانے کا نتیجہ
	رحمت کے مفہوم کی بہترین مثال ماں کی آغوش اور	139	سب سے بڑا معجزہ تو رسولِ خدا کی اپنی زندگی ہے
155	باپ کا قاعدہ قانون سکھانا ہے	140	معجزہ انسانی عقل کے چراغ کو گل کر دیتا ہے
156	بچے کی صحیح پرورش رحمت اور الملک کے امتزاج کی رہین منت ہوتی ہے	140	استقامت کے میدان میں استہزا کے سخت پتھر کا مقابلہ کرنا ہوگا
157	انسانی دنیا میں صفاتِ خداوندی کے ظہور کی اہمیت اور اس کی لم	141	انسان کی ایک نفسیاتی کیفیت کا نفسیاتی طریق پر جواب
157	قرآن حکیم انسان کو ڈیوٹی کا نہیں بلکہ تصور دیتا ہے	142	رسول بھی ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتا

171	زنا کی سزا جرم کے متعلق آیت بکری کھا گئی	171	سواتواں باب: <b>سورة الفرقان</b> (آیات 27 تا 31)
172	قرآن حکیم کے حروف پر نقطے بھی نہ تھے	159	قرآن حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظام کی بنیادی
173	قرآن حکیم سات زبانوں میں نازل ہوا تھا، چھ کو جلا دیا گیا	160	خصوصیت صرف دو لفظوں میں
174	قرآن کی پانچ سو آیات منسوخ ہو گئیں	161	ہمارے ہاں نظام ربوبیت کے خدوخال کی نوعیت
175	قرآن حکیم کی آیات کو حدیث منسوخ کر سکتی ہے	161	انسانوں کا اختیار کردہ نظام ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہے گا
176	اور دو سو سال بعد جمع کی جانے والی احادیث کی ماہیت	162	قرآن حکیم کی اصطلاح میں کافر کا مفہوم کسی چیز کو چھپا کر رکھنا ہے
177	فقہ کی تاریخ اور اس کی حیثیت	162	کسی گتھی کے نہ سلجھنے پر چڑچڑاپن کا پیدا ہونا عسرت کہلاتا ہے
177	اپنی اپنی احادیث اور اپنی اپنی فقہ کی روشنی میں	162	آ خر کار انسان کو وہ قرآنی نظام جو اس نے
177	لکھی گئی قرآنی تفاسیر کی حالت	163	ڈھانپ رکھا ہے ظاہر کرنا ہوگا
178	قرآن حکیم کی بعثت کا مقصد اور ضرورت	163	قرآن حکیم کے ہوتے ہوئے اس قندیل آسمانی کی
179	مہجور قرآن کا یہ عمل آج بھی جاری و ساری ہے	163	روشنی سے کون انکار کرے گا؟
181	قرآن حکیم کے علاوہ مثلہ معہ کا عقیدہ	163	شیطان کے متعلق غلط تصور کا نتیجہ
182	آٹھواں باب: <b>سورة الفرقان</b> (آیات 32 تا 34)	164	ہمارے ہاں شیطان کا موجودہ تصور مجوسی یا پارسی مذہب کا پیدا کردہ ہے
182	نبی اکرم ﷺ پر مختلف اعتراضات کا ذکر اور آپ کی عملی زندگی	165	شیطان کے متعلق ہمارے ہاں پائے جانے والے تصور کی حقیقت
182	خلافت راشدہ کے دور کے متعلق ہمارا عملی تصور اور خدا کا فرمان	165	ابلیس یا شیطان کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی ایک خوب صورت حدیث
182	قرآن حکیم کے نزول کے متعلق کفار کے اعتراضات اور	166	لفظ خذولا کا مفہوم
182	خدا کی طرف سے ان کا جواب	166	امت کے خلاف خدا کی عدالت میں حضور ﷺ کی پکار
183	قرآن حکیم کے الفاظ اور اس کا پروگرام موتیوں کی	168	زوال امت کی وجہ جواز
183	ایک مالا کی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں	168	لفظ مہجور کا قرآنی مفہوم
184	ہمارے ہاں ترتیل کے معنی قرآن حکیم کو مختلف	169	ہم نے قرآن حکیم کو کئی ایک رسیوں سے باندھ رکھا ہے
184	آوازوں کے ساتھ پڑھنے کا نام ہے	170	قرآن حکیم کے ساتھ سب سے بڑی اور پہلی گہری سازش:
186	وحی کے مقابل کشف والہام کا عقیدہ	171	اس کے متن میں شکوک و شبہات
			قرآن حکیم کو مختلف ادوار میں ترتیب دیئے جانے کی کہانی

187	غارِ حرا میں وحی کے نزول کی روایت	200	قدامت پرست یا ماضی پرست اقوام کی حالت زار
آپ ﷺ کی ورقہ بن نوفل کی طرف سے	201	پہلے دور کے انسان اور آج کے انسان میں فرق	
نبوت ملنے کے سلسلے میں روایات	202	انسانی عقل اور فکری علم کو صرف قرآن فی سوچ ہی جلا بخشتی ہے	
مستشرقین کی طرف سے من گھڑت قصے ہمارے	202	امروز و فردا کے حالات انسانی سوچ کے لیے تازیانہ ہوتے ہیں	
ہاں کے لٹریچر کی زینت بن گئے	188	نواں باب: <b>سورة الفرقان</b> (آیات 35 تا 40)	
تزکیہ نفس کا قرآن فی مفہوم	189	قرآن حکیم کے تدریجی نزول کی حکمت	
قرآن حکیم کی روشنی میں منزل کی حقیقت	190	وَدَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کا مقام بلند کس طرح حاصل ہوا؟	
وحی کے پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے	207	قرآن حکیم میں تاریخی حقائق بیان کرنے کا مقصد	
عمل ترمیل کی ضرورت ہوتی ہے	191	قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ ﷺ اور فرعون کی داستان	
انسانیت کو زندگی کے حقیقی مفہوم سے آشنا کرنے والی	207	کو کیوں نمایاں حیثیت حاصل ہے؟	
عظیم ہستی مدثر اور خداوندی پروگرام	192	نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی داستانِ موسیٰ ﷺ کے	
تذیل آسمانی کا باہمی ربط مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی نظر میں	193	جہادِ زندگی کی ہی مثل تھی	
قرآن حکیم کے تعلیمی ربط کے سلسلہ میں تذیل آسمانی کی اپنی شہادت	194	قوموں کی موت و حیات کا راز فساد اور انقلاب کے	
عمل پیہم کے استحکام کی خاطر قلبی سکون کی اہمیت اور تیز رفتاری کا دور	195	قرآن فی مفہوم سمجھنے میں مضمحل ہے	
قرآن کی مخالفت کا جواب خود قرآن حکیم دیتا ہے	196	السانہ قرآن حکیم کی ایک بنیادی اصطلاح ہے	
نبی اکرم ﷺ نے قرآن حکیم کتابی شکل میں نوع انسانی کو دیا تھا	197	قرآن فی انقلاب کا مقصد و منتہی	
کتاب مبین کا جمع کروانا اس کی وضاحت کرنا اور اسے		ہماری تاریخی کتب نبی اکرم ﷺ کی شان میں	
محفوظ رکھنا خود خدا کے ذمہ ہے	197	مغربی مفکرین کی گستاخیوں کے لیے اسلحہ خانہ ہے	
قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے والوں کے لیے		مودودیؒ کے نزدیک حضور ﷺ کی زندگی کا عکس	
بتویب القرآن نہایت مفید ثابت ہوگی	198	نبوت کی زندگی کا پہلا دور اندرونی تبدیلیوں کا دور ہوتا ہے	
جہنم کی اصل حقیقت اور اہل جہنم کی پہچان	198	مخالف قوتوں کی طرف سے مخالفت کی وجہ جواز	
ایمان کا انگریزی ترجمہ Faith غلط ہے	199	مکافاتِ عمل انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے	
اہل جہنم کی آنکھیں سامنے کی بجائے پیچھے کی طرف ہوں گی	200		

235	عالمگیر انسانیت کے لیے آزادی کا پیا بھر عظیم	216	اس جیسے پروگرام کی تکمیل کے لیے حضرت موسیٰ ♦
236	الہ کا قرآنی مفہوم	217	کے ساتھ حضرت ہارون ♦ بھی تھے
237	صرف قرآن حکیم ہی انسانی جذبات کی راہنمائی کرتا ہے	218	تکذیب دین کا مفہوم
237	مذہب کی دنیا انسان کو نفس کشی کا سبق دیتی ہے	220	سابقہ قوموں کے تذکرہ کا مقصد ان کے انجام کو ظاہر کرنا ہوتا ہے
238	جذبات کو فنا کرنا تو قوت عمل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے	220	قرآن تاریخی واقعات سے اقتدارِ خداوندی کی اہمیت کو واضح کرتا ہے
238	وحی خداوندی سرکش جذبات کو مساحلوں میں محصور کر دیتی ہے	221	قرآن کے نزدیک تاریخ انسانوں کے تابع ہوتی ہے
239	وحی انسانی جذبات کی کمزوریوں سے ماوراء حقیقت ہے	222	ہیگل کا فلسفہء تاریخ انسانی اختیار و ارادے کو سلب کر لیتا ہے
240	انسانی فیصلوں میں انسانی تخیلات کا ہمیشہ دخل رہا ہے	223	قرآن حکیم انسان کو مجبور محض قرار نہیں دیتا
240	ستاروں کی شکل میں راہنمائی کا ایک مستقل اور نہ بدلنے والا سہارا	223	تاریخ انسانی، تاریخ کے نتائج کی امین ہوتی ہے
241	وحی کے اندر انسانی جذبات کا دخل نہیں ہوتا	223	نتائج کو قرآنی تاریخ کے معیار پر پرکھنا ہوگا
243	بات کو سمجھانے کے لیے قرآن حکیم کا محاکاتی انداز	224	مومن کے دیکھنے اور ایک آرکیولوجسٹ کے دیکھنے میں
244	اختیار و ارادہ کے ہوتے ہوئے عقل سے کام نہ لینے		زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے
244	والا جہنم کا ایندھن ہوتا ہے		دسواں باب: سورة الفرقان (آیات 41 تا 49)
244	عالم گیر سطح پر انسان کے لیے ذلت و خواری کے سبب کی اصل وجہ	226	مذہب کی دنیا میں سیرت رسول ﷺ کی کیفیت
245	حقائق کو سمجھانے کے لیے قرآن حکیم کا انداز بیان بڑا ہی غور طلب ہے	227	احبار و رہبان کی طرف سے حضور ﷺ کی مخالفت کی اصل وجہ
246	قرآن حکیم کی روشنی میں اناللہ وانا الیہ راجعون کا مفہوم	228	انبیائے کرام □ کا انقلابی پروگرام ہی ان کی سیرت تھی
247	کائنات کی مثالوں کو بیان کرنے کا مقصد حقائق کو باور کرانا ہے	229	نبی اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کو قرآن حکیم میں محفوظ کرنے کی اہمیت
248	انسان کے مقابلے میں خارجی کائنات کی ہر شے	230	نبوت کی کشادہ ظرفی کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد
248	تعمیری نتائج پیدا کرتی ہے	231	آسانوں کا حصول ہمیشہ خونِ جگر کا متقاضی ہوتا ہے
248	سورج کی شعاعوں سے کشید کیے ہوئے پانی کی مثال	231	ایک نہ ختم ہونے والا پروگرام
249	مومن کی صفت قانت کا قرآنی مفہوم	323	پہلے سے بھی زیادہ مشکل پروگرام کی تعلیم و تربیت کا مرحلہ تھا
251	گیارھواں باب: سورة الفرقان (آیات 47 تا 52)	233	مزاح اور استہزاء کے فرق کی روشنی میں سیرت رسول ﷺ کا مقام بلند
	گزشتہ سے پیوستہ نفس مضمون	234	آپ ﷺ کے لیے سراج منیر کا لقب بڑا ہی غور طلب لقب ہے



252	لفظ سہات کا استعمال اور یوم سبت	252	خارجی کائنات میں خدا کی حکومت اور اپنی دنیا میں
253	عیسائیوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات نفرت پر مبنی تھے	253	اپنے جذبات کا اتباع: ایک کھلا تضاد ہے
253	بتوں کے نام پہ دنوں کے نام رکھے گئے	253	مختلف مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد انسان کو حقیقت سے آشنا کرانا ہے
254	قرآن حکیم نے زندگی بھر کسی دن کو بھی چھٹی کا دن قرار نہیں دیا	254	قرآن حکیم کا مکمل ہونا اور پھر محفوظ ہونا بذاتِ خود ختم نبوت کی دلیل ہے
254	نیند کی حالت میں انسانی شعور کی کیفیت	254	رسول کی بعثت کا مقصد
256	نیند کی حالت میں انسانی شعور اعصاب سے لائق ہو جاتا ہے	256	لفظ کبیر کا قرآنی مفہوم
256	قوم ہمیشہ وہ تباہ ہوتی ہے جس کا غور و فکر کا سوچ کام کرنا چھوڑ دے	256	مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاں جہاد کبیر اور جہاد صغیر کا فلسفہ تعلیم و عمل
257	نیند اور موت دونوں حالتوں میں شعور کو روک لیا جاتا ہے	257	ضابطہ حیات کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف کا نزول بھی
257	شعور کے تسلسل کا ہی دوسرا نام میموری (Memory) ہے	257	جہاد کبیر کے لیے تلوار اور تلوار کے ساتھ قرآن:
	”سہات“ کا یہ ایک لفظ حیات بعد الممات کی پوری	257	یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں
257	کیفیت کا ترجمان ہے	257	بارہواں باب: <b>سورة الفرقان</b> (آیات 53 تا 58)
	نیند کے بعد صرف معلومات ہی نہیں بلکہ احساسات	257	کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں
259	اور جذبات بھی واپس آ جاتے ہیں	259	کارخانہ قدرت میں اقسام تفریق کی ایک حیران کن مثال
259	خواب میں شعور کی نوعیت	259	قرآن حکیم نے انسانوں کو صرف دو گروہوں میں ہی تقسیم کیا ہے
260	شعور کا مربوط ہونا ضروری ہے	260	انسانوں کے مابین نگر او کی وجہ جواز صدقتوں کی نفی ہے
260	موت کے بعد کی زندگی کے درمیان کا وقفہ	260	عربوں کی تمدنی زندگی پر ایک نظر
261	کاش ایک کالج کی تعمیر کا میرا خواب پورا ہو جاتا	261	زمین کے نیچے قدم قدم پر بہتے ہوئے پانی کی کیفیت
261	موت کے بعد شعور اس دنیا میں واپس نہیں آتا	261	زندگی کے تسلسل کو ماننے والوں اور اس سے
262	قرآن حکیم کے نزدیک چھٹی کا کوئی تصور ہی نہیں	262	انکار کرنے والوں کے مابین ایک پردہ حائل ہے
263	جمعہ کے روز جمع ہونے کا ایک مقصد تھا جسے نظر انداز کر دیا گیا	263	چودہ سو سال پیشتر قرآن حکیم کے پیش کردہ حقائق
264	نعمائے خداوندی کا تذکرہ پانی کے سلسلہ میں نظام قدرت	264	انسانوں کا اصل سوال طبعی طور پر یا قبائلی طور پر تقسیم ہونے کا نہیں
266	بارشی پانی کے لیے طہوراء کی تشبیہ	266	ہر دو طرف سے سسرال کا باہمی احترام جنتی زندگی کی نوید ہے
266	حیات بعد الموت کے سلسلہ میں زمین مردہ کی مثال	266	ہمارے ہاں بیوی کا بھائی شادی سے پہلے بھائی جان اور بعد میں سالا

303	ذنب کا مفہوم قرآن حکیم کی روشنی میں	286	انسان کو انسان پرستی سے نجات قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم ہے
	تیرھواں باب: <b>سورة الفرقان</b> (آیات 59 تا 62)		ختم نبوت کی حقیقت نے انسان کو مکمل طور پر
306	قرآن حکیم کے نزدیک ارض و سما کی کیفیت	286	آزادی کے تصور سے روشناس کر دیا ہے
	کائنات کی ابتدا کے سلسلے میں انسانی عقل و شعور	287	آج ہمارا انگ انگ شخصیت پرستی میں جکڑا ہوا ہے
306	جواب دینے سے عاجز ہے	287	تیرا دل تو ہے صنم آشنائے تجھے کیا ملے گا نماز میں؟
307	کائنات کی ابتدا ایک ہیوٹی سے ہوئی	288	مردہ لڑکی کا درخت کے ساتھ نکاح
307	موجودہ کائنات لمحہ بہ لمحہ پھیل بھی رہی ہے اور سنورتی بھی جا رہی ہے	289	قرآن حکیم کی بجائے پکی روٹی اور پکی روٹی کی امامت کا نتیجہ
308	ہمارے ہاں کے مفسرین کے نزدیک ”عرش“ کی کیفیت	291	مولانا احمد شاہ نورانی مرحوم کا ایک بیان
308	عرش کے معنی کائنات کا مرکزی کنٹرول ہے	291	شب و روز عمر بھر پرویز کی مخالفت کی وجہ جواز
	اس قدر محیر العقول سلسلہ کائنات پر کنٹرول کا مالک	292	عقل و فکر کی دعوت عمر بھر نبی کی زندگی کا خاصہ ہوتی ہے
309	ہونے کے باوجود وہ الرحمن ہے	293	بے لوث عمل قرآن حکیم کا بہترین اصول ہے
310	حضرت ابراہیم ؑ کے خاندان کا ذکر خیر اور ان کی خدمات	294	کسی لیڈر یا راہنما کے انتخاب کا بہترین اصول لیڈر کا بے لوث ہونا ہے
310	عربی زبان کی وسعت و کیفیت کا تذکرہ	294	زندگی آرزو کے آب حیات سے ہی قائم و دائم ہے
312	لغت کے انداز میں رب العلمین الرحمن اور الرحیم کا مفہوم		انسانوں کے مرتب کردہ اصولوں کے مقابلے میں
313	دنیا کی کوئی زبان قرآن حکیم کے الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکتی	295	خدا کی طرف سے ملنے والے اصول ہمیشہ ابدی ہوتے ہیں
313	سلسلہ کائنات کی تحقیق اور خدا کی رحمت	296	ہماری تباہی و بربادی کا باعث ”توکل“ کا غلط مفہوم ہے
314	لائبڈ مارگن کی تحقیق: فجائی ارتقا	296	خداوند تعالیٰ کے قوانین پر مکمل بھروسے کا نام توکل ہے
315	سورة الرحمن میں لفظ الرحمن کی وضاحت	297	لفظ سج کا قرآنی مفہوم
315	قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت تو قدم قدم پر غور و فکر کی متقاضی ہے	298	لفظ حمد کا مفہوم
316	ہمارے ہاں کُلُّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ کا کیا جانے والا ترجمہ	299	ذنوب کے غلط ترجمے نے قرآن حکیم کی ساری تعلیم کو ہی بدل دیا
317	”عالم تغیرات میں تغیر نا آشنا انسانی ذات“ کی کیفیت		اس سلسلہ میں مودودیؒ کی تفسیری بیان جو
317	قرآن حکیم کے لفظی مسئلہ کا قرآنی مفہوم: احتیاج اور ضرورت	300	قابلِ صدافسوس بھی ہے اور عجیب بھی
		302	آپ حضور ﷺ کی چالیس سالہ زندگی آخر کس چیز کی شہادت تھی؟

335	اس جھکاؤ کا وہ مفہوم جو ہمارے ہاں پیش کیا جاتا ہے	319	ہر آن قدم قدم پر بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ہر چیز کی نشوونما کرنے والی ذاتِ خداوندی
336	تصوف کی دنیا کا پیش کردہ اسلام	319	انسانوں کی دنیا میں حرمتِ الفاظ کا مقام بلند اور ان کی اہمیت
336	سورۃ مدثر میں پیش کردہ سیرتِ رسول ﷺ	320	مذہب کی دنیا میں خدا کا تصور اپنا اپنا ہوتا ہے
337	اہل تصوف کی مصروفیات	321	ان بتوں کی بے کسی کی حالتِ زار
340	متصوفانہ نظریاتی زندگی کا نتیجہ	321	چودہ سو سال قبل سورج کی روشنی کے لیے ضیاء اور چاند کے لیے نور کا لفظ استعمال کیا گیا
340	قرآنِ حکیم کے نزدیک غور و فکر کی اہمیت	322	سورج کے لیے ضیاء اور چاند کے لیے نور کے الفاظ کا استعمال کیوں؟
341	قرآنِ حکیم کے برعکس آج ہمارے ہاں ذکر کا پایا جانے والا مفہوم	324	ثواب کے فریب میں مذہبی پیشوائیت کا کردار
342	قرآنِ حکیم انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹتا ہے	325	مذہب کے تند و تیز نشہ سے انسان خود بھی نکلنا نہیں چاہتا
343	نتائج کی دنیا انسانی اعمال کی ہی پیداوار ہوتی ہے	325	حضرت عمر ♦ کی زبانی مومن کی کہانی
344	عذاب سے بچنے کا طریق	326	افسردہ ستاروں کا ہجوم خورشید کے نکلنے تک ہی ہوتا ہے
344	اسراف کا قرآنی مفہوم	326	مذہب کی تاریخ دنیا میں نورِ سحر کی نوید ہوتی ہی نہیں
345	قرآنِ حکیم کا معاشی نظام تو آبِ حیات کے بہتے ہوئے چشمے کی مانند ہے	327	گلشنِ زندگی کی اس خزاں میں بہارِ نو کا سماں اور حیاتِ تازہ کی نوید
346	خلافت و ملکیت میں فرق	328	یہ سب کچھ ہوگا لیکن ایک شرط کے ساتھ
346	موچی گیٹ لاہور کے باہر اقبالؒ کا لا الہ کہنا	328	شکر کا قرآنی مفہوم
347	اسوۃ ابراہیمی ♦ یہ تھا مقامِ ابراہیمی یہ تھا	<b>چودھواں باب: سورۃ الفرقان (آیات 63 تا 70)</b>	
347	ہر نماز سے پہلے کی جانے والی نیت کا اصل مقصد	330	عبادت کا مفہوم
348	قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کی قدر و منزلت	331	علی الارض ہونا کا قرآنی مفہوم
348	جنسیاتی بے راہ روی قوموں کو مضحک کر دیتی ہے	332	جھکولیکن وقار کے ساتھ
349	جنسیات پر ڈاکٹر انون کی تحقیق	333	ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان میں بڑا فرق ہوتا ہے
350	انسانی جذبات کو کنٹرول کرنے کا طریق ارادے کی مضبوطی میں مضمر ہے	333	لفظ ہونا صفت محمود کا قرآنی مفہوم
350	جنسی تقاضے اور طبعی تقاضے میں بنیادی فرق ہے	335	یہاں تو جاہل سے بھی حسن سلوک سے پیش آنے کا سبق دیا گیا ہے

365	انگریزی میں ایمان کا ترجمہ Faith (فیتھ) کرنا غلط ہے	351	مغربی معاشرے میں نوجوانوں کی حالت زار
366	قرآن حکیم کے نزدیک نبوت کے لیے انتخاب کا معیار		اس زوال کے اسباب معلوم کرنے کے لیے
366	ایک رسول کو بھی عقل و شعور کے تحت وحی خداوندی پر ایمان لانا پڑتا ہے	352	کمپیوٹوں کی تشکیل کی ضرورت نہیں
367	وحی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ قلب نبوی پر باہر سے نازل ہوتی ہے		ہمارے ہاں چار چار بیویوں کے علاوہ ان گنت لونڈیوں کی اجازت
	نبی اکرم ﷺ کو خدا تعالیٰ پر اور قرآن پر ایمان لانے	353	یہ سو نہیں بکرا ہے
367	کا اعلان کرنا پڑا تھا	353	اصل پردہ تو نگاہوں کو بیباک ہونے سے روکنے کا ہے
	قرآن حکیم پیدائشی مسلمان کا نہ ایمان قبول کرتا ہے اور		نبی اکرم ﷺ کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
368	نہ اسے مومن تسلیم کرتا ہے	353	کی نفسیات کو بدل کر رکھ دیا
369	کیا عقل و شعور سے ایمان لے آنا کافی ہے؟	354	دور نبوت ﷺ کی پہلی نسل کا کردار
369	ایمان کا دماغ سے قلب تک کی رسائی حاصل کرنا بھی لازم ہے		جس کسی نے بھی جنسی جذبے کو بیباک کیا وہ تباہ ہو گیا
370	نفسیاتی تبدیلی کے بغیر سیرت و کردار کی پختگی ممکن ہی نہیں	355	دیکھیے برطانیہ کی مثال
370	قلب کی تبدیلی کی ایک عملی مثال		جنسی بے راہ روی کے اس جذبے کے باوجود
371	کسی عمل کے لیے طبیعت کا مائل ہونا: یہ سیرت کی تبدیل پر موقوف ہے	355	راہ راست پر آنے کی گنجائش ہے
372	قلب کے بدل جانے سے دو جہانوں اور دو جانوں کی متضاد کیفیت	356	قرآن حکیم کے نزدیک اصلاح کا طریق بڑا غور طلب ہے
373	صرف وحی ہر دور استوں کا تعین کرتی ہے		پندرہواں باب: <b>سورة الفرقان</b> (آیات 71 تا اختتام)
374	وحی کی عطا کردہ سرفرازیوں		تلافی کے لیے تخریبی کام کے مقابلے میں صرف تعمیری کام کرنا ہوگا
374	اقدار خداوندی کے تحت انسانی اختیار و ارادے کی آزادی	360	قرآن حکیم کی تعلیم زندگی کے ایک لمحہ کو محفوظ کرنا چاہتی ہے
	کسی قدر (Value) کی نافرمانی کے سلسلہ میں	360	قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک نہ بھولنے والا واقعہ
375	ایمان کی تجدید اس کی باز آفرینی	361	ایمان کا معیار وہ ہے جسے قرآن تسلیم کرے
376	ایمان ہر آن اپنی قوت کا اظہار چاہتا ہے		قرآن حکیم کی صداقتوں اور حقیقتوں کو غور فکر کے بغیر
376	اہل ایمان کی ایک حسین دعا	362	تسلیم کرنے سے انسان مسلمان تو ہو سکتا ہے مومن نہیں بن سکتا
377	انسان کی کامیابی کا راز گھر کی ٹھنڈک میں مضمر ہے	363	ایمان لانے کا مطالبہ ایمان والوں سے کیا جا رہا ہے
377	اس ٹھنڈک کے حصول کا طریق	364	قرآن حکیم انسان کو علی وجہ البصیرت ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے
378	ہر قسم کی نعمتوں سے بھرپور زندگی		

بسم الله الرحمن الرحيم

## حرف تمنا

قرآن حکیم کے متعلق نوع انسانی کے نزدیک سب سے اہم اور مقدم سوال یہ سمجھا جاتا ہے کہ آخر وہ کون سی خصوصیت کبریٰ ہے کہ جس کے تحت اس قدیل آسمانی کو ذکر للعالمین کہا گیا ہے چنانچہ ہمارا خیال ہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں ہمارا یہ ایمان ہے کہ قرآن حکیم کی صداقتوں اور حقیقتوں کو علیٰ وجہ بصیرت تسلیم کیے بغیر کوئی شخص بھی مومن نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا تعلق اس کے مقرر کردہ قوانین و اقدار سے ہی ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس انسانی دنیا میں سب سے بڑا جرم قوم کو نظریاتی طور پر خوئے غلامی میں مبتلا کر دینا ہے۔ لیکن آج تو پوری انسانیت کی معاشی، سیاسی، تمدنی زندگی کا انگ انگ شخصیت پرستی میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت بالغہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس عہد کے عظیم مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ نے مئی 1980ء کی 16 تاریخ کو درس قرآن حکیم کے شروع میں فرمایا:

”آپ احباب کو جیسے علم ہے میں نہایت انکساری سے متعدد بار عرض کر چکا ہوں کہ میری عمر قریباً ساری کی ساری قرآن کریم کے ہی غور و فکر میں گزری اور اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ اس کے بعد قرآن کی تعلیم کا مقصود تم نے کیا پایا۔ نقطہٴ ماسکہ مرکز اس کا‘ موضوع اس کا‘ عمود اس کا‘ یعنی یہ کیا چاہتا ہے اس نے کیا کیا ہے اس کی تعلیم کیا ہے؟ تو وہ ایک فقرے میں یہ ہے کہ اس نے انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرایا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں تو یہ ہے کہ خدا نے کچھ اپنے متعلق اس میں کہا ہوا ہے وہ یہ کچھ کر رہا ہے اور یہ اس کی کتاب ہے اس نے اپنے متعلق یہ کچھ کہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کتاب تو اسی کی ہے مگر وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا

مگر یہ حرف شیریں تر جہاں تیرا ہے یا میرا

یہ ترجمان جو ہے یہ تو انسان کا ہے اور اس میں اس کے صحیح مقام سے اسے آشنا کرایا گیا ہے اور یہ چیز مذاہب کی دنیا میں تو ایک طرف رہی، یہ تو دنیا کے فکرو دانش میں کہیں نہیں ملے گی، جو اس نے قرآن حکیم میں بیان کی ہے۔

عزیزانِ من! قرآن حکیم کی طرف سے نوع انسانی کے لیے عطا کردہ نظامِ حیات کی بنیادی خصوصیت صرف دو لفظوں میں بیان کرنی مقصود ہو تو وہ یہ ہے کہ **الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمَنِ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا**۔ [25:26]

”مفہوم: اس دور میں اقتدار اور کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو افرادِ معاشرہ کی پرورش ایسے کریں گے جیسے ماں اپنے بچوں کی کرتی ہے۔“

عزیزانِ من! خوف و حزن خواہ وہ کسی قسم کا بھی کیوں نہ ہو وہ تو انسانی صلاحیتوں کو جلا کر رکھ کر دیتا ہے اور بقول پرویز صاحب کہ ”آج کے دور میں تو یہ بخوبی کہا جاسکتا ہے کہ الحق کی تلاش میں سائیکا لوجسٹ فلاسفوں سے بہت آگے ہیں اور تو میں ہمیشہ وہ تباہ ہوتی ہیں جن کے غور و فکر کے سوچ کام کرنا چھوڑ دیں۔“ قرآن حکیم کے الفاظ اور اس کا پروگرام تو موتیوں کی طرح ایک مالا کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے اور وہ اس لیے کہ قرآن حکیم کی تعلیم زندگی کے ایک ایک لمحہ کو محفوظ کرنا چاہتی ہے۔ جبکہ اس تعلیم کا بنیادی اور اولین مقصد انسان کو انسان پرستی سے

نجات دلانا ہے۔ یہ امر واقع ہے کہ انسانی عقل کے فکری عمل کو صرف قرآنی سوچ ہی جلا بخشتی ہے کیونکہ اس کے بغیر تو ظن و تخمین کی محدودیت میں گرفتار انسانی عقل کی صلاحیتیں زبوں کار حیات سے محفوظ رہ نہیں سکتی۔

خارجی کائنات میں خدا تعالیٰ کی حکومت اور اپنی دنیا میں اپنے جذبات کی اتباع! یہ ایک ایسا کھلا تضاد ہے کہ جس کا نتیجہ ہمیشہ انسانوں کے مابین ٹکراؤ کا موجب بنتا ہے کیونکہ یہ دراصل قرآن حکیم کی بیان کردہ صداقتوں کی نفی ہے۔ آج دنیا بھر میں عالمی سطح پر یہی وہ سیکولر ازم ہے جس کی ہر سو بڑی شدت کے ساتھ پوجا ہو رہی ہے اور جس کے تحت مذہبی پیشوائیت کا خود ساختہ متضاد مذہب افسانوں کا لبادہ زیب تن کیے مختلف سیاسی پارٹیوں مذہبی فرقوں بے لگام مغربی جمہوریت نظام ربوبیت کے برعکس نظام سرمایہ داری، نیشنل ازم کی دیرینہ بیماری ذات پات کا کینسر اور زمین و آسمان کے فرق کے ساتھ طبقاتی تقسیم کی مزید صحت مندی کی خاطر شب و روز کوشاں ہے۔

عزیزانِ من! وحی کے بالمقابل عقل انسانی کا طریقہ ہمیشہ تجرباتی رہا ہے چنانچہ عقل انسانی کا یہ ماحصل کہیں صدیوں بعد اُس مقام پر پہنچتا ہے جس کے آغاز میں اسے شعور تک بھی نہیں ہوتا مثلاً چودہ سو سال پیشتر یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں (۲) چاند سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے (۳) زیر زمین کھارے اور بیٹھے پانی کو الگ الگ رکھنے کے خاطر ہم نے دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ (۴) ہم نے ہر شخص کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

لہذا قرآنی دعوتِ فکریہ ہے کہ

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر

چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

چودہ سو سال پیشتر قرآن حکیم کے پیش کردہ حقائق کی ایک اور مثال

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ وحی کے مقابلے میں عقل انسانی کو صدیوں کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہم یہاں محترم پرویز صاحب کی ایک تحریر قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جس سے قرآن حکیم کی اہمیت اور مقام عقل متعین طور پر سامنے آ جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ آج کے دور میں بھی قرآن حکیم کے مروجہ تراجم اور تفاسیر قرآن فہمی کے سلسلہ میں کس قسم کی سوچ لیے ہوئے ہیں چنانچہ محترم پرویز صاحب کا قصہ آدم کی پیدائش کے سلسلہ میں کہنا یہ ہے کہ ”یہ ٹھیک ہے کہ طبعی طور پر یہ سارے جتنے بھی انسان ہیں وہ الذی خلق من المماء بشرًا (25:54) بلکہ اس نے ہر زندہ چیز کی ابتدا پانی سے کی ہے۔“ پانی حقیقت میں زندگی کی بنیاد ہے۔ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ جہاں بھی یہ سائنسدان جاتے ہیں کہیں وہ چاند پہ جائیں، مریخ پہ جائیں، جہاں بھی وہ جارہے ہیں وہاں سب سے پہلے وہ مٹی لیتے ہیں اور مٹی میں دیکھتے ہیں کہ نم ہے یا نہیں۔ اگر اس میں نم ہو تو سمجھتے ہیں کہ یہاں لائف کا زندگی کا امکان ہے اور اگر مٹی میں نم نہ نکلے تو وہ کہتے ہیں کہ یہاں آبادی یعنی زندگی Life in any form (کسی بھی شکل میں زندگی) نہیں ہو سکتی۔ چودہ سو سال پیشتر قرآن نے عرب جیسے مقام میں جہاں جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ان کا جو مرکزی شہر بین الاقوامی شہرت کا شہر مکہ تھا

اس سارے شہر میں سترہ آدمی تھے جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ تعلیم تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے، اس دور میں اس ملک میں ایک ان پڑھ (Unlettered) شخص، جسے اُمی کہا گیا ہے، وہ یہ بات بتا رہا ہے کہ زندگی کی بنیاد پانی ہے، خود انسان کی ابتدا ایک ایسے جرثومے سے ہوئی ہے جو پانی اور مٹی کے ملنے سے نمود میں آیا تھا۔ قرآن یہ کچھ چودہ سو سال پہلے بتا رہا ہے، پھر یہ Evolution (ارتقا) کی Stages (مرحلے) طے کرتا ہوا پیکرِ بشریت تک آیا۔ آج بیسویں صدی میں جا کے کہیں یہ معرکہ آراء سائنس کا انکشاف بتایا جاتا ہے جبکہ وہ ایک اُمی چودہ سو سال پیشتر عرب کے علاقے کے اندر بیٹھا ہوا یہ بات کہہ رہا ہے۔ کیا اس زمانے میں کسی انسان سے یہ ممکن تھا؟ کیا اس کی فکر میں یہ بات آ سکتی ہے کہ وہ یہ کہے کہ هُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا (25:54) خدا نے اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق انسان کی پیدائش قطرہ آب<sup>(1)</sup> سے کی۔“ علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے کہ

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست  
رحمۃ للعالمین انتہا ست

اسی سلسلہ میں مروجہ تفاسیر سے ایک دوسری مثال نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے متعلق ہے، جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کو جادو زدہ کہنے والوں کو ظالم قرار دیا ہے۔ جبکہ ہم آج بھی نوعِ انسانی کو یہ یاد کروانے میں مصروف کار ہیں کہ آپ ﷺ پر جادو کر دیا گیا تھا چنانچہ اس واقعہ کے سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن چھٹی جلد کا صفحہ 554 دیکھا جاسکتا ہے، جبکہ مزید حوالہ جات کے لیے یہ تفسیری بیان کتاب ہذا کے صفحہ 85 پر پیش کر دیا گیا ہے۔

بہر حال اس قسم کی بعید از قرآنی تعلیم کے برعکس قرآن حکیم کی منزہ اور مشہود تعلیم کو تدریسی طور پر نوجوان نسل تک پہنچانے کی خاطر محترم پرویز صاحبؒ ایک کالج کی تعمیر کا خواب بوجہ پورا نہ کر سکے۔ چنانچہ 3 مارچ 1978ء کو آپ نے ایک درس میں فرمایا کہ

”کاش ایک کالج کی تعمیر کا خواب پورا ہو جاتا میری یہ آرزو بھی مرنے کے بعد مجھے نفسِ غیر شعوریہ کی طرح ستاتی رہے گی۔“

عزیزانِ من! یہ تھا وہ مردِ قلندر جس نے اپنی ساری زندگی قرآن حکیم کو سمجھنا اور دوسروں تک پہنچانے میں صرف کی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ

غم سے مرتا ہوں کہ دنیا میں نہیں ہے کوئی

کہ کرے تولیتِ مہر و وفا میرے بعد

آخر پر بزمِ طلوعِ اسلام کا ایک ایک فرد محترم ڈاکٹر منظور الحق صاحب سے لے کر جناب محمد علی فاروقی تک اُن تمام حضرات کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ جن کا علمی اور ادبی تعاون تفسیر ہذا کے مکمل ہونے تک شامل حال رہا۔

محمد اشرف ظفر

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور

نومبر 2007ء





## پہلا باب: سورة الفرقان (آیت 1: تمہید)



عزیزانِ من! آج دسمبر 1977ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان سے ہو رہا ہے: (25:1)

### لفظ برکت کا قرآنی مفہوم اور انسانی سوچ کی کیفیت

سورة کی پہلی آیت ہے: تَبْرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَلَمِينَ نَذِيرًا (25:1)۔ عام ترجمے کی رو سے کہا جاتا ہے کہ ”با برکت ہے وہ ذات کہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا“ قرآن نازل کیا تاکہ یہ انسان کے لیے تمام لوگوں کے لیے ڈرانے کا موجب ہو جائے۔“ آپ کو ہر جگہ یہی ترجمہ نظر آئے گا۔ اس سورة کا آغاز ہی تَبْرَكَ الَّذِي (25:1) سے ہوتا ہے۔ برکت کا لفظ تو ہمارے ہاں صبح سے شام تک ہر زبان پر ہوتا ہے۔ ہم دعا بھی دیتے ہیں کہ اللہ برکت عطا فرمائے۔ تَبْرَكَ اللهُ ہے جو خود با برکت اور برکات عطا کرنے والا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ برکت ہوتی کیا ہے؟ سوچیے تو سہی۔ کیا اس سے آپ کے ذہن میں کوئی متعین چیز آتی ہے؟ ”اے چیزاں تے بچپن اچ ای سندے آئے نا: جے بسم اللہ پڑھ کے روٹی نہ شروع کریئے“ تے فیر برکت ای نہیں رہندی۔“ <sup>①</sup> اس پر سوچیے کہ یہ ہوتی کیا ہے؟ میں عرض کر رہا ہوں کہ برکت کہتے کسے ہیں اس پر سوچیے۔ یہ ایک ذہنی موہوم سی تصوراتی چیز لگتی ہے۔ آپ صرف اس ایک لفظ پر ہی نہیں، کبھی سوچیے گا کہ صبح سے شام تک ہم کتنے ہی الفاظ بولتے ہیں جن کا کوئی متعین مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا، بس ساری عمر بولتے رہتے ہیں، ساری قوم بولتی رہتی ہے، ساری دنیا بولتی رہتی ہے لیکن ذرا کھڑے ہو کر سوچیے تو سہی کہ ہم کہتے کیا ہیں؟ ”برکت عطا کرے“ برکت ہوتی کیا ہے اور یہ چیز ہے جس پہ قرآن زور دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ

① یہ چیزیں تو بچپن سے ہی سنتے چلے آئے ہیں کہ اگر بسم اللہ نہ پڑھ کر کھانا شروع کیا جائے تو ”برکت“ ہی نہیں رہتی۔

تَتَفَكَّرُوا (34:46) جو لفظ بھی زبان سے بولو کھڑے ہو کر سوچو کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے؟ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ جو اعلیٰ تعلیم ہے، جو اعلیٰ اقدار ہیں ان کو تو چھوڑیے، روزمرہ کی زبان میں جو الفاظ آپ بولتے ہیں، ان کے متعلق تو آپ کو معلوم ہو کہ میں کہتا کیا ہوں۔

بڑی مشکل تو یہ ہے کہ یہ کوئی سوچنا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ انسان سوچنے والا جانور بھی ہے لیکن جسے Herd Instinct (گروہی جبلت) کہتے ہیں، جسے بھیڑ چال کہتے ہیں اس میں بہت زیادہ یہی چیز ہے کیونکہ انسان کی زندگی کا نمایاں حصہ تو حیوانی زندگی میں گزرتا ہے۔ اسے ہی Herd Instinct (گروہی جبلت) کہتے ہیں۔ سارے بولتے ہیں، ہم بھی بولتے ہیں، بولتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن اسی Herd Instinct (گروہی جبلت) کو تو ہٹانے کے لیے آیا تھا۔ اس کو ہٹا کر اسے Reason (استدلال) پر لانے کے لیے قرآن آیا تھا۔ قرآن میں خدا کہتا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (12:2) تاکہ تم عقل سے کام لینا سیکھو۔ قرآن کی غرض و نیت یہ ہے۔ لَعَلَّكُمْ ایک عام لفظ ہے۔ عربی جاننے والے بھی جانتے ہیں کہ لَعَلَّكُمْ وہاں آتا ہے جہاں کسی چیز کی غایت بتائی جائے تاکہ یہ چیز ہو یعنی لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (12:2) تاکہ تم عقل سے کام لینا سیکھو۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ عقل سے کام لینے میں تو یہی ہے کہ آپ کھڑے ہو کر سوچیں۔ سوچنے کے دو الگ الگ طریقے ہیں۔ وہ میں ابھی عرض کروں گا لیکن بہر حال قرآن کہتا ہے کہ تَتَفَكَّرُوا (34:46)۔ قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ایک ہی بات کہی تھی کہ سوچا کرو۔ سوچنے کی پہلی ابتدا تو ہونی چاہیے کہ صبح سے شام تک ہم جو الفاظ زبان سے بولتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے؟ یہ جو ہم بلا سوچے بولتے چلے جاتے ہیں یہ اس طرح سے Herd Instinct (گروہی جبلت) ہوتی ہے۔ اس کو عربی زبان میں تقلید کہتے ہیں۔ قلاۃ وہ پٹہ ہوتا ہے جو جانور کے یا مویشی کے گلے میں ڈالا جاتا ہے اور اس سے کھینچ کے اس کو لیے چلے جاتے ہیں<sup>①</sup>۔ جبلی طور پر (Instinctively) حیوانات میں یہ چیز ہوتی ہے۔ جسے

① امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ”المفردات فی غریب القرآن“ میں لکھا ہے کہ قَلَادَةُ کے معنی بٹی ہوئی ڈور یا چاندی وغیرہ کا تار ہے جو گلے میں ڈالا جائے لیکن بعد میں ہر اس چیز کو کہنے لگے جسے گلے میں پہنا جائے یا جو کسی چیز کا احاطہ کر لے۔ اُسے اپنے گھیرے میں لے لے۔ تاج العروس اور محیط المحيط میں ہے کہ اَلْأَقْلِيْدُ اوٹنی کی ناک کی نتھنی جس میں کیل کی رسی ڈالی جائے۔ اس سے تقلید کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی کیل کی نتھنی جسے ناک میں یا پٹا جسے اپنے گلے میں ڈال لیا جائے اور رسی دوسرے کے ہاتھ میں دے دی جائے اور پھر اس کے پیچھے انسان جانور کی طرح چلتا جائے۔ چنانچہ بقول صاحب تاج العروس اسی نہج سے کہتے ہیں تَقَلَّدَ الْوُلَاةُ الْأَعْمَالُ یعنی والیوں کا ملازموں کو مختلف کاموں پر تعینات کرنا۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے نزدیک ان عقائد اور شعائر کو کہتے ہیں جو ان کی کتابوں میں کہیں مدون نہیں لیکن جنہیں انہوں نے اپنے اسلاف سے زبانی حاصل کیا اور یہ سلسلہ اسی طرح متواتر چلا آ رہا ہے۔ (دیکھیے: پرویز (1991): لغات القرآن جلد سوم۔ لاہور: ادارہ طبع اسلام۔ ص 1382 تا 1384)۔

ہم بھیڑ چال کہتے ہیں اس میں اگلی بھیڑ جس طرف چلی جا رہی ہوتی ہے اسی طرف پچھلی بھیڑ چلی جا رہی ہوتی ہے۔ جب سے پہلی بھیڑ ہوئی ہے اور جب تک ہمارے ہاں آخری بھیڑ ہے ان کی یہ ایک ہی روش چلی آ رہی ہے۔ اسے Herd Instinct (گروہی جبلت) کہتے ہیں۔ اسے ہی تقلید کہتے ہیں۔ یہ جو تقلید ہے یہ آپ کے ہاں کا کوئی فقہی مسئلہ نہیں ہے، یہ کوئی فروعی مسئلہ نہیں ہے کہ یہ مقلدین ہیں یا یہ غیر مقلدین ہیں۔ سوال ہی یہ ہے کہ کیا آپ نے Herd Instinct (گروہی جبلت) پر چلنا ہے یا Reason (استدلال) پر چلنا ہے؟ اور Herd Instinct (گروہی جبلت) کی جو بات ہے جس کا عام ترجمہ ہمارے ہاں بھیڑ چال کیا جاتا ہے اس میں پہلی چیز یہاں سے شروع کرو کہ وہ جو دن بھر آپ الفاظ بولتے ہیں کھڑے ہو کر سوچو کہ اس کے معنی کیا ہے۔

یہاں برکت کے لفظ سے ایک چیز آئی ہے جو اپنے مقام پہ محکم ہو، جم کے کھڑی ہو مگر اس میں نشوونما ہو رہی ہو۔ اب جم کے کھڑے ہونے میں تو پتھر بھی ہے۔ وہ ایک ہی مقام پہ جم کے کھڑا ہوتا ہے، پہاڑ بھی ایک ہی مقام پہ جم کے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں نمو یا نشوونما نہیں ہوتی یہ جامد ہوتا ہے لیکن ایک شے جو اپنے مقام پہ محکم بھی ہو، مستحکم بھی ہو اور اس میں نشوونما بھی ہو رہی ہو، عربی زبان میں اسے برکت کہتے ہیں جیسے درخت اپنے مقام پہ بھی جم کے کھڑا ہے اور نشوونما بھی ہو رہی ہے۔ سوچ رہے ہیں آپ کہ ایک لفظ میں کیا کچھ کہہ جاتے تھے! زبان بنانے میں یہ عرب پہ نہیں کیا کر گئے۔ برکت یہ ہے کہ اپنے مقام کے اوپر محکم اور مستحکم بھی کھڑا ہو اور اس میں نشوونما بھی ہو رہی ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا (41:30) جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس دعوے پر جم کر کھڑے ہو گئے تَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ (41:30) ان پر فرشتے اترتے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ محض جم کے کھڑے ہونا نہیں ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ تو پتھر اور پہاڑ بھی اپنے مقام پہ جم کے کھڑا ہوتا ہے۔ ایک مقام پر جم کے کھڑے رہنا اور نشوونما ہوتے چلے جانا یعنی ساتھ کے ساتھ اس کا جو بڑھنا پھولنا پھلنا ہے اسے برکت کہتے ہیں۔ ”اللہ برکت عطا فرمائے“ کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے محکم اصولوں پہ بھی جم کے کھڑے رہو اور زندگی کی ارتقائی منازل بھی طے کرتے چلے جاؤ۔ اب سوچے گا کہ ہم میں سے کسے برکت حاصل ہوتی ہے؟

تبرک کا مفہوم ہوا کہ وہ ذات جو خود اس صفت کی مالک ہے اور وہ دوسروں کو یہ چیزیں عطا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے برکت کا یہ جو اصول جو کلیہ جو طریقہ عطا کیا وہ کس طریق پہ کام کرتا ہے۔ یہاں کہا کہ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (25:1) فرقان نازل کیا گیا تاکہ برکت عطا فرمائے۔ یہ وہ ہے جسے ثبات و تغیر کا امتزاج (Combination of permanence and change) کہتے ہیں۔ اس میں اپنے مقام پہ محکم بھی کھڑا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نشوونما (Development) بھی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

## الفرقان کے لفظ کی بلاغت

کس مقصد کے لیے یہ نازل کیا؟ کیا نازل کیا؟ کہا کہ الفرقان نازل کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم کی خصوصیات بیان کرنے کے لیے قرآن میں بہت سے الفاظ آئے ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اگر صرف یہ ایک ہی لفظ آتا تو کافی ہو جاتا۔ یہ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے اتنا جامع لفظ ہے۔ اس ایک لفظ فرقان کا مادہ تو ”فرق“ ہے یعنی فرق۔ ہمارے ہاں بھی تو فرق کہتے ہیں: ایک چیز کا دوسری چیز میں فرق کرنا۔ فارسی زبان میں یہ لفظ ”سر“ (Head) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ فرق؛ تابعہ قدم ہر کجا کہ می نگریم سر سے پاؤں تک۔ یہ بھی ذرا سا ہٹا ہوا ہے۔ عربوں کے ہاں فرق بالوں کی مانگ کو کہتے تھے اور مانگ کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر ایک بال بھی ادھر سے ادھر ہو جائے دوسرے سے الگ نہ ہو تو مانگ ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ اس طرح دو چیزوں میں امتیاز، تفریق، Distinction کرنا کہ ان میں بال برابر فرق نہ رہے ایسی نمایاں طور پر دو چیزیں الگ الگ ہوں کہ ان میں بال برابر فرق نہ رہے تو اسے ان کے ہاں فرق کہا جاتا تھا۔ مانگ کو سیدھی ہونا چاہیے۔

آپ کو پتہ ہے کہ مانگ سیدھی کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ قرآن کریم کے اعمال قرآنی ایک چیز ہوتی ہے۔ اعمال تو کام کا نام تھا لیکن ہمارے ہاں اعمال قرآنی کے معنی ہوتے ہیں: قرآن کی آیتوں پہ تعویذ لکھنا، ورد و وظائف بتانا۔ اس کے اوپر کتابیں لکھی ہوئی ہیں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کی بھی اس پہ ایک کتاب ہے۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت صاحب کے ہاں شکایت کرنے کے لیے ایک بی بی بھی آئی کہ میری مانگ سیدھی نہیں نکلتی تو آپ نے فرمایا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (1:5) سات دفعہ پڑھ کر کنگھی پہ پھونک مارو، مانگ سیدھی نکل آئے گی۔ ”تہانوں استعمال ای نہیں پتہ اپنا آیتاں دا۔ ساڈیاں منڈیاں دے وال ای ایوں کر کے کر دے: پہلے کھجے پاسے کیتی مانگ۔ اتھے وی کم نانیا، اوناں نے سجے پاسے کیتی فیروال ای کٹالیے۔ اسی اینوں بی باکینے آں۔ چلو سیا پای مکایا وچوں۔“<sup>①</sup> نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ان کی ساری زندگی میں وہ مانگ ہی نکل گئی یہ فرق یعنی مانگ ہی نہیں رہتا۔ عزیزانِ من! تفریق ہی نہیں رہتی۔ عربی زبان میں فرق کہتے تھے ایسی نمایاں تفریق جس میں بال برابر فرق نہ ہو۔ الفرقان وہ فرقان ہے جو اس قسم کی تفریق پیدا

① آپ کو ان آیات کے استعمال کا علم ہی نہیں ہے۔ ہمارے بچوں کے بال بس یونہی سے کیے ہوتے ہیں: پہلے بائیں جانب مانگ نکالی۔ یہاں بھی کام نہ بنا نہ چچے تو دائیں جانب نکال لی پھر سر منڈالیا۔ ہم اسے بہت اچھا بچہ کہتے ہیں۔ چلو یہ مانگ وانگ کی مصیبت ہی ختم ہوئی۔

کردے اور الفرقان تو صرف وہی ایک شے ایسی ہے جو اس قسم کی تفریق پیدا کر سکتی ہے۔ عربی زبان میں الف لام (ال) یوں آتا ہے: کسی چیز میں خاص تفریق کرنا۔ انسانیت کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ حق اور باطل میں تفریق، Truth & False میں تفریق، خیر اور شر میں تفریق، Good & Evil میں تفریق۔ یہ Ethics یا اخلاقیات کا بنیادی مسئلہ ہے کہ خیر کیا ہے؟ Good کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ Evil کسے کہتے ہیں؟ False کیا چیز ہے؟ Truth کیا چیز ہے؟ آپ کہیں گے کہ یہ کون سا ایسا مسئلہ ہے۔ یہ اسی لیے ہے کہ آپ نے کہیں، کبھی کھڑے ہو کے سوچا نہیں۔ کبھی ان سوچنے والوں سے پوچھو۔ جب سے سوچنے والوں کی تاریخ سامنے آئی ہے وہ یونان کے فلاسفر ابوالحکمت کہلاتے ہیں۔ ان کے ہاں اس زمانے سے یہ خیر اور شر، حق اور باطل کی تفریق کی بات شروع ہوئی کہ کسے خیر کہتے ہیں؟ کسے شر کہتے ہیں؟ حق کیا ہے؟ باطل کیا ہے؟ یہ اس زمانے سے شروع ہوئی اور آج تک چلی آرہی ہے لیکن آج تک انسان یہ فیصلہ نفع و ضرر کرنے نہ سکا اور آپ حیران ہوں گے کہ آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ یہ بات تو کوئی ایسی ہے ہی نہیں کہ جس میں یہ کچھ ہو۔ بعض حالات کے اندر بعض چیزیں اچھی ہوتی ہیں، دوسرے حالات میں وہ اچھی نہیں رہتیں۔ اس کے برعکس اچھی ہو جاتی ہیں۔ ایک وقت میں ایک چیز کو آپ حق کہتے ہیں دوسری چیز میں وہی باطل ہو جاتا ہے۔ خیر کو اچھا کہیں، شر کو برا کہیں تو حالات کے بدلنے کے ساتھ یہ چیزیں بدلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں اضافی (Relative) ہیں۔ مثلاً یہ چیز عام طور پر کہی جائے گی کہ سچ بولنا اچھا ہے، جھوٹ بولنا برا ہے، مگر بوقت ضرورت یہ سچ اور جھوٹ اضافی (Relative) رہے گا، مطلق (Absolute) نہیں ہوتا کیونکہ وہاں مصلحت کا تقاضا یہی ہوگا کہ جھوٹ بول دیا جائے۔

### بدلتے ہوئے حالات میں حق اور باطل کی تعریف

عزیزانِ من! اب اگر یہاں پہلی چیز یہ پوچھی جائے کہ صاحب! یہ جھوٹ بولنا برا کیوں ہے؟ آپ وہیں کھڑے ہو جاتے ہیں کہ صاحب! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ برا کیوں ہے۔ بتا دیجیے کہ کیا یہ پوچھنے کی بات نہیں؟ ”مجھے نہیں پتہ۔“ آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے کہ صاحب! سوسائٹی اس کو بڑا مذموم سمجھتی ہے اس لیے یہ بری چیز ہے۔ اگر کل کو سوسائٹی اس کو اچھا سمجھنے لگ جائے تو پھر یہ اچھی ہو جائے گی۔ تاریخ میں کتنی ہی سوسائٹیاں ایسی گزری ہیں جن کے ہاں جھوٹ بولنا بہت بڑی اچھائی کی بات سمجھا جاتا تھا، بڑا جوہر سمجھا جاتا تھا۔ دھوکا دینا، فریب دینا بڑے نیکی کے کام سمجھے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں ابھی کل تک ٹھگوں کی جماعت تھی۔ وہاں ایک پورا مذہب تھا۔ ان میں درگاہ یا کالی دیوی کے پجاری تھے، ان کے ہاں بنیادی چیز یہ تھی کہ نوجوان لڑکے کی شادی اس وقت تک

نہیں ہوتی تھی جب تک وہ کسی کو دھوکا دے کر مار نہ آئے۔<sup>①</sup> ہمارے ہاں تو عام طور پہ ماں باپ کی عزت و تکریم کی جاتی ہے مگر کئی قبائل ایسے گزرے ہیں جو ماں باپ کو کچا کھا جانا بہت بڑی نیکی سمجھتے تھے۔ رومنز کے ہاں رومنز کو دھوکا دینا بری بات تھی مگر غیر رومن کو دھوکا دینا بڑی نیکی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے ہاں بھی غیر یہودی سے سود لینا بالکل شیر مادر کی طرح حلال ہے۔ یہودی یہودیوں سے سود نہیں لیتے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں دھرم شاستر کے اندر عصمت بڑی چیز ہے لیکن غیر برہمن لڑکی پر اگر برہمن دست درازی کرتا ہے تو اس میں کوئی چیز معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی۔<sup>②</sup>

یہ کیا چیزیں تھیں؟ آپ نے ان مثالوں سے کیا سمجھا؟ یہ کہ یہ چیزیں جو ہیں مثلاً سچ بولنا، عصمت کی حفاظت کرنا، دغا نہ دینا، فریب نہ دینا، یہ کچھ ٹھیک نہ تھا۔ یعنی ہم نے دیکھا یہ ہے کہ بعض سوسائٹیوں کے اندر اس کے بالکل برعکس تھا، حالات کے تابع یہ چیزیں بدلتی چلی جاتی تھیں۔ جو چیزیں اس طرح سے بدلنے والی ہوں، ان کو یا تو Relative (اضافی) کہتے ہیں یا مشروط ہوتی ہیں کہ ان حالات کے تابع ہوں یہ اچھی بات ہے، اگر یہ حالات بدل جائیں تو پھر یہ اچھی بات اچھی نہیں رہتی بری ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں یہ چیز بری ہے اگر وہ حالات بدل جائیں یا یہ شرائط بدل جائیں تو وہ ایک بری چیز اچھی ہو جاتی ہے۔ یہ Relative (اضافی) چیز ہوئی لیکن حق یا Truth تو وہ ہے جو اضافی نہ ہو بلکہ Absolute (مطلق) ہو۔ ہر حالت میں وہ حق ہو، باطل ہر حالت میں باطل ہو، ہر دور میں باطل ہو، ہر قوم میں باطل ہو، ہر تمدن میں باطل ہو۔ یہ Absolute (مطلق) اور Relative (اضافی) دو Terms (اصطلاحات) آئیں۔ اب ہمارے

① ڈاکٹر تھینی ڈکٹ (Ruth Benedict) نے اپنی کتاب Patterns of Culture میں بحر اکاہل کے نزدیک ایک قبیلہ کے متعلق لکھتی ہے کہ ان کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق شمار کی جاتی ہے اور جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہو اسے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ خود ہندوستان میں ٹھگوں کی یہی حالت تھی۔ سپارٹا میں چوری کرنا بہت بڑی خوبی سمجھا جاتا تھا۔ ازمنہ مظلمہ (Dark Age) میں لوٹ مار کو ہمیشہ عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا..... ازٹیکس (Aztecs) کا خیال تھا کہ اگر پوجاریوں کو باقاعدہ انسانی گوشت نہ کھلایا جائے تو سورج کی روشنی مدھم پڑ جائے گی۔ (پرویز: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 2002ء، ص 156 تا 157)

② راشڈل (Rashdall, Hostings) نے اپنی کتاب The Theory of Good and Evil کی پہلی جلد میں اسی طرح کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ مثلاً ”بہت سے ایسے کام جنہیں اقوام عالم جرم قرار دیتی ہیں یونانیوں کے ہاں انہیں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ مقدس (Puritans) حبشی بچوں کو چرا کر لے جانے اور آئرستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے (ص 84)۔“ اس باب میں پروفیسر میور ہیڈ (J.H. Muirhead) اپنی کتاب The Elements of Ethics (عنصر اخلاقیات) میں لکھتا ہے کہ ”ان اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقیات ہر جگہ اور ہر زمانہ میں حالات کے مطابق بدلتے رہے ہیں اور اخلاق ہمیشہ اپنے ماحول کے اندر ہی اخلاق رہتا ہے۔“

(جو قارئین اس باب میں مفصل مواد سمجھنا چاہتے ہیں وہ مطالعہ فرمائیں: پرویز (2002)۔ انسان نے کیا سوچا؟ باب اخلاقیات ص 136 تا

ہاں مطلق اور اضافی، یعنی بحثیں آج تک آئی ہیں، یہ فلسفہ اخلاق Ethics<sup>1</sup> ہے، فلسفے کی ایک چیز ہے۔ اس میں یہی چیزیں آئی ہیں کہ مطلق حق Absolute Truth کیا ہے؟ یا مطلق خیر کیا ہے؟ یہ وہ ہے جو کسی حالت میں نہ بدلے کسی شرط سے مشروط نہ ہو، Relative (اضافی) نہ ہو، Absolute (مطلق) ہو، یعنی اپنے مقام کے اوپر محکم ہو تو وہ حق مطلق ہے۔

### حق ہمیشہ حق ہوتا ہے

میں کہتا ہوں کہ عربی زبان میں تو حق کے ساتھ مطلق کے لفظ کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ تو حق کہتے ہی اسے تھے جو ہر مقام پر ہر شرط پر ہر حالت میں حق ہو، اٹل ہو۔ حق کا لفظ ہی وہاں بولتے تھے جو Absolute (مطلق) ہو۔ ان کے ہاں Relative حق یعنی اضافی حق کا تصور ہی نہیں تھا۔ یہ کیا ہی خوب بات ہے! وہ تو جب ہمیں اس اضافی یا Relative کو الگ کرنا پڑا تو ہم حق مطلق اپنے ہاں بولتے ہیں۔ یہ زبان کے اعتبار سے غلط ہے، حق ہے ہی The Truth۔ یہ جو چیز ہے کہ ایک چیز بعض شرائط کے تابع شر ہے ذرا حالات بدل جائیں وہی خیر ہو جاتا ہے بالکل غلط ہے۔

### جھوٹ بولنے کی اجازت کا فتویٰ

معاف رکھیے گا کہ شاید آپ کے ذہن میں آج یہ ہو کہ اس نے یہ کچھ فلسفیانہ گفتگو چھیڑ دی، اس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آئیے ہم نیچے کی سطح پر گفتگو کریں۔ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ ٹھیک ہے، ہر ایک ہم میں سے کہے گا کہ قرآن کی رو سے جو کذب ہے، یہ باطل ہے، شر ہے۔ ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مطلق (Absolute) باطل ہے، مطلق شر ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں یہاں کیا چیز جاری ہوئی؟ پرانے زمانے میں آپ کی ملکیت کے دور کے اندر تو یہ چیزیں تھیں کہ جھوٹ ہے تو بری بات لیکن زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن میں جھوٹ بولنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ پرانی تفسیروں کو تو چھوڑیے۔ آج کے دور میں آپ کے ہاں مولانا مودودی صاحب<sup>2</sup> تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے کہا ہے زندگی کی بعض عملی ضروریات ایسی ہیں جن میں جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے یعنی آدمی جھوٹ نہ بولے تو گناہگار ہو جاتا ہے اور یہ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے تو گویا سچ جو ہے حق مطلق نہ رہا، Absolute Truth نہ رہا، Relative (اضافی) ہو گیا، Conditional (مشروط) ہو گیا۔ زندگی کی بعض ضرورتوں کے تابع جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ اب جھوٹ بولنا شر مطلق یا باطل مطلق نہ رہا، Absolute نہ رہا، اضافی ہو گیا، ضرورت کے تابع مشروط ہو گیا

1 انگریزی میں Morality عام اخلاق کو کہتے ہیں اور Ethics اُس سائنس یا فلسفہ کو جو Morality سے بحث کرتا ہے۔ ہمارے یہاں ان کے لیے الگ الگ اصطلاحات موجود نہیں ہیں اس لیے ان دونوں کو اخلاق سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے (پرویز: انسان کے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور 2002ء، ص-141 (فٹ نوٹ 1)۔

2 سید مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979)

پوچھیے ان سے کہ دنیا میں کون سا جرم ہے جس کے لیے مجرم سے پوچھیے تو وہ یہ نہ کہہ دے کہ میں نے ضرورت کے تابع یہ کیا ہے۔ پھر میں دہرا دوں جو برسوں سے دہرایا کرتا ہوں: ہمارے ہاں تو روز کہتے ہیں کہ اوتو جھوٹ بولیا ہیگا؟ کہن لگا: مینوں کی لوڑ پٹی ہوئی ہیگی سی کہ میں جھوٹ بولدا۔ مینوں کی لوڑ سی؟<sup>1</sup> جھوٹ بولا تم نے، جواباً کہا کہ جی! مجھے کیا ضرورت تھی، گویا ضرورت نہ ہو تو کوئی بھی جھوٹ نہیں بولتا، ضرورت نہ ہو تو کوئی بھی کوئی جرم نہیں کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک چیز اس کے نزدیک ضرورت ہو آپ کے نزدیک وہ ضرورت نہ ہو لیکن اس سے پوچھیے تو وہ ضرورت بتا دے گا۔

## جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں ارتکاب کا عمل

ایک ضرورت تو Physical (طبعی) ضرورت ہے۔ اس سے روپیہ پیسہ ملتا ہے۔ یہ چیزیں جذبات کی تسکین<sup>2</sup> کرتی ہیں۔ زنا کار کو

- 1 ارے، کیا تم نے جھوٹ بولا؟ کہنے لگا: مجھے کیا ضرورت لاحق تھی کہ میں جھوٹ بولتا۔ مجھے کیا ضرورت تھی؟
- 2 اخلاقی مفکرین کا ایک گروہ ہے جس کا خیال ہے کہ انسان کا مقصد زندگی حصول لذت ہے۔ یعنی ہر کام کا جذبہ محرکہ حصول لذت کا خیال ہوتا ہے لہذا جو اعمال حصول لذت میں مدد و معاون ہوتے ہیں خیر (Good) کہلاتے ہیں اور جو اس مقصد کے حصول کی راہ میں مانع ہوتے ہیں شر (Evil) کہلاتے ہیں۔ اس نظریہ کو Hedonism کہتے ہیں۔ Hedone یونانی لفظ ہے جس کے معنی Pleasure (لذت) کے ہیں ہابز (Hobbes) نظریہ لذتیت (Hedonism) کی انتہائی شکل Egoism کے نظریہ کا قائل تھا..... یعنی اپنی ذات کے لیے حصول لذت۔ اسپنوزا (Spinoza; 1637-1677) نے اس میں اتنی تبدیلی کی کہ انسان کو لذت (Pleasure) اپنی ذات کے تحفظ اور اس کی تکمیل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اعمال خیر وہ ہیں جن سے انسان تحفظ نفس اور اس کی تکمیل کر سکے..... اس کی بنیاد بھی اسی جذبہ خود غرضی (Selfishness) پر ہے جس پر ہابز (Hobbes) کا نظریہ Egoism مبنی تھا..... یہی وہ تصور ہے جس پر رہبانیت کی عمارت قائم ہے..... یہی تجرد و انفرادیت تھی جو یونان میں رواقیت (Stoicism) کی بنیاد قرار پائی..... تصوف اسی کے ایک حسین پیکر کا نام ہے..... اخلاقیات میں دوسرا نظریہ افادیت (Utilitarianism) ہے۔ اس میں عمل خیر وہ ہے جس سے زیادہ سے زیادہ افراد کا زیادہ سے زیادہ فائدہ مرتب ہوتا ہے..... اس سلسلے میں نظریہ افادیت کے آئمہ فکر میں سے مل (John Stuart Mill) ہمیں بتاتا ہے کہ ”لذت (Pleasure) کا حصول اور درد (Pain) سے نجات ہی مقصود زندگی ہے۔“..... راشڈل (Rashdall) نے افادیت کا ایک اور نظریہ وضع کیا جسے وہ مثالی افادیت (Ideal utilitarianism) کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ نظریہ ارتقا کا حامی ہر برٹ اسپنر (1820-1903) بقاء اصلح (Survival of the Fittest) کا موجد بنا اور طبیعیات کے دائرے سے نکال کر اسے اخلاقیات کے دائرے میں لے آیا۔ اس نظریہ کا نام ارتقائی اخلاقیات (Evolutionary Ethics) ہے جس میں نوع انسانی کا باقی رہنا (Survival) ہی خیر (Good) ہے۔ اس بقا کے لیے ماحول سے مطابقت (Adaptability to Environment) ضروری ہے۔ اس کا قول ہے کہ ”اخلاقیات کی بنیاد انتقام کا خوف ہے۔“ اس پر پرویز نے کہا کہ ”جب انتقام کا خوف نہ رہے تو پھر اخلاق کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔“ G.G. Simpson نے اس نظریہ کی تردید کی اس کے طرز فکر کو فطریت (Naturalism) یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ نظریہ انسانیت (Humanism) بھی کہتے ہیں۔ علم الانسان (Anthropology) اور علم المعاشرت (Sociology) کی رو سے اخلاقی ضوابط ان رسوم کے مجموعہ کا نام ہے جنہیں سوسائٹی نے وقتاً فوقتاً اختیار کیا اور جو پھر نسل بعد نسل متواتر منتقل ہوتے چلے آئے۔ اس سے اخلاق بدلتے رہتے ہیں۔ پال (Leslie Paul) کے الفاظ میں ”اخلاقیات“ کا مباحی کا دوسرا نام ہے (The Meaning of Human Existence. P-210) اسی روش کا نام مصلحت کوئی (Expediency) ہے اور جھوٹ اچھی چیز ہے۔ اسے کہتے ہیں نظریہ وجدانیت (Intuitionistic Theory of Ethics)۔ یہ ایک لمبی بحث ہے اور بہت سے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ فرمائیے: پرویز (1955)۔ انسان نے کیا سوچا؟ کراچی: ادارہ طلوع اسلام۔ ص: 118 تا 168۔



جذبات کی تسکین کی زیادہ اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے حرام مطلق قرار دیا ہے یعنی کوئی بھی حالت ایسی نہیں کہ جس میں اس کی اجازت ہو۔ اب یہ جو زبان سے اس کا ارتکاب کرتے ہیں وہ یہ کچھ نہ کہیں تو بھی ایک اشد ضرورت ہے جس کے تابع یہ کیا جاتا ہے اور وہ ہے جنسی جذبے کی تسکین۔ اگر اس میں میری بیٹیاں اور بہنیں معاف رکھیں، جنسی جذبے کا اشتعال ہی نہ ہو، انگیزت ہی نہ ہو تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، خیال ہی نہیں ادھر آ سکتا۔ وہ تو اس جذبے کی شدت ہے جس سے یہ عمل سرزد ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ جسے آپ ضرورت کہتے ہیں، یہ جذباتی ضرورت ہے۔ زندگی کی ساری ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ جتنا کچھ ایک کے پاس ہے یہ جو ہوسِ زر ہے اس کو مارے مارے لیے پھر رہی ہے بھاگے بھاگے چلا جا رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اَلْهٰکُمْ التَّکَاثُرُ ۝ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) اور زیادہ سمیٹنے کی، دوسروں سے اور آگے بڑھنے کی، یہ جو ہوس ہے، یہ انسان کو لیے چلے جا رہی ہے تا وقتیکہ وہ قبر تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ آپ کے نزدیک ضرورت نہیں ہے۔ ہم روز کہتے ہیں کہ صاحب! اس کے پاس اتنی دولت ہے، اس کے بعد اس کو اور کیا ضرورت ہے جو یہ جھک مار رہا ہے، فریب دے رہا ہے، چوری کر رہا ہے، دغا کر رہا ہے، غلط الامنیں لے رہا ہے۔ کیوں یہ کچھ کر رہا ہے؟ آپ کے نزدیک اس ”کیوں“ کا کوئی جواب نہیں ہے کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس کے اندر ایک جذباتی ہوس ہے اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ جذباتی ضرورت تو طبعی ضروریات سے بھی کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔

### ہر جرم کا ارتکاب ضرورت کا رہین منت ہوتا ہے

عزیزانِ من! ضرورت کے بغیر کسی بھی جرم کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ آپ ضرورت کی نوعیت میں فرق کر سکتے ہیں۔ اگر تصور اور نظریہ یہ ہو جائے کہ ضرورت کے مطابق ایک چیز جو غلط ہے وہ صحیح ہو جاتی ہے، اس کے کرنے کی اجازت ہو جاتی ہے، تو دنیا میں کوئی چیز بھی باطل مطلق یا شر مطلق نہیں رہتی۔ بڑے سے بڑے قاتل سے بھی آپ پوچھیے، وہ بھی اپنے اس جرمِ قتل کے جواز میں کچھ نہ کچھ کہے گا کہ میں نے یہ کیوں کیا۔ اس ”کیوں“ کا جواب ہی تو ”ضرورت“ ہوتی ہے۔ مثلاً میں نے انتقام لینا تھا یہ ایک جذباتی ضرورت ہے۔ ٹھگ اگر مال لینے کے لیے کچھ کرتا تھا یا اپنا جو عقیدہ تھا اس کی ضرورت کے ماتحت دوسرے کو قتل کرتا تھا تو یہ انتقام لینے کے لیے قتل کر رہا ہے، یہ اُس ضرورت کے تحت ہو رہا ہے۔ یہ اضافی (Relative) چیزیں ہیں۔ مطلق حق کیا ہے؟ وہ جو ہر حال میں حق ہے، یہ Absolute (مطلق) ہے، یہ Relative (اضافی) نہیں ہے، Conditional (مشروط) نہیں ہے، کسی حالت میں بھی بدل نہیں سکتا، بس اتنی سی چیز ہے۔

### الحق کے لیے وحی کی راہنمائی کی ضرورت لازم ہے

عزیزانِ من! یہاں آ کر آپ اس کا نام کچھ بھی رکھ لیجیے وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ایسی چیزیں دیتی ہے جو Absolute

(مطلق) حق ہوتی ہیں اور یہی مسئلہ ہے جو یونان سے لے کر آج تک چلا آ رہا تھا کہ حق یا خیر مطلق کیا چیز ہے۔ تنہا عقل انسانی ضرورت کے تابع حق یا باطل، خیر یا شر کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ جو آپ کسی مجرم سے پوچھتے ہیں کہ تم نے کیوں کیا تو اس کے لیے وہ عقل کی رو سے دلائل دیتا ہے۔ جس کی عقل اپنے مقام پہ قائم نہیں ہوتی، اُسے آپ دیوانہ کہتے ہیں۔ دیوانے کی Definition (تعریف) یہ کی جاتی ہے کہ اسے اپنے نفع نقصان کا بھی پتہ نہیں ہوتا، وہ (عقل) دلائل دیتی ہے۔ وہ دلائل ہی ہیں جن کی رو سے آپ کے ہاں کے یہ جتنے نظام آج تک دنیا میں چل رہے ہیں یہ سیکولرازم کے اوپر مبنی ہیں۔ یعنی انسان بیٹھ کر اپنی ضرورتوں کے تابع کوئی قانون بناتے ہیں، کل کو ضرورتیں بدل جاتی ہیں پھر وہ اس قانون کے خلاف دوسرا قانون بنا لیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بدلتے بدلتے وہ ضرورتیں ہی ہیں جن کے تابع مثلاً آج وہاں انگلینڈ میں Homo Sexuality (ہم جنسی) بھی قانوناً جائز قرار پا گئی ہے۔ میں ان پہ تنقید نہیں کر رہا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ کل ہی ایک چیز ان کے ہاں جرم تھی، ایک قانون کے تابع وہ جرم جرم نہیں رہا تو گویا وہ چیز جو کل جرم قرار پائی تھی، معیوب تھی، ان کے ہاں شر تھی، باطل تھی، مطلق شر یا مطلق باطل نہ رہی کیوں کہ دوسرے ہی دن دوسرے ہی وقت میں انہوں نے اسے بدل دیا، اس کے خلاف قانون بنا دیا۔ سیکولرازم کہتے ہی اسے ہیں جس میں کوئی قدر یا حق مستحکم (Established) نہ ہو Absolute نہ ہو، مطلق نہ ہو جو بدل سکتی ہو اور جب مختلف قومیں اپنے ہاں اس نظریے کو ہی رائج کریں کہ اپنی ضرورت کے تابع جو چیز کل وہ حق سمجھتے تھے آج اس کو بدل سکتے ہیں اور اس کے خلاف چل سکتے ہیں اس کا نتیجہ وہ فساد ہے جو ساری دنیا میں اس وقت قائم ہے۔ آپ کسی قوم کے متعلق کہہ ہی نہیں سکتے کہ آج جس چیز کو اس نے باطل قرار دیا ہے، کل کو بھی وہ اسے باطل ہی قرار دے دے۔ یونان کے فلاسفوں سے لے کر آج تک پوری انسانیت اسی کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی کہ یہ معلوم کر سکے کہ مطلق حق یا مطلق خیر کیا ہے جو ہر حالت میں Absolute (مطلق) ہو لیکن آج بھی انسان وہیں کھڑا ہے۔

میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ روز تو انین بدلتے رہتے ہیں۔ آپ کے ہاں اس بات کی دلیل یہ ہے کہ مطلق حق یا خیر کے اوپر انسان نہیں پہنچ پایا۔ اگر مطلق ہوگا تو اُسے بدلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مطلق کے متعلق تو قرآن کے الفاظ میں کہا ہی یہ جائے گا کہ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (10:64) مطلق حق تقاضوں کے مطابق، ضروریات کے مطابق بدلتا نہیں۔ آج بھی یہی صورت ہے۔ روز تجربے ہوتے ہیں، انسان Trial & Error (سعی و خطا) کی رو سے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ابھی تک حق مطلق پر نہیں پہنچا۔ اقبال (1877-1938) نے کہا ہے کہ

آدمی اندر جہانِ خیر و شر  
کم شناسد نفعِ خود را از ضرر  
کس نداند زشت و خوب کار چیست  
جادۂ ہموار و ناہموار چیست

انسان ابھی تک مطلق خیر اور حق پر نہیں پہنچ پایا۔ یہ جو ابھی ابھی میں نے بات کہی ہے کہ یہ جس چیز کو بھی بدلتے ہیں اس میں ہوتا یہ ہے کہ ہر وہ چیز جسے معیوب کہا جاتا تھا آج اسے مستحسن قرار دیا جاتا ہے۔ ان سے بات کیجیے تو وہ اس کے حق میں ہزار دلائل دیں گے۔

### آج الحق کی تلاش میں سائنکولوجسٹ فلاسفروں سے بہت آگے ہیں

میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ قرآن کریم سکھاتا ہی یہ ہے کہ تم کس طرح عقل سے کام لو۔ اب وہ جو دلائل دیتے ہیں وہ تو عقل کی رو سے ہی دیتے ہیں۔ یہ مسئلہ پھر مشکل آ پڑا۔ اس کے لیے غور و فکر کرنے والے مغرب کے بھی فلاسفر ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ جو آج فلاسفر سے سائنکولوجسٹ آئے ہیں یہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہ جسے میں ”فرقان“ کہوں گا یہ فرق کر رہے ہیں۔ حقیقت میں ان کے ہاں دو Terms (اصطلاحات) آئی ہیں اور بڑی عمدہ Terms (اصطلاحات) ہیں۔ ان کے ہاں ایک چیز Reason (استدلال) ہے اور دوسری چیز Rationalizing Intellect (منطقیانہ عقل) ہے۔ یہ لوگ Reason (استدلال) بولتے ہیں Absolute (مطلق) شے کے متعلق جو بات کہی جائے اور یہ جو اضافی چیزیں روز بدلتی ہیں اس کو حق ثابت کرنے کے لیے اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ یہ جو Intellect (عقل) ہے یہ اپنے فیصلوں کو Rationalize (منطقی) کرتی ہے۔

### دانش نورانی اور دانش برہانی میں بنیادی فرق ہے

معاف رکھیے گا بات ذرا مشکل ہے لیکن غور سے سمجھتے جائیے بڑے اہم مسائل ہیں۔ عزیزان من! عقل اور عقل میں یہ جو فرق ہے اس کے لیے ہمارے ہاں یہ دو Terms (اصطلاحات) آئی ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938) کی نگاہ تو بہت دور جاتی ہے۔ اس کی قرآن پر نگاہ ہے۔ قرآن میں یہ جو دو قسم کی عقلیں ہیں ان میں فرق کیا ہے۔ باطل کے حق میں یہ جتنے بھی باطل پر چلنے والے لوگ ہیں دلائل دیتے تھے قرآن ان کے دلائل کو بیان کرتا ہے لیکن اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ یہ ان کی عقل فریب کا کام تھا جو یہ کر رہے ہیں کیونکہ یہ جو باطل ہے یہ اس کو حق ثابت کر رہے ہیں۔ قرآن کریم کی اس حکمت کی رو سے اقبالؒ (1877-1938) کو جو بصیرت حاصل تھی اور ادھر وہ فلسفے میں بھی آپ جانتے ہیں جو اس کا مقام تھا وہ ان چیزوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ہمیں دو Terms (اصطلاحات) دیں: ”دانش نورانی اور دانش برہانی“ اور میں کہتا ہوں کہ آج جو سائنکولوجسٹ نے Rationalizing Intellect (منطقیانہ عقل) کہا ہے اسے اس شخص نے دانش برہانی کہا ہے۔ کیا بات ہے! ایک دانش نورانی ہے کہ جسے ان ماہرین نفسیات نے Reason (خرد) کہا ہے اور یہی ہے وہ چیز جسے وہ کہتا ہے کہ وحی حق مطلق دیتی ہے اور اس کے حق میں جو دلائل دیتی ہے وہ دانش نورانی ہے۔ قرآن اپنی کسی بات کو بغیر دلیل کے نہیں منواتا۔ وہ کتاب کے ساتھ حکمت کو نازل کرتا ہے۔ یہ جو سائنکولوجسٹ کی دو اصطلاحیں آج آئی ہیں ان کی رو

سے ہم کہیں گے کہ قرآن یہ جو Absolute (مطلق) حق کے حق میں دلائل دیتا ہے، وہ Reason کہلا سکتی ہیں اور یہ جو باطل کو حق ثابت کرنے کے لیے دلائل دیئے جاتے ہیں، وہ Rationalizing Intellect کہلا سکتی ہے جسے اقبالؒ دانش برہانی کہتا ہے اور دوسری جگہ وہ انہی کو عقل خود ہیں اور عقل جہاں ہیں سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے صاحب!

عقل خود ہیں غافل از بہبود غیر

سود خود بیند نہ بیند سود غیر

ایک عقل تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنے مفاد کے لیے اپنے آپ کو استعمال کرتی ہے، دوسرے کے مفاد کا اس کو کوئی خیال نہیں رہتا۔ یہ جو دوسرے کو دھوکا دینا، جھوٹ بولنا، فریب کرنا ہے یہ اپنے لیے کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے ہے اور اس سے پوچھیے تو وہ ہزار دلائل دے دے گی صاحب! یہ ہے:

عقل خود ہیں غافل از بہبود غیر

سود خود بیند نہ بیند سود غیر

اور اس کے مقابلے میں ”وحی حق بینندہ سود ہمہ“ ہے۔ وحی کی رو سے جو Absolute (مطلق) اقدار یا Values ملتی ہیں وہ تمام نوع انسانی کی منفعت کو دیکھتی ہیں:

وحی حق بینندہ سود ہمہ

در نگاہش سود و بہبود ہمہ

اور یہ فرق کر دیا۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا بَالُ الْمَرْءِ أَلْهُوَ الْقَرَىٰ (13:17) بقا اسی عمل کے لیے ہے جو پوری کی پوری نوع انسانی کے لیے منفعت بخش ہو ورنہ اپنی ذات کے لیے اپنے خاندان کے لیے اپنے قبیلے کے لیے اپنی قوم کے لیے، منفعت کی تو ہر ایک سوچتا ہے۔ یہ دانش برہانی ہے۔ یہ Rationalizing Intellect کہلاتی ہے، تمام نوع انسانی کی منفعت کے لیے سوچنے کی جو بات ہوگی اسے ہم دانش نورانی کہیں یا عقل جہاں ہیں اور اس کے لیے آج کی سائیکولوجی کی اصطلاح میں اسے Reason کہا جائے گا۔ یہ چیز Absolute (مطلق) ہوگی۔ آج کے انسان کے متعلق اقبالؒ نے یہ لکھا ہے کہ

عشق ناپید و خرد می گزردش صورت مار

وحی سے محروم ہو کر اپنی عقل کی رو سے جو چیزیں یہ طے کرتا ہے، وہ سانپ کی طرح اس کو ڈسنے لگ جاتی ہیں۔ وہ اس لیے کہ یہ اپنی عقل کو تابع فرمان نظر کرنے کا اور اس نے وحی کی روشنی میں عقل سے وہ کام لینا تھا۔ یہ اس نے نہیں سیکھا لہذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا  
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

## وحی کی شکل میں قرآن حکیم کی تعلیم کا حاصل

عزیزانِ من! دین اور قرآن کا سارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ مطلق حق کیا ہے اور مطلق باطل کیا ہے؟ مطلق حق یا خیر وہ ہے جو پوری نوع انسانی کے لیے منفعت بخش ہے اور اس کے لیے خیر کا اور برکت کا موجب ہے۔ شر وہ ہے جو پوری نوع انسانی کے لیے نقصان دہ ہو یعنی اپنے دائرے کے اندر اپنی قوم کے اندر وہ خیر ہو ذرا اس سے باہر دوسرے جو انسان ہیں ان کے لیے وہ شر ہو جائے۔ اگر یہ چیز ہے تو یہ خیر مطلق یا حق مطلق نہیں ہوا بلکہ اضافی (Relative) ہو گیا۔ الفرقان وہ ہے جو Absolute (مطلق) حق اور باطل میں فرق کر کے ایسا فرق بتائے جس میں بال برابر بھی ابہام نہ رہے، الجھن نہ رہے، جو خیر اور شر میں حق اور باطل میں اس طرح سے فرق کر کے بتائے کہ اسے مانگ کے متعلق کسی دلیل کی ضرورت نہ ہو اسے دیکھنے سے ہی پتہ چل جائے کہ سیدھی ہے یا ٹیڑھی، کچھ بال ادھر آگئے ہیں یا نہیں، کس قدر صحیح ہے۔ یہ عرب ایسی قوم تھی جو فلسفیانہ Abstract talk میں نہیں جاتی تھی، یہ محسوسات کے مشاہدے سے نتائج اخذ کرتی تھی۔ اس لیے اس زبان کے سمجھانے کے لیے ہمیشہ محسوس مثال دی جاتی تھی: دو چیزوں میں ایسا نمایاں Distinction (فرق) کہ جس میں دیکھتے ہی پتہ چل جائے کہ سیدھی ہے یا نہیں، ادھر ادھر فرق تو نہیں۔ اب اس کے لیے مانگ کی تشبیہ دینا کیا بات ہے! قرآن ان کے ان الفاظ کو استعمال کرتا ہے اور یہی ہے وہ فرق کرنے والی شے: حق بھی Absolute اور حق کو بتانے والے یہ جو وحی کی رو سے اقدار دی گئی ہیں یہ بھی الفرقان ان میں جو فرق کر کے دکھائے۔ اب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ قرآن کریم کا ہے کے لیے آیا ہے اور پھر یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (10:64) کیوں کہتا ہے۔ اگر یہ حالات کے تابع مشروط ہو، اگر یہ ضروریات کے تابع بدل جاتا ہو تو یہ بدلنے والی شے تو پھر مطلق رہ ہی نہیں سکتی، وہ تو Absolute (مطلق) ہوتی نہیں ہے۔ Absolute (مطلق) تو ان شرائط اور تقاضوں اور ضروریات سے بالا ہوتا ہے۔ ہر حالت میں ہر آن میں ہر زمانے میں وہ حق حق رہتا ہے، خیر خیر رہتا ہے، یہ پوری نوع انسانی کی منفعت کے لیے ہوتا ہے۔ اب برکت کے معنی بھی آگئے۔ تَبَرَكَ الَّذِي (25) میں اب آگیا کہ وہاں لفظ قرآن نے اپنے خدا کی صفت (تبرک) کیوں کہی ہے۔ اس میں پہلی بات یہ تھی کہ وہ اپنے مقام پہ محکم کھڑا ہو اور آگے (الفرقان) میں ہم نے دیکھا کہ حق مطلق ہوا، اپنے مقام پہ اٹل ہو لیکن اپنے مقام پہ اٹل اور اس کے ساتھ ہی جتنی زمانے کی ضروریات ہوں ان کو ساتھ پورا کرتا چلا جائے۔ تبرک کس لیے چیز بھی تھی کہ پتھر کی طرح جامد نہ ہو بلکہ اس میں نشو و ارتقا بھی ہو۔

## خدا تعالیٰ کی صفت تَبَرُّک کے مفہوم کی وضاحت

یہ مسئلہ پھر بڑا مشکل ہے کہ ایک چیز اپنے مقام پہ محکم بھی ہو اور زمانے کے تقاضوں کا بھی ساتھ دیتی چلی جائے۔ سنیے! عرب اس قسم کی چیز کو کیا کہتے تھے۔ اس کے لیے پھر وہی محسوس مثال ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں آج کل کے دروازے ہیں ان میں تو وہ چول نہیں لگی ہوتی، البتہ پرانے زمانے کے جو دروازے ہوتے تھے ان میں نیچے وہ چوکھٹیں سی ہوتی تھیں، نیچے ایک ایسی لکڑی ہوتی تھی اور اسی طرح سے اوپر اس میں ایک چول سی ہوتی تھی تو وہ دروازے اس طرح کے ہوتے تھے۔ عربوں کے ہاں یہ چیز جس کے اندر یہ آ کے رکھی جاتی تھیں یہ تو اپنے مقام کے اوپر مستحکم ہوتی تھی اور دروازہ ضرورت کے مطابق کھلتا بھی تھا اور ضرورت کے مطابق بند بھی ہوتا تھا تو وہ اسے حق کہا کرتے تھے یعنی جو اپنے مقام پہ اٹل ہو۔ اگر وہ جو اس کی چوکھٹ ہے وہ وہاں سے نہ ہلے وہ اپنے ہاں جامد ہو جائے یعنی بند ہے تو بند رہے کھلا ہے تو کھلا رہے وہ دروازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ تو دیوار ہو گئی۔ محکم اس قدر ہو کہ ذرا ادھر ادھر نہ بل سکے اور ضرورت کے مطابق جب اندر جانا چاہے کھل جائے باہر آنا چاہے بند کر دیں جب جی چاہے بند ہو جائے جب جی چاہے کھول دیں۔ وہ اپنے مقام کے اوپر اٹل کھڑا ہوتا ہے یہی برکت ہوگی۔ یہاں کہا کہ تَبَرُّکَ الَّذِي نَزَلَ الْفُرْقَانُ (25) <sup>1</sup> عزیزانِ من! یہ قرآن ہے:

اس کتابے نیست چیزے دیگر است

یہ عربوں کی زبان تھی جو ان حقائق کی متحمل ہو سکتی تھی۔ کیا بات تھی! سوچیے کہ اس دور میں چودہ سو سال پیشتر سمجھانے کے لیے اس مثال سے بہتر مثال کوئی ہو سکتی ہے! آج بھی نہیں ہو سکتی: اپنے مقام پہ بھی مستحکم رہے ضروریات کا ساتھ بھی دیتا چلا جائے۔ یہ حق ہے پتھر کی طرح جامد نہیں ہے درخت کی طرح مستحکم ہے، جما ہوا بھی ہو اور اس کے ساتھ تغیرات میں اس کی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے: نَزَلَ الْفُرْقَانُ (25:1) اللہ تعالیٰ نے کئی ایک مقام پہ قرآن کو ”الفرقان“ کہا ہے۔ میں اس کے لیے ایک ریفرنس دے دینا ضروری سمجھتا ہوں سورۃ دخان 44 ویں سورۃ میں ہے کہ حَمَّ <sup>2</sup> وَ الْكِتَابِ الْمُبِينِ <sup>3</sup> اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبْرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ (44:1-3) ہم نے اسے لیلۃ مبارکہ میں نازل کیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہی تَبَرُّکَ الَّذِي (25:1) والی بات ہے۔ یہاں قرآن کے نزول کے زمانے کو لیل کہہ رہے کہ اس میں تاریکیاں ہی تاریکیاں تھیں۔ یہ نہیں ہے کہ جسے ہم ایک رات یعنی شام سے صبح تک کہتے

<sup>1</sup> کس قدر فراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل اور حق و باطل اور غلط اور صحیح میں امتیاز (Distiction) کر دینے والی ہے۔

<sup>2</sup> خدائے حمید و مجید کا ارشاد ہے کہ

<sup>3</sup> یہ کتاب مبین، یہ واضح ضابطہ حیات اپنی صداقت پر آپ شاہد ہے۔ (حوالہ برائے فٹ نوٹ 3: 122: پرویز: مفہوم القرآن)

ہیں۔ اس سے مقصد یہ تاریکیوں کے دور کے اندر کا ہے لیکن وہ تاریکیاں کس قدر بابرکت ثابت ہوئیں کہ اس قسم کا سپیدہ سحر اس سے نمودار ہو گیا۔ کیا چیز نازل کی؟ **فِيهَا يُفَرَّقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ** <sup>①</sup> (44:4)۔ یہاں بفرق کہا ہے۔ یہ بھی وہی اب ”فرق“ کا Verb یعنی فعل کا صیغہ آ گیا جس میں دیکھیے کہ وہ اس کے متعلق دوسرے مقامات کے اوپر کیا کہتا ہے، فرقان کہا۔ یہاں Verb (فعل) کے طور پر استعمال کر کے بتا دیا کہ اس میں کیا کیا ہے۔

### شبِ برات کی شرعی حیثیت

میں نے اس لیے خاص طور پر یہ کہا کہ **اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبْرَكَةٍ** (44:3)۔ وہ جو شبِ برات کی رات آیا کرتی ہے اس کی کوئی شرعی حیثیت ہے ہی نہیں۔ ویسے تو ہمارے جو ہر تہوار مناتے ہیں کچھ نہ کچھ تو بتاتے ہیں کہ اس میں یہ ہوا، اس میں یہ ہوا، شبِ برات کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس میں کیا ہوا، یہ تقریب کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ ہاں بی بی حلوہ تے ونڈن۔ <sup>②</sup> اب تو شاید یہ بھی بات ختم ہو گئی ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ شروع کہاں سے ہوئی تھی؟ یہ جو عباسیوں کے خلفاء (750-1258ء) تھے یہ مجوسی تھے مسلمان ہو کر ادھر آئے، اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا۔ ”رام جاندا ای جاوے، رحیم اوندای آوے“ <sup>③</sup> مجوسیت کی جو آتش پرستی تھی وہ بھی ساتھ آئی اور ان کے ہاں کا یہ عقیدہ بھی آیا کہ سال میں جو نوروز ہے اس دن سال بھر کے فیصلے ہو جاتے ہیں، موت کے زندگی کے، بیماری کے، ہر شخص کی قسمت کا آنے والے سال کا فیصلہ اس ایک رات میں ہو جاتا ہے جس کے بعد نوروز ہوتا ہے اور وہ آتش پرست قوم تھی اس میں پھر یہ بہت زیادہ آگ جلاتے تھے۔ اب یہ ادھر آئے تو اسلام میں اس کی کہیں بھی گنجائش نہ تھی: نہ یہ وہ قسمت کا مسئلہ، نہ یہ آگ کا کھیل تو انہوں نے یہ تقریب وضع کی۔

آپ کو معلوم ہے کہ شبِ برات کی اس اصطلاح برات کے معنی ہی تقدیر ہوتے ہیں: ”میری برات ابچ ای، اے نہیں سی ہیگاتے“ میں کی کراں؟“ <sup>④</sup> شبِ برات تو وہ آئی: مجوسیوں کی تقدیر والی رات، قسمت بانٹنے والی رات۔ خود لفظ قسمت کے معنی تقسیم کرنا ہے۔ یہ تو ہوئی وہاں کی وہ تقریب۔ اب ان کی ہوئی وہ آتش پرستی کی ہوس۔ تو یہ ساری جتنی آتش بازی آپ چلاتے ہیں، یہ وہاں سے آئی ہوئی ہے۔ اب آپ کے ہاں یہ چلا آ رہا ہے۔ یہ مذہب کا جزو ہو گئی۔ مذہب کا جزو کس طرح ہوئی تھی اس کے لیے کوئی تو دلیل دینی چاہیے۔

① اس میں ان تمام امور کو جو آسمانی حکمت پر مبنی ہیں (غلط امور سے) الگ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1157)

② البتہ حلوہ تو ضرور ہی تقسیم کیا جاتا ہے۔

③ نہ رام جلدی جاتا ہے اور نہ رحیم جلدی آتا ہے، ”رام“ کی ”رحیم“ سے تبدیلی بڑا وقت لیتی ہے۔

④ میری قسمت میں ہی نہیں تھا تو میں کیا کروں؟

واعظ کے نزدیک دلیل لانا کون سا مشکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھیے! یہ تو قرآن شریف میں ہے۔ یا اللہ! شب برات کا ذکر قرآن شریف میں!!! کہ بھی! قرآن شریف میں کہاں ہے؟ میں نے تو ریڈیو پر تقریریں سنی ہیں۔ بڑے بڑے علامہ آتے ہیں۔ جی! قرآن شریف میں ہے۔ جی؟ یا اللہ؟ ہم بھی سنیں بھی! کہنے لگے یہ دیکھیے: اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ مُبْرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (44:2-3) ہم نے اس کو رات میں نازل کیا ہے جس میں تمام معاملات کے فیصلے سال بھر کے لیے کیے جاتے ہیں۔ چل بھی! کہنے لگے کہ وہ یہ ہے۔ عرض کیا گیا کہ حضور! یہ جو شب برات ہے یہ شب برات تو شعبان میں آتی ہے اور قرآن کریم کے متعلق خود قرآن میں ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ (2:185) یہ رمضان کے مہینے میں نازل ہوا ہے تو وہ رمضان کے مہینے میں کوئی رات اگر آپ کہتے ہیں تو آنی چاہیے! یہ پہلے ہی آگئی۔ یہ کیسے ہو گیا؟ کہنے لگا ”جی تہاںوں جتھاں بڑیاں اوندیاں ہیکیاں نیں ایہدا کی علاج اے!!“<sup>1</sup> یعنی دلیل تاریخ سے کوئی لایا نہیں۔ انہیں کہا کہ بھی! قرآن میں یہ ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ (2:185) کوئی رات ایسی تم نے بنائی تھی رمضان میں تو بناتے۔ وہ رمضان کے آخری عشرے کے اندر اس رات کی تلاش کرتے ہیں۔ ”تے شب برات تو ٹردے نیں تے عید تیک رات ای لبدے ترے جان دے نہیں۔“<sup>2</sup> میں کہہ یہ رہا تھا کہ آپ قرآن کا مصرف دیکھتے ہیں کس طرح ہوتا ہے۔ یہ مسجد کے اندر وعظ نہیں تھا یہ ریڈیو کے اوپر ساری دنیا کو سنارہے تھے اور ہر سال یہ کچھ کرتے ہیں۔ قرآن تو الفرقان کہتا ہے۔ بہت اچھا جی! قرآن تو ہے۔ الفرقان حق و باطل میں اس طرح سے فرق کرتا ہے۔ ہمیں فرقان نے کیا دیا؟ کہا کہ تمہیں بھی دیا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقٰنًا (8:29) اے جماعت مومنین! اگر تم قوائین خداوندی کی نگہداشت کرو گے تو تمہیں دنیا کے اندر امتیازی زندگی حاصل ہو جائے گی: ”فرقان“۔ ساری دنیا دور سے دیکھ کر کہہ دے گی کہ یہ ہے وہ امت جو آخرت للناس نوع انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ یوں باقی دنیا سے تمہاری تفریق ہو جائے گی امتیازی نشان ہے Distinction حاصل ہو جائے گی: يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقٰنًا (8:29) تمہیں امتیازی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ کیسا امتیاز؟

مومن بالائے ہر بالا ترے

جو بھی دنیا میں جس بلندی کے اوپر بھی کوئی قوم ہے مومن اس سے بھی آگے ہے اس لیے کہ

غیرتِ اُو برنباہد ہمسرے<sup>3</sup>

1 آپ کو بڑی عجیب و غریب جتیں آتی ہیں۔ اس کا کیا علاج!!

2 شب برات سے چلتے ہیں تو عید تک وہ اس رات کی تلاش میں ہی چلتے چلے جاتے ہیں۔

3 دنیا میں کوئی انسان کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو مومن کا مقام اس سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ مومن کی غیرت گوارہ ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی اور انسان اس کا ہمدوش ہو جائے۔



کسی دوسرے کا آگے چلے جانا یا اوپر ہو جانا تو ایک طرف اس کی غیرت تو اس کو بھی پسند نہیں کرتی کہ دنیا کے اندر کوئی اس کا ہمدوش ہو۔ آگے بڑھنا یا بلند ہونا تو ایک طرف رہا، وہ تو کسی کو غیرت اور بتابد ہمسرے اقبال (1877-1938) یہ چیزیں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ یہ فرقان کی تفسیر ہے۔ یہی یَجْعَلُ لَّكُمْ فُرْقَانًا (8:29) ہے۔ یہی امتیازی نشان ہے۔

### روزِ محشر امتیازی نشان رکھنے والی قوم کی نشانی: بھوک اور محکومی؟

ان سے پوچھیے کہ قرآن تو یہ کہتا ہے۔ آج ہمارا ساری دنیا میں امتیازی نشان کیا ہے؟ ساری دنیا میں ہم ہی بھوکے ہیں، ساری دنیا میں ذلیل، ساری دنیا کے محکوم ہم ہی تو ہیں، اس میں کوئی قوم ہماری ہمدوش نہیں ہے۔ انہوں نے امتیاز تو دیا۔ ”بدنام نہ ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔“ یہ ہے امتیازی نشان؟ معاف رکھیے گا، بیچ میں کبھی ایسی چیزیں بھی آ جاتی ہیں۔ فرقان یا امتیازی نشان؟ کہ حشر کے دیہاڑے <sup>①</sup> مختلف قومیں آتی جائیں گی، تعارف کے لیے آواز آئے گی کہ یہ وہ قوم آئی ہے، یہ وہ قوم آئی ہے۔ اس کے بعد ایک قوم آئے گی صاحب! سوکھی ہوئی، ہڈیاں نکلی ہوئی، زرد و کپڑا بھی پورا پہننے کے لیے نہیں ملا۔ نظر آ رہا ہے کہ بالکل فقر و فاقے کی حالت میں چلی آ رہی ہے۔ آواز آ جائے گی کہ ہاں یہ آ رہی ہے اللہ کے محبوب کی امت۔ دیکھیے سارے! وہ پوچھیں گے کہ یہ کس قسم کی قوم ہے، انہوں نے کہا کہ آپ نے دیکھا کہ یہ باقی ساروں سے الگ ایک ممتاز قوم ہے۔ کہنے لگے کہ اس کا کیا امتیاز ہے؟ وہ کہنے لگے کہ یہ اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے، نہ وہ کھاتا ہے نہ انہیں کھانے کو ملتا ہے نہ وہ پہنتا ہے نہ انہیں کپڑا ملتا ہے، وہ بھی لا مکان ہے، ”اینا داوی گھر گھاٹ کوئی نہیں بیگا ایتھے۔“ <sup>②</sup> یَجْعَلُ لَّكُمْ فُرْقَانًا (8:29) امتیازی زندگی ہے۔ ”بس تھوڑا جیا آدمی نوں ڈھیٹ ہونا پیندا اے۔“ <sup>③</sup>

### اس دنیا میں مومن کی زندگی کے آثار

عزیزانِ من! قرآن نے واضح زبان میں یہ کہا ہے کہ یہ کبھی نہیں ہو سکے گا کہ کفار کو مومنین کی جماعت کے اوپر غلبہ حاصل ہو جائے، کبھی نہیں ہو سکے گا۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی کسی خطہ میں الگ قومیں کہنا ہی اسلام کے خلاف ہے۔ وہ تو امت ہی واحدہ تھی لیکن آج چونکہ یہ بٹ چکی ہے، کہنا پڑتا ہے کہ کوئی ایک قوم بھی دنیا میں ایسی نہیں ہے جس پر کفار کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح سے غلبہ نہ ہو۔ یہ مادی نہیں تو ذہنی سہی سیاسی سہی ساری دنیا کی مغلوب قوم ہے۔ اس نے کہا تھا کہ کفار کو کبھی مومنوں کے اوپر غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

① روز

② ان کا بھی کوئی گھر گھاٹ نہیں ہے۔

③ بس انسان کو تھوڑا سا ڈھیٹ ہونا پڑتا ہے۔

فرقان اسے کہتے ہیں لیکن یہ فرقان حاصل کیسے ہوتا ہے اس کے متعلق بھی فرقان دینے والے نے جو وعدہ کیا تھا اسی نے بتایا کہ فرقان حاصل کیسے ہوتا ہے؟ تیرہ سالہ کی زندگی دنیا بھر کے مصائب اور مشکلات اور نامساعدات اور تکالیف برداشت کرنے والی قوم اپنے مقام کے اوپر جم کے کھڑی ہوئی، کیا تھا ایمان ان لوگوں کا صاحب! اس قدر تکالیف سے آج بھی جب کوئی سنتا ہے تو انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے مقام سے ہلا ہو۔ ایک فرد ہی نہیں، پہلے تو اس قسم کی ایک جماعت ہے۔

### جماعت مومنین ہر آن صفت فرقان کی ایک نئی شان سے مزین ہوتی ہے

پہلا فرقان یہ ہے کہ اس مقام میں جہاں نظام خداوندی یا حکومت خداوندی کے تمکن کے امکانات بظاہر ابھی نہیں تھے یہاں سے سارے کے سارے الگ ہو کر مدینے چلے گئے۔ اسی لیے قرآن نے اسے اتنی اہمیت دی ہے کہ مکے کے رہنے والے یا کسی اور جگہ کے رہنے والے استطاعت کے امکان کے باوجود اگر وہاں سے ہجرت کر کے یہاں نہیں آتے تو وہ جماعت مومنین میں شامل نہیں ہیں۔ فرقان کی یہ کیفیت! وہ ان کو وہاں چھانٹ کے الگ کر دینا چاہتا تھا وہاں پناہ گزینوں کی حیثیت سے جانچنے۔ وہاں یہ بیچارے ابھی بچے ہیں کہ ان مکے والوں نے یورش کر کے اس دور کے معیار کے مطابق ایک لشکر جرار لے کر اپنے ساتھ ہزار آدمی کا لشکر پورا ہتھیاروں سے لیس، مدینے پہ چڑھائی کے لیے آ گئے۔ ارے بابا، یہاں بیٹھے ہوئے بیچارے یہ پناہ گزین تمہیں تو وہاں کچھ نہیں کہتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ ان کچھ نہ کہنے والوں کا اگر نظام دنیا کے کسی خطے میں بھی متمکن ہو گیا تو یہ کسی دوسرے نظام کو نہیں چھوڑے گا۔ پھر وہ یورش کر کے یہاں آ گئے۔ اب وہ وقت آ گیا۔ یہ جو چھوٹی سی تین سو کی جماعت تھی دنیا کے ہر معیار کے مطابق نظر آتا تھا کہ ان کے مقابلے میں میدان جنگ میں جائے گی تو ان میں سے شاید ایک بھی باقی نہیں بچے گا۔ دیکھتے ہیں کہ یہ امتحان کتنا کڑا تھا، کتنا سخت تھا، منزل کتنی کڑی تھی۔ کیا انھوں نے ان کے ساتھ کچھ مفاہمت کر لی، مداہنت برقی، مصالحت پہ اتر آئے، Compromise میں آ گئے؟ کیا انہوں نے یہ کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں، حق بھی اضافی ہوا کرتا ہے، ضرورت کا آج تقاضا یہ ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ صلح کر لی جائے؟ میں کہتا ہوں اس سے بڑی ضرورت بھی کوئی اور ہو سکتی تھی جو اس مقام کے اوپر آ پڑی تھی۔ ضرورت کے ہر معیار اور تقاضے کے مطابق اس سے اشد ضرورت ہی کوئی نہیں ہو سکتی تھی لیکن اگر اب ضرورت کا ہمارا ہی معیار ہوتا تو حق و باطل کا فرقان تو دنیا میں نہ ہو سکتا۔ فیصلہ یہی ہوا کہ کامیابی نہ بھی ہوگی تو دنیا کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ حق پر جم کر کھڑے ہونے والے جان دے دیا کرتے ہیں، Compromise (مفاہمت) نہیں کیا کرتے کہ حق Compromise (مفاہمت) کر ہی نہیں سکتا، وہ ایسے وقت میں کم درجے کی ضرورت تو ایک طرف رہی، جان کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کے بھی قائل نہیں ہوتے۔ میدان میں جانکل کھڑے ہوتے ہیں۔

## جنگ بدر<sup>①</sup> میں عملی طور پر صفت فرقان کی ایک زندہ مثال

وہ جو تاریخ میں آیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ کی وہ دعا ہیرے کی طرح جگمگا رہی ہے، جو انہوں نے کی ہے۔ وہ ہے حقیقت میں فرقان کی صحیح تفسیر۔ کہا یہ گیا ہے کہ صفیں باندھ کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس زمانے میں، جسے یہ آج مذہبی پیشوا کہتے ہیں، جسے آج رسول کہتے ہیں، وہ مسجد میں صرف نماز پڑھانے والا نہیں، جماعت کرانے والا نہیں، یا وعظ کہنے والا نہیں ہوتا تھا، فوج کا کمانڈر ان چیف بھی وہی ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اپنی اس فوج کے سربراہ، کمانڈر ان چیف تھے۔ صفیں کھڑی کرنے کے بعد حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ ایک طرف تنہائی میں کھڑے ہو گئے۔ ایک محویت کے عالم میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ محویت کا یہ عالم تھا، تاریخ کہتی ہے کہ حضور ﷺ کی چادر جواو پر لی ہوئی تھی وہ سرک کے نیچے ڈھلک کر جا رہی تھی اور حضور ﷺ رب العزت کی درگاہ میں فریاد کر رہے تھے یا التجا کر رہے تھے کہ بار الہا! یہ مٹھی بھر جماعت، اس آسمان کے نیچے جو حق کی علمبردار ہے، اس کے علاوہ کوئی اور حق کا علمبردار آج ہے نہیں۔ یہ تو حق کی شہادت دینے کے لیے میدان میں آ گئی۔ انہوں نے تو اپنی جان دے دینی ہے۔ اس سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا یہ سب کچھ سمجھ سوچ کر یہاں آئے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آج یہ جماعت اس میدان کے اندر ختم ہو گئی تو پھر میں چونکہ خاتم النبیین ہوں اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آنا۔ یا اللہ! یہ سوچ رکھ کہ اس کے بعد قیامت تک تیرا نام لینے والا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔ کیا بات ہے اس دعا کی! ذمہ داری اس پہ ڈال دی: ”میرا تو کچھ نہیں جانا۔“ آپ ان چند فقروں کو سوچیے یعنی یہ کہ جماعت تو اپنا سب کچھ بچا کر کفن بدوش آ گئی ہے۔ انہوں نے جان دے دینی ہے۔ اگر یہاں یہ سب ختم ہو گئے تو ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، یہ تو اس مقصد کے لیے آئے ہیں تو سوچ لے کہ اس کے بعد پھر دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔

## دو قومی نظریہ کی مکمل محسوس تفسیر

یہ وہ مقام ہے جہاں خدا نے کہا کہ آج کا دن بدر کی جنگ میں یوم الفرقان ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَمَا أُنزِلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّنْفِي الْجَمْعَيْنِ<sup>②</sup> (8:41)۔ یوم الفرقان یعنی فرقان کا وقت آتا ہے، جب آ منے منے جتھے کھڑا ہو جائے، لشکر کھڑے ہو جائیں۔ یہاں یوم الفرقان آیا ہے۔ وہ جو تھا کہ ہم تمہیں فرقان عطا فرمائیں گے، عزیزانِ من! وہ در دو طائف اور نفل پڑھنے

① سترہ رمضان 2ھ (مطابق 13 مارچ 624ء)

② اور ان احکام پر (ایمان رکھتے ہو) جو ہم نے اپنے بندے پر اس دن نازل کیے تھے جب دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل آئے تھے اور جب حق و باطل نکھر کر سامنے آ گیا تھا (پرویز: مفہوم القرآن، ص 404)۔

سے نہیں آجاتا۔ یہاں آیا ہے یوم الفرقان، محسوس تفریق۔ آپ سننا چاہتے ہیں تو تاریخ سے پوچھیے کہ فرقان کسے کہتے ہیں۔ آج تک یہ بات طے نہیں ہو سکی کہ دو قومی نظریہ کیا ہوتا ہے۔ جی، دو قومی نظریہ یوم الفرقان میں سامنے آتا ہے۔ فرقان کی پہلی چیز یہ ہے کہ چھٹ کے الگ ہو جائیے۔ یہ سارے مکے کے رہنے والے یا بیشتر مکے کے رہنے والے عرب ہی تھے جو مکے سے ادھر آ گئے تھے۔ یہ مدینے میں کاہے کے لیے آ گئے تھے؟ یہ ایک الگ قوم بن گئی تھی۔ اب یہاں ان دو قوموں کا نظریہ تھا یا جسے فرقان کہا جاتا ہے، یہ تھا۔ دو قومی نظریے کے معنی ہی فرقان کے ہیں: حق کے علمبردار اور باطل کے علمبردار میں محسوس تفریق ہے۔ اور وہ یہ صورت تھی کہ ایک طرف حضرت ابوبکر صدیق ♦ تھے تو مقابل کی صف میں ان کا بیٹا کھڑا تھا، ادھر حضرت عمر ♦ تھے تو ان کے سامنے ان کا حقیقی ماموں جس کے خون میں ان کی تلوار بعد میں رنگی ہوئی نظر آئی، ادھر حضرت علی ♦ تھے تو سامنے ان کا بھائی (عقیل) تھا، ادھر خود نبی اکرم ﷺ تھے تو ادھر حقیقی چچا (حضرت عباس) تھے، نہیں! اور آگے جائیے ادھر آپ ﷺ کھڑے تھے تو دوسری طرف بیٹی کا سہاگ لٹ رہا تھا، داماد<sup>①</sup> کھڑا تھا۔ یہ تھا یوم الفرقان۔<sup>②</sup>

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے  
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

”چوں می گویم مسلمانم بلرزم“، یعنی جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کیوں کہ دائم مشکلات لا الہ را: میں جانتا ہوں کہ لا الہ کی مشکلات کیا ہوتی ہیں۔ یہ منظر آسمان کی آنکھ نے کبھی دیکھا تھا! عزیزانِ من! کہ فرقان، دو قومی نظریہ ہے۔ اور باپ کا وہ واقعہ تاریخ میں رقم ہے کہ اس بیٹے نے باپ<sup>③</sup> سے یہ کہا کہ ابا جان! بدر کے میدان میں ایک وقت ایسا بھی آ گیا تھا کہ آپ بالکل میری شست میں تھے، تیر میں نے چڑھا رکھا تھا، آپ سامنے آ گئے، میرا ہاتھ کانپ گیا اور میں نے کمان وہیں رکھ دی، تیر نہیں چلایا۔ آپ<sup>④</sup> نے کہا کہ بیٹا! اگر ایسا وقت مجھ پہ آتا اور میرے سامنے تم آتے تو میرا ہاتھ کبھی نہ کانپتا، اس لیے کہ میرے سامنے ابوبکرؓ کا بیٹا نہیں تھا، ایک باطل پرست حق کے مقابلے میں کھڑا تھا۔ یہ تھا، یوم الفرقان<sup>④</sup>

① ابوالعاص

② یہ یوم الفرقان یوں بھی تھا کہ ادھر حضرت حذیفہؓ تھے تو صف غنیم میں ان کا باپ عتبہؓ تھا، ادھر ام المومنین حضرت سودہؓ تھیں تو سامنے ان کا عزیز سہیل بن عمر تھا۔

③ حضرت ابوبکر صدیقؓ (573-634AD)

④ یہ تھی وہ حقیقی تقسیم جو وطن، رنگ، زبان، نسل وغیرہ کی غیر فطری حدود و ثغور سے ماوراء، ”دائم مشکلات لا الہ لا“ تھی۔ حبش کا رہنے والا بلالؓ اپنوں میں سے تھا، لیکن حقیقی چچا عباسؓ غیروں میں سے، روم کا صہیب یگانہ لیکن حقیقی بیٹا یگانہ۔

رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف  
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یہ مجاہدین اور مہاجرین سب کے سب مومنِ حقہ تھے

عزیزانِ من! یہ تین سوکون تھے جن کے ایمان کی شہادت تو ابھی سامنے آگئی؟ یہ درجہ اول کے صحابہ مہاجرین اور مجاہدین ہی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ مومنِ حقہ ہیں، خدا ان کے مومنِ حقہ ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ یہ وہی ہیں جن کے لیے اس نے کہا ہے کہ ہم نے ان کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے۔ سوال ہی نہیں کہ ان کے متعلق شبہ ہو۔ یہ سارے کھڑے ہیں اس طرف ملاحظہ ہو کہ عین اس وقت کیا کہا گیا۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ یہ جو کچھ ہم نے نازل کیا وہ یوم الفرقان پہ کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم نے یوم الفرقان پہ کیا نازل کیا تھا۔ یوم الفرقان پہ کہا یہ تھا کہ یاد رکھو! وَمَنْ يُؤْلَمْ يَوْمَئِذٍ ذُبْرًا إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَ مَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ط وَ بِنَسِ الْمَصِيرُ (8:16) سن رکھو کہ آج اس میدانِ جنگ میں تم میں سے اگر کسی نے پیٹھ دکھائی، مجزاس کے کہ وہ جنگ کے کسی تقاضے کے لیے سٹریٹجی (Strategy) کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو جائے یا اپنی جماعت سے ملنا ہو، شکست خوردگی کی ذہنیت میں نہیں۔ (یہ صحابہ سے کہا جا رہا ہے) کہ اگر آج کسی نے پیٹھ دکھائی تو خدا کا غضب اس کے اوپر ہوگا، وہ سیدھا جہنم میں چلا جائے گا۔ اس طرح سے فرقان حاصل ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! دنیا میں یہ تھے جن کو وہ فرقان حاصل ہوا۔ تاریخ کے اوراق سے پوچھیے۔ اس زمانے میں دنیا میں دو ہی صاحبِ فرقان تو میں تھیں: ایران کی تہذیب اور رومن کی تہذیب۔ چند سالوں کے عرصہ کے اندر اندران کے تختے الٹ کر رکھ دیئے۔ ان کے وارث بن گئے صاحب! اب یہاں کہا ہے کہ تَبَرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ<sup>①</sup> (25:1)۔ اور اس کے بعد کہا تھا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا<sup>②</sup> (8:29)۔ ”فرقان“ ملتا تھا۔ جنگ بدر میں یوم الفرقان کہا گیا ہے اور اس کی کیفیت یہ تھی کہ صحابہ جیسے صاحبانِ ایمان اور اعمال سے بھی اگر ایک مقام کے اوپر کسی کے قدم میں کسی طرح سے کہیں لغزش آتی ہے تو وہ بھی سیدھے جہنم میں جا پہنچتے ہیں۔ سنتے ہیں آپ قرآن کیا کرتا ہے۔ کہا کہ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ<sup>③</sup> (25:1)۔ ایک

① کس قدر فراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل اور حق و باطل اور غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینے والی ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 815)۔

② اگر تم ان کی بیجا کشش و جاذبیت سے بچتے، اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کر دے گا۔

③ اس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار کی حامل اور حق و باطل اور غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینے والی ہے۔

ایک لفظ پر غور کیجیے اس کے سامنے مذاہب عالم کی تاریخ تھی خدا کے سامنے تو ہوتی ہے۔ یہ چھوڑ دیجیے کہ ہر رسول خدا کی طرف سے آیا اس نے خدا کا دین دیا، بعد میں اس کی امت نے اس دین کو مذہب سے بدل دیا۔ جتنے بھی مذاہب عالم آرہے ہیں ان میں آپ ایک چیز دیکھیں گے۔ وہ ہے جسے قرآن نے غلو کہا ہے۔ خاص طور پر یہودیوں سے کہا کہ یاد رکھو! دین میں غلو نہ کرنا۔ غلو کے معنی ہوتے ہیں ”کسی کو اپنے مقام سے بڑھا دینا“ مبالغہ کر دینا۔ کوئی قوم بھی اپنے بانی مذہب کی توہین نہیں کرتی، کبھی بھی نہیں برداشت ہی نہیں کر سکتی اس کو اس کے مقام سے نہیں گراتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم نے اسے اس کے مقام سے اوپر کر دیا، بڑھا دیا۔ ہندوؤں نے تو اپنے بانیان مذہب کو اتار خدا، بشکل انسانی دنیا میں آئے ہوئے کہہ دیا تو وہ بھی ان کا مقام نہ رہا، بڑھا کے اوپر لے گئے۔ یہودیوں نے عزیر کو ابن اللہ کہہ دیا۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ ﷺ کو ابن اللہ کہہ دیا۔ وہ بھی اس مقام سے ان کو بڑھا دیا، اس مقام پہ نہیں رکھا۔ یہ تاریخ چلی آرہی تھی اس خدائے علیم وخبیر کی کہ جو جانتا ہے کہ پھر جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو کس طرح سے اس کے مقام کو اوپر لے جاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کا بلند ترین مقام ”علی عبدہ“ کہہ کر متعین کر دیا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ الفرقان کے لفظ کی کیا بات تھی! بات یہ تھی کہ انہیں فرقان حاصل ہو، اس قوم کو باقی قوموں کے مقابلے میں بہت بلندی حاصل ہو۔ تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ تو میں اپنے بانی مذہب کو اس مقام سے بہت اونچا لے جایا کرتی ہیں اس مقام سے بھی بہت اونچا جہاں ان کے لیے فرقان کا ایک وعدہ دیا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ جو تمہارے ہاں ہمارا رسول ﷺ ہے یہ جو تمہارے ہاں کا امام ہے تمہارا سربراہ ہے جس پر ایمان لانے سے تم مومن ہوتے ہو سن رکھو! اس کا مقام کیا ہے۔ علی عبدہ (25:1) یہ خدا کا عبد ہے۔ متعین کر دیا اس کا مقام کلمہ شہادت میں جز بنا دیا: اشہد ان محمداً عبده ورسوله۔ خدا کا عبد ہے اور بہت بڑا مقام عبودیت خداوندی یا عبودیت خداوندی ہے۔ انتہا یہی ہے اسے متعین کر دیا: علی عبدہ (25:1)۔ میں اس وقت اس میں نہیں جانا چاہتا کہ پھر ہم نے کیا کیا۔ مقام بھی نازک ہے اور تفصیل طلب بھی ہے کہ ہم نے پھر اسے کیا بنایا۔ خدا نے تاکید کے ساتھ تصریحاً بار بار قرآن میں حضور ﷺ کو اللہ کا عبد کہا ہے: علی عبدہ (25:1)۔ اس کے بعد اگلا لفظ ہے کہ کا ہے کے لیے نازل کیا؟ تمہارے لیے فرقان دینے کے لیے: لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (25:1)۔ عالمین یہ ہے کہ جی! حضور ﷺ پر قیامت تک کے لیے ختم نبوت ہے لہذا ان میں مباحثوں اور مناظروں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ لفظ قیامت تک تمام دنیا کے انسانوں کے لیے آتا ہے۔ جب آپ اس دنیا کو عالم کہیں گے تو دنیا کے تمام انسان اس میں آجائیں گے عالمین کہیں گے تو ہر دور کے انسان اس میں آجائیں گے اور قرآن کو اس نے کہا ہے کہ مکمل بھی ہے غیر متبدل بھی ہے محفوظ بھی ہے تو جب یہ مکمل غیر متبدل محفوظ قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہے تو پھر اس کے بعد رسول کا ہے کے

لیے آئے گا؟ اس میں لمبی چوڑی آیتیں پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں، تمام اقوامِ عالم، تمام نوعِ انسانی کے لیے، قیامت تک کے لیے، یہی رسول ہے۔ اسے یہاں ”نذیر“ کہا ہے۔

### ذاتِ خداوندی انسانوں کو ڈراتی نہیں بلکہ آگاہ کرتی ہے

نذیر بڑا عجیب لفظ ہے۔ ہمارے ہاں ہمیشہ اس کا ترجمہ آتا ہے: ڈرانے والا۔ عزیزانِ من! بات پھر کہیں اور چلی جائے گی۔ ڈر (Fear) تو کسی کا بھی ہو، جو ہر انسانیت کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس سے تباہی آتی ہے وہ ہے انسان کی ذات (Self) خودی، انا، تشخص (Personality) انسانیت (Humanity) پہ ڈر۔ یہ تباہی ان کے اوپر خوف سے آتی ہے اور قرآن نے تو مومن کے متعلق یہی کہا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (2:38) خوف بھی نہیں اور حزن بھی نہیں۔ خوف تو پھر بھی آپ کے محسوسات کی دنیا میں ہوتا ہے۔ پوچھو آج کے سائیکولوجسٹ سے کہ قرآن نے چودہ سو سال پہلے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آج کا سائیکولوجسٹ بتائے گا کہ اس نے حزن کیوں کہا ہے۔ حزن کا تعلق انسان کی Personality (شخصیت) سے ہوتا ہے، خوف کا تعلق انسان کے محسوسات سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن وہ ہے جس کو نہ عالم محسوسات میں کوئی خطرہ ہوگا نہ اس کی Personality (ذات) کے لیے کوئی چیز گھٹن کی ہوگی۔ حزن گھٹن کو کہتے ہیں۔ اس میں حزن نہیں پیدا ہوگا۔ اقبال (1877-1938) اسی لیے تو کہتا ہے:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے یہ جوئے کم آب

اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

### خوف و حزن تو انسانی صفات کو جلا کر خاک کر دیتا ہے

حزن، زندگی میں گھٹن پیدا کر دیتا ہے۔ جوئے کم آب تو کیا وہ تو بالکل سراب بن کر رہ جاتی ہے، فریب ہی فریب ہوتی ہے۔ اس لیے اس نذر (نذر) کے معنی ڈرانے کے نہیں ہیں۔ اس کے معنی ”آگاہ کرنے“ کے ہیں۔ تقویٰ کے یہی معنی ہیں: محتاط رہنا، زندگی کی شاہراہ پہ جتنے خطرناک مقامات آتے ہیں، جن سے اس میں گھٹن پیدا ہوتی ہے ان سے محتاط رہنا، آگاہ رہنا۔ نذیر کے معنی ہیں ”ان مقامات سے آگاہ کر دینے والا کہ یاد رکھو! ان چیزوں سے زندگی کی یہ جو ”بحرِ بے کراں“ ہے یہ ”جوئے کم آب“ بن جائے گی، ان سے محتاط رہو۔ یہ چیزیں راستے میں آئیں گی، یہ ان چیزوں سے آگاہ کر دینے والا ہے۔ یہ قرآن نے شروع میں کہا ہے کہ ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (2:2)۔ ہمارے ہاں ان پر اعتراض چلا آتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ متقی کسے کہتے ہیں؟ اعتراض یہ چلا

❶ FEAR= False Evidence Appearing Right

آتا ہے کہ صاحب! جو متقی ہو گیا اُس متقی کا تو مومن سے بھی ہمارے ہاں اعلیٰ مقام ہوتا ہے۔ یعنی تقویٰ شعاع قرآن کریم نے کہا ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (2:2) تو یہ جو متقی ہو چکے ہیں ان کے لیے کہا ہے کہ ان کو ہدایت کی ضرورت ہے۔ وہ تو متقی ہو گئے۔ متقی کے یہ معنی نہیں ہیں۔ یہ بڑا عجیب لفظ ہے۔ انگریزی زبان میں ایک چیز Curative ہے۔ یہ Curative ہوتا ہے کہ جب کوئی مرض میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس کی اصلاح کر دینے والا ہو اور ایک چیز یہیں سے ہے۔ یہ Curative نہیں بلکہ Caring for ہے۔ یہ بڑی اچھی اصطلاح ہے یہ بھی سائنکولوجی کی اصطلاح ہے: وہ اس مصیبت میں مبتلا ہو کر اس کی اصلاح نہیں کرتے، وہ Caring for life ہے۔ میں اس کا کیا ترجمہ کروں۔ اس کا عربی زبان میں ترجمہ تقویٰ ہے۔ پہلے سے ہی اس بات کے لیے محتاط رہنا کہ اس قسم کی کوئی بات نہ ہو جائے جس سے لائف (زندگی) میں گھٹن پیدا ہو جائے۔ یہ He cares for his life ہے۔ تقویٰ اور نذیر کے معنی یہ ہیں کہ ان مقامات سے ان لوگوں کو آگاہ کر دینا جو اپنی زندگی کے لیے Care کرتے ہیں کہ یہاں یہاں خطرناک گھاٹیاں ہیں اور پھر اس طرح سے آگاہ کیا کہ الفرقان یعنی وہاں Sign board (نشاناتِ راہ) لگا دیئے جہاں Pit falls (گڑھے) تھے وہاں کسی کو کھڑا کر دیا، سرخ متی جلادی، وہاں پہرے دار کھڑا کر دیا، وہ آگاہی دینے والا ہو گیا۔ اس طرح نذیر اس کو کہیں گے کہ جو اس سے محتاط و آگاہ کر دے کہ ادھر نہ آنا ادھر سے جانا۔ کہتا ہے: یہ ہے نذیر تمام نوع انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرنے والا۔

اب سورۃ الفرقان کی ابتدا اس سے ہوئی کہ تَبَرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (25:1)۔ بہت بڑی چیز ہے جو کچھ کہا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کہنے والا کون ہے۔ الذی له ملک السموات والارض (25:2) یہ کہنے والا وہ ہے جس کے قانون کی کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کارفرمائی جاری و ساری ہے کسی اور صاحب کی نہیں۔ اسی کو حق پہنچتا تھا کہ یہ کہے لیکن اس بات کی تفصیل آئندہ درس میں سہی کیونکہ آج درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی پہلی آیت پہ ہم تھے خدا کرے کہ میں اس کو سمجھا سکا ہوں۔ سمجھانے کے لیے تو میں نے کہا ہے کہ قرآن نصاب کی کتاب ہے۔ یاد رکھیے! یہ تو کلاسز کے اندر پڑھانے کی کتاب ہے۔ بہر حال جتنا وقت بھی ملا، میں نے عرض کیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ



① کس قدر فراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل اور حق و باطل اور صحیح و غلط میں امتیاز کر دینے والی ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھیجی گئی تھی تاکہ اس کے ذریعے تمام اقوام عالم کو آگاہ کر دیا جائے کہ ان کے سفر زندگی میں کون کون سے خطرناک مقام آتے ہیں اور ان سے بچ کر چلنے کا طریق کیا ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 815)۔



## دوسرا باب: سورة الفرقان (آیت: 2)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج دسمبر 1977ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی دوسری آیت سے ہو رہا ہے: (25:2)

سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ تَبَرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا<sup>①</sup> (25:1)۔ سارا درس اسی ایک آیت کی نذر ہو گیا تھا اور اس کے بعد بھی میں سمجھتا ہوں، یوں کہیے کہ میرا توجی نہیں بھرا تھا۔ اس کے اندر ایک نکتہ ہے، اسے پھر دہرا دوں۔ وہ ہے عَلٰی عَبْدِهِ (25:1)۔ اس نے اپنے عبد پر اس الفرقان کو نازل کیا۔ قرآنِ کریم میں حضراتِ انبیاء کرام □ کو۔ ان میں نبی اکرم ﷺ بھی شامل ہیں، عبد کہا گیا ہے اور میں نے بتایا تھا کہ اس کی وجہ جاننے کے لیے آپ مذاہبِ عالم پہ نگاہ ڈالیے، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں نے اپنے اپنے بانیانِ مذہب کو ان کے حقیقی مقام سے بہت بلند کر دیا۔ یعنی انہیں خدا بنا دیا، خدا کا بیٹا بنا دیا، غلو کیا۔

قرآن کہتا ہے کہ تم نے مبالغہ کیا، انہیں ان کے مقام سے نیچے لے آئے، اس سے تو ان کی تحقیر ہو جاتی ہے، تم جوشِ عقیدت میں انہیں ان کے مقام سے اونچا لے گئے اور انہیں مقامِ الوہیت میں داخل کر دیا۔ یہ بھی ظلم ہے کہ کسی شے کو اس مقام پہ نہ رہنے دینا، جس

① کس قدر فدا و انیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل، اور حق اور باطل اور غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینے والی ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھیجی گئی ہے تاکہ اس کے ذریعے تمام اقوامِ عالم کو آگاہ کر دیا جائے کہ ان کے سفرِ زندگی میں کون کون سے خطرناک مقام آتے ہیں اور ان سے بچ کر چلنے کا طریق کیا ہے؟ (پرویز: مفہوم القرآن، ص-815)۔

مقام کے لیے وہ بنی ہے یا جہاں اسے ہونا چاہیے۔ خواہ وہ اسے نیچے لے آئے خواہ اسے اوپر لے گئے، یہ ظلم ہے۔ اس کو اس کے صحیح مقام سے اوپر لے جانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک ہو گئے، اس کے اختیارات میں شریک ہو گئے تو توحید باقی نہ رہی۔ اسی لیے قرآن کریم نے حضرات انبیائے کرام □ کو جنہیں ان کے Followers یعنی متبعین اس درجے سے اوپر لے جا کے خدائی میں شریک کر لیتے تھے، عبد کہا۔ یہ ہے ان کا صحیح مقام لیکن اس میں بھی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ صاحب! یہ تو کوئی مقام نہیں ہے۔ عبد کا عام طور پہ ترجمہ غلام کیا جاتا ہے، یعنی مطیع، فرماں بردار، محکوم، عبد۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ کیا مقام ہے۔ اس میں ایک بڑا اہم نکتہ قابل غور ہے۔ ہر جگہ کہا ہے: عبدہ یعنی اس کا غلام اس کا عبد۔ توحید کے معنی یہ ہیں کہ جو اس کا عبد ہے وہ دنیا میں کسی اور کا عبد ہو نہیں سکتا۔ اسی لیے جہاں کہا عبدہ کہا۔

اب آپ دیکھیے کہ قرآن ایک لفظ سے یا ایک لفظ کے ساتھ ذرا سی اضافت سے بات کیا کہہ گیا۔ ایک تو انہیں مقام الوہیت تک جانے سے روک دیا، وہیں رکھ دیا کہ مقام الوہیت تو ان کو حاصل ہی نہیں ہو سکتا وہ تو انہیں اس مقام تک آپ لے جا ہی نہیں سکتے اور اس کا عبد کہنے سے یہ بات واضح کر دی جو اس کا ہو گیا، یہ کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا تو وہ عبد ہے۔ اس نے کعبہ کو بیعتی کہا یعنی میرا گھر۔ اب میرے گھر کی نسبت سے کعبہ کسی اور کا گھر ہو ہی نہیں سکتا۔ جس چیز کی نسبت خدا اپنی طرف کر لیتا ہے اس کے وحدہ لا شریک ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ شے کسی اور کی ہو نہیں سکتی۔ یہ جو انبیائے کرام □ کا یا رسول اللہ ﷺ کا مقام عبدیت ہے یعنی جب انہیں عبدہ کہا ہے یعنی اس کا عبد، تو ساری دنیا کی عبدیت اور غلامی سے ان کو آزاد کر دیا۔ وہ کسی اور کا محکوم، مطیع، فرماں پذیر، غلام، عبد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ یہ ہے صحیح مقام عبدہ کا اور یہی چیز ہے کہ آپ بھی کلمہ شہادت میں دیکھتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کے بعد محمد ﷺ کے متعلق عبدہ و رسولہ ہے تو یہ جو عبدیت ہے یہ اتنی بات ہے۔ یہ عبدہ ہونا وجہ تخصیص ہے اور یہ ہے کائنات کے اندر ایک بلند ترین مقام۔ اب یہ کسی اور کا عبد ہو نہیں سکتا۔ صاحب! اتنی بڑی آزادی دنیا میں کیسے میسر آ سکتی ہے؟ اس کو آ سکتی ہے جو عبدہ ہو جائے۔ جب آپ کسی ایک کی طرف منہ کریں گے باقی ساری دنیا کی طرف پشت کرنی پڑے گی۔ آپ ایک وقت میں ایک سے زائد سمتوں کی طرف اپنا رخ نہیں کر سکتے، اسی لیے دعائے ابراہیمی ♦ جو توحید کے لیے آئی ہے یہ ہے کہ اِنِّیْ وَجْہْتُ وَجْہَیْ لِلذِّیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ<sup>①</sup> (6:79)۔ غور کیجیے بات کیا کہہ گیا ہے: میں نے تو اپنا رخ

① میں اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اس ذات بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو اس تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے (اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اُس سے نہ ستاروں کو مفر ہے نہ چاند اور سورج کو مجالِ سرتابی) اس لیے میں اُس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ میرا دو ٹوک فیصلہ ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 305)۔

اس طرف کر لیا۔ اب سوال ہی نہیں ہے کہ اس رخ میں کوئی دوسرا شریک ہو سکے۔ رخ تو ایک وقت میں ایک ہی سمت کی طرف رہے گا۔ جو عبدہ ہے وہ عبدہ رہے گا۔ کسی اور کا عبدہ نہیں سکتا، اس لیے کہ سورۃ الفرقان کی اگلی آیت میں یہ کہا کہ **الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** (25:2) اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اقتدار اور اختیار اسی کا ہے کسی اور کا نہیں ہے۔

دین صرف خدا کی طرف سے ملتا ہے کوئی رسول دین کا بانی نہیں ہوتا

یہ جو کہا کہ باقی اہل مذاہب اپنے اپنے بانیان مذہب کو ان کے صحیح مقام سے اوپر لے گئے، صحیح نہیں ہے۔ یہ بانیان مذہب کا لفظ تو میں ان کی اپنی اصطلاح میں استعمال کر رہا ہوں، ورنہ یہ رسول دین کے بانی نہیں ہوتے تھے یہ رسول ہوتے تھے۔ اس نکتے کو بھی سمجھ لیجیے کہ دین کسی پیغمبر کا نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے بھی اسلام کو دین اللہ کہا ہے، خدا کا عطا کردہ دین۔ اور اگر آپ دین کا ترجمہ نظام حیات کرتے ہیں تو یہ نظام خداوندی ہو سکتا ہے کسی رسول کا نہیں ہو سکتا۔ رسول تو دین خداوندی کو پہنچانے والا اس کو قائم کرنے والا اس کو متشکل کرنے والا ہے۔ دین اس کا بنایا ہوا نہیں ہوتا، وہ خدا کے دین کو لاتا ہے، پہنچاتا ہے، دیتا ہے، قائم کرتا ہے۔ اس لیے کہا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اقتدار اور اختیار اسی کا ہے اور آگے کہا کہ **وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ** (25:2)۔ اس کے اس اختیار و اقتدار میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔

ابن اللہ کا غلط تصور

یہ جو تم حضرت عیسیٰ کے متعلق کہتے ہو کہ وہ ابن اللہ تھے، خدا کے بیٹے تھے۔ بیٹا تو باپ کی ہر شے میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابن اللہ کہا تو جھٹ سے یہاں آ گئے، یعنی باپ بیٹا روح القدس۔ ان تین میں ایک ایک میں تین۔ خدائی کا مرتبہ انہیں دے دیا، الوہیت کا مرتبہ انہیں دے دیا۔ کہا کہ یہ غلط ہے۔ اُس کے اقتدار اور اختیار میں اس کائنات میں دوسرا شریک ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بیٹا کیا حیثیت رکھتا ہے؟

یہودیوں کے ہاں نبوت اور عزیر کے تصورات کی حقیقت

ضمناً ایک بات سامنے آ گئی۔ قرآن کریم نے یہودیوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ عزیر کو ابن اللہ کہتے تھے (9:30)۔ اس کے علاوہ قرآن میں عزیر کا کسی اور جگہ ذکر نہیں آیا اور عام طور پر وہ اس پہ اعتراض بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں عزرا نبی گزرا ہے۔ نبی کا لفظ وہ

① اُسے نہ تو اپنی امداد کے لیے اولاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی اُس کے اقتدار میں کوئی اور قوت شریک ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 815)

اپنے ہاں کے جوکاہن ہوتے تھے ان کے لیے بولتے تھے۔ وہ نبی کا لفظ پیشین گوئی کرنے والے کے معنی میں لیا کرتے تھے اور یہ ان کے ہاں جو ٹیمپل تھا، معبد تھا، مقدس تھا، اس میں ایک بہت بڑا کہانت کا منصب تھا۔ یہ قسمیں بتانے والے، فالیں نکالنے والے، پیش گوئیاں کرنے والے کاہن کہلاتے تھے۔ ان کو وہ نبی کہا کرتے تھے۔ ایک تو ان کے ہاں وہ عزرا نبی ہیں، وہ عزرا<sup>1</sup> ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ عزرا کو تو ہم ابن اللہ نہیں کہتے۔ عزیر کا لفظ کہیں اور آیا نہیں، تو اصل میں یہ جو عزیر ہے، یہ مصریوں کا دیوتا Osiris (عزیرس)<sup>2</sup> تھا جس کی نیل کی سی شکل تھی۔ وہ اس کی پرستش کرتے تھے اور اسے ابن اللہ مانتے تھے۔ بنی اسرائیل نے مصر میں اپنے تمام اعتقادات انہی مصر میں بسنے والے بت پرست مشرکین کے اپنا لیے تھے اور انہی میں یہ Osiris (عزیرس) دیوتا کی بھی پرستش کرتے تھے، اسے خدا مانتے تھے۔ یہ

**1** عزرا نبی (یا عزرافیقہ)۔ عزیر یہودیوں میں بڑی عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ جب یہودی بابل کی اسیری کے بعد، یروشلم میں واپس آئے تو کتاب مقدس (تورات کا مجموعہ کتب) ان سے ضائع ہو چکا تھا۔ کتاب تکمیلہ (باب 8) میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ تورات کے سلسلہ اول کی پانچ کتابوں کو عزرا نبی (یا عزرافیقہ) نے دوبارہ مرتب کیا۔ موجودہ تورات میں خود کتاب عزرا بھی موجود ہے جس میں عزرا نبی نے بتایا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو کیسے از سر نو مرتب کیا۔ یہ قریب ساڑھے چار سو سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ [پرویز (1961)۔ لغات القرآن جلد سوم، لاہور: ادارہ طلوع اسلام ص 1159 تا 1160] ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی نے The Qur'an as it explains itself میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

Some Jews in the Arabian Peninsula used to believe that Osiris, the Egyptian idol, was God's son while others thought of Ezra, who restored The Torah after it had been lost in the Balylonian Exile, as Good's son (p.128). Some Jews in Arabia, still under the influence of ancient Egyptian traditions during the times of the exalted Messenger, used to believe in UZAYR or OSIRIS, the bull-god as God's son (p.225). Shabbir Ahmad (2003). The Qur'an as it explains Itself. USA, Lawderhill, FL: Galaxy Publications).

**2** ہیروڈس نے آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل، اس دیوتا کا نام Osiris یعنی عزیرس لکھا ہے۔ یونان میں اسماء کے بعد ’س‘ ہمیشہ زائد ہوتی ہے۔ اس صورت میں اس دیوتا کا نام عزیر ہے جو قرآنی عزیر کے بالکل مشابہ تھا۔ مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا نام ’ایزاری‘ آیا ہے۔ اس کے نام پر جو سائنڈ نیل پوجا جاتا تھا اس کا نام ’ایزاربانی‘ یعنی عجل عزیر تھا۔ اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور ’فتاح‘، یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا (ابن اللہ) مانا جاتا تھا۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں شروع کر دی تھی۔ (اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود کو اس گنہگار پرستی سے روک دیا۔ لیکن آپ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہو گئی۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد، شمالی سلطنت کے بادشاہ یروبعام اول (933 ق م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کر دی۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے تراجم کی تصحیح ہوئی ہے اس کے پیش نظر اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود تھا لیکن (غلطی سے) لفظ عزیر کو ’سیر‘ سمجھ کر اس کا ترجمہ ’قیدی‘ کر دیا گیا۔ اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے۔ (حوالہ پرویز (1961)۔ لغات القرآن جلد سوم، لاہور: ادارہ طلوع اسلام ص 1161)۔ اسی کے بارے میں (باقی اگلے صفحہ پر)

عبرانی زبان میں عزرا (Ezra) ہو گیا۔ مصری بھی اسے ابن اللہ مانتے تھے یہ بھی اسے ابن اللہ کہنے لگے۔ یہ ہے وہ عزرا جس کو یہ یہودی ابن اللہ کہتے تھے: مصر کا Osiris دیوتا۔ اور ہماری جہالت دیکھیے کہ ہم عزیر نام رکھتے ہیں۔ کبھی کوئی کھڑا ہو کر سوچتا نہیں، تحقیق نہیں کرتا۔ ہم کرتے کیا ہیں؟ بھئی! یہ عزیر؟ کہ جی وہ ایک نبی تھے۔ ارے! کہاں لکھا گیا ہے؟ نبیوں کے نام تو قرآن کریم میں قریباً سب کے سب جن کی بستیوں کے کھنڈرات سے عرب گزرتے تھے دے دیئے۔ اس میں تو یہ نام کہیں نہیں لکھا، انبیائے کرام میں اس کا نام تو ہے نہیں۔ اور جہاں عزیر کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ وہ اسے ابن اللہ کہتے تھے اور یہ ہے مصر کا دیوتا۔ یہ ضمنی بات تھی۔

### خدا کے صحیح تصور کی اہمیت

عزیزانِ من! اس ضمنی بات سے پہلے بات یہ ہو رہی تھی کہ کائنات میں ہر جگہ اُسی کا قانون کارفرما ہے اور کہا یہ تھا کہ اس کے اقتدار اور اختیار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا پھر فوراً ہی قرآن نے کہا تھا کہ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ① (25:2)۔ شریک کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو ہر شے کو پیدا کیا ہے۔ مخلوق تو خالق کی شریک نہیں ہو سکتی اور آگے ہے کہ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2)۔ لیجیے صاحب! یہ دو الفاظ ہیں جن کے اندر پورا دین اسلام اور خدا سمٹ کر آ جاتا ہے۔ غالباً یہ مغرب کا مشہور فلاسفر ہے جس نے کہا ہے کہ تم مجھے یہ بتادو کہ فلاں قوم نے اپنے لیے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا تھا اور میں اس قوم کے متعلق بتادوں گا کہ اس کا تمدن کیا

ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی نے The Quran as it explains itself میں یوں لکھا ہے:

" As-Samiri originally hailed from northern India. Babu Rajindra's treatise "Casting of a Caste" shows Samiri belonging to the "Untouchable". Fed up with apartheid he tried to lay down the foundation of a new mixed caste that could socialize with all four castes of Hinduism. As a consequence he was exiled by the powerful Brahmins and ended up in Egypt and later followed Moses in the Exodus. Cow worship was running in his blood stream. Side by side, the golden calf of the Israelites symbolized centuries old Egyptian influence. The Egyptians used to worship the sacred bull APIS who was considered to be a god-incarnate. The soul of the sacred bull upon death was supposed to transmigrate into another idol called OSIRIS whom they worshiped as God's son. (p.225)"

① اُسے نہ تو اپنی امداد کے لیے اولاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے اقتدار میں کوئی اور قوت شریک ہے۔ اس نے ہر شے کو ایک خاص ترتیب دے کر پیدا کیا۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 815)۔

تھا؟ تہذیب کیا تھی؟ ثقافت کیا تھی؟ خیالات کیا تھے؟ معتقدات کیا تھے؟ بس اتنا بتا دو کہ انہوں نے اپنے لیے خدا کس قسم کا تجویز کر رکھا ہے۔ خدا کے تصور کی اہمیت اتنی بڑی ہے اور یہ حقیقت ہے۔ اس میں ساری بات سمٹ کر آ جاتی ہے۔ تمہارے ہاں خدا کا تصور کیا ہے؟ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے وہ تو کسی کے تصور میں، وہم میں، گمان میں، قیاس میں، آہی نہیں سکتی۔ جنہیں خدا کی صفات کہتے ہیں، انہی سے اس کا تعارف ہوتا ہے، انہی صفات کی رو سے ہمارے ذہن میں اس کا ایک تصور قائم ہوتا ہے۔ اسلام کی یا قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا کی صفات اس قسم کی دیتا ہے جن کی رو سے خدا کا ایک تصور قائم ہوتا ہے۔ وہ کہیں اور سے نہیں ملتا۔ یہ ہے قرآن اور اسلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت۔ ہمارے ہاں چونکہ اسلام کے متعلق دین کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے، یہ بھی ایک مذہب شمار کیا جانے لگا ہے، ہم نے بھی اسے ایک مذہب ہی کہا ہوا ہے: مذہب اسلام۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ Religion ہو گیا ہے۔ اب Christianity (عیسائیت) بھی Religion، ہندومت بھی Religion، اسلام بھی Religion، یہودیت بھی مذہب، انہوں نے اسلام کو بھی اس کی صفت میں کھڑا کر دیا اور اس کے بعد مذاہب عالم کے مناظرے ہونے لگے۔ انہی میں اسلام بھی شریک ہو گیا۔ اب یہ اپنے مذہب کو اسلام کو، دیگر مذاہب کے مقابلے میں افضل ثابت کرتے تھے یعنی اسلام جو مذہب ہے ہی نہیں، اسے مذاہب سے زیادہ افضل ثابت کرتے تھے۔ ثابت کیا ہو سکتا تھا، وہ مذہب تو ہے نہیں۔ بس چلے ہوئے ہیں اسی طرح سے۔

اصل چیز یہ ہے کہ قرآن نے خدا کا تصور کس قسم کا دیا ہے۔ یہ ہے بنیادی نکتہ عزیزان من! اسی بنیاد پر دین کی اور انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے: خدا کا تصور کس قسم کا دیا ہوا ہے۔ وہ تصور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، اس کی صفات سے قائم ہوتا ہے اور یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے صفات خداوندی کو اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور وہ صفات دینے کے بعد یہ کہا ہے کہ فَانُ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِہٖ فَقَدْ اهْتَدَوْا (2:137) اگر یہ اس کے مطابق خدا کو مانیں جس طرح تم مانتے ہو تو سمجھا جائے گا کہ یہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اس کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہیں، ورنہ خدا کو تو چند ہر یوں، لحدوں کے سوا ساری دنیا مانتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کا خدا کا ماننا بالکل نہیں ہے، خدا پر ایمان ہی نہیں۔ یہ اس خدا کا ماننا ہے جس کا تصور اس کی ان صفات کی رو سے قائم ہوتا ہے جو اس نے خود بیان کی ہیں، اپنے متعلق دوسرا کوئی بیان ہی نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے ہاں پایا جانے والا تصور خدا اور اس کے اثرات

آج ہمارے سامنے ایک ایسی چیز آتی ہے جو ان صفات میں بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایسی خصوصیت کبریٰ ہے جو خدا کے متعلق کہیں اور نہیں ملتی۔ خدا کے متعلق کہیں بھی آپ دیکھیے، تصور یہ ہوتا ہے کہ اسے ہر قسم کا اقتدار حاصل ہے، اختیار حاصل ہے، وہ جو

چاہے کرے اس کے فیصلے میں دم مارنے کی جاہ نہیں ہے، وہ قادرِ مطلق ہے، مرضی مولا برہمہ اولیٰ اس کے مقابل میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج کی اصطلاح میں اسے Authoritarian God کہا جائے گا یعنی اختیارِ مطلق کا مالک۔ آپ نہ Question (سوال) کر سکتے ہیں، نہ اعتراض کر سکتے ہیں، بلکہ یہ بھی نہیں کہ آپ اسے یہ کہیے کہ حضرت! یہ سمجھا ہی دیجیے کہ آپ نے کیوں حکم دیا ہے۔ میں نے Authoritarian اس لیے کہا کہ آج کل ذرا ڈکٹیٹر شپ سے کچھ لوگ جھینپ رہے ہیں۔ اس کی بجائے انہوں نے Authority کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسے Authoritarian کہا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں خدا کا یہی تصور تھا۔ ہمارے ہاں جو آئے تو میں نے کہا ہے کہ ہم نے سارے تصورات ان سے لیے ہیں۔ قرآن کی رو سے جو تصور قائم ہوتا ہے وہ ہمارے ذہنوں میں ہے ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یورپ نے عیسائیت اور یہودیت کے متعلق انگریزی زبان میں جب ترجمے کیے تو انہوں نے خدا کے لیے Lord (لارڈ) کا لفظ استعمال کیا۔ Lord سے تو آپ سمجھتے ہی ہیں کہ کیا ہے، اگلی نسل تو شاید نہ سمجھے۔ ہم تو جانتے ہیں کہ جب لارڈ صاحبِ کیندے سن تے مطلب کی ہوندا؟<sup>①</sup> یہ کہ Lord of the Kingdom<sup>②</sup> دیکھا آپ نے، وہ کتنا بڑا Authoritarian God نظر آتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ہمارے قرآن کریم کے جو ترجمے ہوئے وہاں بھی رب کا ترجمہ Lord کیا جاتا ہے۔ دیکھیے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) کا انگریزی ترجمہ ہوتا ہے:

Prayer be to Allah, the Lord of the world<sup>③</sup>

اور جتنا کوئی اس کو زیادہ Lord مانتا جائے اتنا ہی زیادہ وہ خدا پرست تسلیم کیا جاتا ہے۔ قرآن نے آ کر یہ کہا کہ یہ تو نہیں ہے کہ یہ پہلی دفعہ کہا ہے۔ وحی کی رو سے تو یہ ہے کہ پہلے بھی تمام انبیائے کرام □ کی طرف وحی آتی تھی۔ وحی کی رو سے تو اسی خدا کا تصور دیا گیا

① ہم تو جانتے ہیں کہ جب لارڈ صاحب کہتے تھے تو اس کا مطلب و معنی کیا ہوتا تھا۔

② (وہ) سلطنت کا مالک کل ہے۔

③ پکتھال (Marmaduke Pickthall) نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے:

Praise be to Allah , Lord of the Worlds

آغا محمد یعقوب نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

All praise is due to Allah, the Lord, the Cherisher and the Sustanier of the worlds (Printed at:

JAWED BLOCK, Pakistan Chowk, Karachi. P.26)

محمد ایوب خان نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

Praise be to God, the Lord of the World (ادارہ اشاعت القرآن لاہور کینٹ۔ ص۔ 12)

تھا جو تصور آخر میں قرآن میں ہے لیکن چونکہ وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں نہیں رہیں اور ان کے بھی ترجمے در ترجمے ہوتے چلے آئے یہ چیز کہ وہ مذاہب کیا ہیں ان کی کتابوں کے ساتھ کیا ہوا وہ میری کتاب ہے: ”مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں۔“ اس میں ان کی یہ ساری تاریخ (History) دی ہوئی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس کی کتاب اپنی اصلی شکل میں آج اس دنیا میں موجود ہو۔ اس کی گواہی وہ اہل مذاہب خود دیتے ہیں کہ ہمارے پاس وہ اصلی کتاب نہیں ہے۔ اس لیے ان کے ہاں تو اس کی تلاش غلط ہے۔ قرآن کریم اپنی شکل میں تھا اور آج بھی ہے۔ انہوں نے بھی رب کے لیے یہ Lord ترجمہ کیا۔ Authoritarian God کا تصور اور عقیدہ انہوں نے دیا۔ آج کی اصطلاح میں، میں یہ کہوں گا کہ قرآن نے پہلی دفعہ آ کر خدا کے متعلق Authoritarian God نہیں کہا Constitutional God کہا۔ ہمارے ہاں ایک کہتا ہے کہ یہ کیا کر دیا تم نے؟ دوسرا جواب میں کہتا ہے کہ میں نے تو کچھ نہیں کر دیا یہ تو خود خدا نے کیا ہے کیونکہ پہلی چیز اس نے یہی کہی کہ **الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ** (25:2) ساری کائنات کے اندر اقتدار اور اختیار اسی کا ہے۔ دیکھتے ہیں آپ کہ ذہن میں وہ Lord والا تصور آ رہا ہے کہ **لَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ** (25) اور اس کے اقتدار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ اتنا بڑا تصور آ یا اور کہا کہ **وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ** (25:2) اور ہر شے کو جس میں انسان بھی شامل ہے اس نے پیدا کیا ہے۔ یہ اس کی مخلوق ہے اس لیے یہ شریک نہیں ہو سکتے تو اس سے یہ اتنا بڑا تصور آ یا Authoritatively تصور اس سے قائم ہوتا ہے لیکن ابھی فقرہ ختم نہیں ہوا نتیجہ اخذ کرنے میں اتنی جلدی نہ کیجیے۔

### قرآن حکیم کی روشنی میں ہی خدا تعالیٰ کا حقیقی تصور ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم نے کہا کہ **خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ** (25:2) تخلیق کیا اس نے ہر شے کو اور **فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا** (25:2) ان سب کے لیے قانون اور پیمانے اور اندازے اور معیار مقرر کر دیئے جو کبھی نہیں بدلیں گے جن کو ہم بھی نہیں بدلیں گے۔ میں نے کہا ہے کہ آج کی اصطلاح میں اسے Authoritarian God کی بجائے Constitutional God کہیں گے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ دو لفظ آگئے ہیں جن میں سارا تصور سمٹ کے آ جاتا ہے۔ معاف رکھیے گا مجھ میں تو کچھ وجد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ **الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ** (25)۔ دیکھا ایک ایک لفظ سے اتنی بڑی اتھارٹی قائم ہو رہی ہے۔ صاحب! اس کے اقتدار اور اختیار کا کائنات میں کوئی شریک ہی نہیں ہے اس لیے کہ **خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ** (25:2) وہ خالق ہے ہر شے کا۔ اور آگئے کہ **فَقَدَرَهُ** (25:2)۔ کیا بات ہے اس ”ف“ کی! **فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا** (25:2) پیدا کرنے کے بعد ہر ایک کے لیے قانون مقرر کر دیا اور قانون ایسا مقرر کر دیا جسے ہم بھی نہیں بدلیں گے۔ صدقے جائیے ایہو جئے رب دے۔ ہے



ناجیھی پانوں جی کردا۔<sup>1</sup> اس تضاد کو دیکھیے، معاف رکھیے کیا کہوں! میرا تو جی چاہتا ہے ہزار بار دہراؤں کہ اَلَّذِي لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (25)۔ ایک طرف تو اقتدار اور اختیار کی یہ کیفیت اور اس کے بعد ہے کہ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2) پھر ہم نے ہر شے کے پیمانے، اندازے، معیار، قانون مقرر کر دیئے اور یہ بھی کہ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ (10:64) ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی، ہم بھی تبدیلی نہیں کریں گے۔ وہ اتنا بڑا صاحب اختیار ہے، کتنی بڑی پابندی اپنے اوپر عائد کر رہا ہے۔ ہر شے کے لیے قانون اور معیار مقرر کر دیا اور کہتا ہے کہ ہم بھی اس کو نہیں بدلیں گے۔

### خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا تعلق اس کے مقرر کردہ قوانین سے ہوتا ہے

عزیزانِ من! دیکھیے آپ، خدا کا یہ تصور کہیں اور بھی ملتا ہے؟ نہیں، قطعاً نہیں۔ پھر آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو اس تصور کی خصوصیت اور انفرادیت ہے اس کی رو سے خدا کے ساتھ ہمارا تعلق کس بنا پر رہ جاتا ہے؟ اس کے قوانین کی بنا پر۔ جب اس نے کسی معاملے میں دخل ہی نہیں دینا، قانون بنا دیئے اور ان میں وہ کہتا ہے کہ ہم دخل نہیں دیں گے، ہم انہیں بدلیں گے ہی نہیں، تبدیل نہیں کریں گے، تو ہمارا تعلق تو صرف قوانین خداوندی کے ساتھ رہ گیا۔ آج بھی مملکت کے اندر جو قانون چلتا ہے، ہم کبھی پوچھتے ہی نہیں کہ کس پارلیمنٹ نے اس کو بنایا، ویسے بھی ہمیں اس چیز کے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ یہ قانون ہے، اس کا اتباع ہم نے کرنا ہے، اس نے قوانین بنا دیئے۔ جہاں تک خارجی کائنات کے ساتھ انسان کا تعلق ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ جو Discover (اکشاف) کرنے والے علوم ہیں، ان میں سے ایک ایک قانون کو Discover (بے نقاب) کرتے چلے جاتے ہیں، منکشف کرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق تھا، وہ قوانین اس نے اپنی الکتب کے اندر دے دیئے۔ کتاب کا معنی ہی ضابطہ قوانین ہوتا ہے اور اس کے بعد خود اپنا اختیار یہاں تک ہی رکھا کہ یہ قوانین جو ہم نے دیئے ہیں، یہ اسی طرح سے اٹل چلتے رہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی نقص یا حرج واقع نہ ہو۔

### دو حصوں میں اقتدار کی تقسیم: عالمِ امر اور عالمِ خلق

اس نے یہ جو اپنا ملک کہا ہے، مملکت کہا ہے، دائرہ اقتدار کہا ہے، اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو ”عالمِ امر“ ہے جہاں وہ کائنات کی تخلیق کرتا ہے، اشیاء کی تخلیق کرتا ہے، ان کے لیے قانون متعین کرتا ہے۔ یہ وہ عالمِ امر ہے جس کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہاں یہ کس طرح کرتا ہے، اسی لیے اس دائرہ کے متعلق اس نے کہا کہ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (5:1)

1 اس خدا پر ہزار جان نثار ہو۔ اسے بغلیں ہونے کو جی چاہتا ہے، نہ یہی؟

جس طرح ہمارا ارادہ کرتا ہے ویسے وہاں ہم کرتے ہیں، حکم دیتے ہیں، یَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (3:40) جیسی ہماری مشیت ہوتی ہے اس کے مطابق ہم کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہاں تو ہونا ہی یہ چاہیے وہاں ہے کون جس سے وہ مشورہ کرتا پھرے۔ وہاں کسی پابندی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے ارادے اور مشیت کے مطابق جس چیز کو جس طرح سے چاہتا ہے اس کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ ہے اس کا عالم امر۔ اس نے تو خود بتایا ہے کہ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط وَ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ① (2:117)۔

### کائنات کی ابتدا کے متعلق موجودہ تحقیق اور قرآن حکیم کا ارشاد

یہ خود جو بڑے بڑے Scientists (سائنسدان) ہیں وہ اس کائنات کے اندر جو خدا کا قانون یا قوانین فطرت رائج ہیں ان میں سے ایک ایک کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں، کرتے چلے جاتے ہیں کہ یہ کیسے کام کر رہا ہے اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یہ کرتے کرتے وہ پیچھے چلے جاتے ہیں۔ اسے وہ Law of Cause & Effect (قانون علت و معلول) کہتے ہیں۔ Cause (علت، سبب) یہ ہوتا ہے یعنی ہر نتیجہ جو پیدا ہوتا ہے اس کا ایک سبب ہوتا ہے Cause ہوتا ہے۔ اس کائنات کے اندر یہ چیزیں ہیں اور وہ اس کی تحقیق کرتے چلے جاتے ہیں، Discover (بے نقاب) کرتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی Scientists کوئی قانون بناتے نہیں ہیں۔ غالباً سلیوان ① (Sullivan) کا بڑا اچھا فقرہ ہے:

② We only read the Book of nature, we can't write it.

یہ بہت خوبصورت ہے کہ ہم کتاب فطرت لکھتے نہیں ہیں، ہم کتاب فطرت کو پڑھتے ہیں۔ یہ پڑھتے پڑھتے، جب پیچھے (ماضی میں) چلے جاتے ہیں تو اس مقام پہ پہنچ جاتے ہیں جہاں کائنات وجود میں آئی۔ معاف رکھیے وہاں بات یوں ہی بنتی ہے کہ وہاں حیرت ہی حیرت ہوتی ہے۔ پھر بات دوسری طرف چلی جائے گی کہ جہاں قرآن نے سدرۃ المنتہی کہا ہے۔ انتہا ہے یہ بات کہ اس سے پہلے وہ سمجھتے تھے کہ یہ Cause (علت) ہو تو اس کا یہ نتیجہ (Effect) ہوتا ہے۔ اب جب کائنات کی ابتدا ہے تو وہاں وہ کیا کریں گے؟ یہ کس طرح وجود میں آگئی؟ وہاں جا کے یہ سب حیرت میں ہوتے ہیں کہ یہ وہ مقام ہے جس سے ہم آگے جا ہی نہیں سکتے۔ Effect یعنی نتیجہ تو

① تمہارا محدود ذہن تمہیں یہی بتا رہا ہے کہ خدا کا طریق آفرینش بھی تولید (Procreation) کا ہے یعنی وہ طریق جس کی رو سے ایک باپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ خدا وہ ہے جو ساری کائنات کو پہلی مرتبہ (عدم سے) وجود میں لایا ہے۔ اُس کا انداز تخلیق یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کے پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، تو اس کے ساتھ ہی اس شے کی تخلیق کا آغاز ہو جاتا ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 42)۔

② ہم صحیفہ فطرت کو صرف پڑھ سکتے ہیں، لکھ نہیں سکتے۔ دراصل شین (F.J. Sheen) نے اپنی کتاب Philosophy of Religion: p.156 (مذہب کا فلسفہ ص 156) میں لکھا تھا کہ ”سائنس“ کتاب فطرت کو پڑھتی ہے، اسے لکھتی نہیں۔“ غالباً سلیوان (Sullivan) نے شین کے ہی حوالے سے یہ بات کہی ہے۔

سامنے ہے علت (Cause) کا پتہ نہیں چل رہا۔ یہ اتنی بڑی کائنات ہے اس کائنات کا ابھی تک ذہن انسانی احاطہ ہی نہیں کر سکا۔ خود جتنی موجود ہے اس کا بھی احاطہ نہیں کر سکا۔ نیوٹن تو کہتا ہے کہ ہم علم کے سمندر کے کنارے پہ گھونگھے چن رہے ہیں، سپیاں چن رہے ہیں، علم کا سمندر تو ابھی آگے آتا ہے لیکن جتنی کائنات کا احاطہ کر چکے ہیں اسے جیمز جیمز (James, Jeans) تو The Expanding Universe کہتا ہے یعنی یہ Universe (کائنات) پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ اس نے کیا کہنا تھا، چودہ سو سال پہلے کا ایک عرب <sup>①</sup> کہتا ہے کہ **يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (35:1)**۔ ہم اپنی تخلیق میں اضافے کرتے چلے جاتے ہیں۔

رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

عدم سے وجود میں لانے والی ہستی کسی Cause (سبب) کی محتاج نہیں

وہاں پہنچنے کے بعد یہ جو Cause & Effect (علت و معلول) کا سلسلہ ہے وہاں Effect (معلول، نتیجہ) تو سامنے ہے اس کائنات محسوس کا کوئی Cause (سبب) معلوم نہیں اور یہ مقام ہے جہاں اس نے کہا کہ **بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (2:117)**۔ بدع کے معنی ہوتے ہیں Nothingness (عدم) سے کسی چیز کو وجود (Being) میں لے آنا۔ ہر شے جو وجود میں آتی ہے اس میں ہوتا یہ ہے کہ پہلے کچھ چیزیں ہوتی ہیں ان کو ملاتے ہیں تو اس طرح سے ایک نئی چیز بن جاتی ہے۔ اسے عربی زبان میں خلق کہتے ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ایک خاص نسبت سے ملائے پانی کا قطرہ وجود میں آ جاتا ہے۔ پہلے وہ دو چیزیں موجود ہوں گی تو پانی کا قطرہ بنے گا لیکن سوال یہ ہے کہ ہائیڈروجن کیسے وجود میں آ گئی؟ اس کے لیے عربی زبان میں بدع کا لفظ ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس کنارے پہ جہاں یہ مجو حیرت کھڑے تھے وہاں اس نے کہا کہ کیا سوچ رہے ہو؟ سنو! **بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (2:117)**۔ وہ Nothingness (عدم) سے اشیاء کو وجود میں لانے والا ہے۔ صرف عدم وہ مقام ہے جہاں ہم Cause (سبب) نہیں معلوم کر سکتے اور ہونا بھی یہی چاہیے۔ اس سلسلے کو پیچھے لے جائیے کہیں تو کوئی مقام ایسا آئے گا ہی کہ پیچھے Cause (سبب) نہ ہو اور Effect (نتیجہ) ہو۔ یہ ہے اس کی صفت: **بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (2:117)**۔ اس کے بعد وہاں کیا ہوتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **وَ اِذَا قَضٰى اَمْرًا (2:117)** جب وہ ہمارے الفاظ میں یہاں ”امر“ کا لفظ آیا ہے ارادہ کر لیتا ہے تو پھر **فَاَنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ (2:117)** بس وہ اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ کہتا ہے ”ہو جا“ **تَوَفِّيْ كُوْنُ (2:117)** ہو جاتی ہے۔ عربی زبان میں ”کان“ آتا ہی وہاں ہے جہاں کوئی تصوراتی چیز محسوس شکل اختیار کر لے۔ یہ تو وہ عالم ہے جہاں کسی قاعدے اور قانون کا وہ پابند نہیں ہے، ہو ہی نہیں سکتا، قانون وہاں

① یہ اشارہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین نبی اکرم کی طرف ہے۔

چل ہی نہیں سکتا۔ قانون وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں Cause (سبب) سے Effect (نتیجہ) آتا ہے۔ وہ مقام ایسا ہے جہاں کوئی Cause (سبب) نہیں ہے، وہاں Effect (نتیجہ) ہے۔ اس نے کہا کہ تم صرف Cause (سبب) سے Effect (نتیجہ) سمجھ سکتے ہو اور وہ مقام ایسا ہے جہاں Cause (سبب) نہیں، Effect (نتیجہ) ہے۔ وہاں کے متعلق یہ سمجھ لو کہ وہاں تو یُحْكُمُ مَا يُرِيدُ (5:1) اور یَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (3:40) ہے اور جب وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے تو پھر خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (25:2) کا عمل ہے۔ یہاں آگئے۔ کہا کہ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2) پھر اس کے متعلق ہم قانون بنا دیتے ہیں کہ اب کوئی Cause (سبب) ظہور میں آئے یعنی Effect (نتیجہ) میں آئے بغیر نہیں رہے گا۔ قرآن کریم میں قدر ”ق در“ کا لفظ ہے قانون کا لفظ نہیں آیا اور یہ بڑی چیز ہے۔ بھلا قرآن کریم میں کون سی چیز بڑی نہیں ہے! سب بڑی ہیں۔ یہ جو ”ق در“ ہے اسی سے یہ قدر اور تقدیر ہے۔ عربی زبان میں اسی مادہ ”ق در“ سے تقدیر کا لفظ بنا ہے اور بڑا ہی غور طلب ہے۔

### بیج کی تقدیر

عزیزانِ من! یہ چیزیں زیادہ غور طلب ہیں۔ اتفاق سے سامنے آ گئی ہیں، بیان ہو جانی چاہئیں۔ جو شے بھی وجود میں آتی ہے وہ مکمل طور پر بنی بنائی نہیں ہوتی۔ جو بیج (Seed) ہے وہ بنا بنایا درخت نہیں ہوتا۔ اس میں درخت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے، درخت بھی اپنی تکمیل تک نہیں پہنچا۔ محض درخت بن جانا تو کوئی شے نہیں ہے۔ درخت میں پھل لگے گا۔ یہ جو پھل لگنا ہے، یہ بیج کا منتہی ہے یعنی بیج کے اندر یہ امکانی صلاحیت (Realizable Potentiality) رکھ دی گئی۔ اسے انگریزی میں Realizable Potentiality کہتے ہیں یہ Potential (صلاحیت) ان کی خصوصیات میری بیٹیاں سمجھیں گی جو طالب علم ہیں۔ یہ Potentialies (خصوصیات) Actualize (بارز) ہوتی چلی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنے انتہا پہنچ جاتی ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ آم کی گٹھلی کی انتہا یہ ہے کہ وہ آم کا پھل بن جائے۔ اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے آگے کچھ انتہا نہیں ہے۔ عربی زبان میں غور سے سنئے، عزیزانِ من! سارے مسئلہ حل ہو جاتے ہیں، یعنی وہ عرب اس پھل کو گٹھلی کی ”تقدیر“ کہتے تھے یعنی جو کچھ بننے کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے، اس کا وہ کچھ بن جانا یہ اس کی تقدیر کہلاتا ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ جب لفظوں کا استعمال بگڑتا ہے تو بات کیا سے کیا بن جاتی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں تقدیر کا لفظ کہاں بولا جاتا ہے یعنی جس میں نہ کوئی ہمارا دخل ہو نہ اختیار ہو نہ قاعدہ ہو نہ قانون ہو۔ ”تقدیر ہی ایہ ہو جی ہگی سی“ تقدیر پھٹے تقدیر اچ لکھیا ہووے گا، تامل جائے گا۔<sup>①</sup> ہم روز تقدیر کا لفظ بولتے ہیں۔ اس مقام پہ جہاں نہ کوئی قاعدہ نہ کوئی

① تقدیر ہی ایسی تھی، پھٹی تقدیر! اگر اس میں لکھا ہوگا تو مل جائے گا۔

قانون نہ یہ کیا بننا تھا کیا بن گیا، کچھ نہیں جو جیسے ہوا ہو گیا اور جو آگے کہا جائے کہ یہ کیسے ہو گیا تو وہ خدا کی مرضی۔ اب آپ سوچئے کہ یہ کیا ہوا اور کیا بنا!

### قرآن فہمی کے سلسلہ میں میرے لیے علامہ اقبالؒ کی راہنمائی

عزیزانِ من! قرآن کریم کے الفاظ پر جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) نے مجھے سمجھایا کہ قرآن حکیم محاورہ عرب کی رو سے کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآن سمجھا ہی اسی طرح جاسکتا ہے جو یہ پتہ چلے کہ مثلاً یہ قدر اور تقدیراً جو قرآن نے فَقْدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2) میں کہا ہے سے یہ سمجھا جائے کہ اس زمانے کا عرب اس لفظ سے سمجھتا کیا تھا۔ ان عربوں نے حضور ﷺ سے کہہ کر! سمجھا تو دیجئے کہ یہ فَقْدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2) میں آپ ﷺ نے کیا لفظ بول دیا۔ تقدیر تو ہم مانتے ہیں۔ ”جیہڑی مقدراج لکھی ہوئی ہوندی اے۔“<sup>①</sup> تو یہ کیا بات ہے؟ یہ لکھی ہوئی کیا چیز آپ کہہ رہے ہیں؟ حضور ﷺ سے کسی نے یہ نہیں پوچھا۔ یہ اس لیے کہ ان کی زبان میں یہ باتیں تھیں اور وہ انہیں ان معنوں میں روز بولتے تھے۔

قرآن اس صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے عزیزانِ من! جب یہ معلوم ہو کہ عرب ان الفاظ کا اس دور میں کیا مفہوم لیتے تھے۔ اس سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے کسی تفسیر کی ضرورت نہیں رہتی۔ تفسیروں کی ضرورت ہو تو کتاب مبین کیا ہوئی!! تفسیر ایک ہی تفسیر ہے: قرآن کی آیت کا مفہوم دوسری آیات کی روشنی میں۔ یہ خود قرآن نے بتایا ہے کہ میرے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے۔ اسی لفظ تقدیر کو لے لیجئے تو عزیزانِ من! ساتھ ساتھ میں کہتا چلا جاؤں تاکہ آپ احباب کو سمجھنے میں آسانیاں ہو جائیں۔

### لغات القرآن، مطالب الفرقان اور تبویب القرآن کی افادیت

میں نے اپنے لغات القرآن میں ان الفاظ کے معنی اس طرح سے متعین کر کے بتائے ہوئے ہیں کہ نزول قرآن کے زمانے میں عرب ان سے کیا مفہوم لیتے تھے اور اس کے بعد جو میں نے اب پھر یہ تفسیر کا سلسلہ شروع کیا تو قرآن نے خود کہا ہے تصریف آیات سے ہم اپنے معنی واضح کرتے ہیں۔ تصریف آیات کے معنی ہی ہوتے ہیں ”پھر پھر کے ان کو لانا“ مختلف مقامات پہ بیان کرنا۔“ مطالب الفرقان مرتب ہی میں نے اس طرح سے کیا ہے اور اس کے بعد آپ احباب کی سہولت کے لیے تبویب القرآن بھی اب شائع ہو گئی ہے۔ کسی ایک لفظ کے متعلق یا قرآن کے ایک تصور کے متعلق اس میں میں نے وہ سارے قرآن کے حوالے دے دیئے ہیں کہ کہاں

① جو قسمت میں لکھی ہوتی ہے:

چاہے تم پاؤں گھسویا کہ رکھو سر بسجود  
بات پیشانی کی جو ہے سو پیش آتی ہے

کہاں یہ لفظ آیا ہے۔ دیکھ لیجیے ان حوالوں کو لغات سے ابتدائی مفہوم ذہن میں لے آئیے تبویب سے یہ دیکھیے کہ قرآن کے کس کس مقام پر یہ لفظ آیا ہے وہ آیات اکٹھی کر لیجیے بنیادی معنی وہاں سے لے لیجیے قرآن واضح ہو جاتا ہے۔

### تقدیر کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن میں ہے کہ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2) یہ قدر یہ تقدیر بھی یہ ہے کہ جہاں اس نے تکمیل تک انتہا تک پہنچنا ہے وہاں تک پہنچ کے بننا ہے جو کچھ بننے کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا۔ وہ یونہی نہیں بنتی۔ اس کے لیے قدرہ ہے۔ اس کے لیے قاعدے مقرر ہیں، قانون مقرر ہے۔ ان قاعدوں کے مطابق اگر یہ چلی جائے گی تو یہ اپنی تقدیر تک پہنچ جائے گی۔ عجیب چیز ہے کہ انگریزی زبان میں ایک لفظ آیا۔ میں نے دیکھا کہ کہاں ان کی نگاہ پہنچتی ہے۔ یہ بن جائے گی تقدیر۔ انگریزی میں اس کو Destination کہیں گے۔ اس کا آخری مقام جہاں پہنچنا ہے یعنی منزلِ اخروی، آخری منزل اور آپ کو معلوم ہے کہ وہاں انہوں نے Destiny کا لفظ لیا ہے اور اس کے معنی مقدر یا قسمت کے لیے ہیں۔ Destination سے Destiny وہ تو لے آئے اور ہم تو جن کے ہاں یہ لفظ اس معنی میں آیا تھا، ہم نے کبھی اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال ہی نہیں کیا۔ ہم جب Destiny کہیں گے تو ہمارے نزدیک بھی وہی تقدیر ہوگی: ”جیہڑا متھے دا لکھیا ہو یا پھٹ پیندا اے ہن۔“<sup>1</sup> ان کے ہاں بھی Destiny کا لفظ Faith کے ہی معنی میں آتا ہے۔ یہ بھی بھول گئے کہ یہ اصل میں Destination ہے۔ اس لیے کہ ان کے ذہن میں یہ تصور ہی نہیں تھا کہ یہ خدا کا قانون کیا ہے: فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2) اس کی تقدیر کے لیے ہم نے پیمانے، اوزان، معیار، قانون مقرر کر دیئے ہیں۔ اس کی تقدیر کے لیے یعنی جو کچھ اس کا انتہا میں پہنچ کر بننا مقصود ہے اس کے لیے قانون مقرر کر دیئے ہیں۔ یہ ہیں فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2)۔

### الذی خلق فسویٰ کا مفہوم

دوسری جگہ ایک آیت میں یہ آیا ہے کہ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى (87:2)۔ جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن یعنی یہ جی چاہتا ہے کہ قرآن کی یہ آیتیں آئیں، فرصت ہو، نصاب کی بات ہو، تو پھر میں عرض کروں کہ قرآن یہ کیا کہہ گیا: الَّذِي خَلَقَ (87:2)۔ میں نے کہا ہے کہ خلق کے معنی ہوتے ہیں مختلف چیزوں کو اکٹھا کر کے ایک نئی چیز بنادینا، ہائیڈروجن اور آکسیجن کو یوں جمع کر کے پانی بنا دینا لیکن ہائیڈروجن اور آکسیجن خاص Proportion (تناسب) سے ملے گی تو پانی کا قطرہ بنے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ آپ اتنی ہائیڈروجن

1 جو پیشانی میں لکھا ہوتا ہے وہی پیش آتا ہے۔

لے لیں اور آکسیجن، جتنی جی چاہے لے لیں، ان کو ملا دیں، تو وہ پانی کا گلاس بن جائے، بالکل نہیں۔ اس میں سے جتنی وہ آپ کے ہاں مقدر میں پڑی ہوئی ہے، اس میں سے تراش کر اس Proportion (تناسب) کے مطابق دو چیزوں کو آپ لیں گے، تو پھر بنے گی تیسری چیز۔ یہاں (87:2) میں کہا کہ تراش کے الگ کیا اور ان کی جو Proportion (تناسب) تھی، وہ قائم کی۔ یہ فسویٰ ہے۔ یہاں تو ہمارے ہاں اب ”چک جنوں کیندے سن“<sup>1</sup> ہے ہی نہیں، اور کمہار جو چاک کے اوپر رکھ کے کرتے تھے، نئی نسل والے ہمارے بچوں نے وہ چاک دیکھا ہی نہیں ہوگا۔ وہ بہت بڑا پیہہ گھماتے تھے تو وہ کرتا کیا تھا؟ مٹی گوندھی ہوئی رکھی ہوتی تھی، وہ اتنا سادہ سادہ مٹی کا تھوبہ سا، لے کے اس کے اوپر رکھ دیتا تھا۔ پھر اس کے بعد اس میں سے ادھر ادھر سے گھماتے گھماتے وہ پھیلتا جاتا تھا، اس کی زائد مٹی کو پھیلتا بھی جاتا تھا اور کچھ وہ انگوٹھوں انگلیوں سے یوں یوں بھی کرتا چلا جاتا تھا۔ وہ جتنی زائد مٹی ہوتی تھی، وہ ساری چھیل کر اسی مٹی کے تھوبے میں سے کبھی لوٹا بنا دیتا تھا، کبھی پرات بن جاتی تھی، کبھی صراحی بنا دیتا تھا، کبھی پیالہ بنا دیتا تھا۔ وہی مٹی ہوتی تھی۔ وہ کیا کرتا تھا: فَسَوٰی (87:2)۔ یہ کرنے کے بعد وہ ایک شکل اختیار کرتی تھی۔ یہ ہے خَلَقَ فَسَوٰی (87:2)۔ یہ خلق ہے۔ اس سے اخلاق کا لفظ آپ کے ہاں آیا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں انسانی قوتوں میں صحیح Proportion (تناسب) پیدا ہو جانا، صحیح توازن پیدا ہو جانا۔ عربوں کی یہ قوم کیا بلا تھی! اخلاق نام ہی اس کا ہے کہ کوئی انسانی صلاحیت یا اس کی قدرت یا اس کا اختیار اپنی ذات سے بڑھا ہوا ہو تو وہ اخلاق کے خلاف ہے، گھٹا ہوا ہو تو اخلاق کے خلاف ہے، حمیت میں ضرورت سے زیادہ تیزی آجائے، تو غصہ ہو جاتا ہے، کمی ہو تو کمزوری ہو جاتی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ خَلَقَ فَسَوٰی ۝ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ (87:2-3)۔ پھر اس کے بعد اس نے اس کے لیے قوانین مقرر کر دیئے: فَهَدٰی (87:2) پھر اس کی راہنمائی کر دی کہ تم اس راستے پہ چل کے اپنی تقدیر تک پہنچو۔ چار لفظوں میں یہ سب کچھ بتا دیا۔<sup>2</sup>

### ذاتِ خداوندی اپنے آپ کو از خود پابند کرتی ہے

عزیزانِ من! ساری بات کر دی کہ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (25:2) کائنات میں وہ سارا اقتدار و اختیار اس کا ہے۔ جو اتنا بڑا صاحبِ اقتدار ہے، اس پر کسی پابندی کا سوال ہی عائد نہیں ہوتا اس لیے قرآن نے کہا کہ وَلَمْ یَكُنْ لَهُ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْكِ (25:2) اس کے اقتدار میں کوئی شریک ہی نہیں ہے، تو اس میں کون ہے جو پابندیاں عائد کرے گا۔ اس نے کہا کہ ہم تو کوئی اور

<sup>1</sup> جسے چاک کہتے تھے۔

<sup>2</sup> اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، پارہ 30 (مکمل): (سورۃ الاعلیٰ) ادارہ طلوع اسلام

پابندی عائد نہیں کر سکتے البتہ ہم نے اپنے آپ یہ خود کچھ پابندیاں عائد کر لی ہوئی ہیں۔ میں اس کے لیے لفظ یہی استعمال کروں گا۔ بڑے ہی جگرے کی ضرورت ہے کہ بے پناہ اختیارات ہوں اور پھر اپنے اوپر وہ پابندیاں عائد کر لے۔ مثلاً کہا کہ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12)۔ کتب عربی زبان میں کہتے ہی یہ ہیں جہاں کوئی قانونی پابندی کسی کے اوپر عائد کی گئی ہو۔ اسی طرح کَتَبَ عَلَیْکُمْ الصِّیَامُ (2:138) اور کَتَبَ عَلَیْکُمْ الْقِتَالَ (2:216) میں یہ لفظ کتب ہے۔ اس کتب سے مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ چیز مقرر کی گئی ہے پابندی عائد کی گئی۔ وہاں تو یہ ہے کہ عائد کی گئی تو کسی دوسرے کی طرف سے عائد کی گئی ہے۔ یہاں اپنے متعلق یہی لفظ ہے کہ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) ہم نے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر دی کہ جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے ان کا سامان نشوونما بھی ہم دیں گے ہم نے یہ پابندی اپنے اوپر عائد کر لی یا اللہ! اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ عزیزانِ من! کوئی دوسرا کسی پر پابندی عائد کرے تو وہ اس کی حکومت ہو جاتی ہے جو اپنے اوپر خود کوئی پابندی عائد کر لے تو یہ تو بہت بڑا شرف انسانیت ہے۔ اسی کو تو با اصول آدمی کہتے ہیں۔ میرا یہ اصول ہے بھی! کسی تھانیدار نے اس کو حکم نہیں دیا ہوا کہ صبح پانچ بجے اٹھ کے اس بستر میں سے نکل کے تین میل چلو پھر واپس آؤ۔ وہ خود اپنی صحت کی خاطر اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لیتا ہے اسی لیے یہ ہے کہ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) اور حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47) مومنین کی مدد کرنا ہم پر فرض ہو جاتا ہے۔ یا اللہ! کیا خدا ہے یہ اور لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (3:9) یہ جو ہم اپنے اوپر پابندی عائد کر لیتے ہیں اس کی خلاف ورزی ہم کبھی نہیں کرتے۔

انسانی دنیا کی طرف آئیے۔ ہم اپنے متعلق تو یہ کیفیت کبھی نہیں کریں گے لیکن خدا کہتا ہے کہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (33:62)۔ جو ہم نے اپنے اوپر یہ پابندی کر کے اپنے لیے ایک روش متعین کی ہے اس میں تم کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ معاف رکھیے گا کہ الفاظ یوں ہو گئے کہ اس کے اختیارات ہی سلب ہو گئے اس کی آزادی ہی سلب ہو گئی وہ ان چیزوں کا پابند ہو گیا اور ایسا پابند کہ وہ کبھی اس کی خلاف ورزی کرتا ہی نہیں ہے۔ یعنی ہم کہیں گے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرتا نہیں ہے جو اس نے کہا ہے۔ اب اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خارجی کائنات کے متعلق بھی تو اس نے یہ کہا کہ لِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ <sup>①</sup> (16:49) پہلی چیز تو یہ حکومت کی ہے نہیں اس کا اختیار نہیں ہے کہ اس کی خلاف ورزی کر سکیں۔ پہلے حصے میں تو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے یہ خدا سے الگ ہو گئیں۔ اس نے ان کے اوپر پابندی عائد کی کسی دوسرے نے عائد نہیں کی۔ جو دوسرا حصہ ہے کہ یہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے اس خلاف ورزی نہ کرنے میں تو یہ دونوں برابر ہو گئے۔ تیسری چیز اس کائنات میں انسان ہے۔

① کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے قوانین کے سامنے مجبور ہے۔



## اقدار کے سلسلہ میں حضرت انسان کی عملی کیفیت

عزیزانِ من! تیسری چیز یہ ہے کہ اس کائنات میں انسان ہے۔ ایک خالق ہے ایک خارجی کائنات کی اشیاء ہیں۔ ایک یہ حضرت صاحب ہے یعنی یہ انسان۔ انسان کو اس نے صاحب اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ جس طرح اس نے خارجی کائنات کے متعلق قوانین مقرر کیے، اس کے لیے بھی قانون مقرر کیے لیکن وہاں (خارجی کائنات میں) انہیں اجازت نہیں ہے کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکیں۔ یہاں خارجی کائنات اور خدا جو ہے جیسے اس نے کہا کہ ہم بھی خلاف ورزی نہیں کریں گے تو دونوں ایک ہو گئے۔ یہ جو اس نے اپنے اوپر پابندی عائد کی تھی اس کے متعلق تو کہا ہے کہ ہم اس کی خلاف ورزی کبھی نہیں کریں گے۔ انسانوں کے اوپر پابندی عائد نہیں کی صرف یہ بتایا کہ یہ ہیں وہ قوانین جو ہم نے تمہارے لیے وضع کیے ہیں یا اختیار کیے ہیں یاد دہانی ہے۔ اس بتانے کے بعد کہا کہ اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (41:40) تمہارا جو جی آئے، تم اس کے مطابق عمل کرو یعنی وہاں عالم امر میں تو مشیت ہماری تھی یَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (3:40) وہاں ہماری مشیت تھی جیسا ہم جی چاہتے تھے کرتے تھے یہاں اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (41:40) اب تمہاری مشیت ہے جیسے تم جی چاہو کرو، ہم دخل نہیں دیں گے۔ معاف رکھیے گا اس معنی میں انسان خدا سے ایک قدم آگے چلا گیا، اس کے اوپر خود کوئی پابندیاں عائد نہیں ہوئیں پابندیوں کا بتا دینا یعنی قانون کی کتاب دے دینا، اور قانون کسی کے اوپر جبراً لگانا، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ قانون کی کتاب دے دی اور اپنے متعلق اس نے کہا کہ ہم نے جو اپنے اوپر پابندی عائد کی ہے اب ہماری آزادی (معاف رکھیے گا) سلب ہو گئی۔ ہم اس کے خلاف نہیں کرتے، اسے (انسان کو) کہا کہ تمہارا جو جی آئے کرو، ہم اس میں دخل ہی نہیں دیں گے۔ تو صاحب اختیار تو یہ ہوا، عزیزانِ من! مناظرے اور مباحثے کیا کرنے ہیں۔ کہیے اقوامِ عالم میں اہل مذاہب ہی کو نہیں، اہل دانش کو بھی کہیے، سائنسٹ کو بھی کہیے، مفکرین کو بھی کہیے کہ خدا کا یہ تصور کہیں اور سے لاکے بتا دے۔ یہ ہے قرآن کی انفرادیت کہ اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (41:40) تمہارا جو جی آئے، تم اس کے مطابق عمل کرو۔

## انسانی اعمال کے نتائج کو بدلنا انسان کے اختیارات سے باہر ہے

لیکن آگے ایک بات کہی جہاں پھر انہیں جکڑ لیا۔ کہا یہ کہ تمہاری مشیت پہ منحصر ہے کہ یہ ہے مصری کی ڈلی، یہ ہے سنکھیے کی ڈلی، جو تمہارے جی میں آئے اُس کو اٹھا کے کھاؤ، ہم دخل نہیں دیں گے، لیکن جب کھا چکو گے تو سنکھیے کی تاثیر کا بدل دینا تمہارے اختیار میں نہیں رہے گا۔ کیا الفاظ ہیں: اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (41:40) جو تمہارا جی چاہے کرو اِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (41:40) لیکن ہم پھر دیکھتے ہیں کہ جو تم کرتے ہو اس کا وہ نتیجہ نکلے گا، تم اسے نہیں بدل سکتے۔ اب انسان کا اختیار یہاں تک ہوا، یہ آگے نہیں ہوا کہ کھائے سکھیا،

تاثير مصرى كى هو يه نهىس هوسكتا۔ يهاں تك تو تم صاحب اختيار هو كه جى چا هے سكها كهاؤ، جى چا هے مصرى كهاؤ ليكن اكل بات جو هے كيا بات هے ان الفاظ كى! كها كه اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (41:40) ساآه موج هوكل راول عيش لكها هے۔ لكها هے كه اَنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (41:40) پهر هم كرتے كيا هیں؟ همارا قانون كيا كرتا هے؟ وه كهتا هے كه جس راستے پتم چلتے هو، وهاں هم دخل نهىس ديتے كه تم ادھر مڑتے هو يا ادھر مڑتے هو۔ جدھر جى چا هے مڑ جاؤ ليكن اس مڑنے كے بعد پهر همارا قانون مكافات تمهارے پچھے لك جاتا هے وه نهىس چھوڑتا۔ جو راسته تم نے اپنے ليے اختيار كيا هے وه راسته جس منزل كى طرف جاتا هے وه هم نے مقرر كى هوئى هے۔ اب يه تمهارے اختيار كى بات نهىس هے۔ راسته تو تم نے اختيار كر ليا، يه نهىس كه چلو تم اس سمت كو، پنچ جاؤ تم كهیں دوسرى طرف يه بات نهىس هے۔ آج كى اصطلاح ميں هم يه كهیں گے كه جى! يه تو انسان كے بس ميں هے كه وه كيا Initiative ليتا هے يعنى ابتدا يه كرتا هے جيسا بهى اپنے ليے كرے ابتدا صرف يه كرتا هے اور جب ابتدا كر ليتا هے تو پهر اس كے ليے جو تقدير مقرر هے اس كے ليے جو منزل مقرر هے اس كا جو نتيجه مقرر هے اس كى طرف سه اس ميں تبديلى نهىس هوسكتى۔

سنه! خدا پهر اس باب ميں كيا كهتا هے۔ قوم بنى اسرائيل كا قصه چلا آر هائے۔ ان كو هدايات ديں ان كو هم نے راهنمائى دي ان كو قانون بتائے رسول آئے سب كچه هوا وه چلے ايك راستے پ۔ اس راستے كى خوشگوارياں ان كے حصے ميں آئیں سعادات آئیں بركات آئیں ملك عظيم ملا شوكت سليمانى ملى، حشمت داؤدى ملى۔ يه سارا كچه بهى هے۔ كها كه فَلَمَّا زَاغُوا (61:5)۔ اب يه ان كے اختيار كى بات هے۔ جب وه ٹيڑھے هو گئے يعنى پهلے وه هوئے هیں جب وه غلط راستے كى طرف چلے ٹيڑھا اس كے معنى هوتا هے سيدھے راستے كو چھوڑ كے جب خود وه ٹيڑھے هو گئے تو زَاغُوا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ (61:5) خدا نے ان كے دلوں كو ٹيڑھا كر ديا۔ يه پچھے پچھے هے۔ جب تم ٹيڑھے هو گئے كهنے كى بات هے تو هم نے تمهارے دلوں كو ٹيڑھا كر ديا۔ يعنى يه نهىس هے كه هم نے تمهارے دلوں كو ٹيڑھا كر ديا اس ليے تم ٹيڑھے هو گئے۔ همارے هاں تقدير كے يه معنى هیں كه يه سب خدا كرتا هے صاحب! آپ نے ديكا كه تقدير كے تصور يا معنى يا مفهوم بدلنے سه بات كهًاں سه كهًاں چلى گئى۔ وه كهتا هے كه جب يعنى يه اختيار انسان كا هے Initiative اس كى هے فَلَمَّا زَاغُوا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ (61:5) جب تم نے كج روى اختيار كى خدا كے قانون كے مطابق تمهارے قلوب ٹيڑھے هو گئے۔ تم نے جب يه كيا تو اگر يه نه كرتے تو وه يه كرتا هى نهىس ليكن جب تم نے يه كيا تو پهر اس كے بدلنے كا اختيار تمهارے پاس نهىس هے۔ يه هے وه اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (41:40)۔ يه بڑے اهم مقامات هیں۔

## خدا تعالیٰ انسانی عمل کے ذریعے اپنی مدد کا متمنی ہے

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں یہ چیزیں آئی ہیں۔ میں نے تو یہاں چند ایک کا حوالہ دیا ہے۔ میری کتاب ”کتاب التقدير“ ہے، اس میں آپ اس کے بہت سے حوالے دیکھیں گے، بہت سے حوالے ہیں حتیٰ کہ وہ جو کہا تھا کہ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47) ہم نے جماعتِ مومنین کی نصرتِ مدد دینے کا اپنے اوپر فرض عائد کر لیا ہے، تو پھر مومنین جو ہیں ان کو تو خوش ہو جانا چاہیے کہ بس مومن ہوئے اور خدا نے اپنے اوپر فرض عائد کر لیا ہے اور اس کی خلاف ورزی وہ کرتا نہیں ہے تو پھر راوی عیش لکھتا ہے کہ ملتا چلا جائے گا۔ کہنے لگا کہ نہیں، ذرا تھوڑی سی بات اس میں اور Add کر لو۔ جی فرمائیے: اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ (47:7) اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ کیا بات ہے! وہی پھر Initiative۔ خدا کی مدد کے معنی یہی ہیں کہ دین خداوندی کو قائم کرنے کے لیے اگر تم کوشش کرو گے تو پھر ہم تمہاری مدد کریں گے۔ وہ بھی اپنے مقام پہ ٹھیک ہے کہ ہم نے اپنے اوپر فرض اور واجب قرار دے دیا ہے تمہاری مدد کرنا لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ پہلے تم ہماری مدد کے لیے اٹھو، تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ معنی کیا ہوئے؟ کہ جس قسم کے تم ہو جاؤ گے یا کرو گے، اسی قسم کا ہمارا قانون تم پر لاگو ہو جائے گا۔ سنبھال کھاؤ گے تو قانونِ ہلاکت کے تابع آ جاؤ گے، پانی پیو گے تو وہ مدحیات ہوتا ہے۔ اس لیے زندگی بخشنے والے قانون کے تابع آ جاؤ گے وہ قانون تم پہ لاگو ہو جائے گا۔ اب بات یوں ہو گئی کہ جو طریق، روش، عمل تم اختیار کرو گے، اس کے مطابق تم پہ وہ قانون لاگو ہو جائے گا اور اس کے ذریعے سے جس مقام تک تم پہنچو گے وہ تمہاری تقدیر ہوگی۔ قرآن کہتا ہے کہ فَهْدَىٰ (87:3) راستہ اس نے بتایا ہوا ہے۔ سائن پوسٹ (نشانِ راہ) اس نے لگا دیئے ہوئے ہیں: یہ راستہ ادھر جاتا ہے، یہ ادھر جاتا ہے۔ جس منزل تک بھی ہم پہنچنا چاہیں وہ راستہ اختیار کر لیں۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ”تقدیر کے تو معنی یہ آخری منزل ہیں جہاں تک کسی شے نے پہنچنا ہے“۔ اس کا یہ انتخاب ہم کریں گے اس کے مطابق راستے پہ چلو یعنی راستے کا ہم انتخاب کریں گے۔ اس نے بتا دیا تھا کہ یہ راستہ ادھر جاتا ہے، وہ ادھر جاتا ہے جو راستہ ہم اختیار کریں گے اس کے مطابق پھر یہ الفاظ ہیں: اس کے مطابق ہم پہ قانون لاگو ہو جائے گا اور اس کے مطابق تمہاری آخری منزل یا تقدیر متعین ہوگی۔ وہاں تم پہنچ کے رہو گے۔ سنبھال کھاؤ گے تو اس کی آخری منزل ہلاکت ہے، وہاں پہنچ کے رہو گے۔ مصری کھاؤ گے خوشگواریاں حاصل ہو جائیں گی۔ یہ اقبالؒ (1877-1938) جسے قرآن نے بصیرت عطا کی تھی اور اسے کہنے کا بھی حسین طریق آ گیا تھا اس نے کیا خوب کہا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے ہاں تو پھر وہی فارسی آ جاتی ہے اردو کے لیے بھی ہمیں کہا جاتا ہے کہ صاحب! اس کا

بھی ترجمہ کیجیے۔ ”اودھ اردو داتا ترجمہ پنجابی انچ کرو تے اے کیندے نے جی اک لفظ وی سمجھ نہیں اؤندا۔“<sup>1</sup> ہماری اگلی نسل، عزیزانِ من! گوئی ہو گئی ہے۔ اس کے پاس زبان ہی کوئی نہیں رہی مجھے دکھ ہوتا ہے۔ کہنے کو تو یہ ہے کہ ہم نے مغرب کی بڑی تقلید کی ہے، ان کے ہاں تو انگریزی بھی نہیں رہی، اچھے سے اچھے پڑھے لکھے سے کہیے کہ چار فقرے لکھ کے بتائے! خیر فارسی میں ہی ہے لیکن پوچھو نہیں، اقبالؒ (1877-1938ء) کیا بات کہہ جاتا ہے!

### لفظ تقدیر کی کیفیت اقبالؒ کی زبانی سنئے

حرفِ باریکش بہ رمزِ مضمّر است

بات بڑی گہرائی کی ہے۔ تقدیر کے متعلق اشارے میں ہی کہی جاسکتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ

تُو اگر دیگر شوی او دیگر است

تُو کچھ اور ہو جائے، وہ اور ہو جائے: تُو اگر دیگر شوی او دیگر است۔ یہ وہی ہے جسے انگریزی میں Initiative کہا گیا ہے۔ اگر تم یہ ہو جاؤ، تمہاری تقدیر وہ ہو جائے گی۔ اب وہ اشاروں میں یا مثالوں سے سمجھاتا ہے:

خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا

سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

غبار بن جا، تمہیں ہوا اڑائے اڑائے پھرے گی، کوئی مقام ہی کہیں نہیں ہوگا، تمہارا ثبات ہی نہیں ہوگا، استحکام ہی نصیب نہیں ہوگا، تم اگر یہ ہو جاؤ گے۔ پتھر بن جاؤ۔ اسے ہر کچی چیز کے اوپر مارو گے تو وہ کچی چیز ٹوٹ جائے گی، تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ پتھر ہو جاؤ، ہم نہ تمہیں غبار بنائیں گے، ہم نہ تمہیں سنگ بنائیں گے۔ یہ کچھ ہو جانے کی صلاحیتیں (Potentialities) تمہارے اندر موجود ہیں۔ تم چاہو تو غبار بھی رہ سکتے ہو، تم چاہو تو پتھر بھی ہو سکتے ہو۔

شبِ نیمی؟ اختِ دگی تقدیرِ تست

شبِ نیم ہو جاؤ گے تو زمین پہ گرنا تمہاری تقدیر ہو جائے گی

قلزمی! پائندگی تقدیرِ تست

سمندر بن جاؤ گے تو ہمیشگی تمہاری تقدیر ہو جائے گی۔ کہا کہ

گرزیک تقدیرِ خوں گردد جگر

غلظ روی سے ایک راستے پہ چلے، اور وہ جو ہلاکت کی تقدیر ہے وہ سامنے آگئی تو یہ چیز تو واقعی بڑی سوزِ جگر کا موجب بن گئی: ہلاکت سامنے آگئی۔

1 اگر اس اردو کا ترجمہ پنجابی میں کریں تو کہتے ہیں کہ اس کا ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا۔

کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں ہے:

خواہ از حق حکم تقدیر دگر <sup>①</sup>

اودوسری تقدیر مانگتے ہو

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست

زانکہ تقدیرات حق لا انتہاست <sup>①</sup>

تو اگر اس کے بعد کہے گا کہ نہیں میں کوئی دوسری منزل چاہتا ہوں۔ دوسری منزل اختیار کر لو۔ جتنا جی چاہے منزلیں مانگتے چلے جاؤ، اختیار کرتے چلے جاؤ، لا انتہا ہیں۔ اس کے قوانین کو بدلتے جاؤ، تقدیر تمہاری جتنی بھی ہے وہ بدلتی جائے گی۔ کیا بات ہے!

### تقدیر کے سلسلہ میں حضرت عمر ♦ کی مثال

تقدیر کو سمجھنے والے حضرت عمر ♦ (584-644/45ء) کو دیکھیے۔ وہ ♦ اس لشکر کی خبر لینے کے لیے گئے جو باہر ایران کی سرحد پہ ایک مقام پہ چلا گیا تھا۔ وہاں گئے تو وہاں طاعون پھوٹ پڑی، تو آپ ♦ نے فوراً اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ جلدی یہاں سے نکل چلو۔ اس مقام پہ چلے چلو جہاں طاعون نہیں ہے۔ وہاں کسی نے <sup>②</sup> پوچھا، ان کے ذہن میں تقدیر کا وہ پہلا مسئلہ تھا کہ تقدیریں لکھی ہوئی ہوتی ہیں، بدل نہیں سکتیں۔ اس نے کہا کہ آپ ♦ خدا کی تقدیر سے بھاگ رہے <sup>③</sup> ہیں؟ کیا بات ہے ان لوگوں کی! جواب ملاحظہ کیجیے: کہا کہ ہاں، خدا کی تقدیر سے، خدا ہی کی تقدیر کی طرف بھاگ رہا ہوں <sup>④</sup>۔ سنو! تقدیر یہ ہے کہ طاعون زدہ حصے میں جاؤ گے تو Infection (آلودگی) ہو جائے گی، طاعون ہو جائے گا، دوسری تقدیر یہ ہے کہ اگر اس جگہ چلے جاؤ جہاں یہ نہیں ہے تو اس Infection (آلودگی) سے تم محفوظ رہو گے۔ یہ بھی خدا ہی کی تقدیر ہے، وہ بھی خدا ہی کی تقدیر ہے، تو میں کوئی اپنی تقدیر تو نہیں بنا رہا، خدا کی ایک تقدیر سے خدا ہی کی دوسری تقدیر کی طرف بھاگ رہا ہوں۔ ان سے قرآن سمجھیے، عزیزانِ من!

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست

زانکہ تقدیرات حق لا انتہاست <sup>①</sup>

① اقبالؒ (1877-1938ء) کے ان تمام اشعار اور تقدیر کے مفہوم کے لیے دیکھیے: پرویز: کتاب النقد، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) لاہور، 1986ء، ص

ص-60۳57

② یہ اشارہ حضرت ابو عبیدہؓ کی طرف ہے۔

③ افراد من قدر اللہ۔ کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟

④ نعم۔ افر من قضاء اللہ الی قضاء اللہ۔ ہاں میں خدا کی (ایک) تقدیر سے بھاگ کر (دوسری) تقدیر کی طرف جانا چاہتا ہوں۔

اور اس قدر اس نے انسان کو اس معاملے میں اختیار و ارادے والا بنایا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ دخل نہیں دیتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11) جب تک کوئی قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتی، خدا بھی اس کی حالت کو نہیں بدلتا۔ بدل تو سکتا ہے صاحب اختیار ہے اس نے شروع میں لہٰ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (25:2) کہا ہے مگر یہاں جو آغاز کار ہے جو Initiative ہے وہ تو انسان کے پاس ہے۔ جی تو یہ چیز کبھی قوم ہو جب بھی یہ چیز کبھی کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر داخلی تبدیلی نہیں کر لیتی خدا بھی اس کے حالات میں تغیر نہیں پیدا کرتا۔

### بے عملی کی دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں

عزیزانِ من! دیکھ لیا آپ نے، پچیس تیس برس سے، حرمِ کعبہ کے اندر لاکھوں کی تعداد میں، جبلِ رحمت کے تابع، رور و کر، گرگڑا کر حاجی، جن کے متعلق کہا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتے ہیں، اس حالت میں مقدس سرزمین پہ ایسے خشوع و خضوع سے دعائیں کر رہے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کی توپوں میں کیڑے پڑیں، اس کو تباہ کر دے، برباد کر دے مگر وہ ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ کیوں نہیں آرہی؟ اسے کہتے ہیں کہ تو کرتا جا: ”تہاڈے پیو دانو کر لگا ہویا ہیگا اے“<sup>①</sup> یعنی آپ انسان کی کیفیت سن لیں۔ ”ذرا جتنا پھوڑا نکلا اویا یا اللہ! بڑی پیڑ ہوندی اے۔ تو آرام دے دے۔ جو کم ہیگا جناب۔ یا اللہ! تو کر دے تے فیروا کر دیندا ہیگا اے؟“<sup>②</sup> لگے ہوئے ہیں پچیس تیس برس سے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں نہیں ہوتا۔ انہوں نے خدا ہی کے اس اٹل فیصلے کو نظر انداز کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ (13:11)۔ کہتے جاؤ، مانگتے جاؤ دعائیں، گرگڑاتے جاؤ، روتے جاؤ، ہماری تو شرط یہ ہے کہ اپنے اندر داخلی تبدیلی پیدا کرو، خود قوم کے اندر تبدیلی پیدا کرو، تو پھر باہر بھی تبدیلی ہوگی، نہیں پیدا کرو گے تو مانگتے جاؤ دعائیں، دعا تو یہ ہے کہ ہم وہ نہیں کریں اور تو وہ کر دے۔ آپ سوچتے ہیں کہ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ وہ بڑا ”ڈاڈا“ ہے۔ ڈاڈا کیا ہوتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ جو قانون کا خدا ہے اسے ایسا ڈاڈا ہونا چاہیے۔ اگر وہ میرے گرگڑانے پہ میرے حق میں فیصلہ کرنے لگ گیا، مقدمہ ہودو کے درمیان ہائی کورٹ میں گیا ہوا ہو، کل ہو وہ پیشی ادھر مدعی ہے، وہ دعائیں کرتا ہے کہ یا اللہ! میرے حق میں کامیابی عطا کر دے۔ جناب! وہ وہاں مدعا علیہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یا اللہ! میرے حق میں کامیابی دے دے، میں مصیبت اچ پھنس گیا۔ اواگاں ودھیا۔ ایسے کہیا: بے مینوں کامیابی ہوگئی تے میں سونفل پڑھاں گا۔ اوکیندا اے: میں دوسونفل پڑھاں گا۔ اے کیندا: میں تیرے نیاز دیاں گا، یارہ دیگاں دیاں گا۔ اوکیندا:

① یہ تہارے باپ کا نوکر لگا ہوا ہے۔

② ذرا سا پھوڑا نکلا (دعائیں مانگتے ہیں کہ) یا اللہ! بڑی تکلیف واذیت ہے تو آرام فرما دے۔ جو بھی کام ہوتا ہے (کہتے ہیں کہ) یا اللہ! تو آرام عطا فرما۔ تو کیا پھر وہ آرام عطا کر دیتا ہے؟

اے میں اٹھو نجا دیگا دیاں گا۔ اودواں نوں فیر کی وکھوندا اے؟<sup>①</sup>

خدا اپنے اہل قوانین کو کبھی نہیں بدلتا

میں تو جب ان الفاظ پہ غور کرتا ہوں، خاص طور پر جب ان پر تو سمجھ جاتا ہوں کہ یہ یقینی بات ہے کہ یاد رکھو! إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ (13:11) خدا اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (13:11) تاکہ وہ اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کر لے اور جب اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لے تو اس نے کہا ہے کہ ہم نے اپنے اوپر واجب قرار دیدیا ہے کہ تمہاری حالت میں تبدیلی پیدا کر دیں یعنی یہ انسان خدا کو (معاف رکھیے گا الفاظ یہی ہیں) اس طرح مجبور کر سکتا ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق وہ کرے، قانون کا مالک ہے اس کا قانون ہے کہ آگ پانی کو کھولا دے گی، آگ جلانے، کیتلی اس کے اوپر رکھ کے آپ جو جی میں آئے، کام کرتے پھریں۔ مجبور ہو گیا ہے اس کا قانون کہ اس کے پانی کو کھولا کے اس کے لیے چائے پکائے۔ اور اگر یہ آگ نہ جلانے اور کیتلی رکھ دے تے نفل پڑھنے شروع کر دے تے فیر پی لوے گرم گرم؟<sup>②</sup> یہ تو ہوا کہ یہ نہ کرے۔

وجود کائنات کا یہ سارا سلسلہ تقدیر کے مستحکم ہونے پر ہی موقوف ہے

اگلی بات کی عزیزان من! کہ یہ آگ بھی جلا دے اور کیتلی بھی رکھ دے، گھنٹا بھر تک اوپر رکھی بھی رہے اور پانی ویسے ٹھنڈے کا ٹھنڈا رہے تو نظام کائنات بگڑ جائے گا۔ کیا ہوا؟ جس نے یہ قانون بنایا تھا کہ آگ اس طرح پانی کو گرم کر دے گی، اس نے دخل دیدیا، آگ کو کہہ دیا کہ پانی کو گرم نہ کرنا۔ اگر وہ یہ کرنا شروع کر دے، تو کائنات تو چل ہی قانون پر رہی ہے۔ یہاں کہا کہ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2)۔ اور پھر ہم بدلنے نہیں۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچائے، پانی کی تقدیر یہ ہے کہ جب وہ 100 ڈگری سنٹی گریڈ پہ پہنچے تو ابلا شروع ہو جائے۔ چاول کی تقدیر یہ ہے کہ اس میں جب وہ ڈالا جائے تو وہ پکنا شروع ہو جائے۔ اسے ہم نہیں بدلتے لیکن نہ ہم بغیر آگ جلانے ہوئے تمہارا پانی اُبلاتے ہیں نہ اس میں چاول ڈالے ہوئے ”تہاڈی کھیر پکاوندے ہیگے“<sup>③</sup> نہ اس کے کھائے بغیر تمہاری بھوک مٹاتے ہیں لیکن جب تم کھا لیتے ہو تو پھر تم ہمارے قانون کو مجبور کر دیتے ہو کہ تمہاری بھوک مٹا دے۔ اف! کیا کہوں؟

① میں مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ وہ آگ بڑھا کہنے لگا: اگر مجھے کامیابی ملی تو میں سو نفل ادا کروں گا۔ دوسرا کہنے لگا: میں دو سو نفل ادا کروں گا۔ یہ کہنے لگا:

میں تیرے ہاں نیاز دوں گا، گیارہ دیکھیں دوں گا۔ دوسرا کہتا ہے: میں اٹھاون دیکھیں دوں گا۔ (بھلا بتاؤ کہ) وہ ان دونوں کو کیا دکھائے گا؟

② پھر نفل ادا کرنے شروع کر دے اسے کبھی بھی گرم گرم چائے نہیں ملے گی۔

③ آپ کی کھیر پکاتے ہیں۔

عزیزانِ من! وقت ہی ختم ہو جاتا ہے! لہذا تقدیر کا مسئلہ آپ نے دیکھا کس طرح سے حل ہو جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے:

تُو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ  
خالی رکھی ہے خامہ حق نے تری جبین

(اقبال: ضربِ کلیم)

یہ ہے عزیزانِ من! جو جیسا جی چاہے اس پہ لکھ لیجیے یہ جبین خامہ حق نے خالی رکھی ہے۔ یہ ہے انسان کا مقام اس دنیا میں! یہ ہے خدا کا تصور جو قرآن نے دیا ہے اور یہ ہے قانون اور اس کے نتیجے کا باہمی تعلق یہ ہے انسان کی Initiative اور خدا کا Follow-up کرنا یہ ہے جہاں انسان صاحب اختیار ہے یہ ہے مقام جہاں اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے وہ ہے مقام جہاں پہ اپنے اختیار پہ خود پابندیاں عائد کر دیتا ہے۔ ان چیزوں کو قرآن سے سمجھ لیجیے عزیزانِ من! کون سی چیز باقی رہ جاتی ہے سمجھنے کے لیے صاحب!

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

یہی ہے نکتہ توحید قانون کی وحدانیت یہ ہے خدا کی توحید اور اسی لیے وہ کہتا ہے کہ

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

بت خانوں کو دماغ میں لیے ہوئے یہ چاہتے ہیں کہ اسی گھر کے اندر پھر خدا بھی آ جائے۔ وہ بڑا غیور ہے۔ نیا کرایہ دار اس وقت تک اندر نہیں جاتا جب تک وہ مالک سے یہ نہیں کہتا کہ ”پہلاں اونانوں کد فیئر میں جاواں گا اندر“<sup>1</sup> ایسا نہیں ہے کہ وہ ہزار بتوں کے باوجود آ جائے گا کہ ”کوئی گل نہیں باہر مینہ پیندا ہیگا“ اسیں وی ایویں گزارا کر لاں گے“<sup>2</sup> نہیں عزیزانِ من! وہ یہ نہیں کرتا۔ یہ مقام لا ہے۔ اس کا قانون اٹل ہے وہ اسے نہیں بدلتا وہ جو اتنا صاحب اختیار وارادہ ہے جس نے اپنے اوپر پابندی عائد کی ہوتی ہے وہ اپنے قانون کے متعلق کہتا ہے کہ ہم اسے نہیں بدلیں گے۔ وہ ہمارے لیے قانون بنائے ہوئے ہے۔ کیا وہ ان کو بدلتا چلا جائے گا؟“ نہیں صاحب! قطعاً نہیں۔

اب وقت ہو گیا اور اسے دہرا دوں کہ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (25:2)۔ اب آپ اس آیت پر غور کیجیے اور آگے کہا کہ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا<sup>4</sup> (25:2) اور وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (25) نہ ہی اس کے اقتدار میں کوئی اور قوت

1 پہلے انہیں باہر نکالو پھر میں اندر جاؤں گا۔

2 کوئی بات نہیں باہر بارش ہو رہی ہے ہم بھی یونہی گزارہ کر لیں گے۔

3 یہ کتاب اس خدا کی طرف سے آئی ہے جس کے حیطہ اقتدار سے کائنات کی کوئی شے باہر نہیں۔ کائنات میں ہر جگہ اسی کا قانون کارفرما ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 815)۔

4 اُسے نہ تو اپنی امداد کے لیے اولاد کی ضرورت ہے۔



شریک ہے خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (25:2) اس نے ہر شے کو پیدا کیا، اور وہ خدا اتنی بڑی لامتناہی حاکمیت کا مالک ہے کہ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2) اور پھر اس پیدا کی گئی ہر شے کے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے وہیں مقرر کر دیئے۔ اسی لیے کہا کہ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (25:2) اور اس کے بعد کہا کہ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (25:2)۔ اور پھر اس کے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے مقرر کر دیئے۔ انہی پیمانوں کو ان اشیاء کی تقدیر کہا جاتا ہے۔

### خدا تعالیٰ کا اس قسم کا تصور قرآن حکیم کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا

یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کا تصور۔ یہ ہے وہ بات جو سمجھانے کی ہے دیگر اہل مذاہب ہی کو نہیں، اہل علم و دانش کو بھی، کہ لاؤ کہیں سے خدا کا یہ تصور۔ تمہارے ہاں جو علم و دانش ہے وہ یہ نہیں بتا سکتا۔ یہ تصور صرف وحی دے سکتی تھی، یہ صرف خدا اپنے متعلق بتا سکتا تھا۔ اس کے معنی خدا کی معرفت یعنی خدا کیسا ہے نہیں ہیں۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ اس کی ذات کو کوئی پہچان ہی نہیں سکتا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اپنا تعارف اس نے خود اپنی ان صفات سے جو قرآن کے اندر ہیں، کرادیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

عزیزانِ من! جسے یہ معرفت لیے پھرتے ہیں، وہ تصور نہیں ہے۔ خدا نے تو اپنا تعارف آپ کرادیا ہے اور وہ تعارف خود بخود اس نے آپ کرادیا ہے۔ یہ صرف وحی ہے، اس کے بغیر تو ذریعہ علم ہی کوئی نہیں ہے۔ وحی کی ضرورت اس لیے تھی کہ خدا کا اس قسم کا تصور کوئی فکر انسانی دے ہی نہیں سکتی تھی۔

عزیزانِ من! اس آج کے درس میں سورۃ الفرقان کی یہ ایک ہی دوسری آیت، ہم نے لی، آئندہ تیسری آیت سے ہم آگے چلیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



① یہ کتاب اس خدا کی طرف سے آئی ہے جس کے جیٹہ اقتدار سے کائنات کی کوئی شے باہر نہیں۔ کائنات میں ہر جگہ اسی کا قانون کارفرما ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 815)۔

## تیسرا باب: سورة الفرقان (آیات 103-104)



عزیزانِ من! آج دسمبر 1977ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی تیسری آیت سے ہو رہا ہے: (25:3)

**قوانینِ خداوندی کی نتیجہ خیزی کا دوسرا نام ہی اقتدارِ خداوندی ہے**

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (25:2) اس ساری کائنات میں اقتدار صرف خدا کے قوانین کو حاصل ہے اس طرح پوری کائنات میں اسی کا اقتدار ہے۔ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (25:2) اور وہ اپنے اس اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہ قوانینِ خدا ہی کے تجویز فرمودہ ہیں اسی کا ان پر کنٹرول ہے۔ کنٹرول کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنا صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر کے رہیں اور اس میں کسی دوسرے کا کوئی قانون شامل نہیں ہے۔ اسی کو اقتدارِ مطلق کہتے ہیں۔ آج کل کی سیاسی اصطلاح میں اسے Sovereignty کہتے ہیں۔ اقتدارِ کامل و مطلق خدا کا ہے اور اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ خدا کی تو یہ شان ہے اور اسی لیے اگلی ہی آیت میں کہا کہ ان لوگوں کی جہالت دیکھو کہ وَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهَا اِلٰهَةً (25:3) یہ لوگ خدا کے علاوہ اوروں کو بھی اپنا الہ بنا لیتے ہیں جو اس پر قطعاً قادر نہیں کہ کسی شے کو پیدا کر سکیں۔ وہ تو خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

**مذہب میں پرستش ہوتی ہے جبکہ دین میں اطاعت**

مذہب کی دنیا میں تو الہ سے مراد صرف معبود ہے۔ یعنی وہ جس کی پرستش کی جائے اسے الہ کہا جاتا ہے۔ دین میں پرستش کا تصور نہیں ہے اطاعت یا محکومیت کا تصور ہے۔ اس میں جس کی محکومیت اختیار کی جائے وہ الہ ہوتا ہے۔ اب اس سے آپ سمجھ لیجیے کہ جب کہا گیا کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ<sup>1</sup> (47:19) تو یہ کتنی بڑی عظیم انقلاب آفریں حقیقت کا اعلان ہے کہ ”کوئی شخصیت، کوئی ہستی، کوئی نظام، کوئی ادارہ ایسا نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے صرف خدا کے قوانین کی محکومیت اختیار کی جائے۔“ یہ بہت بڑا انقلابی نعرہ ہے لیکن جب دین مذہب سے بدل گیا تو بڑی آسانیاں پیدا کر لیں۔ الہ کا ترجمہ کیا معبود۔ معبود کے معنی ہوئے جس کی پرستش کی جائے اور یہ کر دیا کہ

صاحب! خدا کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں ہے۔ یہ کام بڑا آسان ہو گیا۔ اطاعت اور محکومیت جس کی جی چاہے کرتے رہے۔ یہ تو دنیا داری کے معاملے ہوئے۔ خدا کے ساتھ یہ تعلق کہ اسی کی پرستش کی جائے گی، ہم اس کی پرستش میں کسی اور کو شریک نہیں کریں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس ذرا سے تصور کے فرق سے کس قدر بنیادیں تک بدل گئیں۔ دین کا تصور ہوتا تو کیا یہ جماعت مومنین، یہ جماعت مسلمین، یہ امت مسلمہ، انہیں کچھ بھی کہہ لیجئے اس دنیا میں کسی کی بھی محکوم رہ سکتی تھی؟ نہیں، قطعاً نہیں۔ غیر تو ایک طرف رہے، جنہیں آپ اپنے کہتے

❶ کائنات میں خدا کے سوا کسی کا غلبہ و اقتدار نہیں۔

ہیں، ان اپنوں کی محکومیت بھی تو شرک ہوتا ہے۔ اس میں کسی انسان کی محکومیت جائز ہی نہیں تھی، محکومیت صرف خدا کے قوانین کی تھی۔ جسے آپ بڑی سے بڑی حکومت، مملکت، سلطنت یا اختیار کہتے ہیں، ان کا فریضہ اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ خدا کے قوانین کو نافذ کریں، خود بھی ان کی اطاعت کریں دوسروں سے بھی ان کی اطاعت کرائیں لیکن جب یہ دین مذہب میں بدل گیا تو خدا کی پرستش کی گئی، مسجدوں میں آگئے نماز پڑھ لی، خدا کی پرستش ہو گئی اور ساری زندگی کے تمام کاروبار میں وہ ساری اطاعت و محکومیت انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی کرتے رہیں۔ جھگڑا اسی میں ہی رہا کہ صاحب! ملوکیت ٹھیک ہے یا جمہوریت ٹھیک ہے یا ڈکٹیٹر شپ ٹھیک ہے۔ یعنی وہ جو انسانوں کی محکومیت کا طرز و اسلوب و طریق ہے، اسی پہ بحث ہوئی۔ سب سے بڑے اسلام پسند وہ ہوئے، جنہوں نے کہا کہ صاحب! آمریت نہیں، جمہوریت چاہیے۔ یعنی ایک شخص کے بنائے ہوئے قوانین کی محکومیت نہیں، انسانوں کی ایک پوری بھیڑ ہے، وہ اگر قوانین بنا لے، تو پھر ان کی محکومیت جائز اور اسلام کے مطابق ہو جائے گی۔ یعنی خدا کا جو ایک شریک بنانا ہے، وہ تو شرک ہے اور تین سو کے قریب ”مغز دودخڑ“ اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں، انہیں معبود بنالینا عین مطابق اسلام۔ آپ دیکھتے ہیں یہ کیا ہے۔

یاد رکھیے! جنہیں آپ Basic concepts (بنیادی تصورات) کہتے ہیں جب تک یہ درست نہیں ہوتے، اس وقت تک ہم کبھی اسلام کے پابند ہو ہی نہیں سکتے۔ اللہ کے تصور میں پہلی چیز یہ کلمہ ہے۔ اسے پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں۔ لا الہ کا یہ تصور یہی قرآن کا تصور ہے، اسے لے آئیے تو سوال ہی نہیں ہے کہ کوئی مسلمان، کوئی مومن، کوئی مسلم انسانوں کے کسی بھی انداز حکومت یا قانون کی اتباع اختیار کر لے۔ اس کے برعکس اللہ کے معنی معبود بنا دیجیے، بس پرستش ہو گئی، پھر آگے بڑھے، تو معبود کے لیے فرق ہی نہیں کیا ہے: رام بھی وہی، رحیم بھی وہی۔ اُس نے اپنے طریق پہ کر لی، آپ نے اپنے طریق پہ کر لی۔ ٹھیک بات تو یہ ہے کہ صحیح جواب صرف ایک ہوتا ہے اور غلط جواب سینکڑوں ہوتے ہیں۔ معبود تو سینکڑوں اور ہزاروں بن سکتے ہیں اللہ تو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔

لا الہ کے بعد لا الہ کا اقرار لازم ہے

لا اللہ بڑی عظیم الشان انقلابی چیز ہے۔ اس نے دنیا میں ہر اس شخص کا ہر اس اتھارٹی کا جو یہ چاہے کہ ہم اپنے جیسے انسانوں پہ حکومت کریں پہلے ہی گلا کاٹ کر رکھ دیا ہے عزیزانِ من! طرزِ حکومت کوئی بھی کیوں نہ ہو لا الہ ہو تو یہ تو انارکی (Anarchy) ہوگی۔ اگر لا الہ ہوگا تو ہم کسی کی حکومت اختیار نہیں کریں گے، فوضویت ہوگئی، انارکی ہوگئی، تمدنی زندگی بسر کیسے کی جائے۔ حکومت تو اختیار کرنا ہوگی اس کے لیے ضرورت ہے لا الہ کی۔ آپ نے دیکھا کہ ان چار الفاظ کے جوڑنے سے بات کہاں جا پہنچی ہے جس کو ہم لا الہ کہتے ہیں اس میں لا الہ کا مفہوم عملی معنی رکھتا ہے اسی لیے اس<sup>1</sup> کہنے والے نے کہا تھا کہ

① یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

چوں می گویم مسلمانم بلرزم

جب میں کہتا ہوں کہ ”میں مسلم ہوں، مسلمان ہوں“ تو کانپ اٹھتا ہوں۔ کیوں کانپ اٹھتا ہوں؟ اس لیے

کہ دائم مشکلات لا الہ را

میں لا الہ کہنے کی مشکلات سے واقف ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی شان تو یہ ہے لیکن ان لوگوں کی جہالت دیکھو کہ یہ وَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِہِ آلَہً (25:3) ان ہستیوں کو صاحبِ اقتدار تسلیم کر لیتے ہیں اپنا لا الہ بنا لیتے ہیں۔ دیکھیے خدا کی الوہیت اس کی حاکمیت ساری کائنات کو محیط ہے اور یہ ہیں کہ یہ اس کے علاوہ دوسروں کو اپنا لا الہ بناتے ہیں۔ اب قرآن بچپاری اور بے بسی کا بڑا محسوس سا ثبوت یا دلیل سامنے لایا۔ وہ دلیل وثبوت تخلیقِ اشیاء کا ہے۔

انسانی صلاحیتوں کی کم مائیگی اور بے بسی کی کیفیت

فرمایا کہ لَا یَخْلُقُونَ شَیْئًا وَ هُمْ یُخْلَقُونَ (25:3)۔ پہلی چیز یہ ہے کہ یہ کسی کو بھی معبود بنائیں، کسی انسان کو معبود بنائیں، انسان کے علاوہ کسی اور کو بنائیں، پتھر کی مورتی کو بنائیں، کسی قبر کو بنائیں، وہ اشیاء تو اس پر قادر ہی نہیں ہیں کہ کسی شے کو پیدا کر سکیں، وہ تو ویسے ہی انسانوں کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں۔ خود انسان سے بھی یہ کہا کہ یہ پیدا شدہ ہیں یہ پیدا کرنے والے نہیں ہیں، انسانی بے بسی کی سب سے بڑی مثال خود انسان کی پیدائش ہے، اس پہ اس کو کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ کیا کہیں انسانی بچے سے وہاں پوچھا جاتا ہے کہ کہیے صاحب! آپ کو دنیا میں بھیجیں یا آپ یہیں رہنا چاہتے ہیں، جانا چاہتے ہیں تو کس کے گھر بھیجیں، کس جگہ بھیجیں، کس قسم کا بنائیں آپ کو؟ اس سے کوئی نہیں پوچھتا۔ وہ بڑے سے بڑا بھی لا الہ ہو جس انسان کو آپ تجویز کر لیں گے، وہ حکومت کی دنیا ہو یا یہ طریقت کی دنیا کہ جسے آپ روحانیت کی دنیا کہتے ہیں، وہ حضرت صاحبِ ہول My Lord, His Excellency ہوں۔ کوئی اس سے نہیں پوچھتا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن جو دلیل پیش کرتا ہے وہ تیرہ چودہ سو سال پہلے کے ایک بدو کی سمجھ میں بھی آتی ہے اور آج کا فلاسفر بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ کسی انسان کو بھی آپ حاکم تسلیم کیجئے، پہلی بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ تو اپنی پیدائش میں بھی صاحب اختیار نہیں ہے۔ دوسروں کا حاکم بننا تو ایک طرف رہا، وہ تو کسی کو پیدا ہی نہیں کر سکتا۔ یہ ہے اس کے اختیار کا عالم، یہ ہے اس کی بے اختیاری کی کیفیت اور اس حالت میں بھی تم اسے خدا بنا رہے ہو؟ اسے صاحب اقتدار مان رہے ہو؟

### سود و زیاں کا لالچ یا نقصان

عزیزانِ من! بات یہ ہو رہی تھی کہ یہ ان ہستیوں کو اپنا الہ بنا لیتے ہیں یعنی ان کی حکومت اختیار کر لیتے ہیں جو اس پر قطعاً قادر نہیں کہ کسی شے کو پیدا کر سکیں۔ وہ تو خود خدا کی پیدا کردہ ہیں۔ ان کی بے بضاعتی کا یہ عالم ہے کہ **وَلَا يَمْلِكُونَ لِنَفْسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا** (25:3) وہ اوروں کے لیے تو ایک طرف، خود اپنی ذات کے لیے بھی قانونِ خداوندی کے خلاف، کسی نفع یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتے۔ آپ قوانینِ خداوندی کے خلاف ان میں سے کسی کو لے لیجئے۔ انسان کے لیے دو ہی چیزیں ہیں یعنی جب وہ دوسروں کی حکومت، تابعداری، اطاعت اختیار کرتا ہے تو دو چیزیں ہوتی ہیں: یا تو دفعِ مضرت یا جلبِ منفعت۔ یعنی یہ ڈر کہ مجھے یہ نقصان پہنچائے گا یا کچھ اس سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں کہ مجھے یہ مفاد حاصل ہوں گے۔ دوسروں سے نقصان یا تکلیف کا ڈر اور ان سے کچھ امیدیں وابستہ۔ ڈر ہو یا امیدیں وابستہ کریں، یہ احتیاج کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ ہمیں کچھ احتیاج ہوتی ہے، اسی وجہ سے ہم یہ کرتے ہیں۔ جس کو کوئی احتیاج نہ ہو، وہ ان چیزوں سے مستغنی ہو تو وہ تو کسی کی حکومت اختیار نہیں کرتا۔ یہی چیز ہے جو اس<sup>1</sup> نے کہا ہے کہ:

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس

ایسا نظام کہ کوئی شخص کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ ہو

نکتہٴ شرع مبیں این است و بس

(پس چہ باید کرد و مسافر)

”دین دانت کڈیا ہو یا اے جے۔“<sup>2</sup>

دین خداوندی یا قانونِ خداوندی کا حاصل طبقات کی نفی ہے

بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ ہو، محتاج نہ ہو تو نہ اس کا اس کو ڈر ہوگا، نہ اس سے کوئی امیدیں وابستہ کرے گا: ”اوئے اسی کسے گھر کھان جانے آں۔ سانوں کی لوڑ ہیگی اے اے گل کرن دی! اسی کسے دے گھر کھان جانے آں۔“<sup>3</sup>

دیکھا، احتیاج ہے جو یہ سب کچھ کراتی ہے:

کس دریں جا سائل و محروم نیست

عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس نظام میں نہ کوئی سائل ہوگا، نہ محروم ہوگا، نہ کوئی آقا ہوگا، نہ اس کا کوئی غلام ہوگا، نہ حاکم ہوگا، نہ کوئی معبود ہوگا۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

① یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

② جناب! یہ دین کا لُحْص دیا گیا ہے۔

③ اب کیا ہم کسی کے گھر سے کھاتے ہیں! ہمیں یہ بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کسی کے گھر کھانے کو جاتے ہیں!

بَنِیْ آدَمَ (17:70) ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہوگا۔ بڑے سے بڑا بھی اس کے قوانین کا محکوم ہوگا۔ چھوٹے

سے چھوٹا بھی ہوگا۔ اس طرح یہ چھوٹے اور بڑے کی تمیز ہی اٹھ گئی۔ نہ محتاجی ہوئی، نہ محکومیت ہوئی۔ یہاں طبقات یوں مٹتے ہیں۔

### ماڈیت کی دنیا میں انسان کی بے بسی کی محسوس مثال

کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے۔ کسی انسان کو لے لیجیے۔ وہ جو خدا کے قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے اگر اس کا سورج طلوع نہ ہو تو ان میں سے جو بڑے سے بڑا خدا بنا ہوا ہے وہ بھی اندھا ہو جاتا ہے اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر آج وہ اس ہوا کو روک لے تو ایک تنفس باقی نہیں رہ سکتا، خواہ وہ بڑے سے بڑے حضرت صاحب ہوں یا بڑے سے بڑا فرعون ہو دم گھٹ کے مر جائے گا۔ کہا: یہ تو اس کے قوانین کی کار فرمائی ہے جو یہ خود بھی زندہ ہیں، خود بھی چلتے پھرتے ہیں اس کے قوانین کو چھوڑ کے دوسروں کے لیے تو ایک طرف، وہ خود اپنے لیے بھی لَا یَمْلِكُونَ لَآ نَفْسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا (25:3) قوانین خداوندی کے خلاف کسی نفع یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتے۔ دوسرے تو ایک طرف رہے، خود اپنے آپ کے متعلق بھی ان کی کیفیت یہ ہے: ہوا روک دی جائے سانس بند ہو جاتا ہے۔ کہیے تو ان میں سے بڑے سے بڑا جو خدائی کا دعویدار ہے اس ہوا کے بغیر سانس لے کر بتائے۔ ویسے کتنی بظاہر پیش پا افتادہ سی مثالیں ہیں لیکن وہ ہیں جو قیامت تک کے لیے صداقت پر مبنی ہیں، کبھی جھوٹی نہیں ہو سکتیں۔ قرآن کے حقائق یا اس کی Values (اقدار) تو ایک طرف رہیں اس نے تو سمجھانے کے لیے جو مثالیں دی ہیں وہ بھی ابدیت درکنار ہیں۔ کہا کہ بتائیے ان سے کہیے تو سہی! یہ اللہ بننے والے دو ہی گوشے ہیں یا حکومت کے گوشے میں فرعون بنے گا، یا لوگوں کے عقل و فکر کو ماؤف کر کے روحانیت کے گوشے میں حضرت جی بنے گا۔ ذرا اس کو کہیے کہ وہ ہوا کے بغیر سانس لے کر دکھائے۔

## مردہ بدست زندہ کی کیفیت

ان کی یہ کیفیت ہے کہ **وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيٰوةً وَلَا نُشُورًا** (25:3) نہ ہی انہیں موت اور زندگی پر کنٹرول ہے اور نہ ہی مرکز جی اٹھنے پر۔ ان سے کہیے جو بڑے سے بڑا ہے کہ موت سے بچ کے دکھائے، اسے زندگی و موت پہ اختیار نہیں ہے۔ اگر ہوا روک لی جائے تو تڑپ تڑپ کے مرجائیں۔ یہاں کی زندگی اور موت پہ اختیار ہی نہیں ہے۔ کہا کہ مرنے کے بعد جی اٹھنے کا کیا اختیار ہوگا۔ کہنے لگا کہ یہ سوچتے ہی نہیں۔ جن کی بے بسی کا یہ عالم ہے انہیں اپنا معبود اور حاجت روا بنائے ہوئے ہیں۔ اور کتنی بڑی حماقت ہے جبکہ بڑی بدیہی بات ہے انسانوں میں سے کون ہے کہ جس کو یہ اختیار حاصل ہے لیکن ہم ہیں کہ یہ کہتے ہیں کہ وہ انسان تو ایک طرف رہے جو انسان ہمارے سامنے مر گیا، وہ مردہ بدست زندہ ہے۔ حضرت صاحب بھی جب وفات پا جاتے ہیں تو وہ جو زندہ ہوتے ہیں وہ ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس سردی کے موسم <sup>1</sup> میں صبح اٹھ کے حضرت نوں جو ٹھنڈے پانی نال ہلوادیں پتہ لگ جائے۔ <sup>2</sup> جہاں ان کا جی چاہے ان کو دفنادیں، جس کپڑے میں جی چاہے کفنادیں یہ بے بس ہیں لیکن جونہی ان کو آپ نے چار سومن مٹی کے نیچے دبایا، اور دبایا ہی نہیں اس پہ بڑی بڑی سلیں رکھیں، دفنایا اب آپ کی حاجت روائی یہ حضرت صاحب کریں گے۔

## انسانیت کے بلند مقام سے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں کی جانب سفر

آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ انسانوں کے متعلق کہہ رہا تھا کہ ان کو تو موت و حیات پہ بھی کسی قسم کا اختیار نہیں اور ہم انہیں صاحب اختیار مان رہے ہیں کہ جو ابھی ابھی ہمارے ہاتھوں میں بے اختیار تھا۔ اس مٹی کے نیچے دبنے میں بڑی تاثیر ہے۔ اندازہ لگائیے کہ انسان جب جھکنے پہ آتا ہے تو پھر کہاں پہنچتا ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ** (95:4) انسان کو تو ہم نے حسین ترین، مکمل ترین، تقویم اور پیکر کے اندر پیدا کیا۔ اس کی یہ کیفیت ہے کہ **ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ** (95:5) پھر جب پستیوں کی طرف جاتا ہے تو انتہا ہی نہیں کہ کہاں چلا جاتا ہے۔ **أَسْفَلَ سَافِلِينَ** <sup>3</sup> (95:5) پستیوں کی طرف جانے والوں میں سب سے زیادہ پستی کی طرف جانے والا اور یہ کیفیت ہے۔ میں نے کہا کہ چلو جی، جیتے جی تو پھر اس کا ڈر سہی جنہیں اپنے ہاتھوں سے ہم نے مٹی کے نیچے دبایا ہے اس کے بعد ساری مرادیں لے کے ان کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ صاحب! ان سے پوچھیے، انہیں خود اپنے متعلق کوئی احساس نہیں ہے۔ جو مٹی کے نیچے مردہ دفن ہو گیا ہے، یہ اس کے پاس جا کے اپنی سناتے ہیں اس سے کہتے ہیں: ہماری حاجت پوری کر۔ اپنے متعلق اس کو یہ اتنی قوت حاصل نہیں۔ قوت حاصل ہو تو اس سے کہیے کہ ذرا اس مٹی کو توڑ کے کھڑا ہو جائے۔ او تمہارے جو مصیبتوں کے پہاڑ ٹالتا ہے، یہ اپنے اوپر سے یہ چند من مٹی کو نہیں الگ کر سکتا۔

## وحی خداوندی کے سلسلہ میں دنیا بھر کے انسانوں کو ایک کھلا چیلنج

عزیزانِ من! افراد ہوں یا اقوام سب کی زندگی قائم بھی خدا کے قانون کے مطابق رہتی ہے اور آگے بھی اُسی کے قانون کے مطابق بڑھتی ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس لیے کہا کہ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا اِنْ هَذَا اِلَّا افْكٌ فِرَءُ وَ

① یہ بات دسمبر 1977ء کی 30 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ اس دور میں پاکستان میں یہ سردی کی شدت کا مہینہ ہوتا تھا۔

② اگر علی الصبح حضرت صاحب کوٹھنڈے پانی سے نہلا دیں تو انہیں پتہ چل جائے۔

③ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل) ادارہ طوع اسلام رجسٹرڈ لاہور

2006ء ص 484 تا 498

اَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُونَ ۚ فَقَدْ جَاءُوْ ظُلْمًا وَّ زُورًا ① (25:4)۔ اندازہ لگائیے ہم یہ کچھ تعلیم دیتے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ خدا کی وحی والی بات یونہی یہ کہہ دیتا ہے (معاذ اللہ) خود ہی گھڑ لیتا ہے، افترا کر لیتا ہے، اپنے جی سے کہہ دیتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ خود یہ گھڑتا ہے اور کچھ لوگ اور ہیں جو اس کی مدد بھی کرتے ہیں۔ یہ مل بیٹھ کے جو کمیٹی بنا لیتے ہیں ان میں یہ چیزیں گھڑ لیتا ہے یہ وحی بنا کے پیش کر دیتا ہے۔ فَقَدْ جَاءُوْ ظُلْمًا وَّ زُورًا (25:4) کس قدر ظلم و زیادتی کی بات کرتے ہیں، کس قدر راہِ راست سے ہٹی ہوئی بات کرتے ہیں! ابھی ابھی وہ بتائے گا جو یہ کہتے ہیں کہ خود بنا لیتا ہے اور ساتھ کوئی جماعت ہے۔ انہیں چیلنج دیا گیا کہ اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ انسانوں کا بنایا ہوا ہے تو تم اور اپنے ساتھ ساری دنیا کے دانشوروں کو اکٹھا کر لو اور اس قرآن کی دس آیتوں کی مثل تم بنا کے بناؤ، پورا قرآن تو ایک طرف رہا، تم ایک آیت بنا کے بناؤ۔ تیس (۲۳) سال تک سارے عرب کو چیلنج دیا گیا۔ وہ عرب جو زبان کے مسئلے میں اس قدر اپنے آپ کو بلند یوں پہنچتے تھے کہ اپنے آپ کو تو یہ عرب فصیح اللسان کہتے تھے اور ساری دنیا کو عجم، گونگے کہتے تھے انہیں چیلنج دیا گیا کہ بھائی! نہ لڑائی کرنے کی ضرورت نہ میدانِ جنگ میں آنے کی ضرورت نہ اس قسم کے بہتانات تراشنے کی ضرورت، تم کہتے ہو کہ یہ انسان کا ہے اس نے آپ بنا لیا ہے اس کے ساتھ کچھ آدمی ہیں، بہت اچھی بات۔ یہ تو اُمی ہے۔ اس سے پیشتر تو یہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ تم تو بڑے بڑے نامور شعراء ہو، دنیا بھر میں تمہاری زبانِ دانی کی دھوم مچی ہوئی ہے، تم آؤ اپنے ساتھ کچھ اوروں کو بھی بلاؤ دعوت دے دو جتنے بھی اپنے حمایتی بلا نا چاہتے ہو بلاؤ مگر مِنْ دُونِ اللّٰهِ (2:23) بیچ میں خدا کو شامل نہ کرنا۔ اور سارا قرآن نہیں جسے کہتے ہو کہ یہ افترا ہے اور کذب ہے اس کی دس آیتیں بنا کے دکھا دو۔ کسی نے اس چیلنج کا جواب نہیں دیا، اسے Accept (قبول) نہیں کیا اور وہی دور نہیں عزیزانِ من! چودہ سو سال ہو گئے اسلام کی مخالفت کی یہ کیفیت ہے کہ تین سو سال تک یہ Crusades



صلیبی لڑائیاں، تمام عیسائی ملکیتیں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتی رہیں، ان میں عربی کے بڑے بڑے فاضل بھی ہوئے، قرآن کے اس چیلنج کو آج تک کسی نے Accept (قبول) نہیں کیا۔ یہ لوگ عربی ادب (Arabic Literature) کے بڑے بڑے فاضل تھے۔

❶ جو لوگ قرآن کی صداقت سے انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ (وحی وغیرہ کا دعویٰ یونہی ہے۔) یہ رسول اس قرآن کو اپنے جی سے گھڑ لیتا ہے اور پھر اسے خدا کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ (اور اس کام کو یہ تنہا نہیں کرتا) ایک اور پارٹی ہے جو اس معاملہ میں اس کی مدد کرتی ہے (اور یہ سب مل کر اسے وضع کرتے ہیں۔) ذرا سوچو کہ یہ لوگ کس قدر جھوٹ اور فریب سے کام لیتے ہیں! (پرویز: مفہوم القرآن ص 816)

## آج کے دور میں قرآن کے متعلق گب (Gibb) کا اعتراف

چیلنج قبول کرنا تو ایک طرف، عزیزانِ من! گب (H.A.R. Gibb) British Orientalist کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہ بہت بڑا فاضل ہے: عربی زبان کا بھی، انگریزی زبان کا بھی، Historian (مؤرخ) بھی ہے اور یہ آج کل موجود ہے۔<sup>❶</sup> اس کی Latest (جدید ترین) کتاب Modern Trends in Islam (اسلام میں جدید رجحانات) ہے وہ دیکھیے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس قرآن کی کسی آیت کا مثل تو ایک طرف، وہ کہتا ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کے ہاں کے یہ عالم وغیرہ، جنہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے، وہ ان کو پھٹکا رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ اؤ تم نے یہ کیا! کیا تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں ہے کہ یہ کیا چیز ہے، جس کا ترجمہ تم نے کیا؟ اور مثالیں دیتا ہے کہ یہ ہے قرآن کی آیت، یہ ہے تمہارا ترجمہ۔ نظر ایسا آتا ہے کہ تم نے قرآن کی آیت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ تم عربی زبان سے بھی واقف نہیں ہو۔<sup>❷</sup> اور وہ پانچ لفظوں کی صرف ایک آیت کو دے کے چیلنج کرتا ہے اور وہ جتنے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے ہیں، خود اپنے ہاں کے وہ کہتا ہے کہ ان پانچ لفظوں والی آیت کا ذرا ترجمہ کر کے بتاؤ تو سہی۔ ترجمہ نہیں ہو سکتا، اس کی مثل بنانا تو ایک طرف رہا۔

❶ یاد رہے یہ بات دسمبر 1977ء کی 30 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

❷ قارئین کی سہولت کے لیے گب کے اصل الفاظ یہاں دیئے جا رہے ہیں:

The Koran is essentially untranslatable, in the same way that great poetry is untranslatable. The seer can never communicate his vision in ordinary language. He can express himself only in broken images, every inflection of which, every nuance and subtlety, has to be long and earnestly studied before their significance breaks upon the reader -- images, too, in which music of the

sounds plays an indefinable part in attuning the mind of the hearer to receive the message. To paraphrase them in other words can only be to mutilate them, to substitute clay for fine gold, the plodding of the pedestrian intelligence for the winged flight of intuitive perception ..... An English translation of the Koran must employ precise and often arbitrary terms for the many - faceted and jewel - like phrases of the Arabic; and the more literal it is, the grayer and more colorless it must be ..... Even in so simple a sentence as

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ (50:43)

"Verily We give life and death and unto Us is the Journeying", it is impossible to present in English (or perhaps any other language) the forces of the five-times repeated "We" in the six words of the original (Modern Trends in Islam, 1945, P.4)

قرآن بتاتا ہے کہ وَقَالُوا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اُكْتَسَبَهَا فَهِيَ تُمْلِي عَلَيْهِ بُكْرَةً وَاصِيلًا (25:5) اور پھر آ کر کہتے ہیں کہ اس میں ہے کیا؟ یہ پہلے وقتوں کے لوگوں کی کہانیاں اور قصے ہیں جو بیان کی جاتی ہیں۔ کوئی آ کر اس کو بتا دیتا ہے یہ لکھ لکھا لیتا ہے۔ یہ سارا کچھ چوری چھپے کرتے ہیں اور پھر باہر آ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ صاحب! مجھ پہ یہ وحی ہوئی ہے اور پھر اپنی وحی اپنے کاتبوں کو لکھا دیتا ہے یہ کاروبار صبح و شام ہوتا رہتا ہے۔ یہاں یہ ان کے اعتراضات ہیں جو نقل کیے گئے ہیں۔

### چودہ سو سال پہلے کا سناتی حقائق کے متعلق محیر العقول انکشافات

ان اعتراضات کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا (25:6) ان سے کہو کہ یہ باتیں جو تم کر رہے ہو یہ تو انسانوں کی ہیں۔ اسے اُس نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے پوشیدہ رازوں تک سے واقف ہے۔ جو چودہ سو سال پہلے یہ کہہ سکتا ہے کہ تم اس زمین کو ہی نہ دیکھو۔ یہ جو تمہیں سماوی کڑے نظر آتے ہیں ان کڑوں کے اندر بھی تمہیں آبادیاں معلوم ہوں گی۔ وہاں بھی آبادیاں ہیں <sup>①</sup> اور ایسا وقت آ سکتا ہے جب یہ آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ربط قائم کر دیں۔ <sup>②</sup> قرآن چودہ سو سال پیشتر یہ کہتا ہے۔ بتاؤ کون سا انسان ہے جو اُس دور میں یہ بات کہہ سکتا ہے۔ اس نے یہ کہا کہ جو فرعون کی لاش تھی ہم نے اسے محفوظ رکھ دیا تاکہ آنے والوں کے لیے یہ آ یہ عبرت بنے۔ <sup>③</sup> دنیا میں کوئی

① قرآن کریم کی متعلقہ آیت یہ ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ دَابَّةٍ طَوْهُ عَلَى جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ (42:29)۔ (خدا کے قوانین فطرت اسی زمین تک محدود نہیں۔ یہ ساری کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ اسی لیے) زمین اور اجرام فلکی کی پیدائش خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔ نیز وہ ذی حیات (چلنے پھرنے والی آبادیاں) جو اس نے ان میں (زمین و آسمانی کڑوں میں) پھیلا رکھی ہیں۔ یہ آبادیاں اس وقت تو الگ الگ ہیں لیکن وہ اس پر بھی قادر ہے کہ انہیں اکٹھا کر دے۔ (یعنی زمین اور ان کڑوں میں بسنے والی آبادیاں)

باہمی ربط پیدا کر لیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ ص-1134) سورۃ النحل میں کہا کہ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ ذَاۤتِ اَبۡیَہٗ (16:49) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے یہ سب اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ خواہ وہ جاندار مخلوق ہو۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص-604)۔

② اس آیت (42:29) سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض آسمانی کرؤں میں زندگی موجود ہے۔ اب انسان نے جس انداز سے اجرام فلکی سے سلسلہ مواصلات شروع کر رکھا ہے اس سے اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کسی کڑے کی آبادی میں اور ہم میں ربط پیدا ہو جائے اور یوں یہ آبادیاں اکٹھی ہو جائیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص-1134 مع حاشیہ)۔

③ قَالَ يَوْمَ نُنۡجِيۡكَ بِدَنۡكَ لِتَكُوۡنَ لِمَنْ خَلۡفَکَ (10:92) اب تو تجھے غرق ہونا ہے۔ البتہ ہم ایسا کریں گے کہ تیری لاش کو سمندر کی موجوں سے محفوظ رکھ لیں تاکہ وہ ان لوگوں کے لیے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، موجب عبرت ہو (پرویز: مفہوم القرآن ص-483)۔

شخص نہیں جانتا تھا کہ فرعون کی لاش کہاں ہے، کیسے محفوظ رکھ دیا، کیسے آہِ عبرت بنے گی؟ یہ کسی کو علم ہی نہیں تھا۔ مفسرین اس کی تشریح مختلف انداز سے کرتے رہے تا نکلے آج خود اس کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے جا کر وہ جواہر ام مصر کھودا، تو جا کر دیکھا اور اب کہہ رہے ہیں کہ یہ ہے وہ فرعون موسیٰ، اور یہ کہا ہے کہ یہ نظر آتا ہے کہ سمندر سے یہ لاش پکڑی گئی کیونکہ مچھلیوں نے اس کے ادھر ادھر سے کچھ گوشت کاٹا ہوا ہے۔ میں تو یونہی دو مثالیں دے رہا ہوں ورنہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ اس خدا کا نازل کردہ ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے پوشیدہ رازوں تک سے واقف ہے۔

راز کیا ہیں؟ یہ مضمر صلاحیتیں (Potentialities) ہیں، یہ کائنات کی ان اشیاء کے اندر پوشیدہ قوتیں ہیں۔ اس زمانے میں جب ابھی دنیا یہ مانتی تھی کہ زمین ساکن ہے اور اس کے گرد یہ سماوی کڑے چکر لگا لیتے ہیں۔ گیلیلیو<sup>①</sup> (Galileo: 1564-1642) نے ابھی کل ہی یہ بات کہی تھی کہ میں تو دیکھتا ہوں زمین گول ہے، گھومتی ہے تو اس پہ موت کا فتویٰ دے دیا۔ یہ کل کی بات ہے<sup>②</sup> قرآن کریم تو چودہ سو سال پیشتر یہ کہہ رہا ہے کہ كُلُّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُحُودًا (21:33) ہر کڑہ اپنے اپنے Orbit (مدار) کے اندر گم گردش ہے۔ کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں، یہ بیٹھا ہوا ہے اور یہ لکھ لکھا لیتا ہے۔ ان سے کہو کہ یہ اس نے نازل کیا ہے جو کائنات کی ان پوشیدہ صلاحیتوں سے واقف ہے اور پھر اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس کائنات کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اگر میں اس عنوان پہ آ جاؤں عزیزان! تو کئی درس چاہئیں کہ یہ محفوظ کیسے رکھا ہوا ہے۔ یہ صرف محفوظ ہی نہیں رکھا ہوا کیونکہ یہ تو پھر جامد اور Static چیز ہوتی ہے کسی کو محفوظ رکھ لینا، Preserve کر دینا اس کے ساتھ رَحِیۡمًا (25:6) بھی ہے، نشوونما بھی کیے چلا جا رہا ہے وہ ان چیزوں کی۔ یہ ہستی وہ ہے جس نے قرآن نازل کیا۔ قرآن کے متعلق تو یہ کچھ کہا کہ خود بنالیتا ہے، لکھ لکھا لیتا ہے، اگلوں کے افسانے ہیں، کہانیاں ہیں۔

- ❶ Galileo (1564-1642), He was Italian astronomer and mathematician. He developed his own telescope (1609), and discovered four satellites of Jupiter and the nature of lunar illumination. His belief that Copernicus was right to claim that the sun was the centre of our Universe led to his persecution by the Ingquisition (1633). He recanted but is said to have muttered under his breath "But it (the Earth) does move". (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited, P. 625)

❷ یہ مجاورۃ کہا گیا ہے۔ ان پر 1633ء میں فتویٰ لگا تھا۔

## قرآن حکیم میں نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعارف

اس کے بعد وہ آئے رسول کی طرف کہ وَقَالُوا مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ (25:7) اور کہا کہ واہ! یہ رسول کس قسم کا ہے۔ بھئی! کھانا کھاتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ قرآن کتنی عظیم چیز کہہ گیا ہے! مذہب میں تصور ہی یہ چلا آ رہا تھا کہ جو خدا کی طرف سے خدا کا نبی یا رسول یا اوتار اس چیز کا دعویٰ کرے اسے عام انسانوں جیسا نہیں ہونا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب نے اپنے بانی مذہب کو الوہیت کا درجہ دے دیا، اس کو خدا بنا دیا، عام انسانوں جیسا نہیں تصور کیا، وہ اس کی توہین سمجھتے تھے کہ اسے بھی کہا جائے کہ یہ عام انسانوں جیسا ایک انسان ہے۔ یہ رسول ہے کہ اس کے وہ بیوی بچے ہیں گھر بار ہے، کھاتا پیتا ہے۔ وہ اعتراض کرتے ہیں کہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ ان کے لیے یہ بات بڑی وجہ تعجب تھی کہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور کیفیت اس کی یہ ہے کہ ہماری طرح کھاتا پیتا ہے، یہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، یہ کس قسم کا رسول ہے! انسان کا ذہن عجوبہ پرست واقع ہوا ہے۔ اس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز Superstitious (توہماتی)، کوئی نہ کوئی چیز Super-natural (ما فوق الفطرت) سی ہونی چاہیے پھر تو وہ اس کو بڑا سمجھتا ہے۔

## عقل و فکر سے ماورا تو ہم پرستی اور کرامات کے قصے

یہ چودہ سو سال پہلے انسان کی بات نہیں ہے۔ آج بھی آپ اچھے سے اچھے مجمع میں درس دے رہے ہوں، عقل و فکر کی باتیں کر رہے ہوں، علم کی باتیں کر رہے ہوں، یہ سارا کچھ ہوا اور کوئی یونہی آ کر کہہ دے کہ باہر ٹینگی کے پاس ایک بابا کھڑا ہے: لمبے لمبے بال ہیں، وہ بالوں کو یوں نچوڑتا ہے تو اس میں سے دودھ نکلتا ہے۔ سارے بھاگ کر اس کے پاس چلے جائیں گے۔ آسائیں بوڑھا شاہ تے گھوڑے شاہ تے کھڑا شاہ۔<sup>❶</sup> ان کے گرد خلقت جمع ہے، وہ ننگ دھڑنگ، غلاظت میں لپٹے ہوئے پڑے ہوئے ہیں صاحب! اب ان

کے ہاں کے جو ادھر ادھر کے دلال ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں: جی! آپ کو پتہ نہیں ہے حضرت صاحب کا رات کو ہم دیکھتے ہیں: سرالگ سے ہوتا ہے دھڑا لگ سے ہوتا ہے وہ بھی اللہ ہو کہتا ہے یہ بھی اللہ ہو کرتا ہے۔ یہ پردے کی باتیں ہیں نہ بتانا کسی کو۔ یہ جتنے بڑے بڑے آپ کے ہاں اونچے اونچے مزار نظر آتے ہیں اور جو ان کی کہانیاں ہیں ان کی طرف کچھ کرامات منسوب ہیں۔

❶ یہ تمام حضرت جی ہیں۔ کوئی بوہڑ شاہ ہے تو کوئی گھوڑے شاہ اور کوئی ککڑ شاہ۔

### جان نثاروں کی قربانیوں کا حاصل اور ہماری احسان فراموشی کا نتیجہ

عزیزانِ من! جن کی طرف کرامات منسوب نہیں ہوتیں کسی کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کا مزار کہاں ہے۔ جس کے تدبر اور جس کی جاں فشانیوں سے اسلام کی اس گاڑی کو اتنا زور دار Push ہوا ہے کہ چودہ سو سال تک بغیر انجن کے بھی چلے آرہی ہے۔ پوچھو ان مسلمانوں سے بہر حال کہ آپ اپنے ہی خالد بن ولید، سیف اللہ کا مزار کہاں ہے؟ عمر فاروق ♦ (581-644/45 AD) کہاں دفن ہیں؟ کسی کو معلوم نہیں۔ سائیں گھوڑے شاہ کے متعلق پوچھیے۔ ”اوتے اونہاں دے گھوڑے داوی پتہ ہے۔“<sup>❶</sup> آپ کو معلوم ہے کہ ایبٹ آباد کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک بہت بڑا مزار ہے وہاں جھنڈے لگے ہوئے ہیں بڑا عرس ہوتا ہے۔ یہ کس کا مزار ہے؟ جی اے کھوتے شاہ دا اے۔<sup>❷</sup> میں مذاق نہیں کر رہا۔ جس کا جی چاہے وہ جائے یہ ایبٹ آباد سے ذرا ایک سڑک کے کنارے پہ ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ بھی کچھ اور نام تھا۔ دبا دیا ہو گدھا ہی، بہر حال وہ تو کچھ انسانوں جیسا نام نہیں ہے مگر فخر سے کہا جاتا ہے: کھوتے شاہ دا مزار اے۔<sup>❸</sup> تو میں نے عرض کیا ہے کہ تو اہم پرستیوں میں چودہ سو سال پہلے کا انسان ہی بتلا نہیں تھا ذرا سی کوئی خلافِ فطرت چیز کسی سے منسوب کر دی جائے تو اس کے گرد جھر مٹ جمع ہو جاتا ہے۔ آج بھی آپ کی یہ کیفیت ہے کہ انسانوں کی ہی نہیں بلکہ یہ گدھوں کے مزاروں کی پرستش ہوتی ہے وہاں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں انسان کا تو پوچھو نہیں کہ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (95:5) کم بخت نیچے گرتا ہے تو پھر کہاں تک چلا جاتا ہے یعنی جو گدھے سے جا کے مراد مانگتا ہے۔ ساڈے تے کیندے سی: منگتیاں کولوں منگنا العنیاں دا کم اے۔ او فیروی کوئی انسان ای ہوندا ہیگا اے۔ کھوتے شاہ دے مزار تے جا کے منگنا کی آ؟<sup>❹</sup>

بہر حال یہ ان کا کہنا ہے کہ صاحب! یہ کس قسم کا رسول ہے: کھاتا پیتا بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ عزیزانِ من! میں اگر ذرا سی ذاتی چیز کو درمیان میں لے آؤں تو معاف فرمائیں۔ میں عرض کر دوں کہ یہ ذہنیت کیسی ہوتی ہے۔ میں سنٹرل گورنمنٹ میں ملازم تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنا انداز یہی رکھا ہے جو آج آپ دیکھ رہے ہیں: یہی شلو اور کرتہ پاجامہ اور کرتہ ٹوپی سر پہنے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ یہ 1931ء کی بات ہے جب میرا پہلا مضمون بٹالہ انڈیا میں سید سلیمان ندوی کے رسالہ معارف میں شائع ہوا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958ء) نے جو تفسیر

لکھی تھی اس تفسیر پر میں نے تنقید لکھی تھی۔ وہ بڑی عجیب چیز تھی۔ میری وہ تنقید اس پرچے میں شائع ہوئی تو گویا یہ تعارف ہوا کہ

① وہاں تو ان کے گھوڑے کا بھی انہیں معلوم ہے۔

② جی! یہ گدھے شاہ کا مزار ہے۔

③ ہمارے ہاں بھی یہ کہتے تھے کہ بھیک منگوں سے مانگنا لعنتیوں کا کام ہے۔ وہ تو پھر بھی انسان ہی ہوتے تھے مگر گدھے شاہ کے مزار پہ جا کر مانگنا کیا ہے؟

میں بھی اسلام کے متعلق کچھ جانتا یا لکھتا ہوں۔ میں اور میرے ساتھ یہ شیخ سراج الحق صاحب تھے جو میرے برادرِ مکرم کی طرح ہیں، ہم زندگی بھر اسی طرح اکٹھے ہی چلے آ رہے ہیں۔ کام کاج کے لیے ہم نئی دلی سے چلتے تھے پرانی دلی میں چاندنی چوک جیسے یہ ہمارے ہاں انارکلی ہے اس قسم کا وہ بازار تھا اس میں سے ہم چلے آتے تھے۔ حسب معمول میں اسی طرح سے گرمی کے موسم میں کرتہ پا جامہ ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور ہم دونوں چلے جا رہے ہیں۔ وہاں ایک ہمارے جاننے والے خوجہ صاحب تھے۔ وہ ذرا زیادہ ہی اسلامی واقع ہوئے تھے پروفیسر تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو مجھے بلایا۔ ایک طرف کر کے کہنے لگے کہ اب آپ اس لباس میں باہر نہ آیا کریں، کم از کم اچکن ضرور پہن لیا کریں۔ میں نے کہا: جی! اب آپ نے فرمایا ہے اب کیا ہوا ہے کہ میں اب یہ کیا کروں؟ کہنے لگے: یہ دیکھیں اب آپ کا شمار علمائے دین میں ہونے لگ گیا ہے۔ یعنی ان کا تصور یہ تھا کہ وہ جو ایک مقالہ لکھا گیا تھا اس کی بنا پر میرا شمار اس میں ہونے لگ گیا۔ جب ان میں شمار ہونے لگ گیا تو پھر بغیر اچکن کے بازار میں نکل آنا صحیح نہیں ہے۔ یہ اس تصور کے منافی ہے۔ تو بہ تو بہ مجھ جیسے ایک نادان کے متعلق یہ تصور میں نہیں آ سکتا کہ تم اب بازار میں نکلو تو صرف گرتے میں نہ نکلو۔ وہ جو رسالت کا دعویٰ کرتے تھے ان کے متعلق ان کا یہ کہنا کہ یہ بازاروں میں پھرتا ہے یہ وہی ذہنیت (Mentality) چلی آتی ہے کہ خدا کی طرف کسی کی کوئی نسبت ہوئی تو انہوں نے اسے انسانوں سے الگ کچھ تصور کر لیا: کس قسم کا ہے یہ رسول! کیا بات ہے: مَالِ هَذَا الرَّسُولِ (25:7)! کیسا ہے یہ رسول! کیا ہو گیا ہے اس کو؟ بازاروں میں پھرتا ہے کھاتا پیتا ہے۔ لَوْ لَا أَنْزَلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرٌ (25:7) اسے باہر نکلتا ہی نہیں چاہیے نکلے تو ایک جلو میں ہو اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہونا چاہیے اس کے آگے آگے وہ چلے باادب باملاحظہ ہوشیار کہتا ہوا۔ یہ ”نذیر“ بہت اچھا لفظ ہے: لوگوں کو ڈراتا ہوا، ہٹ جاؤ راستے سے ادھر ہو جاؤ۔ کیا بات ہے قرآن کی! ایسا نقشہ کھینچتا ہے: پیچھے ساتھ ایک فرشتہ ہونا چاہیے نذیر! لوگوں کو ڈراتا چلا جائے کہ ہٹو راستے سے ادھر ہٹو راستے سے۔ یہ کہتے ہیں کہ اُسے کچھ ہونا چاہیے تھا۔ پھر قرآن ان کے یہ الفاظ Quote کرتا ہے کہ اَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنْزٌ (25:8) کوئی اشرافیوں کا خزانہ اس کے پاس بھیجا جاتا جائے نماز کے نیچے سے حضرت صاحب یوں ہاتھ کر کے اُسے نکالتے کہ لو یہ سکھ اور اس کے پاس جناب! دینے کو یہ نوٹ ہوتے اور وہ نوٹ ہوتے۔ وہ انہیں دکھاتا اور مافوق الفطرت انداز میں دیتا چلا جاتا۔ ان کے ہاں یہ ذہنیت ہے اور آج بھی چلی آرہی ہے۔

## سخاوت اور در ماندگی کے متضاد قصے

عزیزانِ من! پھر سے عرض کر دوں کہ ہم تو انہی وادیوں کے گھومنے والے انہی بازاروں کے رہنے والے ہیں۔ یہ کچھ خود بھی کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ کہا کہ دیکھیے جب کوئی حضرت صاحب! جاتا ہے تو وہ اپنے جائے نماز کے نیچے سے ایک سو روپے کا نوٹ دے دیتے ہیں۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ ان کو دیتا ہے وہ کسی سے لیتے نہیں ہیں اور وہ اس طرح سے دیتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے مگر جو نوٹ وہ دیتے ہیں کیا اس پہ نمبر ہوتا ہے؟ کہنے لگے: ہاں ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا: کیا وہ گورنمنٹ کے نوٹوں والا نمبر ہوتا ہے یا کوئی خاص نمبر ہوتا ہے؟ اگر خاص ہوتا ہے تو حضرت صاحب بناتے ہیں اور اگر گورنمنٹ کے نوٹوں والا ہوتا ہے تو یا کسی نے دیا ہوا ہوتا ہے یا انہوں نے کہیں سے چرایا ہوگا۔ اب بتاؤ کہ کیا شکل ہے اس کی؟ کہنے لگے کہ جب آدمی بے دین ہو جاتا ہے ”تے فیر لکھ نہیں رہندا اوہدا۔“<sup>1</sup> اوبابا! جواب دو اس لیے کہ میں تو ان وادیوں کا خود چلا ہوا ہوں۔ ”ساڈے وی سرہانے نکلدے ہوندے ہیگے سن، روٹی منگ کے کھاندے ہوندے سن“<sup>2</sup> یعنی ان کو کوئی دوسرا آ کے روٹی نہ دے تو یہ تو کچھ کماتے ہی نہیں ہیں۔ تے ترے جاندے بخشش اپنی کردے ہیگے نیں۔“<sup>3</sup> یہ کہتے ہیں کہ ایک خزانہ اس کے ساتھ آنا چاہیے تھا: اَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا (25:8) یا ہونا یہ چاہیے تھا کہ یوں یہ کپڑا ڈالتے اور کہتے: او آم کا درخت اُگ آتا اس میں یہ آم لگے ہوئے ہوتے۔

## عقل انسانی کو قرآن حکیم کی روشنی ہی جلا بخش سکتی ہے

عزیزانِ من! میں کہہ رہا ہوں کہ یہ بات صرف چودہ سو سال پہلے کی ہی نہیں تھی یا رسالت کے عہد کی نہیں بلکہ آج بھی اس چودھویں صدی میں جسے بڑا روشن خیالی کا زمانہ کہتے ہیں یہ کیفیت ہے کہ یورپ جسے تہذیب و تمدن اور عقل کے معراج پہ سمجھا جاتا ہے آج بھی وہاں تیرہ نمبر کا کوئی ہوٹل نہیں لیتا تو یہ بات ہم مشرق کے جاہلوں کی نہیں ہے۔ جہالت سے تو صرف وہ نور اور روشنی نکال سکتی ہے جو خدا کی طرف سے ملتی ہے اور جو قرآن کے اندر موجود ہے۔ جہاں یہ نہیں ہے خواہ وہ مشرق کا مذہب پرست ہے یا مغرب کا الحاد پرست کوئی بھی تو اہم پرستی سے نہیں نکل سکتا۔ اندازہ لگائیے کہ ان کے یہ اعتراضات جو رسول ﷺ کے اوپر تھے یہ وہ بیان کرتا ہے اور پھر وہ یہ نہیں کرتا کہ اچھا بھئی! اگر یہ مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ ہو جائے تو ہم اسلام لے آئیں گے تو چلو کوئی حرج نہیں خدا کے لیے کیا مشکل تھا یہ فرشتہ بھیج دے خزانہ دے دے باغ اگا دے اس کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ یہاں ہی نہیں ہے قرآن کریم میں متعدد مقامات پہ یہ ہے کہ وہ آپ سے معجزات طلب کرتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ انا بشر مثلکم میں تو تمہارے جیسا ایک انسان ہوں مجھ سے تم معجزے طلب کرتے ہو؟ اور آپ کو معلوم ہے کہ پھر معجزہ آپ نے جو پیش کیا تھا وہ کیا معجزہ تھا! یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آنے

- ① پھر تو اس کے پاس تکا تک نہیں رہتا، اس کے پلے کچھ نہیں ہوتا۔
- ② ہمارے سر ہانے کے نیچے سے بھی نکلتے تھے، کھانا مانگ کر کھاتے تھے۔
- ③ چلے جا رہے ہیں اور بخشش اس قدر کیے جاتے ہیں۔

والی ہے کہ ان کے سامنے کوئی فرشتہ آتا نہیں جس کو وہ دیکھ لیں، کوئی اور علامات ظاہری ایسی نہیں ہیں جن سے معلوم ہو کہ یہ واقعی خدا کی طرف سے یہ وحی اس پہ نازل ہوتی ہے، خدا کا رسول ہے۔ وہ کس طرح سے اس دعوے کو مانیں کہ میں خدا کا رسول ہوں، میں اپنے ذہن سے خود یہ کچھ پیش نہیں کر رہا بلکہ مجھ پہ وحی نازل ہوتی ہے۔ ثبوت کیا ہے اس کا؟ محسوس ثبوت تو کوئی ہے نہیں۔ وہ سابقہ روش کے مطابق کسی معجزے کا مطالبہ کرتے تھے اور معجزے کے مطالبے میں جواب ملتا تھا کہ میں تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں، تو پھر کیا ثبوت تھا ان لوگوں کے اطمینان کی خاطر کہ جو کچھ میں کہتا ہوں یہ سچ ہے، جھوٹ نہیں ہے، میں فریب نہیں دیتا، میں جھوٹ نہیں بولتا؟ کیا ثبوت تھا اس چیز کا؟

### نبی اکرم ﷺ کی شخصیت بذاتِ خود ایک معجزہ تھی

عزیزانِ من! یہ بڑا غور طلب سوال ہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ سچ ہے، جھوٹ نہیں ہے، وہ میری تخلیق نہیں ہے۔ ان کا یہ اعتراض بظاہر بجا نظر آتا تھا کہ یہ کیسے مان لیا جائے کہ یہ تمہارے اپنے ذہن کی کاوش نہیں ہے، بلکہ خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے، کوئی کرامات نہیں، کوئی معجزات نہیں، کوئی فوق الفطرت بات نہیں، کوئی Super-natural (ما فوق الفطرت) چیز نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کا جواب کیا دیا گیا تھا؟ یہ کہ سنو! فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (10:16) میں کوئی نیا باہر سے نہیں آیا، اجنبی نہیں ہوں جو تمہیں میرے اس ماضی کا پتہ نہ ہو۔ میں نے اپنی ساری عمر تمہارے اندر گزاری ہے۔ تم عقل و فکر سے کام لے کر خدا کو شاہد کر کے کہہ دو کہ جس قسم کی عمر میں نے تمہارے اندر گزاری ہے کیا یہ عمر ایک جھوٹے کی ہوتی ہے یا سچے کی ہوتی ہے؟ میرے اس دعوے کی یہی دلیل ہے کہ جو میں کہتا ہوں وہ صداقت پر مبنی ہے۔ تم کہہ دو کہ کیا یہ ایسا نہیں ہے۔ کیا بات ہے صاحب! مجھ سے نہ پوچھو، تم بتاؤ۔ چالیس سال تمہارے اندر مِّن قَبْلِهِ (10:16) اس دعویٰ کرنے سے پہلے بھی میں نے تمہارے اندر گزاری، میری اس چالیس سال کی زندگی پر نگاہ ڈالو اور پھر خدا کے لیے خود فیصلہ کرو کہ ایسی زندگی ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے۔ جس نے چالیس سال کبھی جھوٹ نہیں بولا، جس نے چالیس سال کبھی فریب نہیں دیا، کیا راتوں رات اس کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ اتنا بڑا



جھوٹ بولنے لگ جائے گا؟ تم بتاؤ۔ اور ان میں سے کسی ایک نے یہ نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ نہیں، تمہاری پہلی زندگی میں بھی کچھ اس قسم کی کوئی بات ہمیں نظر نہیں آئی تھی۔

نوع انسانی کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت کا یہ اصول قیامت تک کے لیے راہنمائی ہے یہ کچھ وہیں نہیں کہا بلکہ جب آپ ﷺ کے خلاف ابوسفیان ہرقل<sup>1</sup> کی مدد لینے کے لیے اس کے دربار میں گیا تھا تو اس وقت اس نے سب کچھ ان کے متعلق کہا تھا کہ یہ کرتے ہیں، وہ کرتے ہیں، رسالت کا دعویٰ کرتے ہیں، نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے وحی آتی ہے۔ اس پر ہرقل نے یہ پوچھا تھا کہ کیا یہ شخص تمہارے اندر کہیں باہر سے آیا ہے؟ کہنے لگے: جی نہیں، ہم میں سے ہے، ہمارا اپنا ہے، عزیز ہے، رشتہ دار ہے، وہاں کا رہنے والا ہے۔ ہرقل نے پوچھا ہی یہ تھا کہ بتاؤ اس کی پہلی زندگی کس قسم کی تھی؟ اس سے نبی ﷺ کے متعلق پوچھ رہا ہے جو آپ ﷺ کے خلاف مدد لینے کے لیے گیا تھا اور میں کہتا ہوں کہ عربوں کا کیریکٹر بھی بڑی چیز ہے۔ وہاں وہ پوچھتا ہے اور یہ اس سے کہتے ہیں کہ پہلی زندگی تو اس کی بڑی پاکباز تھی، تو اس نے کہا کہ پھر جس کی چالیس سال کی زندگی پاکبازی کی گزری ہے وہ یکا یک اس قسم کا نہیں ہو سکتا، جو تم اس کے خلاف کہتے ہو۔ جاؤ، نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ ہے معجزہ، یہ ہے شہادت، یہ ہے صداقت اور یہ چودہ سو سال پیشتر رسول اللہ ﷺ کی ذات پر ختم نہیں ہو گئی، عزیزانِ من! صداقت کا ثبوت آج بھی یہی ہے، آج بھی یہی معیار ہے، یہی میزان ہے جو بھی کسی قسم کے سچے ہونے کا دعویٰ کرے اس کی پہلی زندگی کو دیکھو کہ اس کی ماضی کی ساری زندگی کس قسم کی ہے، اس کے Past (ماضی) کو پرکھو۔ کہ یہ کہے کہ میں نے تمہارے اندر اپنی زندگی بسر کی ہے تم پہچانو کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ ہے کوئی ایک بھی ایسا کہنے والا! صداقت یہ ہے۔ معجزہ طلب کیا جا رہا ہے۔ چھوٹے پیمانے پہ جواب یہ دیا جا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

قلندریم و کرامات ما جہاں بنی است

مجھ سے کرامت مانگتے ہو تم، کرامت یہ ہے کہ میں نے پوری دنیا کو اپنی نگاہوں سے پرکھا ہے۔

زمانگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی

مجھ سے یہ کہتے ہو کہ سونا کیسے بنتا ہے۔ یہ نہ پوچھو مجھ سے۔ یہ پوچھو کہ سونے کو پرکھنے والی نگاہ کیسے پیدا ہوتی ہے۔

<sup>1</sup> بعثت نبوی کے زمانے میں ہرقل بازنطینی سلطنت کا شاہنشاہ تھا۔ شام، فلسطین اور مصر وغیرہ کے علاقے سب اس کے زیر نگیں تھے۔ حدود شام پر قدیم عربی قبائل بستے تھے جنہوں نے مذہب عیسائیت اختیار کر لیا تھا۔ انہی قبائل کے رؤسا ہرقل کی طرف سے ان علاقوں کے حکمران تھے۔ انہیں غسانی کہا جاتا تھا۔

مسلمانوں کے جس قدر تصادمات ان علاقوں میں ہوئے وہ بالواسطہ ہرقل کے ساتھ تھے کہ وہی اس سرزمین کا شاہنشاہ تھا، لیکن بلا واسطہ غسانی حکمرانوں سے ہوئے جو وہاں ہرقل کی نیابت کرتے تھے (پرویز (1987)۔ شاہکار رسالت۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، ص 164)۔  
وحیہ کلبی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک بصری میں حارث غسانی کو لاکر دیا تھا۔ اس نے قیصر ہرقل، بازنطینی سلطنت کا شاہنشاہ کے پاس بیت المقدس میں بھیج دیا تھا (حوالہ شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ناشران قرآن، ص 475) ابوسفیان وہاں پہنچا تھا۔

### نبی اکرم ﷺ کو جادو زدہ کہنے والوں کو قرآن نے ظالم کہا ہے

عزیزانِ من! اور آگے بڑھتے ہیں۔ آگے ایک اور بات آئی۔ کہا کہ **وَ قَالَ الظَّالِمُونَ اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا** (25:8)۔ یہاں ظالم کا لفظ آیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص پہ تو کسی نے جادو کر دیا ہوا ہے، یہ جادو کا مارا ہوا ہے اور ان پاگلوں کو دیکھو کہ یہ اُس کی اطاعت و اتباع کر رہے ہیں جو رجل مسحور ہے، جس پہ کسی نے جادو کر رکھا ہے، وہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ عزیزانِ من! رک جائیے قرآن کے الفاظ پھر سن لیجیے۔ کہا کہ **وَ قَالَ الظَّالِمُونَ** (25:8) یہ ظالم یہ بھی یہاں تک پہنچ جاتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ **اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا** (25:8) اس شخص پہ تو کسی نے جادو کر دیا ہے، اور یہ لوگ اس جادو زدہ یعنی مسحور کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اس کی اطاعت کر رہے ہیں، اس کا اتباع کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: یہ رجل مسحور ہے جس پہ جادو کیا ہے اور یہ ایک جادو زدہ کا اتباع کرنے والے ہیں۔ **وَ قَالَ الظَّالِمُونَ** (25:8) یعنی ظالم یہاں تک کہتے ہیں۔

### جادو کے سلسلہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ کا تفسیری بیان

بات سمجھ میں آگئی کہ قرآن کی رو سے یہ سب سے بڑا اتہام ہے جو حضور ﷺ کے خلاف لگایا گیا۔ کفار نے یہ الزام لگایا۔ قرآن ان کو الظالمون کہہ کر پکارتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے ہاں کے مفسر آپ کے ہاں کے محدث آپ کے ہاں کے علما کیا کہتے ہیں؟ مجھ سے نہ سنئے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی<sup>1</sup> صاحب کی تفہیم القرآن<sup>2</sup> چھٹی جلد کے 554 صفحہ پہ اس کا لکھا ہے کہ ”صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم 7ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا۔“ گویا نبوت کی زندگی تیرہ سال مکے کی سات سال یہ بھی نبی ہوئے کل بیس سال ہو گئے۔ ہاں تو ”خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لبید ابن اعصم سے ملا جو انصار کے قبیلہ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے کہا کہ محمد ﷺ نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں، انہیں قبول کرو اور محمد ﷺ پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں حضور ﷺ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضور ﷺ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں

① مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1903-1979)

② تفہیم القرآن سورۃ التحریم --- سورۃ الناس جلد ششم مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی نمبر 6، 1993، ص 554۔ (7 جون 1972ء کو تفہیم القرآن کی آخری (چھٹی) جلد مکمل ہوئی اور اکتوبر 1972ء میں شائع ہوئی۔ حوالہ روزنامہ جسارت کراچی 25 ستمبر 2003ء، صد سالہ یوم پیدائش پر خصوصی اشاعت،

ص-3)

اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لید ابن اعصم نے خود جادو کیا تھا، اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگر نیاں تھیں، ان سے اس نے جادو کروایا تھا۔ بہر حال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک زکھور کے خوشے کے خلاف میں رکھ کر لید نے بنی زریق کے کنویں ذروان یا ذی اروان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے بادایا۔ اس جادو کا اثر نبی ﷺ پر ہوتے ہوئے پورا ایک سال لگا۔ دوسری ششماہی میں کچھ تغیر مزاج محسوس ہونا شروع ہوا، آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے، مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضور ﷺ پر ہوا، ”زیادہ سے زیادہ جو اثر ہوا، سنئے، وہ بس یہ تھا کہ ”آپ گھلتے چلے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا تھا“۔ خدا کا نبی ﷺ دین کو پہنچانے کے لیے جو آیا ہوا ہے! یا للعجب!! بس اتنا اثر ہوا ”کہ آپ گھلتے چلے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوئے تھے، اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔“ یہ ہے اثر، جو ان پہ ہوا۔ ماتھاپٹے، عزیزان من! قرآن کی آیت آپ کے سامنے ہے۔ گھر جا کے یہ نسخہ خود نکالے، سورۃ الفرقان کی آٹھویں آیت وَقَالَ الظَّالِمُونَ اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا (25:8) ہے۔ یہ ظالم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس شخص پہ تو کسی نے جادو کیا ہوا ہے اور یہ جادو زدہ کا اتباع کر رہے ہیں۔ یہاں تک اس کے خلاف اتہام لگا رہے ہیں اور یہ ہیں کہ وہ اس جادو کی تفصیل دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یہ مسور ہے، جادو کا اثر بتا رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا اثر ہو۔ گھلتے چلے جا رہے ہیں، کسی بات کے متعلق کہتے ہیں نماز کے متعلق سمجھتے ہیں پڑھ لی ہے، نہیں پڑھی ہوتی۔ اس حد تک معاف رکھیں، میری بیٹیاں، میری بہنیں کہ ازواج مطہرات کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ﷺ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوئے، بعض اوقات آپ ﷺ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا۔

قرآن حکیم کے ارشاد کے برعکس یہ روایات شہادت قرار پا گئیں

جب ان پہ اعتراض کیجیے کہ صاحب! آپ نے یہ کیا لکھ دیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ ظالمین کفار کی طرف سے اتہام تھا جو حضور ﷺ پہ لگا۔ آپ اس اتہام کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں جو حضور ﷺ کے اوپر کفار اور ظالم لگاتے تھے کہ ”آپ رَجُلٌ مَّسْحُورٌ تھے اور اس کا یہ اثر بھی ہوا تھا۔ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ کہا کہ صاحب! یہ روایات میں آیا ہے۔ چل، بھئی! قرآن کی آیت پیش کر رہے ہیں

قرآن کہہ رہا ہے خدا کہہ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ یہ فرما رہے ہیں کہ صاحب! روایات میں یہ آیا ہے۔

یہ بات عقیدت مندی کی نہیں بلکہ مفاد پرستی کی ہے

عزیزان من! یہاں سے ایک بڑی اہم بات سامنے آتی ہے۔ اسے سن رکھیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ حضرات روایات یا جنہیں احادیث کہتے ہیں ماننے پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن اور حدیث دو چیزیں دین کا مآخذ ہیں لہذا کسی کے خلاف سب سے بڑا الزام منکر حدیث ہونا ہے کیونکہ پھر وہ مسلمان بھی نہیں رہتا۔ کتنا زور دیتے ہیں۔ بظاہر یہ نظر آئے گا کہ انہیں واقعی جو یہ احادیث ہیں جن کو آپ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات تھے حضور ﷺ کے اعمال تھے ان سے بڑا ہی لگاؤ ہے بڑی عقیدت ہے اس واسطے یہ اس پہ بڑا زور دیتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ انہیں حضور ﷺ کے خلاف (معاذ اللہ، معاذ اللہ، صد بار معاذ اللہ) حضور ﷺ کے خلاف دین کے خلاف یہ کچھ کہنے کے لیے گنجائش مل جاتی ہے ان کا مشن یہ ہے مجھے کہنے دیجیے کہ کم از کم آنے والی نسلوں کو اسلام سے برگشتہ کر دیا جائے اور اس کا نہایت لطیف بڑا معصوم بڑا مقدس سا طریقہ ہے کہ آنے والی نسل کے نوجوانوں کے پاس ایک حدیث یہ بیان کر دیجیے کہ یہ تھا تمہارا رسول ﷺ (معاذ اللہ)۔

جمع شدہ روایات کی کیفیت

حدیثیں وضع کرنے والوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ اتنی تعداد میں گھڑی گئیں وضع کی گئیں<sup>①</sup>۔ امام بخاری<sup>②</sup> اپنے مجموعے میں لکھتے ہیں کہ مجھے چھ لاکھ حدیثیں ملیں۔ ان میں سے میں نے چھ ہزار اور کچھ حدیثیں ہیں جن کو صحیح سمجھ کر الگ کیا۔ پانچ لاکھ ستانوے ہزار دو سو اڑتیس (597238) کو انہوں نے مسترد کر دیا۔ یہ ایک جامع مجموعہ حدیث ہے۔ باقیوں کے متعلق پوچھو نہیں۔ گویا اتنی زیادہ حدیثیں بنیں اتنی زیادہ وضع ہوئیں۔ اسلام کے دشمنوں نے حضور ﷺ کو بدنام کرنے والوں نے یہ تمام وضع کیں۔ ان کتابوں کے اندر وہ لکھی گئیں۔ انہوں نے تو یہ کر دیا اب ان کے بعد جو آئے انہیں تو یہ چاہیے تھا کہ انہیں پرکھ کر دیکھتے اور پہلی چیز یہ کہتے ہیں کہ نہیں یہ قابل قبول نہیں یہ قرآن کے خلاف ہیں۔ یہی جو حدیث ہے میں کہہ رہا ہوں کہ قرآن کی یہ آیت موجود ہے کہ حضور ﷺ کے اوپر یہ کفار اور ظالم اتہام لگاتے تھے۔ اس روایت کو تو اٹھا کے پھینک دینا چاہیے تھا کہ یہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہ کسی دشمن اسلام نے حضور ﷺ کے کسی سب سے بڑے عدو نے وضع کی ہے۔ یہ افسانہ ہماری حدیثوں کی کتاب کے اندر صحیح بخاری کے اندر درج کر دیا ہے۔ یہ کہہ کے اس کو مسترد کر دینا چاہیے تھا کہ یہ قرآن کے خلاف ہے مگر یہ ہیں کہ اسے مسترد نہیں کرتے رکھے ہوئے ہیں نصاب میں شامل ہیں۔ آپ کے ہاں یہ کتابیں درسوں میں شامل ہیں ان کے ختم ہوتے ہیں ان کو غلط کہنے والا منکر حدیث قرار پاتا ہے۔ کیوں رکھی ہوئی ہیں؟ معاف رکھیے

گا، ان میں بڑی گنجائش نکلتی ہے۔ اگر مودودی<sup>③</sup> صاحب اپنی طرف سے یہ کچھ کہتے، یہی مسلمان ان کا گلا پکڑ لیتے۔ انہوں نے کہا کہ

① تفصیل کے لیے دیکھیے: (پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الحج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005ء، ص 187 تا 242۔

② امام محمد اسماعیل بخاری (260-194ھ)، مجموعہ حدیث صحیح بخاری

③ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979)

صاحب! یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے، انہی جیسا کوئی بخاری میں رکھ گیا اور اب یہ اس کی حفاظت کرتے چلے آ رہے ہیں، اس لیے کہ اس سے گنجائش نکلتی ہے۔ عزیزانِ من! یونہی کسی کے سراہام نہیں لگاتا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس سے گنجائش نکلتی ہے۔ سنیے، گنجائش کیسے نکلتی ہے۔ بات چلی ہے تو پھر آج سن ہی لیجیے کہ اس سے اپنے بعض کاموں کے متعلق سند بہم پہنچانے کی گنجائش نکلتی ہے۔

حکایت قد آں یارِ دلنواز کنیم

بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

مودودی صاحب کے طرزِ عمل پر بعض جید حضرات کا اعتراض اور علیحدگی

مودودی<sup>①</sup> صاحب نے اپنی جماعت تقسیم ہند سے پہلے 1941ء<sup>②</sup> میں بنائی۔ بہت سے لوگ اس میں شامل ہوئے۔ تقسیم کے بعد ان میں سے بہت سے یہاں پاکستان میں بھی ساتھ آ گئے۔ یہ اچھے جید لوگ تھے۔ انہوں نے 1956ء<sup>③</sup> میں ان سے علیحدگی اختیار کی۔ وہ معرکہ بہت قابل ذکر تھا۔ انہوں نے ان سے یہ کہا کہ جماعت بناتے وقت آپ جو اصول ہمیں دیا کرتے تھے، وہ بڑے بلند اصول تھے۔ ہم اسی لیے اس جماعت کے ساتھ ہوئے تھے آپ کے ساتھ ہوئے تھے۔ لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ آپ ان کی خلاف ورزی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ آپ کی روش کیا ہے؟ ہم کس طرح آپ کا یہ ساتھ دیں؟ آپ اقامت دین کا دعویٰ کرتے ہیں۔ عمل اور روش یہ ہے کہ بلند و بالا اصولوں کو اس طرح توڑتے چلے جا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! پتہ ہے اس کا جواب کیا دیا؟ کہا تھا کہ اگر میں یہ کر رہا ہوں تو اپنی طرف سے تو نہیں کر رہا۔ یہ تو اتباع سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ حضور ﷺ بھی تو ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ جی! سن لیجیے۔ ان کے جواب میں لکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کے اصولوں میں ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ یہ اصول تھا۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا ہے اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ حضور ﷺ نے یہ کیا۔ قرآن نے بھی یہ اصول بیان کیا۔ حضور ﷺ نے اس پر عمل بھی کیا۔ یہ سب کچھ ہوا

لیکن مودودی<sup>1</sup> صاحب کے ساتھیوں نے ان پہ الزام یہ دیا تھا کہ آپ وہاں جب تک انڈیا میں تھے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش نہیں تھی

① مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979)

② 26 اگست 1941ء کو لاہور میں 75 افراد کا تاسیسی اجتماع ہوا اور جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی۔ اس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا جماعت اسلامی

کے امیر کی حیثیت سے انتخاب ہوا۔ (حوالہ روزنامہ جسارت کراچی 25 ستمبر 2003ء، صد سالہ یوم پیدائش پر خصوصی اشاعت، ص-3)

③ 1957ء میں ماچھی گوٹھ میں جماعت اسلامی کا چوتھا کل پاکستان اجتماع ہوا۔ (حوالہ روزنامہ جسارت کراچی 25 ستمبر 2003ء، ص-3)

بڑے بڑے اصول دیئے۔ اب یہاں اقتدار کے حصول کے لیے جو آپ کوشش کر رہے ہیں، تو آپ نے وہ اصول توڑ دیئے۔ کیوں؟

## اتباع سنت کے نام پر خود ساختہ عمل کی دو ایک مثالیں

مودودی صاحب نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مساواتِ انسانیہ کے بڑے بلند اصول دیئے، قرآن نے بھی یہ کہا، حضور ﷺ نے کر کے بھی دکھایا لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ ﷺ نے ہدایت دی کہ امام قریش میں سے ہو۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملے میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیے کے طور پر پیش کیا گیا تھا، آپ کسی شخص کے متعلق کہیے کہ یہ بڑا بے اصول ہے، اس کے بعد اس کے کیریئر کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ انہوں نے مودودی صاحب سے کہا کہ تم نے وہ سارے اصول توڑ دیئے جو ابتدا میں دیا کرتے تھے۔ جن کی بنا پر ہم ساتھ ہوئے تھے۔ اب کہہ رہے ہیں کہ میں نے توڑ دیئے ہیں تو کون سا جرم کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ کیا تھا۔ وہ ساری عمر مساواتِ انسانیہ کی تعلیم دیتے رہے، قرآن مجید کا یہ حکم تھا۔ کہتے ہیں کہ ابتدا میں کچھ قائم کرنے کی بھی کوشش کی لیکن جب مملکت کی فرمانروائی کا سوال آیا تو یہ کہا کہ مملکت کی فرمانروائی میرے خاندان کے اندر رہے گی، باہر نہیں جائے گی۔ کہا کہ یہ وہ سارا اصول جو کلیے کے طور پر تھا، توڑ دیا۔ میں نے کیا جرم کیا؟ یہ روایت اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ یہ وضعی ہے، بنائی ہوئی ہے غلط ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ ان کے اپنے سند کے اعتبار سے بھی جو معیار ہیں، ان کے لحاظ سے بھی یہ غلط ہے لیکن انہوں نے یہ روایت رکھی ہوئی ہے۔ ”اے کھوٹا پیسہ کسے ویلے کم آئے۔“<sup>1</sup> کام اس وقت آتا ہے کہ جب الزام دیا جاتا ہے کہ آپ نے سارے اصول توڑ دیئے، کیوں؟ کہا کہ یہ دیکھیے روایت موجود ہے، حضور ﷺ نے ایسا کر دیا (معاذ اللہ، معاذ اللہ)۔ اس کا ریفرنس (حوالہ) ہے: ”رسائل ومسائل“ حصہ چہارم، 329 صفحہ۔ جی اور سنیہ۔ انہوں نے کہا کہ آپ تو کبھی کبھی جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے بولتا ہوں، بھئی۔ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ کہنے لگے: سنت نبوی کا بھی تو اتباع کرنا چاہتا ہوں۔ سنیہ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہا کہ راست بازی اور صداقت شعارِ اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ

بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے، واجب ہو جاتا ہے جھوٹ بولنا۔ یعنی اگر اس وقت سچ بولا جائے تو انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ کہا کہ صاحب! اس کی سند کیا ہے؟ کہنے لگے: سند موجود ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ یہودی کعب بن اشرف کے قتل کے لیے جب حضور ﷺ نے محمد بن مسلمہ کو مامور کیا، ایک یہودی کو خفیہ طور پر سازش کے ماتحت قتل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی ♦ کو متعین کیا، تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں۔

❶ (تاکہ) یہ کھوٹا سکھ کسی وقت کام آ سکے۔

حضور ﷺ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ ”سازش سے خفیہ طور پر قتل“ پہلی چیز ہے ”فریب دے کر“ دوسری چیز ہے۔ آگے وہ تشریح ہے کہ یہ گئے۔ انہوں نے اس کو گلے سے لگایا، اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ چاندنی رات ہے، چلو باہر جا کے شعر و شاعری کریں۔ کم بخت کہاں گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہ بہلا کر اسے تخیلے میں لے گئے۔ پھر وہاں جا کے ان کو کسی طرح قتل کیا۔ یہ کہتے ہیں کہ انہوں ♦ نے فریب سے قتل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے اس چیز کی اجازت مانگی تھی یعنی (پہلے تو رسول اللہ ﷺ نے مامور کیا) انہوں نے اجازت مانگی کہ مجھے کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو جھوٹ بولدوں۔ آپ ﷺ نے بالفاظِ صریح اس کی اجازت دی۔ یہ روایت کا ہے کہ لیے انہوں نے رکھی ہوئی ہے۔ اس کو سچ کہتے ہیں تاکہ اپنا جو جھوٹ ہے اس کے لیے سند مل جائے۔

مجھے تو تجھ سے گلہ ہے اے مسلمان، ان سے نہیں

عزیزانِ من! ہمارے ساتھ تو یہ ہوا ہے۔ یہ آپ کے ہاں کی روایات جنہیں کتب احادیث کہتے ہیں، ان میں یہ سب کچھ موجود ہے اور ان کی موجودگی پر مجھے تعجب نہیں ہے اس لیے کہ اس زمانے میں یہ نہیں کہ بیچارے جامعین حدیث نے کس قسم کی حدیثیں رکھیں۔ اس زمانے میں تو چھاپے خانے بھی نہیں تھے۔ چھپی ہوئی کتابوں میں آج یہ کچھ کر دیتے ہیں تو اس زمانے میں اس قسم کی حدیثوں کو ان کتابوں کے اندر داخل کر دینا مشکل کیا تھا۔ تعجب تو آگے یہ ہے کہ ان تمام چیزوں پہ زور دیا جاتا ہے کہ ان کو سچ مانو۔ آپ حیران ہوں گے کہ اہل حدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ صحیح بخاری، مذکورہ حدیث بھی صحیح بخاری کی ہے، اور مسلم<sup>❶</sup> کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ ان حدیثوں سے اگر آپ انکار کریں تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ میں کہہ صرف یہ رہا ہوں کہ یہ نہیں ہے کہ ان حدیثوں سے اس قسم کی چیزوں سے ان کو بڑی محبت ہے۔ وہ کون ایسا کم بخت ہے کہ جو نبی اکرم ﷺ کی ذات پر ایمان لانے سے مسلمان ہو اور حضور ﷺ کا اس قسم کا کردار وہ اپنے ذہن میں رکھے۔ کون مسلمان اس کو گوارا کر سکتا ہے! انہوں نے یہ چیزیں اس لیے رکھی ہوئی ہیں کہ جب خود اپنا اصول توڑنا ہو تو اس کے لیے یہ سند مل جائے۔ جب خود جھوٹ بولنا ہو تو اس کے لیے گنجائش رکھ دی

جائے کہ جی روایت میں یہ آیا ہے اور یہ نہیں سوچتے کہ اپنا تو ذرا سا ہی اس میں کچھ فائدہ ہوگا، اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے متعلق غیر مسلم دنیا کیا تصور قائم کرے گی۔ کوئی حمیت نہیں، کوئی غیرت نہیں، ناموس رسالت ﷺ کا کوئی پاس نہیں، اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ جو کم بخت یہ کہے کہ نبی اکرم ﷺ کا احترام اور عزت اور حضور ﷺ کی ناموس مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں یہ چیزیں آپ کی طرف منسوب کروں کہ آپ ﷺ ایسے تھے اسے کہا جاتا ہے کہ یہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ عزیزانِ من! جو میرے خلاف بیس سال

① امام مسلم بن حجاج (204-261ھ) وطن نیشاپور، مجموعہ حدیث صحیح مسلم۔

سے ڈگدگی بک رہی ہے کہ یہ مرتد ہے، ملحد ہے، بے دین ہے، وہ یہ ہے کہ میں ان حدیثوں کے متعلق ان روایتوں کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ یہ وضعی ہیں، یہ اسلام اور حضور ﷺ کے دشمنوں نے وضع کی ہوئی ہیں، یہ سچی نہیں ہو سکتیں۔

### حدیث کو پرکھنے کا معیار

میرے نزدیک حدیث کے پرکھنے کا یہ معیار ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف جاتی ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتی۔ میں رسول اللہ ﷺ کی کسی سچی حدیث سے انکار نہیں کرتا۔ پہلی چیز یہی حدیث جو جادو والی ہے، قرآن کہتا ہے کہ یہ ظالم کافر حضور ﷺ کے خلاف اتہام لگاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو حدیث یہ کہتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہ جادو ہوا تھا اور اثر ہوا تھا، قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے۔ دوسرا معیار یہ ہے کہ اگر قرآن کی آیت صریح نہ بھی ہو، تو بھی ہر وہ روایت جس سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت اقدس ﷺ پہ کوئی طعن پڑتا ہو یا صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی ناموس کو یا حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کو داغدار کرتی ہو، میرے نزدیک وضعی ہے، افسانہ ہے، دشمنوں کی بنائی ہوئی ہے، سچی نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ چیز کفر ہے، میں اپنے اس کفر پہ نازاں ہوں۔ ان حدیثوں ان کے راویان اور ان کے جامعین میرے نزدیک اگر ان کی ان چیزوں سے رسول اللہ ﷺ کی ذات پر ذرا سا بھی داغ آتا ہے تو میرے نزدیک حضور ﷺ کے احترام کے مقابلے میں ان کا احترام کوئی شے نہیں ہے۔ میں حضور ﷺ کی ذات اقدس کے اوپر ایمان لا کر مسلمان ہوا ہوں اور ایمان کے معنی یہ ہیں کہ میں حضور ﷺ کے کیریکٹر کو حضور ﷺ کی سیرت کو دنیا کے سب سے بلند ترین انسان کی سیرت مانتا ہوں لیکن یہ یاد رکھیے جو میں نکتہ بیان کرتا ہوں کہ یہ بعض دان چیزوں کو رکھے ہوئے ہیں۔

### حدیث کے متعلق مودودی صاحبؒ کے تصورات اور قرآن حکیم کی تعلیم کے نتائج

آپ حیران ہوں گے کہ انہی مودودی صاحبؒ کا بیان یہ ہے کہ میں ہر اس حدیث کو صحیح نہیں مانتا، جو ان کتابوں میں درج ہو چکی



ہے، میں اپنی بصیرت سے ہر حدیث کو پرکھتا ہوں، میں مزاج شناس رسول ہوں، میری بصیرت جس حدیث کو سچا کہتی ہے میں اسے سچا مانتا ہوں۔ تو مودودی صاحب کی بصیرت ان حدیثوں کو سچا مان رہی ہے۔ اہل حدیث کی تو مجبوری ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں جو آگیا ہے ہم اس کو سچا ماننے پہ مجبور ہیں۔ چھوڑ دیجیے ان کو۔ میں ان سے کچھ بھی تعرض نہیں کرتا۔ یہ تو کہتے ہیں کہ میں ان میں سے بھی اس حدیث کو صحیح مانتا ہوں جسے میری بصیرت صحیح قرار دیتی ہے، تو گویا انہیں جب Quotes (حوالہ دینا) کرتے ہیں، درج کرتے ہیں تو

❶ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979)

انہوں نے جنہیں اپنی بصیرت کے مطابق صحیح سمجھا ہے تو جو بصیرت ان کی رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو پیش کرتی ہے، خدا کرے کہ وہ آنکھیں اندھی ہو جائیں۔

عزیزانِ من! یہ ہے سارا مسئلہ حدیث کے اقرار و انکار کا۔ اس معاملے میں قرآن کہتا ہے کہ وَقَالَ الظَّالِمُونَ اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا ❶ (25:8)۔ ظالم یہ بھی کہتے ہیں اور قرآن اُنْظُرْ (25:9) کہتا ہے کہ ارے دیکھو لوگو! او دیکھو لوگو! کہ کَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْاَمْثَالَ (25:9) اے رسول! تیرے خلاف یہ کس کس قسم کی باتیں کرتے ہیں، کیسے کیسے اتہام لگاتے ہیں: اُنْظُرْ (25:9) دیکھو تو سہی۔ یہ خدا کہہ رہا ہے۔ فَضْلُوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيْلًا (25:9)۔ ان لوگوں نے صحیح راستے چھوڑ دیئے، یہ گمراہ ہوئے ہیں، اور جب تک یہ کچھ کہتے رہیں گے، ان کو صحیح راستہ مل ہی نہیں سکے گا۔ چودہ سو سال سے پیشتر زمانے کے جو لوگ تھے ان کی بھی یہ صورت تھی، آج بھی جو ان چیزوں کو صحیح مانتا ہے قرآن کے اس فیصلے کے مطابق، وَهَافُضْلُوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيْلًا (25:9) گمراہ ہے، اسے صحیح راستہ مل نہیں سکتا، جب تک کہ وہ ان چیزوں کو سچا مانتا چلا جا رہا ہے۔ کہا کہ تَبَرَّكَ الَّذِي اِنْ شَاءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذَلِكَ جَنَّتِ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ وَيَجْعَلُ لَكَ قُصُوْرًا (25:10) یہ کہہ رہے ہیں کہ خزانہ کیوں نہیں مل رہا، باغات کیوں نہیں آ رہے۔ کہا کہ یہ خزانے اور باغات معجزہ کے طور پر، کرامات کے طور پر مل جائیں؟ یہ ایسے نہیں ہوگا، ذرا انہیں انتظار کرنے دو اور پھر دیکھو کہ یہ تو ایک بات کہتے ہیں، قیصر و کسریٰ کی تہذیبوں اور ان کی زمینوں کے کتنے باغات تمہارے پاؤں کے نیچے آتے ہیں۔ ذرا انتظار کرو۔ ان سے کہو کہ دیکھو تو سہی، کیسے آتے ہیں؟ یہ ہے معجزہ! کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ خزانے نہیں، کچھ بستیاں نہیں، ان سے کہو: وَيَجْعَلُ لَكَ قُصُوْرًا (25:10) دیکھنا کیسے کیسے محلات آتے ہیں، میں تو ایک طرف رہا، میرے غلاموں کے پاؤں کے نیچے دیکھو گے کہ قیصر و کسریٰ کا تخت آ جائے گا۔ خدا کہہ رہا ہے کہ ان سے کہو کہ ذرا انتظار کریں لیکن آسمانی معجزے کے طور پر نہیں بلکہ اس معجزے سے جو تم اور تمہارے ساتھی اپنے قوت بازو سے دکھاؤ گے کیونکہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا

الصِّلَحَتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (24:55) ہمارا یہ وعدہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا کے اندر مملکت، سلطنت، حکومت ہے۔ یہ تم لوگوں کو مل کر رہے گی اور تاریخ اس چیز کی شاہد ہے کہ حضور کی حیاتِ طیبہ میں سارا عرب حضور کے زیر نگیں تھا۔ اتنی بڑی مملکت کے مالک حضور ہوئے تھے اور اس کے بعد جو حضور کے ساتھی معہ تھے وہ چند سالوں کے عرصے میں چھا گئے۔

❶ یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایسے شخص کی پیروی کیوں کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے (اور اس طرح اس کا دماغ چل گیا ہے۔) (پرویز: مفہوم القرآن ص-817)۔

عزیزانِ من! پوری تاریخِ عالم آج تک انگشتِ بدنداں ہے کہ چند سال کے عرصے میں ہزار ہا سال سے متمکن چلی ہوئی، ایران اور روما کی دونوں تہذیبیں جو دنیا میں اس زمانے میں، دوہی تہذیبیں تھیں، کا تختہ الٹ کے رکھ دیا۔ صاحب! حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45AD) میں ایک مدائن<sup>❶</sup> کی جو فتح ہے اسے دیکھو کہ انہیں اس ایک ایران سے کیا کچھ ملا تھا۔<sup>❷</sup> یہاں (25:10) میں جَنَّتِ آیا ہے تو یہ باغات کہہ رہے ہیں۔ خزانے کتنے ملے تھے، کیا کچھ وہاں سے حاصل ہوا تھا، بڑی لمبی چوڑی تفصیل ہے اس کی۔ اور یہ ساری عراق کی زمینیں، مصر کی زمینیں، بازنطینی ایمپائر کی زمینیں ان کے باغات یہ سب کچھ ملا تھا۔

قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ تَبَرَّكَلِّلْدِي (25:10)۔ وہ تَبَرَّك ہے جہاں سے یہ سورۃ الفرقان شروع ہوئی ہے۔ یاد ہے جو میں نے بتایا تھا کہ وہ جو اپنے مقام کے اوپر جم کے بھی کھڑا ہوا اور نشوونما بھی پاتا چلا جائے اسے تبارک کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وہ ہے خدا کی ذات جو ایسی فراوانیوں اور خوشگوار یوں کی مالک ہے۔ تم اپنے اصولوں پر مستحکم رہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے اس شجرِ طیب قرآن نے (14:24) میں یہ کہا ہے کی جڑیں پاتال میں ہوں اور اُس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تمہارا یہ نظام جس کے مشکل کرنے کی تم کوشش کر رہے ہو اس قسم کے پھل لائے گا اور آپ دیکھیں گے۔ ان سے کہو کہ تھوڑا سا انتظار کریں۔ اس انقلاب کو آنے دیں کہ جس کے نتیجے میں یہ کچھ ملے گا اور جسے یہ کہہ رہے ہیں کہ بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ (25:11) نہیں، یہ غلط ہے، یونہی دھمکیاں ہیں، وہ انقلاب کیسے آئے گا۔ یہ لوگ اس انقلاب کو جھٹلاتے ہیں۔

عزیزانِ من! اب درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ ہم سورۃ الفرقان کی آیت 10 تک آگئے 11 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

❶ مدائن مملکت ایران کا دارالسلطنت (Capital) تھا۔ فتح مدائن 16ھ بمطابق 637ء کو حضرت سعدؓ کے زیرِ کمان ہوئی۔ اس وقت یزدگرد سلطنت ایران کا حکمران تھا۔

- ② ہیکل اور دیگر مورخین کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق حضرت سعد کو کسریٰ کے خزانوں سے تیس کھرب دینار ملے اور محل (قصر ابیض) میں جو ساز و سامان تھا، اس کی قیمت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ساٹھ مربع گز کا تو صرف ایک قالین تھا جس پر مملکت کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی، جا بجا موتیوں کی نہریں تھیں، کناروں پر چمنستان تھا جس پر منقوش درختوں کے تنے سونے کے، پتے ریشم کے اور پھل جواہرات کے تھے۔ حضرت سعدؓ نے عمر فاروقؓ کو لکھا تھا کہ یہ تمام زرو جواہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہ تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لاکر قائد کے سامنے رکھ دیا۔ یہ معلوم ہونے پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکے گی؟ اس کے جواب میں جو کچھ حضرت علیؓ نے فرمایا اس دیانت اور امانت کا راز اس میں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ”چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لیے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو اس کی نیت میں فرق آ جاتا (حوالہ ہیکل)۔“
- پرویز: شاہکار رسالت، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور (1987) ص 181 تا 182



## چوتھا باب: سورة الفرقان (آیات 11 تا 16)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عزیزانِ من! آج جنوری 1978ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 11 سے ہو رہا ہے: (25:11)۔

### سابقہ درس کی بازگشت: نبی اکرم ﷺ کی معاشرتی زندگی

سابقہ آیات میں بیان یہ چلا آ رہا تھا کہ نبی اکرم ﷺ معاشرہ میں ایک عالمگیر انقلاب کا پیام دے رہے تھے اور مفاد پرست گروہ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ کی زندگی کا آخری دور ہے جس میں ان کی مخالفت ابھی میدانِ جنگ تک نہیں پہنچی تھی۔ اس سے پہلے جس قدر حربے استعمال کیے جاتے تھے وہ کر رہے تھے۔ ان میں تکذیب سب سے بڑی چیز تھی، یعنی ہر بات کو جھٹلانا، اعتراضات کرنا، الزامات لگانا، استہزاء کرنا، مذاق اڑانا اور پھبتیاں کسنا۔ آخری چیز اس میں یہ آئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ یہ خدا کا رسول ہے اور کیفیت اس کی یہ ہے کہ یہ عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں سودا سلف لینے بھی جاتا ہے، تو یہ اس قسم کا آدمی خدا کا رسول کیسے ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی بات تو فوق البشر ہونی چاہیے، الوہیت کا کوئی انداز ہونا چاہیے اس کے جلو میں فرشتے آئیں، گویا آگے آگے گل پوش کرتے ہوئے پائلٹ کی طرح لوگوں کو آگاہ کرتے ہوئے چلے جائیں کہ پیچھے ہو جاؤ، صاحب چلا آ رہا ہے، اور اس طرح وہ لوگوں کو ڈرائیں۔

یہاں کہا ہے کہ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرٌ (25:7)۔ کیا بات ہے! لوگوں کے آگے وہ چلے جا رہے ہوں، لوگوں کو ڈراتے جا رہے ہوں: بچنا، دیکھنا، ہوشیار رہنا، ملاحظہ، بادب، ہوشیار۔ اس کے ساتھ یہ کچھ نہیں ہے۔ یہ خود ہی جاتا ہے، خود ہی جا کر بازاروں سے سودا سلف لے کر آتا ہے، کوئی خزانہ اس کے پاس نہیں ہے، اور کچھ نہیں تو عربوں کے ہاں تو سب سے بڑی متاعِ حیات جاگیرِ باغات ہوتے تھے، وہ تو جہاں پانچ سات کھجور کے پیڑ ہوتے تھے، اسے باغ کہا کرتے تھے، تو انہوں نے کہا کہ اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کچھ باغات ہی ہوتے۔ ان چیزوں میں سے ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں، یہ کس قسم کا رسول ہے اور جواب میں صرف اتنا سا فقرہ کہا تھا

کہ ان سے کہو کہ تھوڑا سا انتظار کریں۔ یہ دیکھیں گے کہ انہی کے ارد گرد دو تہذیبیں، جو ایران اور بازنطینی ایمپائر کی ہیں، ان کے کتنے لہہاتے باغات اس کے پاؤں تلے آجاتے ہیں۔ بس تھوڑا سا انتظار کریں، انہیں یہ سب کچھ نظر آجائے گا۔ وہ کہتے تھے کہ تم تو بس ایک ہو، کوئی بڑا گروہ بھی تمہارے ساتھ نہیں ہے اور کہتے یہ کچھ ہو۔ کتنے دن انتظار کریں۔ جواب تھا کہ بس تھوڑا سا انتظار کرو اور دیکھو کہ کتنے ہی دفائن اور کتنے ہی خزانے اس کے قبضے میں آجاتے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ ۖ وَاعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا ۝ اِذَا رَأَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغِيْظًا وَزَفِيرًا ۝ اِذَا اَلْقَوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنَيْنِ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا ۝ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَّاحِدًا وَّادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا (25:11-14)۔ یہ عجیب آیات آگئیں۔ کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ ”الساعة“ کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو میں نے دہرا دیئے ہیں۔ یعنی یہ جھٹلاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ غلط بات ہے، ایسا نہیں ہو سکتا گا۔ تکذیب کرتے ہیں۔

اب لفظ آگیا ”الساعة“۔ یعنی ساعت کی تکذیب کرتے ہیں اور آگے یہ ہے کہ جب ”الساعة“ آئے گی تو پھر انہیں پتہ چلے گا کہ وہ ہوتی کیا ہے، یہ سچ بن کر بھی سامنے آجائے گی اور پھر یہ چیزیں بھی انہیں نظر آجائیں گی۔ دور سے ہی اس کی آواز سنیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قدر ہوش ربا چیز ہے اور جب اس کے اندر گر جائیں گے تو یہ دیکھیں گے کہ زنجیریں پہنائی ہوئی ہیں، کوٹھڑیوں کے اندر بند کیے ہوئے چیختے چلاتے ہیں۔ اس وقت وہاں یہ ایک تباہی کو آواز دیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ ایک تباہی نہیں، بہت سی تباہیاں ہیں۔ یہ شخص ہے ان آیات کا۔

### قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کو روز قیامت پر اٹھارکھنے کا نتیجہ

بات ہے الساعۃ کی اور کہا یہ ہے کہ یہ الساعۃ کی تکذیب کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو جب دین نے مذہب کی شکل اختیار کی تو قرآن کریم کی یہ جو قیامت، الساعۃ اور مکافاتِ عمل، انسانی اعمال کے نتائج کے ظہور وغیرہ کی اصطلاحات تھیں، ہم نے ان سب کو مرنے کے بعد کی جو قیامت ہے، اس پر اٹھارکھا ہے کہ یہ سب کچھ وہاں ہوگا۔ اس لیے کہ یہاں تو پھر مذہب میں جو بھی مذہبی امور ہوتے ہیں، اعمال ہوتے ہیں، رسوم ادا کی جاتی ہیں، پرستش کی جاتی ہے، عبادت کی جاتی ہے، اُن کا کوئی مرئی (Visible) نتیجہ یہاں تو سامنے آتا ہی نہیں، تو اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ تم کراتے ہو، کرتے بھی ہو، لیکن بے نتیجہ ہے جب کہ دوسری طرف سے جواب یہ ہوتا ہے کہ نہیں، یہ بے نتیجہ نہیں ہیں، اس کا نتیجہ ضرور نکلے گا، اس دنیا میں نہیں نکلے گا، آخرت میں جا کے نتیجہ نکلے گا۔ اب اس کو تو کوئی جھٹلا ہی نہیں سکتا، نہ Verify (تصدیق) کر سکتا ہے۔ اس کے لیے تو آپ کو صرف ایک عقیدے کی ضرورت ہے کہ وہاں جا کے نکلے گا اور یہاں تو کچھ نہیں

ہوگا۔ یہاں جب دن بدن حالت غیر سے غیر ہوتی گئی، پستیاں اور دلتیں اس قوم پہ مسلط ہوتی گئیں، تو کہہ دیا کہ خدا اپنے نیک بندوں کو آزماتا رہتا ہے۔ چلیے، تو اب اس چیز سے ہی کہ ہم ذلیل و خوار ہو گئے، ایک ذہنی Satisfaction (طمینانیت) ہو گئی کہ ہم خدا کے اور محبوب بندے بنتے چلے جا رہے ہیں۔ یوں اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا اور کہا گیا کہ یہ جو دنیا ہے یہ ان مفاد پرستوں کے لیے ہے، باطل پرستوں کے لیے، کفار کے لیے، ملحدین کے لیے، فاسق و فاجر کے لیے ہے بس قیامت میں جنت سب تمہارے لیے ہے، یہ چند دن کی بات ہے، انہیں سب کر لینے دیجیے، بس آخرت میں یہ سب جہنم میں جائیں گے اور تم سب جنت میں چلے جاؤ گے۔ یہ ایک عقیدہ ہے۔

انسان کی موجودہ زندگی نتائج کے لحاظ سے ایک کسوٹی ہے

یہ ٹھیک ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی برحق ہے۔ اس پہ ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن کریم اقوام کے اعمال کے لیے ظہور نتائج کا وقت مرنے کے بعد قیامت کا، اور حشر کا دیھاڑہ ہی نہیں مانتا، وہ اس دنیا کے اندران کے نتائج کو سامنے لاتا ہے اور یہی ہے وہ کسوٹی جس سے یہ چیز پرکھی جاسکتی ہے کہ ہمارے کام خدا کے پروگرام کے مطابق ہیں یا ان کے خلاف جاتے ہیں۔ اگر ان کا نتیجہ وہ نہیں ہے جو خود خدا نے بتا دیا ہے تو ہم کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ یہ خدا کی منشا کے مطابق نہیں ہو رہا۔ یہ ٹیسٹ ہو جائے گا، کسوٹی پہ کسا جائے گا۔ یہ معیار ہے پرکھنے کا، سچ اور جھوٹ کا، غلط اور صحیح کا، حق اور باطل کا۔ یہاں پتہ لگنا چاہیے کہ یہ جو انہوں نے مجھے سوال دیا تھا اس کا جواب صحیح نکلا ہے یا نہیں۔ جواب اس کتاب کے پیچھے ہونا چاہیے ورنہ یہ کہہ جانا کہ تم سوال نکالتے چلے جاؤ اور جواب کے لیے جب تم فیل ہو جاؤ گے تو اس کے بعد بتایا جائے گا۔ قرآن ان کے جواب یہاں بتاتا ہے اور اسی کے مطابق قرآن سے اس کی اصطلاحات کا مفہوم متعین کرنا چاہیے۔ ان اصطلاحات میں قیامت بھی ہے۔ ذہن میں اس کا مفہوم ہی یہ آتا ہے کہ مرنے کے بعد جب مردے اٹھائے جائیں گے اور وہاں وہ حشر کے میدان میں جو کچھ ہوتا ہے وہ قیامت ہے۔ قیامت کا یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے، کوئی دوسرا مفہوم آتا ہی نہیں۔

انقلاب، ملک عظیم اور زبان عربی

قرآن سے پوچھیے تو وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ وہ تو مردوں کا جینا ہے۔ اسی دنیا کے اندر ایک انقلاب آتا ہے اور آج تو اسے ہم Revolution (انقلاب) کہتے ہیں۔ آپ اس قوم کا اندازہ لگائیے جو میں بار بار کہا کرتا ہوں کہ حضرت ابراہیم <sup>1</sup> کی اولاد میں سے حضرت اسحاق <sup>2</sup> کی اولاد بنی اسرائیل، تو شوکت داؤدی اور سطوت سلیمانی کی مالک بنی، ملک عظیم کی مالک بنی اور ان کے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیل <sup>3</sup> کی قوم وادی غیر ذی زرع میں جالبی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ان ہزار سالوں میں کیا کرتی رہی؟ یہ ایک زبان

بناتی رہی جو قرآن کے حقائق کی متحمل ہو سکتی تھی، انہوں نے خود سختیاں برداشت کیں، یہ وہیں وادی غیر ذی زرع میں رہے جہاں کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ سامنے نظر آتا تھا کہ وہ حضرت اسحق کی اولاد، چچے اور چچا کے بیٹے تھے، ان کے پاس اتنی بڑی حکومتیں، اتنی بڑی ملکیتیں ہیں اور یہ اس وادی غیر ذی زرع میں زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ فطرت کا ایک متعین پروگرام تھا۔ اس کے لیے یہ ساری دنیا سے Cut-off (منقطع) ہو کر اس پروگرام میں لگے رہے اور زبان وہ بنادی کہ دنیا میں جس کی نظیر نہیں ہے۔ بڑے بڑے مستشرق، جو عربی زبان کے بڑے فاضل ہیں، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ جو زبان نزول قرآن کے وقت ان عربوں نے بنادی تھی، دنیا کی کوئی زبان، وسعت میں بھی، گہرائیوں میں بھی اور بلند یوں میں بھی، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

### لفظ قیامت کا مفہوم

اب آپ اس زبان عربی کی یہ مثال دیکھ لیجیے: ”قیام“ کا لفظ ہمیں معلوم ہے۔ عرب بھی اسے ”کھڑے ہونا“ کے لیے بولتے تھے اب اگر میں اسی لفظ کے اندر اس کی خصوصیات بتاتے ہوئے چلا جاؤں تو اس کے لیے پورا درس چاہیے۔ یہ وہی ”ق و م“ تو ہے۔ آدمی کھڑا نہیں ہو سکتا جب تک اس کا توازن برقرار نہ ہو۔ ذرا توازن بگڑے، کھڑا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کہتے ہیں کہ ”قوام“ صحیح ہو گیا ہے۔ یہ لفظ توازن کے لیے ہے۔ کھڑے ہو جانا کہ اس میں قیام آ گیا۔ توازن ہو تو آدمی کھڑا ہو سکتا ہے۔ پہلی شرط تو یہی ہوئی اور یہ اسی مادے ”ق و م“ کے اندر لفظ موجود ہے۔ یہ تو ہو گیا ”کھڑے ہو جانا“۔ اس ”قیام“ کے آگے انہوں نے وہ ”ق و م“ لگائی۔ وہ بنا

① تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم ♦ کا زمانہ 2200 ق م کا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ 1000 ق م ہے۔

قیامت۔ اور اس کے معنی ہو گئے: یکبارگی کھڑا ہونا، یکنخت کھڑے ہو جانا، فوراً کسی چیز کا اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ عربی زبان کے اندر ”ق و م“ کا نتیجہ ہے۔ جسے آج آپ Revolution (انقلاب) کہتے ہیں وہ ہوتا کیا ہے؟ ان اصطلاحات کا مفہوم اور معنی خود قرآن نے اپنے ہاں واضح کر دیئے۔ مثلاً کہا کہ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (83:6)۔ اس دنیا کے اندر القیامت کیا ہے؟ جب الناس یعنی پوری کی پوری نوع انسانی، جسے آج عوام (Masses) کہتے ہیں، عالمگیر ربوبیت کے پروگرام کی تکمیل کے لیے یکبارگی اٹھ کھڑے ہوں گے، اسے اس دنیا کے اندر قیامت کہا گیا ہے۔ آج آپ کے ہاں جو اصطلاح Evolution (ارتقاء) ہے، یہ Revolution (انقلاب) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس وقت جب یہی لفظ جو قیام ہے، اس کے بعد وہ عرب ”ق و م“ لگا دیتے ہیں تو قیامت بنا دیتے ہیں اور اس کے بعد ہے: کسی کا یکبارگی کھڑے ہو جانا اور خدا یہ کہتا ہے کہ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (83:6) جب انسانیت ربوبیت عالمینی کے پروگرام کی تکمیل کے لیے یکبارگی By Revolution (انقلاب کے ذریعے) کھڑی ہو جائے گی لیکن یہ جو کھڑے ہونا ہے یہ فساد کے

لیے نہیں ہوگا۔ اس کے لیے کہا کہ وَ أَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (39:69) اور یہ کڑھ ارض خدا اور ربوبیت کے ضامن خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔ یہ اس زندگی کا القیامہ ہے اور قرآن نے اس کے لیے اتنی تفصیل دی ہے کہ آپ اس میں جائے تو نظر آ جاتا ہے کہ پھر یہ القیامہ اس زندگی کے اندر کیسے برپا ہوتی ہے۔

### لفظ الساعۃ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اسی کے لیے ان کے ہاں ایک لفظ الساعۃ ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ ساعۃ کا مادہ ”س و ع“ بھی ہے اور ”س ی ع“ بھی لیکن الساعۃ واوی ہے یائی نہیں۔“ ان کے ہاں ”ساع“ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا ایک مقام پہ جامد کھڑے نہ رہنا بلکہ اس میں تبدیلی ہوتے چلے جانا۔ اب یہ جو تبدیلی ہے، میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ تو یہ فلسفیانہ تجریدی Abstract (غیر محسوس) بحثیں جانتے ہی نہیں تھے یہ محسوس چیزوں کے اندر بات سمجھاتے تھے۔ آپ یہ دیکھیے کہ یہ تبدیلی کے لیے کیا کہتے تھے؟ آج تو ہمارے ہاں گھڑیاں ہیں، ان سے ہم وقت پہچانتے ہیں۔ اُس زمانے میں تو گھڑیاں نہیں تھیں۔ اب بھی ان لوگوں کے ہاں جو صحرائی باشندے وغیرہ ہیں وہ دھوپ کے سائے سے وقت پہچانتے ہیں اور اس تجربے سے ان کو اتنی مشق ہو جاتی ہے۔ راتوں کو وہ ستاروں سے وقت پہچانتے ہیں۔ دن کے وقت وہ دھوپ سے وقت پہچانتے ہیں۔ دھوپ گھڑیاں اب بھی ہمارے ہاں پرانے زمانے کی کہیں رکھی ہوئی موجود ہوتی ہیں لیکن اس سے آپ دیکھیے، صحرا کے اوپر یہ سایہ بڑھتا جاتا ہے، محسوس نہیں ہوتا کہ کب بڑھ رہا ہے۔ آج بھی اگر آپ کی گھڑی کی جو منٹ کی سوئی ہے، وہ اس میں سے غائب ہو جائے، سینڈ کی ہو ہی نہیں اور منٹ کی ہو جائے غائب۔ آپ رکھیے سامنے اس گھڑی کو۔ ایک سے دو، دو سے تین، تین سے چار، تو اس میں وہ چلتی جائے گی، کبھی محسوس نہیں ہوگا کہ یہ گھنٹے کی سوئی چل کیسے رہی ہے۔ یہ جو اس طرح سے سایہ بڑھتا تھا جس میں محسوس ہی نہ ہو، یہ بھی ایک تبدیلی تھی لیکن وہی اس ”ساع“ کے بعد جب ”ساعۃ“ کہتے تھے تو اس کے معنی ہیں کہ اس قسم کی تبدیلی کا یکبارگی ہو جانا۔ جسے آپ یکبارگی کہتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ وہ بھی اصل میں یکبارگی نہیں ہوتا۔ عجیب چیز ہے قرآن کی یہ۔ کہتا ہے کہ پہلے غیر محسوس طور پر اس کے جوام کائنات ہیں وہ غیر محسوس طور پر آتے رہتے ہیں، انسان کو پتہ نہیں چلتا وہی دھوپ گھڑی کی طرح جو صحرا میں چل رہی ہوتی ہے، پتہ نہیں چلتا۔ ایک وقت آ جاتا ہے جب اس میں Maturity آ جاتی ہے، وہ پختگی پیدا ہوتی ہے تو اس کی نمود ہو جاتی ہے۔ عام نگاہیں کہتی ہیں کہ یہ یکبارگی ہو گیا حالانکہ اس کا جو طریق عمل یا پروگرام تھا، بہت پہلے سے شروع ہوا تھا۔ جس وقت یہ اس قسم کا تبدیلی کا عمل محسوس شکل میں نمود کی صورت اختیار کر لے، یوں سامنے آ جائے، وہ اسے ساعۃ کہتے تھے۔ قرآن نے اس پہ ”ال“ لگایا، اس اسم نکرہ کو اسم معرفہ بنایا The definite ہے۔ اب یہ جو قرآنی انقلاب ہے اس کے لیے یہ الساعۃ آ گیا۔



## بنی اسرائیل کی داستان کے تفصیلی بیان میں لفظ الساعۃ کا استعمال

آئیے ذرا قرآن سے سمجھیں کہ پھر وہ الساعۃ کسے کہتا ہے۔ یہ جو انقلاب کا عظیم واقعہ ہے، قرآن کریم اس کے لیے داستان بنی اسرائیل کو پیش کرتا ہے یا کشمکش صاحب ضرب کلیم اور فرعون، بڑی تفصیل سے قرآن بیان کرتا ہے۔ فرعون استبداد کا مجسمہ، دنیا میں ضرب المثل، فرعونیت استبداد کی ایک شکل جو مغلوب اور مفتوح قوم کے جسموں کو مسلط کرتی ہے، قارون جو Economically (معاشی طور پر) ان کو غلام بناتی ہے، اقتصادی طور پر ان کو اپنا محتاج رکھتی ہے، پھر غلام بنا دیتی ہے اور مذہبی پیشوائیت ہامان، جو اس سارے استبداد کو اور اس سرمایہ داری کے نظام کو مقدس سند عطا کر کے کہتی ہے کہ یہ سب غریبی اور امیری، مفلسی اور دولت مندی خدا کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ لکھ کے رکھ دیا ہے۔ جس کے حصے میں وہ دیتا ہے، تمہیں اس کے خلاف شکایت کرنے کی کوئی بات نہیں۔ فرعون، ہامان اور قارون بیک زمانہ ایک دور میں اکٹھے ہوئے اور ان کے نیچے بنی اسرائیل کی قوم تڑپتی پھڑکتی کچلی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کس قسم کا تقابل کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ جسے کہتے ہیں آگ لینے والے گئے تھے پیغمبری مل گئی تھی، وہاں جب آپ ♦ سے کہا گیا کہ جاؤ فرعون کی طرف کیونکہ اِنَّهُ طَغٰی (20:24,43) وہ حد و فراموش ہوتا چلا جا رہا ہے، وہ پانی ساحلوں کے اندر گھرا ہوا نہیں رہا، اس نے ساحلوں کو توڑ دیا ہے، سیلاب بن رہا ہے، بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں، جاؤ فرعون کی طرف، روکو اسے اس سے۔ عرض کیا کہ یہ تو اس قدر مجسمے استبداد کے اور پھر وہ تینوں قوتیں جو انسانیت کش ہوتی ہیں وہ وہاں جمع ہیں۔ میری کیفیت یہ ہے کہ میں تو یہاں ایک چرواہا، اس ملک سے بھاگ کے آیا ہوا، ایک ”جرم“ بھی میرے ذمے لگا دیا گیا ہے، میری قوم جو وہاں بستی ہے وہ ان کی حکومت ہے، اس نے استبداد سے یہ کیا ہے کہ اس قوم کے اندر جتنے بھی سرکردہ بنائے قوم اسے نظر آتے تھے، يَذْبَحُوْنَ (2:49) ان کو اس نے ذبح کر دیا ہوا ہے، کچل کے رکھ دیا ہے، کسی ایک کو بھی ابھرنے نہیں دیتا، جو ان کے اندر باقی رکھے ہوئے ہیں ان میں ایسی صفتیں پیدا کر دی ہوئی ہیں کہ وہاں جو ہر مردانگی رہا ہی نہیں۔ مجھے آپ اس قوم کے اندر اس کی طرف بھیج رہے ہیں، اس ساز و ویراق کے ساتھ کہ میں ایک تبدیلی پیدا کروں، انقلاب پیدا کروں، جو ہو رہا ہے اُسے الٹ کے رکھ دوں۔ انقلاب کے تو یہی معنی ہیں۔ یہ میں کروں؟ کہا کہ موسیٰ ♦! سنو۔ بڑی غور طلب چیز ہے۔ کہا کہ اِنَّ السَّاعَةَ اَتِيَةٌ (20:15) السَّاعَةَ کے معنی قرآن سے سمجھیے کہاں آیا ہے یہ السَّاعَةُ؟ موسیٰ السَّاعَةَ کی گھڑی آگئی ہے۔

## اس کائنات کے اندر کوئی امر یکبارگی نہیں ہوتا

یہیں سے یہ نظر آتا تھا کہ وہ کچھ ہو رہا تھا تو اب اس کے ظہور کا وقت آ گیا ہے، الساعۃ کی گھڑی آرہی ہے۔ آگے ہے کہ اَكْثَادُ اُخْفِيْهَا (20:15) یہ اس سے پیشتر غیر مرئی (Invisible) طور پر، کچھ اندر ہی اندر ہو رہا تھا۔ غور کیجیے، عزیزان من! یعنی قرآن کس

طرح یہ بات سمجھاتا ہے کہ جسے نظر بظاہر یہ دیکھا جاتا ہے کہ یکبارگی ایک چیز ہو گئی ہے وہ یکبارگی نہیں ہو رہی ہوتی۔ پہلے وہ نگاہوں سے پنہاں ہوتی ہے۔ کہا جو الساعۃ ہے اس کے نمود کا وقت آ گیا ہے: اَكْثَادُ اُخْفِيَهَا (20:15)۔ وہ چلی تو آرہی تھی ایک عرصے سے لیکن غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر وہ ایک لاوا پک رہا تھا۔ اب ہمارا پروگرام یہ ہے کہ اس کو بے نقاب کر دیں۔ بس یہ ہے جو کچھ ہے۔ وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے گی یہ ہو جائے گا۔

### اس انقلاب کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟

عزیزانِ من! بات دوسری طرف نکل جائے گی لیکن کیا کروں آیت کے دو الفاظ آگے بھی تو ہیں۔ کا ہے کے لیے یہ انقلاب ہوگا؟ اس نے یہیں بتا دیا کہ فساد اور انقلاب میں کیا فرق ہوتا ہے؟ فساد میں بھی تو ایک نظام ہوتا ہے اس کو بدلا جاتا ہے اکھیڑا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کا ہے کے لیے اکھیڑا جاتا ہے؟ یہ جو ان ہاتھوں سے انقلاب لانے سے تبدیلی آتی ہے وہ تبدیلی جو خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے وجود میں لاتے ہیں جسے قرآن نے کہا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں یہ انقلاب آتا ہے اس سے کیا ہوتا ہے؟ جھوم جائے عزیزانِ من! بات ایسی ہے جیسے کوئی داستان بیان کر رہا ہے قرآن تاریخ کا واقعہ بیان کر رہا ہے لیکن وہ صرف واقعات بیان نہیں کرتا وہ تو ہر واقعہ کے ساتھ جو اس کا نتیجہ ہے مقصد ہے، منہا ہے، مطلوب ہے، مقصود ہے واقعہ کے ساتھ ہی اس کو بیان کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ ”الساعۃ“ آرہی ہے۔ کا ہے کے لیے آرہی ہے؟ اس لیے کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ انقلاب آ جائے الساعۃ نمود ہو جائے تاکہ لَتَجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ (20:15) ہر محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ ملے اس لیے ہم یہ انقلاب لا رہے ہیں۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ یہ جو الساعۃ کا لفظ ہے یہ انقلاب کا وہ Process (عمل) ہے جو پہلے غیر محسوس طور پر مضمطر طور پر اندر ہی اندر چلا آ رہا ہوتا ہے اس کے نمود کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ فوراً ہو گیا۔ وہ فوراً یہی بات ہے جیسے میں نے عرض کیا ہے کہ وہ ”جو“ آ لگا کے فوراً بنادیتے ہیں اصل میں تو وہ پروسس (عمل) ہوتا ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہوتا ہے۔

### لفظ الملوک کے سلسلہ میں اقبالؒ کی بصیرت قرآنی کا اظہار

قرآنی بصیرت رکھنے والے ہمارے دور کے اقبالؒ (1877-1938) نے بڑے حسین انداز میں اس چیز کو کہا ہے۔ یہ بانگ درا<sup>1</sup> میں ہے۔ بہر حال خوش ہو جائیے کہ آج وہ شعر اردو میں ہیں اگرچہ اب مجھ سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اردو کا بھی ترجمہ کیا کرو:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیہٗ اِنَّ الْمُلُوكَ

یہ قرآن کریم کی ایک تنبیہ ہے اور وہ سورۃ النمل کی 34 ویں آیت ہے جس میں حضرت سلیمان ♦ کا واقعہ ہے جب وہ یمن کی

طرف، ملکہ سبا کے ملک کی طرف چلے جا رہے تھے۔ یہ اطلاع پہنچی تو ملکہ نے اپنے مشیروں کو بلایا، Cabinet (کابینہ) کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ بقول ان کے، دشمن حملہ آور ہو رہا ہے تو کیا کیا جائے؟ جیسے کہ ان لوگوں کا جو صاحب ہوتے ہیں قاعدہ ہے کہ صاحب! ہم کوئی چوڑیاں پہنے ہوئے نہیں بیٹھے ہیں، ہم مقابلہ کریں گے جائیں گے، لڑائی کریں گے لیکن کچھ نظر آتا ہے کہ ملکہ ان سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ اس نے کہا کہ قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا (27:34) اس نے کہا کہ تمہیں پتہ نہیں ہے جب بادشاہ یہاں ملوک کا لفظ آیا ہے کسی بہتی میں داخل ہوتے ہیں، کسی ملک میں چڑھائی کر کے آتے ہیں، اور اس کو فتح کر لیتے ہیں اُسے تہ وبالا کر دیتے ہیں وہاں ہر چیز کو الٹ کے رکھ دیتے ہیں: اوپر کے نیچے اور نیچے کے اوپر۔ پنجابی انج کیندے میں پٹھانوں اُتے کر دیندے ہیں۔ <sup>2</sup> أَفْسَدُوهَا (27:34) کیا لفظ ہے جو یہاں آیا ہے! فساد کے معنی ہی یہ ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ اس کے لیے کہا کہ وَجَعَلُوا أَعِزَّةً أَهْلَهَا أَذِلَّةً (27:34) جو صاحب عزت اور صاحب اقتدار نظر آتا ہے اس کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں، کمزور بنا دیتے ہیں۔

- ① یہ ”خضر راہ“ میں ”جواب خضر“ کے ذیلی عنوان ”سلطنت“ میں ہے۔ اقبال (1996)۔ اقبال (1996)۔ بانگ درا۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ ص۔ 271 تا 272
- ② اسے پنجابی میں کہتے ہیں کہ اعلیٰ طبقہ (Elite) کو پست (Down-Trodden) اور پست طبقہ (Down-Trodden) کو اعلیٰ (Elite) میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

### مومن کے انقلاب کی پہچان: امن کا پیغام

عزیزانِ امن! اس میں بھی ایک بڑی چیز ہے کہ ملوک کیا کرتے ہیں، ملوکیت کیا کرتی ہے؟ ٹھیک ہے کہ دوسرے کو مغلوب کیا جاسکتا ہے۔ مغلوب کرنے کے بعد وہ جو ان کا انتقام کا جذبہ ہوتا ہے، ملوکیت اس جذبہ انتقام کی تسکین اس طرح کرتی ہے کہ جو صاحب عزت نظر آتا ہے وہ اسے ذلیل کرتی ہے حالانکہ یہ بھی انسان ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو انقلاب خدا کے بندوں کے ہاتھ سے ہوتا ہے وہ اس نظام کو توالتا ہے انسانوں کو ذلیل نہیں کرتا۔ اس کا مقصد انسانوں سے انتقام لینا نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد باطل نظام کی جگہ حق کے نظام کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ ملوکیت یہ کرتی ہے کہ وَجَعَلُوا أَعِزَّةً أَهْلَهَا أَذِلَّةً (27:34) وہ ارباب عزت و اقتدار کو ذلیل کرتا ہے۔ سمجھ رکھو کہ ملوکیت یہ کیا کرتی ہے اور آگے فقرہ ہے کہ وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ (27:34) یہ بات کوئی خاص بات نہیں ہے، ایسا ہی ہوتا ہے، ملوکیت کی ذہنیت ہی ایسی ہے کہ وہ یہ کرتی ہے اس لیے تم سمجھ لو کہ یہ جو کہتے ہو کہ کوئی بات نہیں ہے اس سے ہم ٹکریں گے، جنگ کریں گے، مجھے جو

اطلاعات پہنچی ہیں ہم اس کے حریف نہیں ہو سکتے، ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اور مقابلے میں جب مغلوب ہو جائیں گے، مفتوح ہو جائیں گے، تو اس پہ کچھ سوچ رکھو کہ بادشاہ چلا آ رہا ہے۔ اس کے نزدیک تو وہ سلیمان ♦ بادشاہ ہی تھا حالانکہ یہی داستان جب سامنے آئے گی تو پھر میں عرض کروں گا کہ حضرت سلیمان ♦ نے اس سے کیا کہا تھا۔ کہا یہی تھا کہ میں بادشاہ نہیں ہوں، صرف خدا کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں، صرف میں اقبالؒ (1877-1938ء) کے ان اشعار کی بات کر رہا تھا:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیہٗ إِنَّ الْمُلُوكَ

اب دیکھ لیا کہ کس آیت کی یہ شرع بیان کر رہا ہے، یہی ملکہ سب ہے۔ جس نے کہا تھا کہ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً (27:34)

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیہٗ إِنَّ الْمُلُوكَ

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو الساعۃ ہے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ By Revolution (انقلاب کے ذریعے) ہوتی ہے، یکنخت و یکبارگی آتی ہے۔ یہ تو کوہِ آتش فشاں کا لاوا ہوتا ہے، اندر پک رہا ہوتا ہے، کسی ایک وقت میں وہ پھٹ کر باہر آ جاتا ہے۔ یہ جو دور ہوتا ہے، وہ اندر اندر رہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے ملوکیت کرتی کیا ہے؟ سنئے، اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیہٗ إِنَّ الْمُلُوكَ

سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

وہ ان محکموں کے اوپر، مفتوحوں کے اوپر، سحر کرتی رہتی ہے مگر انداز یہ ہوتا ہے کہ حکومت نے تمہیں آزادیاں دی ہیں، ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں مگر

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر

پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمران کی ساحری

اور اس کی مثال یہ ہے:

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز

دیکھتی ہے حلقہٗ گردن میں سازِ دلبری

محمود کا جادو یہ ہے کہ وہ محکوم کی گردن میں غلامی کا طوق پہناتا ہے۔ انداز دیکھیے کہ ایاز کہتا ہے کہ کیسا خوشنما لگو بند ہے جو آپ نے مجھے عطا کر دیا۔

اقبالؒ کہتا ہے کہ یہ کچھ تو اندر اندر ہوتا رہتا ہے: پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساحری۔ دیکھا اس نے ساحری کا کیا عجیب لفظ استعمال کیا ہے! جادو کوئی محسوس قسم کی استبداد کی چیز نہیں ہوتی۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کسی قسم کا تشدد ہو رہا ہے، ظلم ہو رہا ہے، خاموشی ہی

خاموشی ہے ہوا جاتا ہے لیکن وہ ”الساعة“ آگئی پھر وہی جو قرآن نے موسیٰ ﷺ سے کہا تھا ہم نے کہا کہ ”الساعة“ آ رہی ہے:

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں  
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

اور اسے ”الساعة“ کہتے ہیں۔

طلسمِ سامری کو توڑنے کا طریق حضور ﷺ کی عملی زندگی کا نمونہ ہے

یہ ہوتا کیسے ہے؟ اقبالؔ ہے عزیزانِ من! ٹھیک ہے آمروں کو سامری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی اس کا طلسم توڑ دیتا ہے۔ کیسے؟ خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں۔ یہ ضرورت ہے کہ اس مفتوح قوم کا خون جوش میں آئے تو پھر کوئی موسیٰ ﷺ طلسمِ سامری توڑتا ہے اور جب طلسمِ سامری ٹوٹتا ہے تو وہ ہے وقت کہ جس کو قرآن الساعۃ کہتا ہے: إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا <sup>1</sup> (20:15)۔ یہ طلسمِ جادوگریؔ! یہ استبدادِ فرعونؔ! یہ پیشوائیتؔ یہ قارونیتؔ خاموش ہی خاموش چلی آرہی تھی اپنا اثر کیسے چلے جا رہی تھی۔ کہا کہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ اب اس کی نمود کی گھڑی آ جائے جب یہ طلسم ٹوٹنا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قرآن کہتا ہے کہ بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ <sup>2</sup> (25:11)۔

① (اس حقیقت کو یاد رکھ کہ تیرے ہاتھوں ایک عظیم انقلاب (Revolution) رونما ہونے والا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب جو اس وقت تک ظاہر نہیں لگا ہوں سے پوشیدہ تھا اب نکھر کر سامنے آ جائے۔ (پرویزؔ: مفہوم القرآن، ص-705)۔

② لیکن یہ لوگ اس آنے والے انقلاب (Revolution) کے متعلق کہتے ہیں کہ یونہی دھمکیاں ہیں۔ یہ اسے جھٹلاتے ہیں (پرویزؔ: مفہوم القرآن، ص-817)۔

اب عزیزانِ من! ساعة کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ حضور ﷺ کی نبوت کا زمانہ تیس سال کا ہے۔ یہ نبوت بھی آخری نبوت ہے جو قیامت تک کے لیے پھیلی ہوئی ہے۔ نبوت کا ایک ایک لمحہ ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری ہے قیامت تک کے لیے تیس سال کا عرصہ ہے۔ اس میں تیرہ سال کا مکی دور کا عرصہ ہے۔ اس کے اندر ایسا نظر آتا ہے کہ جیسا کچھ ہوا ہی نہیں۔ آج کے پیمانوں سے کسی سے پوچھیے۔ ہمارے ہاں یہ زمانہ Speed (تیزی) کا آ گیا ہے: برق رفتاری کا تیزی کا۔ یہ اسپید (Speed) صرف ہوائی جہازوں میں ہی نہیں ہوئی آسمان تک پہنچنے والے ان آلات میں ہی نہیں ہوئی یہ ذہنوں میں بھی ہو گئی ہے۔ اب ذہن لمبا عرصہ برداشت ہی نہیں کرتا۔ یہ فنا فٹ شبشب (Over-night) چاہتے ہیں کہ انقلاب آئے۔ شبشب فساد تو پیدا ہو سکتا ہے انقلاب نہیں آ سکتا۔ جسے آپ باہر کے زمانے کی نمود کہتے ہیں وہ کڑیاں کہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ رات کو درخت ٹنڈ منڈ ہوا دیکھا ایک پتہ بھی نہیں صبح اٹھے تو لیکچر اس میں سے جناب! ہزاروں نئی کلیاں حیات تازہ کا پیغام لیے ہوئے ابھرتی چلی آرہی ہیں۔ یہ راتوں رات نہیں ہوتا۔ بہت پہلے سے یہ

پروسیس (عمل) شروع ہوتا ہے۔ وہ تیرہ سال کا جو عرصہ تھا، وہ اس بہارِ نو کی کلیوں کی تیاریوں کا زمانہ تھا، نظر نہیں آتا تھا نہایت خاموشی سے یہ کچھ ہو رہا تھا اور اس کے بعد آتے ہی مدنی زندگی ہے۔ خزاں کا آخری پتہ چھڑ گیا اور صبح ہوتے ہی بہارِ تازہ کے پیغامات آنے شروع ہو گئے۔ قرآن کہتا ہے کہ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (14:24) یہ شجر طیب کی طرح ہے جس کی جڑیں پائال میں ہوں اور اس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ بہارِ تازہ کے پیغامات آنے شروع ہو گئے۔ یہ بھی جو مدینے کی زندگی میں جانے کے بعد دوسرے ہی سال الساعۃ شروع ہو گئی۔ کہا کہ یہ الساعۃ کی تکذیب کر رہے ہیں۔ مکی زندگی میں ایک طرف، یہ مختصر سی جماعت، چند نفوس پر مشتمل ہے۔ ان میں بھی بیشتر ایسے ہیں جو غلام تھے، محکوم تھے، غریب تھے، مفلس تھے، کمزور تھے، اور وہ بھی چند نفوس۔ تیرہ سال کی رسالت کا دور ہے، صرف تیرہ سال کی رسالت ان کی نگاہوں میں ”کوشش“ ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ آج کا ذہن، جس تیزی سے جا رہا ہے اس میں ہر شخص Frustrated (ناامید) ہو کر بیٹھ جائے کہ صاحب! ہوتا ہی کچھ نہیں ہے: اوکر کی لیا؟ اے تیرہ ورے ہو گئے ٹکراں مار دیاں نوں۔ سانوں تے لگدا اے مار دتا ہو یا اے۔ اوہو یا کی اے؟<sup>①</sup>

عزیزانِ من! روز میرے پاس یہ فساد کے خوگر ذہنیتوں کے مارے ہوئے نوجوان آتے ہیں کہ صاحب! تم نے چالیس سال غرق کر دیئے، کیا کر دکھایا تم نے؟ معاف رکھیے گا، یہ میں درمیان میں آتا ہے اس لیے کہ میں اور کوئی مثال نہیں پاتا۔ کہتے ہیں کہ کیا کر لیا تم نے؟ انہیں دیکھیے کس طرح سے علی علی کر کے آگئے، انہیں دیکھیے ہلا بول دیا، انہوں نے یہ کر دیا، وہ کر دیا۔ اس کے بعد اگلی بات

① ارے کیا تیر مار لیا؟ سر کھپاتے اور جدوجہد کرتے تیرہ سال بیت گئے۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ ہمارا تو ستیاناس ہو چکا ہے اور ہوا کچھ بھی نہیں جہاں تھے وہیں ہیں۔ نہیں کہ ہلا کر دیا، تین مہینے میں۔ اس کے بعد دیکھیے آندھی کی طرح اٹھے ہیں، آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئے۔ عزیزانِ من! یہ تو اس گھڑی کی طرح ہے جس کے منٹوں کی سوئی ٹوٹی ہوئی ہو، گھنٹے کی سوئی چل رہی ہوتی ہے، تمہاری آنکھیں محسوس نہیں کر رہی ہوتیں۔ یہ جو انقلاب ہے یہ تو قلب کی تبدیلی کا نام ہے۔ اس کا تو مادہ (Root) ہی قلب (قل ب) ہے۔ یہ جو Physical (طبعی) تبدیلی ہوتی ہے، طبعی تبدیلی، یہ لوٹ مار، توڑ پھوڑ، تخریب وغیرہ ہے۔ یہ Physical (طبعی) ہے اس کے لیے کسی قلب و نظر کی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تبدیلی اگر پیدا کرنی ہے تو یہ چڑیا گھر کے پنجرے سے ایک شیر کو شہر میں لے آئے اور دیکھیے۔ یہ قلب و نگاہ کی تبدیلی تو ذہنیتوں کا بدلنا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آخری نبوت کے تیس سالہ زندگی کے تیرہ سال کا عرصہ خاموشی ہی خاموشی میں بسر ہو گیا، بظاہر کوئی تبدیلی نظر نہ آئی لیکن تبدیلی وہ ہوئی کہ پھر جب بدر کے ① کے میدان میں پہلی ہی دفعہ یہ سامنے آئے ہیں تو یورپ کے مورخوں سے ہی پوچھ دیکھیے۔ وہ یہ لکھتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں دنیا کی تاریخ میں بدر کا میدان ایک ایسا انقلاب آفریں واقعہ ہے جس کی مثال تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ وہ اس لیے کہ وہ شباشب تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہاں وہ تھے جن کے متعلق ان کا خدا کہہ رہا تھا کہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ط وَ

الَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ<sup>2</sup> (48:29)۔

### نبی اکرم ﷺ پر فرشتے تحسین و آفرین بھیجتے ہیں

یہ تھے وہ اور یہ تھاتیرہ سال کی اس محنت کا حاصل، ثمر اور پھل۔ یہ تھے وہ جن کے متعلق کہا کہ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ<sup>3</sup> (33:43)۔ ہم تو نبی اکرم ﷺ کے متعلق جانتے ہیں کہ خدا نے ان کے متعلق کہا تھا کہ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتُهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ (33:56)۔ وہ جماعت مومنین ہے۔ اسی طرح سے خدا اور اس کے فرشتے تم پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ تیرہ سال کی اس غیر محسوس محنت نے، عزیزانِ من! یہ نفوس پیدا کیے تھے کہ خدا اور اس کے فرشتے ان کے اوپر بدر کے میدان میں تہنیت کے پھول برسارہے تھے ان کی تائید و نصرت کر رہے تھے حوصلہ افزائی (Encouragement) کر رہے تھے ان پر تبریک و تہنیت (Appreciation) کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔ انقلاب ان کے ہاتھوں سے آتا ہے۔ اب یہ کی زندگی کا آخری دور ہے اور اُدھر مخالفین مذاق اڑا رہے ہیں وہ استہزا کر رہے ہیں۔

- ① سترہ رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں۔ جانثاروں کی یہ کل جماعت 313 نفوس پر مشتمل تھی اور بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ ان کے پاس کل دو گھوڑے تھے۔ مقابلے میں قریش بڑے کروڑ اور شان و شوکت سے نکلے تھے۔ ہزار سپاہیوں کی جمعیت، سو سو اوروں کا رسالہ، تمام رؤسائے قریش (باستثنائے ابولہب) شریک فوج، رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔
- ② محمد رسول اللہ اور اس کے رفقاءے کار کی جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلے میں چٹان کی طرح سخت ہیں، لیکن باہم گر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد (5:54)۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 1203)۔
- ③ قوانین خداوندی کی برکات، اور اس کی کائناتی قوتوں (Cosmic Forces) کی تائید و نصرت تمہارے ساتھ رہے گی (33:56)۔ ان کی طرف سے تم پر تبریک و تہنیت کے پھول برسیں گے۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 977)۔

### اس انقلاب کی تکذیب کرنے کا نتیجہ

یقین مانئے، مخالفت کی سب سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما جو چیز آتی ہے وہ استہزا ہوتا ہے۔ کہا کہ بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ (25:11) آنے والے انقلاب کی تکذیب کرتے ہیں۔ تکذیب کر رہے ہیں کہ کہاں کا انقلاب ہے اور کون لا رہا ہے صاحب!! کوئی بات ہے بھلا!! وَاعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا (25:11)۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ جو اس آنے والے انقلاب کی تکذیب کر رہے ہیں، جسے کس قدر جھسم کر دینے والی آگ کہتے ہیں، یہ وہ تیار کی جا رہی ہے۔ یہاں اعتدنا آیا ہے، یعنی وہ بھی یہی نہیں ہے کہ جھٹ سے بھڑکادی جاتی ہے، بلکہ ان کے لیے یہ سب کچھ تیار کی جا رہی ہے اِذَا رَأَوْهُمْ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغِيْطًا وَ زَفِيرًا (25:12)۔ دُور سے نگاہ جائے گی تو اس کی آواز ان کے کان میں پڑے گی۔ یہ ہوش اڑا دینے والی آواز ہے۔ اس سے انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ تصادم، یہ انقلاب کس قدر مہیب ہے، وَ اِذَا اُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنَيْنِ (25:13) اور اس کے

بعد جب یہ اس میں آئیں گے تو پھر تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کے اندر زنجیریں لپٹے ہوئے، جکڑے ہوئے اس کے اندر آئیں گے۔ میں نے کہا تھا کہ وہاں یہ ہلاکت اور تباہی کو پکاریں گے۔ ہمارے ہاں تو جو قرآنی تفسیر چلی آتی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ تو قیامت کا سارا نقشہ ہے جو جہنم میں جا کر ہوگا۔

## قریش کے تکبر کی کیفیت

عزیزانِ من! یہ یہاں کی جنگ تھی، یہیں وہ ٹکراؤ ہونے والا تھا، یہ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں سامنے آنے والا تھا۔ یہی دشمن تھے جو قیدی بن کر آنے والے تھے۔ یہ ان کی کیفیت ہو رہی ہے۔ یہ قریش کے ایسے ایسے سرکردہ تھے کہ جن کی نخوت اور تکبر کی یہ کیفیت تھی کہ بدر کے میدان میں جب ایک نوعمر لڑکا<sup>1</sup>، ابو جہل کی چھاتی پہ بیٹھا، اور اس کا گلا کاٹنے لگا، تو اس نے یہ کہا کہ یہ گلا ذرا نیچے سے کاٹو۔ اس نے کہا کہ یہاں سے تو آسانی سے کٹ جاتا ہے، تکلیف بھی نہیں ہوتی، اور نیچے یہاں ہڈیاں بھی ہیں، تکلیف ہوگی۔ وہ کہنے لگا کہ کچھ بھی ہے، ذرا نیچے سے کاٹو۔ وہ لڑکا کہنے لگا کہ بتاؤ تو سہی کہ کاہے کے لیے نیچے سے کاٹوں۔ ان کے ہاں یہ رسم تھی کہ جنگ کے بعد یہ جو کٹے ہوئے سر تھے ان کو نیزوں کے اوپر اٹھا کے ایک جلوس نکالا کرتے تھے۔ کہنے لگا کہ جب اس کے بعد یہ کٹے ہوئے سروں کا جلوس نکلے گا تو ابو جہل کا سر باقیوں کے مقابلے میں تین انچ اونچا ہوگا۔ صاحب! ان قریش کی کیفیت یہ تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ جن کے تکبر اور فخر کا یہ عالم

1 انصار میں عفراء کے بیٹے معوذ اور معاوذ تھے (سیرۃ النبی - ص 331) انصار کے ان دونوں جوان بھائیوں کی تلوار سے ابو جہل پیوست زمین ہو گیا (معراج انسانیت (1949ء) ص 524)۔ اس سلسلے میں معاوذ کا نام لیا جاتا ہے۔

ہے، تو کل آ کر دیکھ لینا کس طرح سے تمہارے سامنے یہ سرنگوں ہوں گے، سر وہاں خاک کے اوپر رکھے ہوئے ہوں گے۔ انہیں معلوم نہیں کہ الساعۃ کیا ہے اور کیا اس کی تیاری ہو رہی ہے۔ عزیزانِ من! یہ یہیں کی وہ افتاد نمودار ہوئی، اس کے نتائج سامنے آئے اور یوں دنیائے دیکھ لیا کہ حق کیسے غالب آتا ہے، باطل کیسے مغلوب ہوتا ہے۔

## کسی کا مغلوب ہو جانا جہنم ہی کا دوسرا نام ہے

مغلوب کی بات ہے تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ خود مغلوب ہونا بجائے خویش ایک جہنم کی سزا ہے۔ دیکھیے، مجھے یاد آ گیا۔ یہ بدر کے میدان کا ہی واقعہ ہے جس میں قرآن بیان کرتے ہوئے یہ بتا رہا ہے کہ یہ جہنم کیا ہے جو آنے والی ہے۔ سورۃ الانفال آٹھویں سورۃ ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ بدر کے میدان کی آواز کو دبانے کے لیے مال و دولت بے دریغ خرچ کیے چلے جا رہے ہیں۔ کہا کہ کوئی بات نہیں۔ فَسَيَنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً (8:36) تھوڑے وقت کے بعد تم دیکھو گے کہ انہیں افسوس ہوگا کہ خواہ مخواہ کے



لیے اتنا مال و دولت بھی ہم نے ضائع کیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ **ثُمَّ يُغْلَبُونَ** (8:36) یہ اس جنگ کے اندر مغلوب ہوں گے۔ یہ لفظ آپ دیکھ لیجیے یہ وہی ہے جسے ہم مغلوب کہتے ہیں، مفتوح کہتے ہیں اور اس کے بعد ہے کہ **وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ** (8:36) اور یہ ہے پھر وہ جہنم جس کی طرف ہانک کر لے جائے جائیں گے۔ مغلوب اور محکوم تو اس دنیا میں جہنم میں ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ یہاں کی جہنم کا ذکر ہو رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے جہنم کے داروغوں کے متعلق بتایا ہے اس کی بڑی تفصیل ہے۔ وہ جیل خانے کے وارڈن وغیرہ کا نقشہ ذہن میں لائیے۔ وہاں کا جو ہیڈ داروغہ ہے اسے مالک کہا ہے۔ یہاں کسی کا مالک ہو جانا، کسی کا ماسٹر ہو جانا، ملک سے ہی ہے۔ یہ چیز کسی انسان کا دوسرے انسان کا مالک ہو جانا ہے۔

### جہنم کا عذاب موت سے ختم نہیں ہوگا

جہنم کے داروغے کا نام مالک ہے اور یہی ہے وہ جہنم کا داروغہ جس کے متعلق کہا ہے کہ وہ اس سے کہیں گے کہ اوبابا! تو ہی خدا سے کہو کہ اس عذاب سے تو اچھا ہے کہ ہمیں موت دے دے۔ وہ کہے گا کہ پھر وہ عذاب ہی کیا جو موت سے ختم ہو جائے گا۔ اسی لیے وہاں جہنم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں نہ زندگی ہوگی نہ موت ہوگی۔ دیکھتے ہیں کہ یہ جہنم کیا ہے۔ عزیزانِ من! نہ زندگی ہوگی نہ موت ہوگی بلکہ موت کے متعلق تو دوسری جگہ یہ ہے کہ **يَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ** (14:17) انہیں چاروں طرف سے موت آتی نظر آئے گی جیسے چاروں طرف سے موت چلی آرہی ہے، لیکن موت آئے گی نہیں۔ آپ عذاب کی شکلیں دیکھیے جو قرآن بیان کر رہا ہے: چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے گی، لیکن انہیں موت آئے گی بھی نہیں۔

### محکوم قوموں کے لیے تو پورا پورا ملک ہی جیل خانہ ہوتا ہے

مغلوب اور مفتوح کی جہنم یہ ہے عزیزانِ من! جو قرآن بتا رہا ہے۔ محکومیت سے بڑھ کے دوزخ اور جہنم اور کیا ہوگا! یہاں سب سے پہلی چیز یہ کہی تھی کہ صاحبِ عزت کو ذلیل کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا عذاب اس کے اندر ہوتا ہے کہ وہ دعائیں مانگتے ہیں، ہیڈ وارڈن کے پاس، مالک کے پاس یا سپرنٹنڈنٹ جیل کہہ لیجیے کہ پاس درخواستیں پیش کر رہے ہیں کہ خدا سے کہیے کہ ہمارا خاتمہ کر دے۔ اس قدر مفتوح اور مغلوب کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ سچ مچ کے جیل خانے کی بند کوٹھڑی میں ہو، محکوم قوم کے لیے تو پورا ملک جیل خانہ ہو جاتا ہے۔ کس خوب صورتی میں اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا ہے:

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت

ایک ”واعظ کافر گر“ دوسروں کو کافر بنانے والا یہ پیشہ ہے دوزخ کی بات بیان کر رہا ہے۔ یہ شخص<sup>1</sup> ایک ایک لفظ میں بھی کمال کر جاتا

ہے۔ دوسروں کو کافر بنانے والا دوزخ کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ عجیب عجیب بڑی دلچسپ باتیں کر رہا تھا تو سنئے کہ پھر دوزخ کے متعلق کیا باتیں کر رہا ہے؟ کہتا ہے:

حدیث خوشتر ازوئے کافرے گفت

ایک کافر جو سچ مچ کافر تھا اس نے اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات کہی۔ اس نے کیا بات کہی؟ کہا:

ندانم آں غلام احوال خود را

یہ شخص جو غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے کم بخت اپنے متعلق کچھ نہیں جانتا۔

کہ دوزخ را مقام دیگرے گفت

دوزخ کو دوسروں کا مقام بتا رہا ہے۔ اپنے متعلق اتنا بھی نہیں جانتا۔

یہ ہے عزیزانِ من! وہ الساعۃ اور وہ جہنم جس کا ذکر قرآن یہاں کر رہا ہے۔ بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ (25:11) بلکہ یہ لوگ اس آنے والے انقلاب کے متعلق کہتے ہیں کہ یونہی دھمکیاں ہیں۔ یہ الساعۃ کی تکذیب کرتے ہیں جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ آنے والا انقلاب ہے۔ کہا: ان سے پوچھو کہ یہ کیفیت جو ہم نے انہیں بتائی ہے کیا وہ اچھی ہے؟ قُلْ أَذِلَّكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ (25:15) یہ زندگی بہتر ہے یا وہ زندگی کہ جو متقیوں کے متعلق ہم بتا رہے ہیں جس کا وعدہ ہم نے کر رکھا ہے کہ انہیں اس کے بعد وہ زندگی میسر ہوگی۔ ان سے کہیے کہ کَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَ مَصِيرًا (25:15) بہشت کی یہ زندگی ہماری طرف سے فی سبیل اللہ

① یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

اللہ واسطے نہیں ملے گی، بخشش کے طور پر نہیں ملے گی۔ ایسی گداگری ہماری فطرت کے اندر گویا حلول کر چکی ہوئی ہے کہ ہر وقت ہم خدا سے بھی بخشش مانگتے رہتے ہیں سب سے بڑی چیز یہی مانگتے ہیں: اللہ بخش دے یعنی اللہ واسطے دے دے اور وہ تو کہتا ہے کہ یہ جنت اللہ واسطے نہیں ملا کرتی۔ بغیر اعمال کے جزا کے ایک جنت آدم کو اللہ واسطے ملی تھی۔ ایک ذرا سی لغزش ہوئی، کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب وہ تیرے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگی تو وہ حقیقت میں ایک متاع ہوگی: جَنَّةُ الْخُلْدِ (25:15) سدا بہار شادابیوں کی زندگی ہوگی۔ پھر تمہیں وہاں سے کوئی نکالے گا نہیں کَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً (25:15) وہ حسین و شاداب معاشرہ ان کے اپنے حسن عمل کا نتیجہ ہوگا۔ قرآن ایک ایک لفظ میں بات کر جاتا ہے۔ یہاں متقین کی جنت کہی تو ذہن میں شاید ان کے آیا کہ بھئی! ٹھیک ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا اور ان کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ کہا کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ کَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً (25:15) یہ جنت ان کے اپنے حسن عمل کا نتیجہ ہے۔ ایک لفظ میں اصل بات بتادی۔ صاحب! یہ اسلوب بیان کا اعجاز ہے۔

## قرآن کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہمارے تراجم نے کیا ہے

عزیزانِ من! بظاہر یہاں یہ نہ بھی آتا تو ہمارے آپ کے نکتہ نگاہ سے کچھ حرج واقع نہیں ہوتا لیکن اس نے تو مقصد پہ نگاہ رکھی ہے اور کہہ دیا کہ یہ گَانتُ لَهُمْ جَزَاءً (25:15) تمہارے اپنے حسن عمل کا پھل ہے۔ اور اگلا لفظ مَصِيرًا ہے۔ میں نے گزارش کی ہے کہ ہمارے ہاں ہم یہ یا قرآن آپ سب سے بڑا یہ ظلم ہوا کہ اس کے ترجمے ہونے لگ گئے۔ جیسا میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کے الفاظ کا تو عربی زبان میں کوئی مرادف بھی نہیں ملتا چہ جائیکہ دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو جائیں مثلاً وہ جو ہے: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُونَ (2:156) ہم خدا کے ہیں خدا کی طرف پھر جائیں گے۔ اسی طرح وَ مَصِيرًا (25:15) کا ترجمہ بھی کرتے ہیں کہ ہم پھرو ہیں جانے والے ہیں تو بس گویا یہی چیز ہے کہ وہاں سے ہم آئے تھے یہاں آ کے اس دلدل میں پھنس گئے اور یہاں سے کسی طرح چھٹکارا ہوگا تو پھر وہیں چلے جائیں گے As you were ہو جائیں گے<sup>1</sup>۔ یہ سارا چکر یہ انسانوں کا سلسلہ رشد و ہدایت یہاں آنا حق و باطل کی تیز اتنی جانکاہ مشقتیں یہ سارا کچھ کا ہے کے لیے ہے؟ کہ جیسے پہلے تھے ویسے ہی پھر ہو گئے۔

## اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُونَ کا قرآنی مفہوم لفظ المصير میں مضمر ہے

قرآن تو ارتقائی منازل بتا رہا ہے۔ زندگی اولیں جرثومے سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکر انسانیت میں پہنچی۔ یہ یوں سمجھیے کہ طبعی ارتقا تھا۔ اب اس کے بعد انسان کی ذات کا ارتقا شروع ہوتا ہے۔ یہ آگے بڑھتا ہے تدریجاً اگلی منزلیں طے کرتا ہے یہ مرنے کے

1 جیسے تھے ویسے ہی ہو جائیں گے۔

بعد کی زندگی اس زندگی سے اگلی منزل ہے ارتقا کی اونچی بلند منزل اس سے آگے کی ہے۔ اور اس طرح سے آہستہ آہستہ کسی ایک مقام کے اوپر پہنچنا ہے۔ وہ جو میں نے کچھ دفعہ کہا تھا کہ تقدیر کے معنی Destination ہے جسے انگریزی میں Destiny کہا گیا یعنی کسی چیز کا وہاں پہنچ جانا جو اس کا منتہا ہے جو اس کا آخری مقصود ہے اسے فلسفے میں کہتے ہیں: کسی Becoming کا Being ہو جانا۔ Becoming وہ Process ہوتا ہے جس میں وہ کچھ آہستہ آہستہ بن رہا ہوتا ہے اور Being ہوتا ہے وہ جو کچھ وہ بن جاتا ہے۔ یہ لفظ مصیراً ہے۔ قرآن میں ہے کہ وَ اِلٰی اللّٰهِ الْمَصِيرُ (3:28)۔ مصیر کے معنی ہوتے ہیں وہ مقام جہاں انسان ادھر ادھر سے چلتا چلتا جس آخری منزل پہنچ کے تکمیل حاصل کر لے اسے مصیر کہتے ہیں یعنی لفظ ایک ہے مگر قرآن اس کے اندر زندگی کا اتنا بڑا فلسفہ بیان کر جاتا ہے اور پھر یہ مصیر کیسے حاصل ہوتا ہے؟ یہ جو انتہائی مقام ہے یہ انسانی ذات کو کس طرح سے حاصل ہوتا ہے اس کے لیے کہا کہ وَ اِلٰی اللّٰهِ الْمَصِيرُ (3:28) اپنے اندر خدائی صفات کو منعکس کرتے چلے جانے سے یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ وَ اِلٰی اللّٰهِ الْمَصِيرُ

(3:28) کے معنی ”خدا کی طرف آخر میں جانا ہے۔“ تو طرف کے تو معنی ہوں گے کہ خدا کو کسی مقام کے اوپر بٹھا دیا جائے، پھر ہی آپ اس کی طرف جائیں گے۔ وہ تو اطراف اور سمتوں سے بلند و بالا ہے۔ اس کی طرف جانے کے کیا معنی ہیں؟ عام الفاظ میں یوں کہیے کہ بہ حد بشریت خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا، اگر چھوٹے پیمانے پہ کہیے تو انسان کا اپنے حد بشریت میں خدائی صفات کا حامل بننے جانا، انسان خدا تو نہیں بن سکتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آہستہ آہستہ خدائی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا تا نکہ وہ آخری منزل جہاں تک یہ پہنچ سکتا ہے یہ پہنچ جائے۔ یہ وہ چیز ہے جو قرآن کریم کے متعلق یہ شخص<sup>1</sup> کہہ گیا ہے اور اس سے آگے کیا کوئی اور کہے گا! پوچھا یہ گیا کہ قرآن کرتا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

آنچه حق می خواهد آں سازد ترا

جیسا خدا چاہتا ہے کہ تو بن جائے قرآن تجھے ویسا بنا دیتا ہے۔ یہ ہے ومصیراً!

انسان کا بلند ترین مقام کا حاصل کر لینا المصیر جسے جنت کہا جائے گا

عزیزان من! مصیر وہ آخری منزل ہے کہ جس میں جیسا خدا چاہتا ہے کہ تو بن جائے جہاں پہنچ کے تو ویسا بن جائے گا۔ یہ ہے جنت۔ خدائی صفات کا اپنے اندر منعکس کرتے جانا۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ خدا کی سب سے بلند ترین صفت جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے اختیار و ارادہ ہے باقی تمام صفات اس کے نیچے رہتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور اختیار تو لامحدود ہے۔ اس کائنات میں اپنی مخلوق میں

1 یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

ایک حد تک یہ اپنی جو خصوصی صفت اختیار و ارادہ کی تھی یہ انسان کو دی۔ یہ صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ کائنات کی کسی دوسری شے کو اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا اسے دیا گیا ہے تاکہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (18:29) ہم نے دنیا میں اس کی طرف حق بھیج دیا ہے ان میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ یہ بڑی چیز ہے اور یہ جو انسانی ذات کا نشوونما پانا ہے یہ جسے میں نے خدائی صفات کہا ہے یہ ان کا اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا ہے۔

انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت اختیار و ارادہ کی وسعتیں ہیں

سب سے بڑی چیز اختیار کی وسعتیں ہیں۔ اس کا اختیار بڑھتا چلا جاتا ہے جتنا زیادہ یہ خدا کی صفات کا حامل ہوتا جاتا ہے۔ سب سے پہلی صفت اختیار و ارادے کی ہے۔ اس کا اختیار و ارادہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہ مقام جسے جنت اور مصیر کہا ہے اس کی خصوصیت یہ

بتائی ہے کہ لَہُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ (16:31)۔ جس میں یہ جو چاہیں گے ہو جائے گا۔ یہ وہ کیفیت ہے۔ جنت مقام نہیں ہے زندگی کی کیفیت ہے وہ ارتقائی حالت ہے۔ کیا بات ہے صاحب! لَہُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ (16:31) کتنی بڑی چیز ہے، عزیزانِ من! ان کا اختیار و ارادہ اس حد تک بڑھے گا۔ قرآن منفرد ہے۔

پہلی چیز تو اس میں یہ دو باتیں لے لیجیے جن کو واضح کرنا ضروری ہے۔ ذہن میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب کہا جائے کہ جو چاہو گے ہو جائے گا، جو مانگو گے ملے گا، تو پھر تو یہ ہوتا ہے کہ یہ ساری حرام خوریوں کی چیزیں، جتنی بھی ہیں، جو چاہو گے ہو جائے گا تو پھر یہاں تو یہی سیپا ہے۔ یہاں کا جو صاحب اختیار ہے وہ تو یہ کہتا ہے کہ صاحب! اس میں کوئی قانون نہیں، کوئی آئین نہیں، کوئی Constitution نہیں، کوئی Law (قانون) نہیں، کوئی کچھ نہیں، جو ہماری مرضی ہے کریں گے۔ کہا کہ اس کو تو بدترین قسم کا استبداد کہتے ہیں، تو کیا یہ وہاں مستبد قسم کے ڈکٹیٹر اکٹھے ہو جائیں گے؟ اک ڈکٹیٹر مان نہیں جنتوں جہنم بنا دینا اے تے، او جنت اچ بے سارے ڈکٹیٹر اکٹھے ہو گئے، تے پتہ نہیں تے فی اللہ میاں تے، ادناں دے فرشتیاں نوں کتھے تھیں لکھے گا۔<sup>①</sup> قرآن ہے، عزیزانِ من! کہا ہے کہ لَہُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ (25:16) اس میں جو یہ چاہیں گے ہوگا۔ پھر کہا: یہ ہوں گے کون؟ کہا: وہ یہ ہوں گے جو مَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (76:30) چاہیں گے ہی وہی جو ان کا خدا چاہے گا۔

① ایک آمر ہی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ تو جنت کو جہنم میں بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اگر جنت میں وہ تمام آمر اتحاد کر کے آدھمکے تو پھر تو معلوم نہیں کہ اللہ میاں اور اس کے فرشتوں کو کہاں جگہ ملے۔

## انسانی چاہتوں سے بھی آگے کی منزل

اس کے آگے ہے کہ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا<sup>①</sup> (76:30)۔ ہم نے جو کہا تھا کہ جو چاہیں گے وہاں ملے گا اس لیے کہ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا (76:30) اے گل اسی سوچ سمجھ کے کہی۔ ابہد اتر جمہ اے ہووے گا۔<sup>②</sup> ایک بات اور بڑی خوبصورت کہی ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں یہ جو مانگیں گے ملے گا، جو چاہیں گے وہ ہوگا، اور اس کے بعد کہا کہ یہ انسان لامحدود تو نہیں ہے، محدود ہے۔ اس لیے اس کا جو چاہنا ہے وہ بھی تو محدود ہوگا، اس کی جھولی جو مانگنے کی ہے وہ مانی ہوئی، تولی ہوئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بڑی توں بڑی کھنڈ کرے گا تے کی منگ لیے گا۔<sup>③</sup> یعنی جسے ہم یہ کہتے ہیں جو انسان کی تمنا اور آرزو کی آخری حدود ہے وہاں تک ہی جائے گا، اس سے آگے تو نہیں جائے گا اس لیے کہ یہ ٹھیک ہے لَہُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا (50:35) اس میں یہ جو چاہے گا اس کو ملے گا لیکن یہ تو پھر بھی

محدود ہوگا اور اسے کیا پتہ ہے کہ اس کے بعد وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ (50:35) اور ہمارے پاس تو اس کو آگے دینے کے لیے بھی کچھ ہوگا۔ دینے والا ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری مانگ کی جواہر ہے وہ تو کہتا ہے کہ وہ تو ہوتی ہی جائے گی اور ہمارے پاس اس سے آگے بھی دینے کے لیے کچھ اور ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس منزل کو یہ اپنے ذہن میں اپنی آخری منزل سمجھے گا وہ بھی آخری منزل نہیں ہوگی اس سے آگے اور منزلیں ہوں گی:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

(اقبال)

جنت میں انسان کی پیشانی کا نور مزید اگلے راستوں کو منور کرتا جائے گا

عزیز ان من! ایک لفظ اور آیا ہے۔ (18:31) میں نعمائے جنت کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ ساری جتنی بھی نعماء تم دیکھ رہے ہو جو گناہ گئی گئی ہیں اور اس میں ان کا بہت تذکرہ ہے کہ یہ ہوگا اور وہ ہوگا، یعنی انسانی خواہشوں کی آرزوؤں کی تمناؤں کی تصورات کی انتہا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ سارا کچھ جو ہے یوں سمجھو کہ وہ ایک بہت اعلیٰ درجے کی کرسی پہ یا صوفے پہ بیٹھے ہوں گے جس کے یہ بازو بھی ہوں گے

① اس لیے خدا کا قانون علم و حکمت پر مبنی ہے (74:56; 81:29)۔

② یہ بات ہم نے سوچ سمجھ کر کہی ہے۔ اس کا یہ ترجمہ ہوگا۔

③ بڑی سے بڑی خواہش بھی کرے گا تو کیا مانگ لے گا!

تو کہا کہ یہ سارا کچھ کس چیز کے لیے ہوگا؟ ”ارتفاق“ کہتے ہیں اس شے کو جیسے کرسی کے یہ بازو کہ جس کے سہارے سے انسان اوپر اٹھے۔ یہ تمام محنتیں اور خوشگواریاں وہ سہارے ہیں جن کے ذریعے انسان اس مقام سے اور اونچا اٹھے گا۔ اس لیے کہا کہ وَحَسَنَتْ مُرْتَفَقًا (18:31) یہ منتہا نہیں ہے، یہ بھی اور بلند ہونے کا ذریعہ ہے۔ زندگی کے ارتقائی منازل میں جنت بھی آخری مقام نہیں ہے اور قرآن نے اسی لیے کہا ہے کہ وہاں مومنین کی ہیڈ لائن ان کے پیشانی کا نور ان کے اگلے راستے روشن کرتا چلا جائے گا۔ اسی لیے وہاں کی نعماء کو اس نے ”ارتفاقات“ کہا ہے۔ مرتفعاً کہا ہے جس کے سہارے سے انسان اوپر اٹھ جائے۔ خلل دین (25:16)۔ اور وہاں سے نکالے گا کوئی نہیں اور اس کے بعد کہا کہ كَانَ عَلَى رَبِّكَ وَعْدًا مَسْئُولًا (25:16) یہ یونہی کسی ایرے غیرے کا وعدہ نہیں ہے یہ تیرے رب کا حتمی وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔

انسان خدا کے کیے گئے وعدہ کے متعلق بھی پوچھ سکتا ہے

جہاں بھی قرآن نے خدا کا وعدہ کہا ہے اس کے معنی ”اس کا یہ غیر متبدل قانون ہوتا ہے“ اور خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اس کے معنی ہیں: لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (48:23) خدا کے قانون میں جو کچھ اس نے کہا ہے یوں کہیے اس میں کبھی تبدیلی نہیں آتی اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا۔ پہلی چیز تو یہ کہی کہ كَانَ عَلَى رَبِّكَ وَعْدًا (25:16) یہ تیرے خدا کا وعدہ ہے یہ قانون ہے اور اگلا لفظ ہے عزیزانِ من! بڑا ہی اہم نکتہ میں توجہ اس پہ آیا ہوں تو پوچھیے نہیں میری کیفیت کیا رہی ہے كَانَ عَلَى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا (25:16) یہ وہ وعدہ ہے سمجھانے کے لیے کہ اگر بفرض محال تم سمجھو یہ پورا نہ ہو تو مَسْئُولًا تو تم پوچھ سکتے ہو کہ یہ وعدہ کیوں پورا نہیں ہوا۔

میں نے عرض کیا تھا عزیزانِ من! کہ ایک ہی چیز ہے کہ قرآن سے اگر خدا کا تصور متعین کر لیا جائے سب کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ وعدہ ہے قانون ہے غیر متبدل ایسا ہے کہ كَانَ عَلَى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا (25:16) وہ وعدہ ہے یعنی یہ تو اس نے کہا ہے کہ اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ سمجھانے کے لیے کہا ہے کہ اگر بفرض محال کبھی ایسا ہو تو یہ وہ ہے کہ تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا سرکار! آپ نے تو یہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا یہ زندگی اچھی ہے یا وہ زندگی کہ جس کے اندر تم زنجیروں میں جکڑے جاؤ گے تنہائی کی کوٹھڑیوں میں بند کیے جاؤ گے کیفیت تمہاری چیخنے چلانے کی یہ ہوگی کہ داروغہ جہنم کی منتیں کرو گے کہ ہمیں پھانسی کے تختے پہ لٹکا دو اس عذاب سے نجات دلا دو اور وہ کہے گا کہ یہاں تو موت نہیں ہے تمہیں ہر طرف سے موت آتی دکھائی دے گی موت آئے گی نہیں۔ پوچھا کہ کیا یہ زندگی بہتر ہے یا یہ زندگی کہ جس میں کیفیت یہ ہوگی کہ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ (25:16) اتنی وسعتیں اختیارات کی ہوں گی کہ جو چاہو گے ہوگا یہاں تک کہ وَلَنَّا مَزِيدٌ (50:35) اس سے بہت کچھ اور آگے بھی ہوگا۔ خَلْدِينَ (25:16) وہاں سے تمہیں کوئی بھی نکالے گا نہیں اور یہ اس خدا کا وعدہ ہے کہ جس کے وعدے کی کیفیت یہ ہے کہ اگر بفرض محال یہ کہا جائے

کہ پورا نہ ہو تو اس سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ وعدہ کیوں نہیں پورا کیا۔ کہا کہ بتاؤ دونوں زندگیوں میں سے کون سی بہتر ہے؟

عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی آیت 16 تک ہم آگے 17 ویں آیت سے آئندہ درس میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط





## پانچواں باب: سورة الفرقان (آیات 17 تا 18)



عزیزانِ من! آج جنوری 1978ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 17 سے ہوتا

ہے: (25:17)۔

### قرآنِ حکیم کی تعلیم کو نظروں سے اوجھل کر دینے کا نتیجہ

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں عمودی موضوع جہنم کا بیان تھا اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مرنے کے بعد کی قیامت، حشر، جہنم، جنت، پرتو ہمارا ایمان ہے لیکن قرآنِ کریم نے صرف قیامت، حشر اور جہنم کا ہی ذکر نہیں کیا جو مرنے کے بعد آتا ہے وہ اس دنیا میں بھی جہنم کے عذاب کا ذکر کرتا ہے جس میں خصوصیت سے غلام اور محکوم قومیں گرفتار ہوتی ہیں اور یہ محض تفسیر یا تاویل نہیں، قرآن نے خصوصیت سے ان چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی سازش تھی کہ قرآن میں جہاں جہاں محکومیت کے اس عذاب کا ذکر آیا، اس امت کے سامنے یہ نہ بتایا گیا کہ ہم خود اس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ اگر یہ بتایا جاتا تو اس سے نکلنے کی کوئی تدبیر سوچی جاتی، کم از کم دل میں آرزو ہی اُبھرتی لیکن جب مطمئن کر دیا جائے کہ نہیں، ان کا تعلق تو آخرت سے ہے اور آخرت میں صرف کفار اور مشرکین اور ملحد اور مرتدین، یہ سب جہنم میں جائیں گے اور خدا کے محبوب کی امت کے لیے جنت لکھ دی گئی ہے، تو سیدھی بات ہے پھر جس حالت میں بھی ہم رہیں اس سے نکلنے کی کوئی خواہش و آرزو کا پیدا ہونا تو ناممکنات میں سے ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھے اور کہا کہ اس دنیا میں یہ مصیبتیں، تکلیفیں، نامساعد حالات، خدا کے مقرب بندوں کی علامات ہیں، تو جہنم میں زندگی بسر کیے جا رہے ہیں اور ذہنی طور پہ ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ تم خدا کی محبوب قوم ہو، خدا کے برگزیدہ بندے ہو۔ صدیوں سے اس قوم کو اس مغالطے میں مبتلا رکھا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دن بدن ان کی حالت ابتر سے ابتر ہوتی چلی گئی یہ **اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ** <sup>①</sup> (95:5) کے درجے تک پہنچ گئے لیکن بڑے مطمئن بلکہ بڑے خوش رہے۔ جتنی زیادہ تکلیفیں پہنچیں، اتنے ہی خوش ہو گئے کہ ہم خدا کے زیادہ محبوب بندے بنتے چلے جا رہے ہیں۔

سابقہ آیات کے ضمن میں ایک فقرہ یہ آیا تھا کہ ان کے مقابلے میں دوسری وہ جماعت ہے جو خدا کے قوانین کا اتباع کرتی ہے۔ اس

کی زندگی کس قدر خوشحالی اور خوشگوار یوں کی ہے قرآن کریم یہ ذکر کر کے پھر اسی جہنم کی طرف آتا ہے کہ وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ ءَآنْتُمْ أَضَلَلْتُمْ عِبَادِي هَؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ<sup>2</sup> (25:17)۔

### قرآنی آیات کے موجودہ تراجم اور تفاسیر کے عمل نے قرآن کو کیا سے کیا بنا دیا

اب یہاں مَا يَعْْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (25:17) آ گیا۔ اس کا ہمارے ہاں عام ترجمہ اور تفسیر یہ چلی آرہی ہے کہ جن چیزوں کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے تھے انہیں اور انہیں اکٹھا کیا جائے گا اور ان سے جن کی یہ پرستش کرتے تھے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ہمارے بندوں کو غلط راستے پہ ڈال دیا تھا؟ اب ہمارے ہاں تو یہ جہاں بھی آتا ہے کہ یہ خدا کو چھوڑ کے کسی اور کی پرستش کرتے تھے تو وہ بت ہوتے ہیں۔ بتوں کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ بت ہیں جن کی خدا کو چھوڑ کے پرستش کی جاتی ہے۔ تو اب یہاں بات یہ ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ان بتوں سے پوچھے گا کہ کیا تم نے ہمارے بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ جب اعتراض کیا کہ صاحب! بت تو ساری عمر ہمارے سامنے ہوتے ہیں وہ تو بولتے ہی نہیں ہیں۔ ان چیزوں کا جواب تو بڑا آسان ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں ان کو یہ قوت گویائی عطا کر دے گا۔ خدا ان پتھر کی صورتوں سے پوچھے گا کہ کیا تم نے ان جیتے جاگتے انسانوں کو گمراہ کیا تھا؟ وہاں عبادت کا مفہوم پرستش کیا، اور یہ جو پرستیدہ ہیں یہ

#### 1 حیوانی زندگی کی پست ترین سطح

2 جب (ظہور نتائج کے وقت) ان لوگوں کو جو خدا کے اقتدار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں، ان کے معبودوں کے ساتھ اکٹھا کیا جائے گا۔ تو ان کے معبودوں سے پوچھا جائے گا کہ میرے ان بندوں کو صحیح راستے سے بہکایا تھا یا یہ خود ہی بہک گئے تھے (پرویز: مفہوم القرآن ص 818)۔

مٹی اور پتھر کی صورتیں اور بت بنائے۔ اب ساری باتیں ان کی طرف منسوب کر دیں۔ نہ ہم مشرک ٹھہرے نہ جن کی ہم معبودیت اختیار کیے ہوئے ہیں، حکومت اختیار کیے ہوئے ہیں، غلامی اختیار کیے ہوئے ہیں، نہ وہ معبود بنے نہ ان سے کسی قسم کی باز پرس ہوئی، نہ ہم سے کوئی سوال ہوا۔ سوال ہوا تو وہ بت پرستوں سے اور ان کے بتوں سے۔ معاملہ وہاں تک ٹھہر گیا۔ یہاں یہ قصہ ہوا اور وہاں قیامت میں جو سوال جواب کا تعلق ہے، وہ ان سے ہو گیا۔ ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن کیا بات بتاتا ہے، یہ کن کی معبودیت تھی، کون تھے جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ تم نے ہمارے بندوں کو گمراہ کیا تھا؟

### جہنم میں متبعین اور لیڈروں کے مابین باہمی مکالموں کا ذکر

قرآن کریم میں متعدد مقامات میں جہنم میں کچھ مکالمات کا ذکر آیا ہے۔ ان کے درمیان واضح طور پہ وہ بتاتا ہے کہ

لیڈروں اور عوام میں سے ان کے Followers (متبعین) کے مابین باہمی مکالمے ہیں۔ بڑی تفصیل سے قرآن نے وہ مکالمات دیئے ہیں۔ جہنم کے عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد یہ عوام سب سے پہلے ان پہ اعتراض کرتے ہیں کہ تم تو ہمیں یہ کہتے تھے کہ ہمارے پیچھے چلو اور اس کے بعد دیکھو کہ کس قسم کی تمہیں خوشگوار یوں کی زندگی عطا ہوتی ہے! ہمارے نظام میں کیا کیا چیزیں ملیں گی جب وہ قائم ہوگا، بس اس نظام کے قیام میں ہماری مدد کرو، پھر دیکھو راوی عیش لکھتا ہے اور وہ یہ کہیں گے کہ ہم تو جہنم کے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔ تم نے کیا کہا تھا اور یہ ہوا کیا؟ اب ان اعتراضات کو ان سوالات کو دیکھیے۔

بڑے دلچسپ مکالمے ہیں۔ وہ تمام تفصیل تو بہر حال اس وقت آئے گی جب یہ مقام خود سامنے آئیں گے یعنی آیات سامنے آئیں گی، ضمناً سورۃ سبائیں آیا ہے کہ وَلَوْ تَرَىٰ اِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ صَلَّٰی يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ اِلْفَوْلَ يَقُولُ الَّذِیْنَ اسْتَضْعَفُوا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوا لَوْ لَا اَنْتُمْ لَکُنَّا مُؤْمِنِیْنَ (34:31)۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ان مجرد حقیقتوں کو، بسیط حقیقتوں کو، جو Abstract Truth ہوتی ہیں، جو غیر محسوس ہوتی ہیں، تمثیلی انداز میں، محسوس طریقے پر سامنے لاتا ہے۔ اس طرح سے بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور جلدی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ وہ نقشہ یوں کھینچتا ہے کہ جیسا خدا کی عدالت ہے اور اس کے سامنے یہ لوگ پیش ہیں اور وہاں ان سے پوچھا جاتا ہے سوال کیا جاتا ہے اور وہاں کٹھرے میں کھڑے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے ایک طرف یہ Leaders (لیڈر) ہیں، دوسری طرف متبعین ہیں اور وہاں ان کے آپس میں سوال جواب ہوتے ہیں۔ محسوس انداز میں وہ بات کرتا ہے کہ وہاں یہ خدا کے سامنے کھڑے ہیں اور یَقُولُ الَّذِیْنَ اسْتَضْعَفُوا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوا<sup>1</sup> (34:31)۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بات بتوں کی نہیں ہے۔ قرآن خود اسْتَکْبَرُوا (34:31) بتا رہا ہے، یعنی وہ جو ان میں سے بڑے بن بیٹھے تھے۔

میں پھر عرض کروں گا کہ آپ قرآن کے الفاظ پہ آئیے۔ یہ باب استکبر و اکامادہ ”ک ب ر“ ہے جس میں اکبر اور کبریائی آئی ہے لیکن یہ جو استکبر و اکا باب ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ”درحقیقت تو وہ ایسے نہیں تھے البتہ ایسے بن بیٹھے تھے۔“ یہ زبان عجیب و غریب ہے۔ اس کے بنیادی معنی ایک ہوتے ہیں، وہ تو ہر لفظ کے اندر جھلکتے چلے جاتے ہیں، پھر ان میں مختلف باب<sup>2</sup> ہوتے ہیں مثلاً اسْتَفْعَال<sup>3</sup> باب ہے۔ ان کے وزن پہ جو الفاظ آئیں گے ان میں اس باب کی جو الگ خصوصیت ہوتی ہے وہ بھی آئے گی۔ اس کی مثال استکبروا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ ان لوگوں میں سے بڑے بن بیٹھے تھے، بڑے بننے کی خواہش ہوتی تھی۔ دوسری طرف ہے: اَلَّذِیْنَ اسْتَضْعَفُوا لِلَّذِیْنَ (34:31) جنہیں کمزور کر دیا گیا تھا یا جنہیں کمزور سمجھ لیا گیا تھا، بنا دیا گیا تھا۔ یہ ہے اس باب کا

خاصہ اس لیے کہ قرآن کریم کی رو سے تو تمام انسان یکساں ہوتے ہیں۔ انہیں تو انسان کچھ کر دیتا ہے: **يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ** (28:4)۔ ان میں ابنائے قوم کو ذبح کرتا چلا جاتا ہے، باقیوں کو کمزور کرتا چلا جاتا ہے اور خود بڑا بن کے بیٹھ جاتا ہے۔ کہا کہ وہ لوگ جنہیں یہاں کمزور کر دیا گیا تھا، کمزور سمجھ لیا گیا تھا، وہ ان سے کہیں گے جو یہاں ان کے ہاں کے بڑے بن بیٹھے تھے۔ اب عزیزانِ من! خود سمجھ لیجیے کہ ان سے بات بتوں کی تو نہیں ہو رہی۔ یہ کہیں گے کہ **لَوْ لَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ** (34:31) اگر تم ہمارے ہاں نہ ہوتے تو ہم واقعی صحیح راستے پہ چلتے جو خدا نے ہمیں بتایا ہوا تھا۔ یہ تمہاری وجہ سے ہے کہ ہم نے وہ راستہ چھوڑا اور غلط راستہ اختیار کیا: **قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتَضَعُّوْا اَنْحُنْ صَدَدْنا كُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ** (34:32) وہ ان سے کہیں

① عوام جو قوت میں کمزور تھے اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ.....

② فعل کی ہر نئی شکل جو فعل ماضی اور اس کے فعل مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں (زبر، زیر، پیش) سے مل کر بنے ایک باب کہلاتی ہے۔ ماضی اور مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں کے اعتبار سے ثلاثی مجرد کے چھ ابواب مستعمل ہیں۔ ثلاثی مجرد کے علاوہ ایسے افعال جن میں اصلی حروف تو تین ہی ہوں، لیکن ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں، ثلاثی مزید فیہ کہلاتے ہیں۔ ان کے مختلف ابواب مختلف اوزان پر آتے ہیں، جن میں بیشتر استعمال ہونے والے ابواب قرآن مجید میں بارہ ہیں۔ ان کی مزید تفہیم کے لیے دیکھیے: پرویز لغات القرآن جلد اول۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص 46 تا 70۔

③ باب **اسْتِغْفَعَالٌ** کے خواص: ثلاثی مجرد کو باب **اسْتِغْفَعَالٌ** میں منتقل کرنے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب ہوتے ہیں: (1) کسی کام کو چاہنا، اسے طلب کرنا اور مانگنا۔ (2) مفعول میں فعل کی صفت کو پانا یا سمجھنا۔ (3) کسی کام کا اثر قبول کرنے اور اس کے ساتھ جیسا کیا جائے ویسا ہو جانے کے لیے بھی اس باب کو استعمال کیا جاتا ہے۔ (4) کبھی یہ باب ثلاثی مجرد کے ہم معنی ہوتا ہے (پرویز لغات القرآن جلد اول ادارہ طلوع اسلام لاہور ص 64-65)۔

گے کہ خدا کی طرف سے صحیح ہدایت و راہنمائی تو تمہارے سامنے آچکی تھی۔ کیا تم آج چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ ہم نے تمہیں اس سے گمراہ کیا تھا؟ اصل بات یہ ہے کہ تم ہی اس کے اوپر نہیں چلنا چاہتے تھے، تم خود مجرم تھے، ہم نے تو تم سے صرف فائدہ اٹھایا ہے۔ قرآن بڑی عظیم بات کہہ گیا ہے۔ یہ ایک غلامی اور محکومی کی نفسیات ہوتی ہے، ایک سائیکولوجی ہوتی ہے۔ یہ خود نہیں اس راستے پہ چلنا چاہتے اور اونگھتے کو سوجاتے کا بہانہ۔ یہ جو درمیان میں بڑا بننا چاہتے ہیں، وہ ذرا سا ان کو اشارہ کرتے ہیں اور یہ لپک کر ان کے پیچھے چل دیتے ہیں۔ از خود یہ کیوں نہیں کرتے؟

اصل بات اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کرنا ہے

قرآن بتاتا ہے کہ ان کے من کے اندر تو اپنا چور ہوتا ہے لیکن یہ اس کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتے کہ ہم خود گمراہ ہوئے تھے۔ جیسے ہر فرد اپنے ہر بد فعل کا ذمہ دار شیطان کو قرار دے دیتا ہے۔ **Self-deception** (فریب نفس) ہے۔ یہ اپنے آپ کو خود ایک مغالطے

میں رکھنا ہے۔ یہ جو ہم اپنے ہر برے کام کو ابلیس یا شیطان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، یہ درحقیقت فریب نفس ہے کہ ہم اس کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے، قبول نہیں کرنا چاہتے، اعتراف نہیں کرنا چاہتے یا یہ جو کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ ابلیس کی طرح کرنے والے تو گناہ گار مجرم ہوئے اور ہماری طرح کے یہ جو اللہ کے بظاہر مقدس بندے ہیں، میں مقدس Quoted کہہ رہا ہوں، وہ جو کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ تو اللہ کی مرضی سے یہاں سب کچھ ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ملتا، بات یہ بھی وہی ہے کہ یہ جو ہم سے غلطیاں ہوتی ہیں، ہم سے گناہ سرزد ہوتے ہیں، تو انسان تو مجبور واقع ہوا ہے۔ خدا کے حکم کے بغیر تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بھی وہی چیز ہے۔ اسی لیے اس<sup>1</sup> نے کہا تھا کہ:

یہ تیرے مومن و کافر، تمام زناری

شیطان کو ذمہ دار ٹھہرانے والے یا یہ کہنے والے کہ خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتہ نہیں ملتا، اس لیے ہم کیسے اپنی مرضی سے یہ کر سکتے تھے، دونوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان اپنے جرائم اور غلط کاریوں کی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتے جیسے شیطان کو بدنام کر کے اس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ اللہ کے بندے خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور مقدس بن جاتے ہیں کہ رضائے خداوندی یہی ہے، مرضی مولیٰ برہمہ اولیٰ۔<sup>2</sup> قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ایمان سے کہو تمہارے دلوں کے اندر کیا یہ بات نہیں تھی کہ یہ اس قسم

1 یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

وجود انہی کا طواف بتاں سے ہے آزاد یہ تیرے مومن و کافر، تمام زناری! (ضرب کلیم)

2 مالک کی رضا سب سے بہتر ہے۔ ہر امر میں خدا کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔

مرضی یار کے خلاف نہ ہو لوگ میرے لیے دعائے کریں

کے خدا کی پابندیاں گراں گزرتی تھیں، ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے، جن کے اندر تو یہ بات تھی مگر جرأت اتنی نہیں تھی کہ اس کا یوں اعلان کرتے۔ تم تو چاہتے تھے کہ کسی طرح سے ذرا سی کوئی سبز جھنڈی دکھائے اور گاڑی چل پڑے۔ اوگاڑی تو چلنے کے لیے پہلے تیار کھڑی ہوتی ہے۔ انجن چلنے کے لیے تیار نہ ہو، یہ گاڑی لاکھ جھنڈیاں دکھاتا رہے گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ انہوں نے کہا کہ تم خود مجرم تھے لیکن تمہارے اندر یہ جرأت نہیں تھی۔ اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ وَقَالَ الَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَأْمُرُونَنَا اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهُ اٰنَادًا (34:33) کہا کہ تم ہمیں یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ وہ جو دن رات تم پلان بناتے رہتے تھے، سازشیں کرتے رہتے تھے، چالیں چلتے رہتے تھے کہ اس طرح سے انہیں الجھاؤ، اُس طرح سے اپنے پیچھے لگاؤ، یہ جو کچھ تم کرتے رہتے تھے، ہم تو اس کی وجہ سے پھنس گئے۔ غور کیجیے جب کسی غلط نظام، غلط دور، اقتدار کے نتائج

سامنے آتے ہیں اس سے سارا معاشرہ چیخ اٹھتا ہے۔ یہ ادب والوں سے کہیے کہ تمہاری وجہ سے یہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہم کیا برے ہیں جیسا دودھ ہوتا ہے اسی قسم کی بالائی آتی ہے ہم اسی قوم کے پیدا کردہ ہیں، قوم ہی ایسی ہے۔ وہ قوم کہتی ہے کہ ہم جو کچھ کرتے تھے یہ اتنے چالاک تھے کہ ہمیں یہ اس غلط فہمی میں مغالطے میں رکھتے تھے دھوکا دے جاتے تھے فریب کر جاتے تھے الجھا جاتے تھے ہمیں سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں بس الجھا کے لے جاتے تھے تو ہم تو اس طرح سے مارے جاتے تھے ہم تو بالکل بدھود واقع ہوئے تھے۔ اس غلط نظام میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے یہ جو محکوم متعین یا عوام یا جن کو آج کی اصطلاح میں پیچھے چلنے والے کہتے ہیں یہی محکوم ہیں یہ آگے چلنے والے معبود ہیں یہ ان کے عبادت گزار کہیے۔ یہ ان کے مکالمے ہو رہے ہیں۔

### قرآن حکیم نے سائیکولوجی کو بڑی اہمیت دی ہے

ان عوام کی پیچھے چلنے کی جو نفسیات ہے آج کی سائیکولوجی نے جیسا میں اکثر کہا کرتا ہوں قرآن کے سمجھنے کے لیے بہت سی چیزیں بہت اچھی کی ہیں۔ یہ بات فلسفے سے بہت آگے چلی گئی ہے۔ قرآن کا تعلق فلسفے سے نہیں ہے بلکہ زیادہ سائیکولوجی سے ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ جب تک کسی قوم کی نفسیات میں تبدیلی نہیں واقع ہوتی اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک نیا علم اس دور میں ہمارے ہاں پروان چڑھا ہے یا بڑھ رہا ہے گو کہ ابھی آگے تک وہ سائنس تو نہیں بن سکا لیکن اس کے باوجود نفسیات کے متعلق وہ بڑی عجیب باتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ ایرک فرام<sup>1</sup> امریکہ میں سے ہے۔ آج کل Psycho-Analysis (تحلیل نفسی) میں بڑے بلند مرتبے کا ریسرچ اسکالر (Scholar) مانا جاتا ہے۔ اس کی بڑی عمدہ کتابیں ہیں۔ Latest (جدید ترین) ہیں اس لیے میں اکثر اس کے حوالے دیتا رہتا ہوں۔ اس کی ایک کتاب Fear of Freedom (خوف آزادی) ہے۔ ساری دنیا یہ کہتی ہے کہ ہر شخص Freedom (آزادی) چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں یہ جو عوام ہیں یہ Freedom (آزادی) سے ڈرتے ہیں کیونکہ Freedom (آزادی) میں بڑی ذمہ داریاں لینی پڑتی ہیں یہ ذمہ داریوں سے گھبراتے ہیں۔ یہ وہی بات جو بہت پہلے<sup>2</sup> وہ کہہ گیا ہے کہ

نے تیرکماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ محکوم کی نفسیات ہے اور پھر یہ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب ہے۔ اس کی نگاہ بھی نفسیات پہ بڑی گہری جاتی تھی۔

## اپنے لیے خود کو کوئی فیصلہ کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے

یہ بات ایرک فرام (1900-1980) لکھتا ہے کہ عوام یہ نہیں چاہتے ہیں کہ ذمہ داریاں لیں۔ یہ ذمہ داریوں سے گھبراتے ہیں۔ اس نے کہا کہ سب سے بڑا مشکل کام اپنے لیے خود فیصلہ کرنا ہے۔ یہ اس سے گھبراتے ہیں۔ یہ کرائے ہوئے فیصلے چاہتے ہیں۔ سب سے پہلا مغالطہ تو یہ مذہب دیتا ہے یعنی یہ کیے کرائے ہوئے فیصلے لیتا ہے مثلاً اسلاف نے یہ فرما دیا، فلاں کتاب میں یہ آیا ہے، تفسیر میں یہ لکھا ہے، فلاں امام کا یہ قول ہے یا یہ کہ ہم توفیقہ خفی کے پابند ہیں صاحب! ہم امام بخاری کے پیچھے چلتے ہیں۔ یہ خود کوئی Decision (فیصلہ) نہ لینا ہے۔ اپنے لیے خود کوئی فیصلہ لینے میں بڑی محنت کرنا پڑتی ہے، سیروں خون خشک ہو جاتا ہے، فکر کے بعد کسی فیصلے پہ پہنچنا اور اس فیصلے کے بعد پھر اس کی ذمہ داری لینا، بڑی ہمت کا کام ہے۔ قرآن اس قسم کی قوم پیدا کرنا چاہتا ہے جو ذمہ داری لے۔ وہ شخص اس پوری کتاب میں لکھتا ہے کہ یہ Fear of Freedom (خوفِ آزادی) ہے جس سے اس قسم کے بنے بنائے عوام ان لیڈروں کو ہاتھ

① اس کا سال وفات 1980ء ہے۔

Fromm, Erich (1900-1980). German born U.S psycho-analyst and philosopher. Challenging the theories of Sigmund Freud (1856-1939), he argued the importance of sociological and cultural influences in causing psychological disturbances. (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited, P.614)

② یہ اشارہ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869) کی طرف ہے۔

آ جاتے ہیں۔ یہ ان کے اندر کی چیز ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی اور ذمہ داری سنبھال لے۔ اور وہ اس کا Exploit (سلب) کر جاتے ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ دنیا میں غلط نظام قائم ہی اس طرح سے ہوتا ہے۔

## لیڈر عوام کو اور عوام لیڈروں کو قصور وار ٹھہراتے ہیں

اب دیکھیے کہ قرآن جو جہنم میں مکالمات پیش کر رہا ہے، یہ انہی کے مکالمے ہیں، انہی کی نفسیاتی کیفیت ہے۔ وہ لیڈر ان عوام کو مورد الزام قرار دیتے ہیں، یہ عوام ان لیڈروں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اب ایک اور بات پیدا ہو گئی۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ذمہ دار تو یہ لیڈر ہوتے ہیں۔ عام طور پہ ہمارے ہاں یہی چیز ہے کہ جو ذمہ داری ہوتی ہے وہ تو ان لیڈروں کی ہوتی ہے۔ عوام کیوں اس عذاب میں آتے ہیں؟ جیسے ہم آپ آج کل اپنے آپ کو یہ فریب دیتے ہیں کہ صاحب! ہم نے کیا کیا تھا؟ نہ کوئی لوٹ چائی، نہ کوئی دھاندلی کی، نہ

کچھ حاصل کیا اور خواجواہ اس عذاب کے اندر ہم بھی گرفتار ہیں۔ تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں الگ ہونا چاہیے تھا، جہنم میں تو انہی کو ہونا چاہیے تھا جو یہ بڑے بڑے لیڈر تھے۔ وَ اِذْ يَتَحَايُّونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُونَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ <sup>1</sup> (40:47) یہ جو عوام ہوں گے میں Followers (متبعین) کا یہی ترجمہ کروں گا ورنہ یہ جو Followers اور لیڈر ہیں ان کا ترجمہ وہی ہے۔ یہ ان بڑوں سے کہیں گے کہ تم ہمیں کشاں کشاں اس منزل میں لے آئے ہو۔ کیا الفاظ ہیں قرآن کے عزیزان! سورۃ ابراہیم میں ہے کہ جس کارواں کے سالار اس قوم کو اس منڈی میں لے آئیں جہاں اس جنس کا سد کا کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ <sup>2</sup> وہ ان سے یہ کہتے ہیں کہ تم تو ہمیں بڑے بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے یہ کہاں آ گئے؟ تو تم اتنی ذمہ داری لیا کرتے تھے کہ کوئی بات نہیں، کچھ ہوگا ہم ذمہ دار ہیں۔ کہا کہ تم ذمہ داری لیتے تھے تو آج ہمیں کچھ اس عذاب میں سے چھڑاؤ۔ کیا جواب ملے گا؟ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوا اِنَّا كُلُّ فِیْهَا (40:48) وہ ان سے کہیں گے کہ اس جہنم میں تم ہی نہیں ہو، ہم سب اس جہنم کے اندر ہیں۔ کوئی بھی ایک دوسرے کا عذاب ٹال نہیں سکتا۔ یہ كُلُّ فِیْهَا (40:48) آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں قرآن بھی ان Followers کو بری الذمہ قرار نہیں دے رہا۔ ابھی وہ انہیں بتاتا ہے کہ تمہارا جرم کیا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ یَوْمَ تُقْلَبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَّا اطْعَمْنَا اللّٰهَ وَ اطْعَمْنَا الرَّسُوْلَ ۝ وَ قَالُوْا رَبَّنَا اِنَّا

<sup>1</sup> اُس جہنم میں لوگ ایک دوسرے سے جھگڑیں گے۔ وہ کمزور لوگ (عوام) جنہیں بڑے بڑے لیڈروں نے اپنے پیچھے لگا رکھا تھا، ان سے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع تھے۔ کیا تم اس عذاب کا کچھ حصہ ہم سے دور نہیں کر سکتے؟ (14:21; 33:67; 34:32; 37:27-29; 38:60) (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1099)۔

<sup>2</sup> وَ اَحْلَوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (14:28)

اَطْعَمْنَا سَادَتَنَا وَ كُبْرَآءَنَا فَاصْلُوْنَا السَّبِيْلَ <sup>1</sup> (33:66-67) وہاں یہ جو Followers (متبعین) ہیں، یہ کہیں گے کہ اے کاش! اس کے بجائے ہم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے، صحیح نظام خداوندی کی اطاعت کرتے۔ ہم نے اپنے سیاسی لیڈر اور مذہبی راہنماؤں کی اطاعت کی۔ سَادَتَنَا وَ كُبْرَآءَنَا (33:67) میں یہ دونوں آ گئے۔ آج کی اصطلاح میں سیاسی لیڈر سَادَتَنَا <sup>2</sup> بھی اور مذہبی راہنما کُبْرَآءَنَا بھی دونوں آ گئے۔ کہا کہ ہم نے ان دونوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں خدا کی طرف جانے والے راستے سے گمراہ کر دیا۔

قرآن حکیم احبار و رہبان دونوں کو مجرم قرار دیتا ہے

علماء و مشائخ کے متعلق تو قرآن نے بالصریح کہا ہے کہ یہ خدا کی طرف جانے والے راستے سے روکتے ہیں۔ سورۃ توبہ (9 ویں



سورۃ (کی وہ 34 ویں آیت ہے جس میں یہ کہا ہے کہ یہ احبار اور یہاں بَصُودُونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰہ (9:34) جو بظاہر تمہیں خدا کی طرف جانے والے راستے کی طرف لیے چلے جا رہے ہیں حالانکہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی لوگ ہیں۔ یہ کتاب قرآن تو فریبِ نفس کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑتی، عزیزانِ من! بہر حال ان تبعین (Followers) نے کہا کہ ہم نے ان کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں بھی ڈبو دیا اور کہا کہ رَبَّنَا اَتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ (33:68) اے ہمارے پروردگار! یہ ٹھیک ہے کہ ہم تو ہیں ہی جہنم کے اندر۔ کم از کم انہیں دو گنا عذاب دو۔ ایک تو اس لیے کہ یہ خود غلط راستے پہ چلے تھے اور دوسرے اس لیے کہ انہوں نے ہمیں بھی غلط راستے کے اوپر چلایا تھا۔ ہمارے جو جرائم ہیں ان کی ذمہ داری ان کے اوپر عائد ہوتی ہے۔ چونکہ ان پہ دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے ان کے اپنے جرائم کی بھی اور جو ہم نے جرائم کیے ان کی بھی حقیقت میں موجب ابتداء یہی تھے اس لیے ان کو دہرا عذاب دو تو گویا اکہرے عذاب تک تو یہ معترف ہو گئے۔ انہیں دہرا عذاب دو۔ آپ کو معلوم ہے کہ کیا جواب ملتا ہے؟

① اُس وقت ان کی حالت یہ ہوگی کہ یہ اس تباہی کی آگ میں اوندھے منہ جھونک دیئے جائیں گے اور یہ بصد حسرت و یاس کہیں گے کہ اے کاش! ہم بھی اللہ اور رسول (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرتے (تو ہماری آج یہ حالت نہ ہوتی)۔ اُس وقت ان کے عوام کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے ان لیڈروں کی جو ہم سے بڑے بنے ہوئے تھے اطاعت کی تو انہوں نے ہمیں زندگی کے صحیح راستے سے بہکا دیا۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 984)۔

② اس کا مادہ ”س و د“ ہے۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ ”السَّائِدُ“ سردار کا سید سے نیچے کا سردار۔ السید رئیس صاحب سواد جس کے ساتھ بہت سی جماعت ہو۔ ”الْأَسْوَدُ مِنَ الْقَوْمِ“ قوم کا سب سے بڑا اور جلیل المرتبہ آدمی ہو بزرگ قوم ہو۔ (پرویز: لغات القرآن جلد دوم ادارہ طلوع اسلام لاہور 1960ء) (ص 915-916)۔

### اعمال کی نتیجہ خیزی کے وقت لیڈروں اور تبعین کے مابین باہمی چپقلش کا منظر

قرآن کریم یہاں افراد کا ہی ذکر نہیں کرتا بلکہ پارٹیز کا بھی ذکر کرتا ہے۔ سورۃ الاعراف (7 ویں سورۃ) کی 38 ویں آیت میں قرآن کریم کہتا ہے کہ جہنم کی کیفیت یہ ہوگی کہ پہلے ایک قوم ایک فریق، ایک پارٹی، جہنم کے اندر آ جائے گی۔ اب اس کے بعد ایک دوسری پارٹی ہوگی وہ ان کے بعد آئے گی۔ یہ دوسری پارٹی کون ہے؟ یہ وہ ہے جس نے پہلی پارٹی کی تقلید کی تھی اس کی روش پہ چلے تھے اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس اعتبار سے ابتدا تو انہوں نے کی تھی جو پہلے آئے ہیں لیکن یہ ان سے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ کُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ① (7:38)۔ کیفیت یہ ہوگی کہ اس دنیا میں تو یہ سب ایک ہی تھے ان کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے ان لوگوں نے باہمی اتحاد کیا ہوا تھا ایک جماعت بنے بیٹھے تھے۔ وہاں جہنم میں کیفیت یہ ہوگی کہ یہ جو جہنم میں

بعد میں آنے والے ہیں وہ پہلے آنے والوں کے اوپر لعنت کریں گے کہ ستیاناس تمہارا خود تو ڈوبے تھے صنم ہم کو بھی لے ڈوبے۔ تم نے تو جہنم میں آنا تھا، ہمیں بھی اس جہنم میں دھکیل دیا۔ قَالَتْ اٰخَرُهُمْ لَا وِلٰهُمُ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ اَضَلُّوْنَا فَاتِيْهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (7:38) یہ بعد میں آنے والے خدا سے کہیں گے کہ اے پروردگار! انہوں نے ہمیں تباہ اور گمراہ کیا تھا۔ اس لیے انہیں دہرا یعنی دوگنا عذاب دو۔ یہ وہی ہے جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انہیں دوگنا عذاب دو۔ آپ کو پتہ ہے کہ قرآن کی جانب سے اس کا کیا جواب مل رہا ہے: قَالَ لِكُلِّ ضِعْفٌ (7:38)۔ انہوں نے کہا کہ دونوں کو دوگنا عذاب دو۔ انہیں اس لیے کہ خود گمراہ ہوئے اور تمہیں گمراہ کیا اور تمہیں اس لیے کہ (لفظی تصرف سے)

”انہیں“ تو ”تو“ کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا

”حضور“ تم نے بنایا ”جناب“ تم نے کیا

لیڈروں کی قوت تو ہمیشہ عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے

تم اگر انہیں لیڈر نہ بنا دیتے تو انہیں کون پوچھتا تھا۔ ان کی قوت تو تمہارے زور کے اوپر تھی اور تم کہتے ہو کہ ان کو ان کے جرائم کا دوگنا عذاب دیا جائے۔ تمہیں دوگنا عذاب تو اس لیے ہے کہ تم نے ان کو لیڈر بنایا، اس لیے انہوں نے جو جرائم کیے ہیں ان کی قوت کا موجب تو تم ہو۔ عزیزان من! غلط معاشرے میں کوئی بھی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا۔ ہمیں اس فریب نفس میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ یہ

❶ قوموں کی حالت بھی عجیب ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی تقلید کرتی ہے، لیکن جب کچھ عرصہ بعد یہ بھی اُسی گڑھے میں جا گرتی ہے جس میں پہلی قوم گری تھی تو یہ (بعد میں آنے والی قوم) پہلی قوم کو مطمئن کرنے لگ جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا بھی ایسا حشر ہوا (پرویز: مفہوم القرآن ص 346)۔ کتنی عظیم بات ہے جو کہہ گیا ہے کہ ان کی اپنی قوت و طاقت تھی ہی کیا؟ یہ تو تمہارے بل بوتے کے اوپر یہ کچھ بنے ہوئے تھے۔ جس دور میں قرآن نازل ہوا ہے اس دور میں تو شاید یہ بات سمجھ میں نہ آ سکتی کہ عوام کے بنائے ہوئے یہ صاحب اقتدار کس طرح کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں تو ملوکیت تھی اس میں وہ ہر صاحب قوت، شمشیر کے زور پر آ کر اقتدار حاصل کر لیتا تھا تو یہ جو محکوم تھے ان کا جرم یہی تھا کہ یہ محکومی پہ قناعت کر جاتے تھے، مطمئن ہو کے بیٹھ جاتے تھے۔ قرآن اس کو بھی بہت بڑا جرم قرار دیتا ہے۔ کسی غلط بات پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے لیکن وہاں پھر بھی یہ صورت تھی کہ وہ بزورِ شمشیر آ کر قوت اختیار کرتے تھے۔ یہ جو قرآن کہتا ہے کہ یہ تو تمہارا ہی دیا ہوا اقتدار ہے جو ان کے ہاتھ میں آیا تھا۔ آج کے دور میں تو بات نکھر کر سامنے آ گئی ہے۔ ارے تم انہیں اگر ووٹ نہ دیتے تو یہ کس طرح سے مسند کے اوپر آ جاتے۔ یہ تو تمہارے ووٹوں کی تعداد پہ صاحب اقتدار بنے ہیں۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ

صاحب! یہ جرائم ان کے کیے ہوئے ہیں ہمارے کیے ہوئے نہیں ہیں۔ تم نے تو ان کو اس قابل بنایا کہ یہ جرائم کر سکیں، اس لیے اگر ان کے لیے دو گنی سزا کا مطالبہ کر رہے ہو تو دو گنی سزا تمہیں بھی ساتھ ملنی چاہیے اور ملتی ہے، عزیزانِ من! غلط نظام کے جو تباہ کن عواقب اور نتائج ہوتے ہیں، ان میں کبھی بھی یہ عوام بخشے نہیں جاتے، الگ نہیں کیے جاتے اور اس کی وجہ یہی ہوتی ہے جو چودہ سو سال پیشتر قرآن یہ کچھ بتاتا ہے۔

### آج کا جمہوری نظام اور اقبال کی نظم ”ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“

میں کہہ رہا ہوں کہ آج کا جو یہ جمہوری نظام ہے، اس کو کس وضاحت سے بیان کیا ہے۔ یہ وہ جمہوری نظام ہے جسے آج ابلیس بڑے فخر سے پیش کرتا ہے۔ میں کئی دفعہ یہ کہا کرتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ (1877-1938) کی ارمغانِ حجاز میں، جو ان کی اردو کی نظم ہے، یہ آخری بڑی لمبی نظم ہے، ”ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“ ہے جو 1936ء<sup>1</sup> میں کہی گئی تھی۔ یہ بڑے غور سے پڑھنے کی ہے۔ یہ میرے ذہن میں ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی یہ کیا تھا کہ ایک خاص نشست میں، خاص تقریب میں، غالباً میں نے یہ پوری نظم تمام سندوں حوالوں کے ساتھ، اور دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق پیش کی تھی، آج پوری نظم تو نہیں، آج کے اس درسِ قرآن کے عنوان کی نسبت سے، اس کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ وہ ہے بڑی دلچسپ چیز۔ علامہ<sup>2</sup> نے بھی یہ چیزیں محاکاتی انداز میں، ڈرامائی انداز میں، پیش کی ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ

1 نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے 1996ء میں طبع ہونے والے ارمغانِ حجاز..... اردو..... کے نسخہ میں ”ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“ کے نیچے 1936ء درج ہے۔

2 یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔ انہیں بلا خوف و خطر علامہ محمد اقبالؒ بھی کہا جاتا ہے۔

کیبنٹ ہو رہی تھی، اس میں جو وزیر اعظم تھے یا صدر مملکت تھے وہ خود ابلیس تھے اور باقی ان کے وزراء یا مشیر تھے۔ Review کرتے ہیں کہ انہوں نے جو نظام ابلیسی قائم کیا ہوا ہے، اس کے متعلق اس کے نتائج کیا ہوئے، کیا خامیاں رہ گئیں، کیا کیا چیزیں برآمد ہوئیں، آئندہ پروگرام کیا ہے، کیا کرنا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مشیر یا وزیر جو اس کا اپنا شعبہ ہوتا ہے، ڈیپارٹمنٹ ہوتا ہے، منسٹری ہوتی ہے، اس کی رپورٹ پیش کرتا ہے کہ میں نے اپنے ہاں انسانوں کو تباہ کرنے کے لیے یہ کیا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ میں نے اپنے شعبے میں یہ کیا ہے۔ وہ سنتا رہتا ہے، چھوٹی چھوٹی تنقید بھی کرتا ہے اور پھر آخر میں بتاتا ہے کہ یہ جو سب چیزیں ہیں یہ ناکام ہیں، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کرنا کیا چاہیے۔ یہ بڑی عجیب نظم ہے۔ ”کرنا کیا چاہیے“ میں ابھی بتا دوں۔ یہ کہتا ہے کہ ہمیں دنیا میں کسی نظام سے ڈر نہیں ہے، کسی قوم سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے، صرف ایک ہی ڈرنے کی بات ہے کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں <sup>①</sup>

بس یہ ہے کرنے کا کام باقی سارے نظام اپنی موت آپ مرجائیں گے۔ یہ جو قرآن کا نظام ہے یہ ہے جس سے ابلیسی نظام کو خطرہ ہے اور اس کے لیے میں تمہیں پروگرام دیتا ہوں اور پروگرام یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے

پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں انہیں

ادو فرستے خیراں کہ ہو گیا <sup>②</sup>۔ اس نظم میں ”پہلا مشیر“ یہ پیش کر رہا ہے کہ یہ جو ابلیسی نظام ہے اس میں قوموں کو محکوم رکھا جاتا ہے:

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام

پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

سب سے بڑا جرم قوم میں خوئے غلامی کا پیدا کرنا ہے

خوئے غلامی میں مجبوراً، جبراً کسی کو غلام بنا لینا اور بات ہے اس میں خوئے غلامی کا پیدا کر دینا، اور پھر اس میں ان کا پختہ ہو جانا، یہ ہے اصل چیز۔ یہ ہے ابلیسیٹ! پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام۔ اور سینے! اس طرح پختہ تر ہونے کے بعد ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ:

① عصر حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف..... ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

② ارے! پھر تو سبھی ٹھیک ہے، بہتری ہی، بہتری ہے اپنا کام بن گیا۔

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں تجود

ان کی فطرت کا تقاضا ہے نماز بے قیام

عزیزانِ من! غور کیجئے میں نے کہا ہے کہ فرصت نہیں ہے ورنہ میں آپ کو سمجھاؤں۔ اس میں ایک ایک لفظ سمجھنے کا ہے۔ آپ کے ہاں کا سارا مذہب، ساری شریعت، بلکہ آگے چل کر کہتا ہے کہ سارا تصوف کیا ہے؟ جھکنا، جھکنا، جھکنا: ہر صاحبِ قوت کے سامنے جھکنا، انکساری، عجز، محکومیت۔ ”ہو جا لکھ مسیت دا“ <sup>①</sup> وہ پہلا مشیر کہتا ہے کہ ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں تجود ہی ہیں، ان کی جو نماز ہے اس میں قیام آتا ہی نہیں ہے، سجدہ ہی سجدہ ہے، کسی باطل کے سامنے کھڑے ہونا، ان کی نماز میں ہے ہی نہیں۔ ان کی فطرت کا تقاضا نماز بے قیام ہے اور آگے ہے کہ

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں  
 ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام  
 اور یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج یہ ابلیس فخر سے اپنا کارنامہ اپنی منسٹری کا یہ کارنامہ کینٹ میں، بحضور وزیراعظم و صدر مملکت  
 پیش کر رہا ہے کہ

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج  
 صوفی و ملا ملکیت کے بندے ہیں تمام

افلاطون کے فلسفہ کے مقابلے میں ارسطو کا Logic (منطق) کامیاب ہے

اور آگے یہ ہے کہ ہم نے اس قوم کے لیے کیا کیا ہے۔ تمہیداً میں عرض کردوں کہ یونان میں ایک چیز ہے جسے فلسفہ یونان کہتے  
 ہیں۔ اس میں فلسفہ زیادہ نہیں ہے اصل میں Logic ہے جسے منطق کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کے لیے علم الکلام کی اصطلاح آئی  
 ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے جب اپنے ہاں یونان والوں کے ترجمے کیے تو اس کا نام انہوں نے علم الکلام رکھا۔ ارسطو (322-384 ق م)  
 اس Logic (منطق) کا ابوالآباء ہے چونکہ پلینیو یا افلاطون (347-428 ق م) وغیرہ کے ہاں فلسفہ ملتا ہے۔ ارسطو (322-384 ق م)  
 جو Logic (منطق) کا ابوالآباء ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے ہاں Logic کے متعین کیے ہوئے فارمولے آج تک اسی طرح  
 چلے آ رہے ہیں۔

❶ مسجد کی صف کے تنکے کی طرح بے ضرر ہو جائی بے قدر و وقعت ہو جا (یہی مقصود مذہب و شریعت و تصوف ہے)۔

Logic (منطق) کے الفاظ کی الجھنوں کے جال کی گرفت اور اس کا اثر

انسانی ذہن کی گمراہی کے لیے منطق Logic سے زیادہ کوئی اور حربہ مؤثر نہیں ہوتا۔ یہ ہوتا کیا ہے؟ صرف الفاظ کا گورکھ دھندہ  
 اس کے علاوہ اس کے اندر اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کسی چیز کو Reality (حقیقت) میں مانتے ہی نہیں ہیں کہ حقیقت میں بھی کچھ قدر یا اقدار  
 ہیں۔ جس چیز کو جو چاہیں الفاظ کے ہیر پھیر سے ثابت کر دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کہو تو ہم پیتل کو سونا ثابت کر دیں، کہو تو سونے کو  
 پیتل ثابت کر دیں۔ ان فارمولوں کی اس قدر گرفت ہوتی ہے کہ ان الفاظ کی گرفت سے انسان کا ذہن نکل ہی نہیں سکتا۔ میں نے عرض کیا  
 ہے کہ انسان کے ذہن کو ماؤف کرنے کا الجھنوں میں ڈالنے کا یہ سب سے زیادہ مؤثر حربہ ہے۔ یہ پوچھو نہیں، جس دور کے اندر یہ فقیر  
 خود اس سے گزرا ہے! کیا کیفیت تھی؟ پتہ نہیں وہاں سے کیسے نکل گیا ہوں! اللہ تعالیٰ کا ہی فضل ہے اور اس کے مقابلے میں یہ چیز تو کچھ

نہیں ہے۔ یہ منطق اور فلسفہ تو ذہنی چیز ہوتی ہے۔

### یونان کی سوغات: تصوف کی خواب آور دنیا

اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں تصوف کو اختیار کیا گیا۔ یہ ایجاد نہیں کیا گیا۔ یہ بھی مانگ کر لیا ہے۔ ہم نے یہ بھی یونان سے لیا ہے۔ تصوف<sup>2</sup> کا تعلق انسان کے جذبات سے ہوتا ہے۔ اس میں دماغ، فکر، ذہن، خرد کو آنے ہی نہیں دیا جاتا۔ یہ لٹھ لے کر اس کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تصوف کے اندر یہ ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دو، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، انسان کی انفرادیت (Individuality) (انفرادیت) اس کا تشخص اس کی خودی اس کی میں اس کا I - am - ness سب ختم ہو جاتا ہے، یہ باقی ہی نہیں رہتا:

کافر ہوں جو ”میں“ سمجھوں کہ ”میں“ بھی کچھ ہوں

جو کچھ ہے سو ”تو“ ہے میرا ایمان یہی ہے

سنیے کیا کہتا ہے یہ ابلیس کا پہلا مشیر کہ ہم نے کیا کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی

ورنہ ’قوالی‘ سے کچھ کم تر نہیں ’علم کلام‘!

جو ہم چاہتے تو علم کلام کو بھی عام کر سکتے تھے۔ ’قوالی‘ سے مراد یہاں تصوف ہے۔ وہ بھی تھا لیکن یہ جو مشرق کی طبع ہے اس میں شروع سے

① یہ اشارہ پرویز کا اپنی ہی طرف ہے۔

② تصوف برائے شعر گفتن خوب است (شیخ علی حزیں)

ہی مذہب زیادہ مشرق کے اندر آیا ہے۔ یہ جتنے بڑے بڑے پیغمبر ہیں آپ دیکھیں گے کہ مشرق کی طرف آئے ہیں۔ مشرق کو عام طور پر جذبات پرست کہا جاتا ہے۔ یہ پہلا مشیر کہہ رہا ہے کہ میرے ذہن میں تھا کہ یہاں ان مسلمانوں کے اندر منطق کو عام کروں لیکن میں نے یہ سمجھا کہ نہیں ان کے لیے زیادہ مؤثر حربہ تصوف کا ہے تو میں نے یہاں تصوف کو عام کر دیا۔ تصوف پر اقبالؒ (1877-1938) نے بہت کچھ لکھا ہے:

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید

جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

### تصوف کی تعلیم کا حاصل

اس تصوف میں ہوتا ہی یہ نماز بے قیام ہے: اس دنیا سے ترک، مادہ سے ترک، ہر میٹرل شے کو قابل نفرت سمجھنا، دنیاوی زندگی کو جیل خانہ قرار دے دینا، اسے مردار سمجھنا، ساری جونگاہ اور عشرت ہے وہ کس قسم کی ہے:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

تصوف کے اندر یہ منتہی ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ خلوت گاہوں کے اندر فِی السِّرِّ (16:36) کا وظیفہ کرنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ فِی السِّرِّ (16:36) جاؤ زمین میں چلو پھرو اور اقوام گزشتہ کے کھنڈرات سے عبرت حاصل کرو کہ ہم نے کیا کیا ہے: تاریخ سے پوچھو ان کے اوراق سے پوچھو جاؤ پھرو: فِی السِّرِّ (16:36)۔ آپ حیران ہوں گے کہ تصوف میں فِی السِّرِّ (16:36) ایک چلہ ہے۔ انہوں سے آ کر مرید نے پوچھا: کہ میں حضرت صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، صاحب! میں ذرا ہاتھ چومنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں آج کل تو نہیں ہو سکتا۔ یہ کچھ کہنے لگے: کیوں؟ کہنے لگے کہ حضرت صاحب تو باہر نہیں آ سکتے چالیس دن تک خلوت میں ہیں۔ کہنے لگے: او کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ حضرت صاحب آج کل فِی السِّرِّ (16:36) کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں، خلوت میں بیٹھے ہیں۔ کمرے سے باہر برآمدے میں بھی نہیں آ سکتے: فِی السِّرِّ (16:36) کا وظیفہ ہو رہا ہے یہاں بیٹھے ہوئے:

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے<sup>①</sup>

① غالب، مرزا اسد اللہ خاں (2002)۔ دیوان غالب۔ لاہور: جہانگیر بک ڈپوسٹ-189۔

جانا آنا تو کوئی ہوتا نہیں ان کے پاس تصورِ جاناں کیے ہوئے بیٹھے رہیں۔ اس لیے وہ<sup>①</sup> یہ کہتا ہے کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے

بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

بات تو اس دنیا کے جو ہنگامے ہیں ان کو انسان کے لیے سہل کرنا تھا لیکن اقبال کہتا ہے کہ اگر زمین کے یہ ہنگامے سہل نہ ہوں تو ”بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی“۔ اقبال ہی کا ایک اور شعر<sup>②</sup> ہے:

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا

زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے، فضائے گردوں ہے بے کرانہ

کوئی بات نہیں ہے اگرز میں تنگ ہے تو کیا؟ وہ جو میں دو بھائیوں کی تقسیم جائیداد کا قصہ سنایا کرتا ہوں کہ باپ کا چھوڑا ہوا وہ ایک ہی کوٹھا تھا جو انہوں نے تقسیم کرنا تھا۔ بڑا بھائی چھوٹے سے کہنے لگا کہ برخوردار! دیکھو تمہارا زیادہ حق ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں ہے، کچھ اور بھی کر لوں گا اور میں تمہارے لیے تمہارے سر پہ باپ کی جگہ ہوں میں نے ہی ہاتھ رکھنا ہے تو یوں کرتے ہیں کہ ”از صحن خانہ تا بہ لب بام“ مجھے دے دو یعنی یہ زمین یہاں فرش سے لے کر صرف چھت تک جو دس بارہ فٹ کا ہے مجھے دے دو اور ”از بام خانہ تا بہ ثریا“ یعنی چھت سے لے کر آسمان تک تم لے لو۔ میں تیرے پیودی تھاں ہیں نا۔<sup>3</sup> یہ ہے تصوف:

زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے، فضائے گردوں ہے بے کرانہ

اور یہاں تو پھر اس فضائے گردوں کو کہا جاتا ہے۔ آپ کے مذہب کی دنیا میں تو سارا قصہ ہی آخرت کی جنت پہ رکھ دیا جاتا ہے۔ ایسا سبز باغ دکھاتے ہیں کہ یہ دنیا و در دنیا کا سارا جو قصہ ہے یہ کفار اور مشرکین کے لیے رکھا جاتا ہے اور وہ ”بام خانہ“ سے ”تا بہ ثریا“ اور اس سے آگے پھر ”تا بہ سدرۃ المنتہی“ وہ اس قوم کے حصہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ کہتا ہے:<sup>4</sup>

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی

① یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر سر محمد اقبال (1877-1938) کی طرف ہے۔ ان کا یہ شعر ضرب کلیم کے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد 1992ء کے ص 33 پر موجود ہے۔

② اقبال (1996)۔ ارمغان حجاز اردو۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ ص 69

③ یہ اس لیے کہ میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔

④ اقبال کی ”ارمغان حجاز اردو“ میں ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ کے عنوان سے پہلا مشیر یہ بیان دیتا ہے۔

یعنی منطق میں یا فلسفے میں بہر حال ذہن تو کام کرتا تھا یہ جو افیون ہے اس میں ذہن بالکل معطل ہو جاتا ہے کیف اور نشہ ہی رہتا ہے وہ کہتا ہے کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیہ کو

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

(غالب)

تاکہ میں کسی وقت بھی ہوش میں نہ آؤں۔ ذرا سی بھی آنکھ نیم وا بھی نہ ہونے لگے۔ کیا کہہ گیا ہے کم بخت! ہوش میں آ رہا ہوں میں، چشم ساقی تری دہائی ہے اور پلا آ رہا ہوں میں، بڑا خطرہ ہے

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی



ورنہ 'قوالی' سے کچھ کم تر نہیں 'علم کلام'!  
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا  
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

(اقبال: ارمغانِ حجاز)

### نبوتِ قادیان اور جہاد

آخر میں آ کے وہ کہتا ہے کہ اور تو اور! انتہا ہو گئی کہ تم کو وہ قادیان <sup>1</sup> ایک نبی مل گیا۔ اس نے کیا کہا؟ کہتا ہے:

کس کی نو امید ی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید؟  
'ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلمان پر حرام'!

چل قصہ ہی ختم ہو گیا۔ اے آخری نبی! اے کہن واسطے آیا سی! ایس قوم نوں۔ <sup>2</sup>

عزیزانِ من! یہ ہیں وہ مکالمے جو جہنم میں ہو رہے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس میں آپؐ (Followers) (متبعین) یا عوام کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہیں اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے۔ اب آ جائیے پھر اسی طرف جہاں سے یہ درس شروع کیا تھا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ ءَاَنْتُمْ اَضَلَلْتُمْ عِبَادِي هٰؤُلَاءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ (25:17) جب (ظہورِ نتائج کے وقت) ان لوگوں کو جو خدا کے اقتدار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں اُن کے معبودوں

<sup>1</sup> یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) کی طرف ہے۔

<sup>2</sup> یہ ”آخری نبی“ اس قوم کو یہ کہنے کے لیے آیا تھا۔

کے ساتھ اکٹھا کیا جائے گا تو اُن لیڈروں سے بڑوں سے علماء اور مشائخ سے پوچھا جائے گا کہ تم نے انہیں گمراہ کیا تھا؟ وہ جو پہلی بات تھی کہ غلط راستے پر چلنے کی آرزو تو ان کے سینے میں خود مچلتی تھی مگر وہ کہیں گے کہ قَالُوا سُبْحٰنَكَ (25:18)۔ کیا لفظ ہے! یہاں کہا جائے گا کہ یہ کون سا مقام ہے جو سُبْحٰنَكَ کہا ہے؟ کہا کہ تو تو اس سے بہت بلند ہے کہ تجھے کسی چیز کا علم نہ ہو اور تو ہم سے پوچھے کہ تم بتاؤ۔ یہ بات نہیں کہ ہم کوئی جواب دیں، لیکن تم نے چونکہ حجت کے لیے ہم سے پوچھ لیا ہے اس لیے ہم جواب دینے کی جرأت کرتے ہیں ورنہ تو اس سے بلند ہے کہ تیرے ہوتے ہوئے ہم کہیں کہ تمہیں معلوم نہیں، ہم بتاتے ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ اَوْلِيَاءَ (25:18)۔ انہیں گمراہ کرنا تو ایک طرف رہا، ہمارے لیے یہ بھی جائز نہیں تھا کہ ہم بھی تیرے سوا کسی اور کو اپنا سر پرست مقرر کرتے۔ یہ ہے سرپرستی کی صورت جسے محکومیت کہا گیا ہے۔

## اس روش زندگی کا نتیجہ بھوک اور خوف کا عذاب ہے

یہ ہوا اس قوم کے ساتھ۔ اور دیکھیے، عزیزانِ من! کہ اس قوم کے ساتھ کیا ہوا؟ ایک فقرے کے اندر اس عذابِ جہنم کی ساری لم آجاتی ہے۔ قرآن کریم نے مفلسی اور غربی کو جس کا نام بھوک ہے خدا کا عذاب قرار دیا ہے: لِبَاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ (16:112) ہر وقت سر پہ خوف کا رہنا کہ کیا ہوگا، کیا بنے گا؟ اس سے مستقبل تو بڑا تاریک نظر آ رہا ہے: وہ نہ حملہ کر دے وہ نہ اچک کے لے جائے۔ جہنم کے اندر بدترین چیز کسی محکوم قوم کی بھوک اور خوف (16:112) ہے۔ ملک میں بھوک ہو جائے غلہ نہیں رہے تو یوں ہوگا کہ فلاں جگہ سے لینا پڑے گا فلاں جگہ سے برآمد کرنا پڑے گا اگر یہ نہ رہا تو کیا بنے گا؟ ڈر اور بھوک کو یہاں خدا کا عذاب کہا ہے۔

## ایک تمثیلی بیان میں عذاب کی ایک دوسری شکل

یہاں میں وہ لفظ سامنے لے ہی آؤں یوں آگے گزرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ کون سا جرم ہے جس کی بنا پہ یہ عذاب آتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (16:112) اللہ مثال کے طور پہ جو بات اس میں ہے بیان کرتا ہے سمجھ لو کہ کوئی ایک بستی تھی بڑی خوشحال بڑی آسودہ حال۔ چاروں طرف سے خدا کی نعمتیں اس کے ہاں بھی موجود تھیں اور چاروں طرف سے چلی بھی آرہی تھیں۔ اتنی خوشحالی تھی! پھر اس کے ساتھ کیا ہوا؟ بتایا کہ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ (16:112) خدا کی ان نعماء سے جو اس نے عطا کی تھیں ان لوگوں نے کفر برتا۔ کفر کے معنی ہوتا ہے ”کسی چیز کو چھپا کے رکھ لینا“ انہوں نے کفر برتا ان نعماء کی ناقدر شناسی کی۔ بڑے بڑے لوگوں نے اپنے لیے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَادْفَقَهَا اللَّهُ لِبَاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ (16:112) تو خدا نے انہیں خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ ان کا کیا جرم تھا؟ بتایا کہ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (16:112) انہوں نے جو اپنے ہاتھوں سے مصنوعی نظام بنا کے کھڑا کیا تھا اور بتاتے کچھ تھے حقیقت میں وہ کچھ اور تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ قوم ڈر اور بھوک دونوں کے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ یہاں لفظ يَصْنَعُونَ (16:112) ملاحظہ فرمائیے۔ یہ تو کوئی زیادتی ہوگی اگر میں صنعت ترجمہ کر کے انڈسٹری کہہ لوں لیکن وہ بات کچھ ایسی ہی کہتا ہے۔ انڈسٹری تو خیر بات نہیں ہے۔ Capitalist (سرمایہ داری) نظام ہے یہ ہے عزیزانِ من! سنئے قرآن کے الفاظ! یہ ہے اس کی لم۔ کہا کہ نہیں ہم نے انہیں گمراہ کیوں کرنا تھا ہم تو خود بھی تیرے سوا کسی اور کو چارہ ساز نہ مانتے، لیکن ہوا کیا؟ وَلَكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّى نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا (25:18) اصل میں یہ سب کچھ اتنی افراط سے ان کو بغیر محنت کیے ہوئے مل گیا کہ یہ اس نشے میں مدہوش ہو گئے اور اس کی وجہ سے یہ صحیح راستہ چھوڑ بیٹھے۔ اب وہاں (16:112) میں تو مفلسی، قلاشی، بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے اور یہاں (25:18) میں دولت کی افراط کو خدا کے عذاب کا موجب قرار دیا ہے اور یہ دونوں ہی باتیں ٹھیک ہیں۔

## قرآن حکیم کی روشنی میں افراطِ زر کی تعریف اور اُس کی تباہ کاریاں

عزیزانِ من! دوسرے مقام پہ ہے کہ وَ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطَرَتْ مَعِيشَتَهَا (28:58) کئی قومیں تم ایسی دیکھو گے کہ وہ بھوک کے عذاب سے نہیں مریں، افراطِ زر یا افراطِ معیشت کے عذاب سے غرق ہو گئیں۔ وہ ایسی تباہ ہوئیں کہ فِتْلَکَ مَسْکِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا (28:58) یہ دیکھو معدودے چند کے علاوہ ان کے کھنڈرات، ان کی تباہیوں کے نوحہ خواں ہیں۔ ان کی ٹھیکریوں پہ ان کی داستان لکھی ہوئی ملیں گی۔

یہ معیشت کا افراط کیا چیز ہے؟ آج کی اصطلاح میں Capitalistic System (نظام سرمایہ داری) کہتے ہیں۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ دولت اکٹھی کرنے کو منتہائے زندگی قرار دے دیا جائے، مقصد حیات قرار دے دیا جائے۔ دولت کچھ مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے، یہ فی ذاتہ مقصد نہیں ہوتی۔ یہ اسی طرح ہے جیسے یہ تلوار خود ایک مقصد نہیں ہوتی، کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے، بندوق مقصد نہیں ہوتی کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے کہ خطرہ ہو تو اس کے ذریعے سے اس کو رفع کر دیا جائے۔ اگر یہی چیزیں مقصودِ حیات بن جائیں کہ صرف انہیں اکٹھا کیے جاؤ، اکٹھا کیے جاؤ تو کہا کہ یہ اکٹھا کرنے کی ہوس انسان کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہا کہ تباہی ہے اس کے لیے۔ کون ہے یہ؟ اَلَّذِي جَمَعَ مَالًا وَ عَدَّدَهُ (104:2) وہ جو دولت اکٹھی کرتا ہے اور پھر اس کا وہ اتنا ہی کام رہ جاتا ہے کہ روزِ بنک بیلنس دیکھتا چلا جائے کہ اب اتنا ہو گیا، ابھی کم ہے۔ ہمارے ہاں اسے ننانوے کا پھیر کہتے تھے کہ ابھی کم ہے اور اس میں جمع کیا جائے۔ یعنی اندازہ لگائیے عزیزانِ من! قرآن کے انداز کا۔ اس دور کے اندر یہ بات کہنا کہ جَمَعَ مَالًا وَ عَدَّدَهُ (104:2) کتنا بڑا کام تھا! عزیزانِ من! صرف جمع مال جرم نہیں قرار دیا بلکہ جمع کرنے کے بعد صحیح مصارف پہ خرچ کیا جائے تو اس سے بڑے بڑے مقاصد حاصل ہوتے ہیں لیکن جمع کیا جائے تو مقصد حیات صرف یہ بن جائے کہ وہ اس کو گنتا رہے۔ یہ Capitalistic System (نظام سرمایہ داری)۔ وہ کہتا ہے کہ اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۚ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) اس کو دوسرے سے بڑھ جانے کی آگے نکل جانے کی ہوس ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ میرے پاس آئے، وہ ایک موٹر ہے، ٹھیک ہے تیرے گزارے کے لیے ٹھیک ہے، نہیں صاحب! وہ جو ہمارے ہاں فلاں صاحب ہیں ان کے پاس تین ہیں Latest (جدید ترین) آئی ہیں میں پانچ منگاؤں گا۔ اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ (102:1) یہ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی ہوس انسان کو مقصد حیات سے غافل کرتی ہے حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:2) اور اس ہوس کا تو ٹھکانہ ہی کوئی نہیں ہوتا، قبر تک پہنچ کر بھی یہ جو ہوس ہے اس کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ وہ جَمَعَ مَالًا وَ عَدَّدَهُ (104:2) مال جمع کرتا اور گنتا رہتا ہے اور اس طرح یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهُ اَخْلَدَهُ (104:3) سمجھ یہ رہا ہے کہ بس اس دولت کے بل بوتے پہ حیات جاوید مجھے مل جائے، میں مروں گا ہی نہیں۔

دولت اکٹھی کرنے والوں کے ذہن میں یہ کبھی آتا ہی نہیں ہے کہ میں نے مرجانا ہے۔ اَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (104:3-4) ان کو کہو کہ کیا کر رہے ہو ایک چکر اس نظام کا آئے گا، بیک گردش ایک انقلاب آئے گا۔ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (83:6) جس دن عام انسانیت خدا کی ربوبیت عالمینی کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ تو کیا ہوگا؟ یہ تمہارا مال و دولت ٹکڑے ٹکڑے کر کے جہنم کے اندر اسی جہنم کے اندر ڈال دیا جائے گا۔ وہ کون سی جہنم ہے؟ اس کے لیے بتایا کہ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْأُفُقِ (104:6-7) وہ باہر کہیں آگ نہیں جلی ہوئی ہوتی، وہ تمہارے دلوں کے اندر آگ جلی ہوئی ہوتی ہے۔ ان شعلوں میں تیری دولت کو ڈال دیا جائے گا۔ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ ۝ فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ (104:8-9) تو سمجھتا ہے کہ یہ جو دولت کے بڑے بڑے ستون ہیں، میرے لیے مدحیات ہیں۔ یہی تو تیری تباہی کا باعث ہیں کیونکہ تُو جَمَعَ مَالًا ۝ وَ عَدَدَهُ (104:2) دولت اکٹھی کرتا ہے اور پھر گنتا ہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہو گیا اور اب کتنا۔ وہ ننانوے کے پھیر میں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی تباہی کا موجب یہ تھا باعث یہ تھا۔ وَلٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَاَبَاءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الَّذِیْ كَرَّمْ وَ كَانُوْا قَوْمًا بُورًا (25:18) ہوا یہ کہ ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو زندگی کا ساز و سامان اس قدر فراوانی سے مل گیا اس لیے تیرے قوانین کو انہوں نے نشے میں بدمست ہو کر نظر انداز کر دیا اور تباہ ہونے والی قوم ہو گئی۔ Capitalistic System (سرمایہ داری نظام) جب ان کے اندر آ گیا تو انہوں نے اپنی تباہی خرید لی۔ اس سرمایہ داری نظام میں بڑی تباہیاں ہوتی ہیں۔

### افراط زر کا نتیجہ تباہ کن طبقاتی تفریق کی شکل میں نکلتا ہے

عزیزانِ من Capitalistic System (سرمایہ داری نظام) میں دو طبقات ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بے شمار دولت اکٹھی کر لیتا ہے، دوسرے وہ ہوتے ہیں جو محتاج ہوتے ہیں۔ یہ جو بے شمار دولت اکٹھی کرتا ہے، بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ یہ بڑا آزاد بندہ ہے، اسے کسی کی احتیاج نہیں مگر وہ اپنے اندر کی اس ہوس کا اس قدر غلام اور محکوم ہوتا ہے کہ اسے آپ آزاد کہہ ہی نہیں سکتے اور یہ جو باہر والے ہیں ان کو اگر اس میں سے ان کی ضروریات زندگی کی جو چیزیں ہیں، دے بھی دی جاتی ہیں تو ان کو اس قیمت پہ دی جاتی ہیں کہ ان کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔ یہ دونوں محکوم ہوتے ہیں: وہ دولت کا غلام ہوتا ہے، یہ دولت مند کے غلام ہوتے ہیں۔ سائیکولوجی میں دو Terms (اصطلاحات) بڑی عمدہ وضع کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ Capitalistic System (سرمایہ داری نظام) ہے اس میں دولت مند اور غریب دونوں کو "Freedom from" (سے آزادی) حاصل ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نوجوان طالب علموں کا جو "Freedom from" (سے آزادی) کا تصور ہے، وہ واضح نہیں ہے۔ وہ ہے Freedom from Hunger (بھوک سے

آزادی ہے) احتیاج سے آزادی ہے۔ اس سے تو انہیں ”Freedom“ (آزادی) حاصل ہو جاتی ہے مگر ”Freedom to“ (کی آزادی) ان کو نصیب نہیں ہوتی مثلاً

Freedom to think as will I, freedom to do as will I<sup>1</sup>

یہ ان کو نہیں ملتی۔ کیا بات ہے عزیزانِ من! میں ترجمہ نہیں کرتا۔ کہا کہ اس قوم کی تباہی یوں آتی ہے کہ ان کے ہاں بطرت یعنی معیشت یا فراوانی دولت سے جو غلط نظام کی وجہ سے ہے اس پوری قوم کو ”Freedom from“ (سے آزادی) تو حاصل ہو جاتی ہے مگر ”Freedom to“ (کی آزادی) ان کو حاصل نہیں ہوتی۔ اور جس قوم کو<sup>2</sup> Freedom to do some thing as will نہ حاصل ہو تو اس سے بدتر محکوم قوم کوئی نہیں ہو سکتی ہے۔ کہا کہ یہ اس لیے تباہ ہوئے ہیں۔

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ حَتَّى نَسُوا الذِّكْرَ (25:18) اس وجہ سے ان لوگوں نے اے خدا! تیرے قوانین کو نظر انداز کر دیا، پیچھے ڈال دیا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (20:124) جو ہمارے ”الذکر“ کو یعنی ہمارے ضابطہ قوانین کو ترک کر دے گا، پس پشت ڈال دے گا، اس دنیا میں اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی پھر وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى (20:124) اور قیامت کے دن بھی وہ اندھا اٹھایا جائے گا۔

عزیزانِ من! اب درس کا وقت پورا ہوا۔ 17-18 دوہی آیات ہم نے لیں۔ بات بھی بڑے کام کی ہو گئی۔ 19 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

1 اپنی منشا کے مطابق سوچنے کی آزادی، اپنی منشا کے مطابق کچھ کرنے کی آزادی۔

2 اپنی منشا کے مطابق کچھ کرنے کی آزادی

## چھٹا باب: سورة الفرقان (آیات 19 تا 26)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج جنوری 1978ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 19 سے ہو رہا

ہے: (25:19)۔

### معاشرتی نظام کی ذمہ داری ہر شخص پر عائد ہوتی ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ جہنم میں لیڈروں اور ان کے متبعین (Followers) کے مکالمات کا ذکر تھا اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ یہ آخرت کی جہنم میں جو ہوگا وہ تو وہاں کی بات ہے اس دنیا کا جہنم وہ ہے کہ غلط معاشرہ کے انجام میں جو تباہی آتی ہے قرآنِ کریم نے اسے یہاں کے جہنم سے تعبیر کیا ہے۔ اگر ان مکالمات کو یہاں کے اس جہنم کے Context (سیاق و سباق) میں دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس تباہی کے وقت یہ عوام یا Followers یا متبعین اپنے لیڈروں کو الزام دیتے ہیں کہ ان کی وجہ سے یہ کچھ ہوا اور وہ لیڈر انہیں الزام دیتے ہیں کہ یہ دودھ ہی اس قسم کا زہر بیلا تھا جس کی وجہ سے اوپر بالائی بھی ایسی ہی آئی غرضیکہ وہ ایک دوسرے کو مطعون کرتے رہتے ہیں اور قرآن یہ بات کہتا ہے کہ اس میں نہ تھا وہ لیڈر اس کے ذمہ دار ہیں نہ تھا یہ متبعین ان کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ذمہ داری پورے کے پورے معاشرے کے اوپر عائد ہوتی ہے اس لیے یہ سب اس جہنم کے عذاب میں محصور ہیں اور انہیں تو یہ عذاب بھگتنا ہی پڑے گا۔ اگر یہ پیچھے چلنے والے اس وقت اپنے عقل و ہوش سے کام لیتے اور جذبات کے سیلاب میں نہ بہہ جاتے، تو ان لیڈروں کے پاس کون سی قوت تھی جس کی بنا پر یہ آج اس قسم کا جہنم برپا کر سکتے تھے۔ بہر حال، آخری بات یہ تھی کہ وہ لیڈر یہ بات ان کے منہ پہ دے ماریں گے کہ الزام ہم پہ دے رہے ہو قصور تو تمہارا بھی اتنا ہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ بِمَا تَقُولُونَ لَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا (25:19) وہ ان عوام یا Followers (متبعین) سے یہ کہتا ہے کہ یہ دیکھ لو تمہارے منہ پہ تمہیں جھٹلا رہے ہیں تو اس کے بعد اب نہ اس عذاب کا رخ کسی اور طرف مڑ سکتا ہے نہ اس میں کوئی تخفیف ہو سکتی ہے نہ تفریق ہو سکتی ہے وہ تو پھر سارا معاشرہ ہی اس کے اندر مبتلا ہوتا ہے اور آگے یہ اس کی وجہ بیان کی کہ وَمَنْ يَظْلِمِ مِّنْكُمْ نَذِقْهُ

عَذَابًا كَبِيرًا (25:19) تم میں سے جس نے بھی ہمارے قوانین سے سرکشی برتی تھی اسے سخت عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ ہے۔

## قرآن حکیم کے نزدیک ظلم کا مفہوم

اصل بات تو یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہے ظلم کا۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے متعدد بار عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے نزدیک تو ظلم یہ جو بالا دست طبقہ ہوتا ہے اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ جو کمزور طبقہ ہوتا ہے یہ جو عوام ہیں انہیں مظلوم کہا جاتا ہے انہیں ظالم نہیں کہا جاتا ہے لیکن عربی زبان اور قرآن کریم کے استعمال کی رو سے ظلم کے تو بنیادی معنی ہیں کہ ”جس چیز کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اسے وہیں نہ رکھا جائے“ تو اگر بالا دست طبقے نے ان عوام کو انسانیت کے مقام سے بھی نیچے رکھا اور انہیں اجناس (Comodity) قرار دیا کہ جہاں جی چاہے جس بھاؤ جی چاہے انہیں بیچ دیا جائے یہاں بکس یہاں بیچ دیا جائے ایکسپورٹ کرنا ہو وہاں بھیج دیا جائے تو ان کو بھی تو ان کے مقامِ انسانیت سے نیچے رکھا اور ان عوام نے انہیں اٹھا کر انسانوں کے مقام سے الوہیت کا درجہ دے دیا خدائی مقام ان کو دے دیا ان کے احکام کی اسی طرح اطاعت کرتے رہے جیسے خدا کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ اسی لیے خدا نے پہلے ان کو کہا ہے کہ تم نے ان کو اپنا معبود بنا رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں Worship (پرستش) کا تصور ہے دین اسلام میں وہ تصور نہیں ہے۔ یہاں تو یہ صورت ہے کہ کسی کو کس مقام سے اٹھا کے اونچا رکھتے ہو یہ بھی ظلم ہے اس کے مقام سے نیچے رکھتے ہو یہ بھی ظلم ہے اور Unbalanced (غیر متوازن) معاشرہ کا بنیادی نقص یہ ہوتا ہے کہ اس میں کوئی چیز یا کوئی انسان اپنے اُس مقام پہ نہیں ہوتا جہاں اُسے ہونا چاہیے۔ یہ ہے جو ظلم کے معنی ہیں۔

اب دیکھیے یہاں کتنی دلچسپ چیز ہے کہ قرآن ان Followers (متبعین) کو عوام کو جنہیں ہم اپنی اصطلاح میں مظلوم طبقہ کہتے ہیں کہتا ہے کہ تم نے بھی تو یہ ظلم کیا تھا کہ انہیں جس مقام پہ ہونا چاہیے تھا اُس مقام سے اٹھا کے خداوندی اختیارات کا مالک بنا دیا۔ جو کچھ یہ کہتے رہے تم سر جھکا کر اس کی اطاعت کرتے چلے گئے کبھی یہ پوچھا نہیں کہ یہ جو چیزیں کہہ رہے ہیں ان کے صحیح ہونے کی سند کیا ہے۔ اس کے لیے کوئی معیار ہونا چاہیے کوئی کسوٹی ہونی چاہیے تھی جس پر تم پرکھ کر ان سے یہ کہتے کہ یہ غلط چیز ہے اس کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ تم نے بھی تو ان کو یہ مقام دے رکھا تھا تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ اب جو بھی کسی کو غلط مقام دے گا اس کی بنا پہ جو تباہ کن نتائج نکلیں گے وہ تو اسے بھگتنے پڑیں گے۔

ہماری اصطلاح میں ظالم اور مظلوم کے یہ معنی نہیں ہیں۔ ظالم کے جو معنی ہیں قرآن انہیں خوب واضح کر رہا ہے کہ ظلم کسے کہتے ہیں۔ اب انہوں نے اعتراض یہ کیا تھا اور جو پہلے آچکا ہے ابھی چارہی آیتیں پہلے وہ کہتے تھے کہ یہ کس قسم کا رسول ہے ہماری طرح کھاتا

پیتا ہے بازاروں میں جاتا ہے سودا سلف خریدتا ہے عجیب قسم کا رسول ہے۔ جو رسالت کا دعویٰ کرے جو خدا کا رسول ہو اسے تو عام انسانوں سے الگ تھلک کوئی مخلوق ہونا چاہیے۔ یہ اعتراض تھا اور یہ تصور ہر مذہب میں ہے کہ وہ اپنے مذہب کے بانی کو خواہ وہ انبیائے کرام □ میں سے ہوں یا ان لوگوں کے اپنے تجویز کردہ انہیں مقام الوہیت دیتے ہیں۔ وہ ہوتے تو دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی تھے لیکن ان کے یہ مرید مرنے کے بعد ان میں سے ہر ایک کو خدائی اختیارات کا حامل اور مافوق الفطرت قسم کا ایک ہیولا بنا دیتے تھے۔

### رسول کو مافوق الفطرت یا مافوق البشر سمجھنے یا بنانے کا نتیجہ

قرآن نے یہیں آ کر بہت بڑا انقلاب تھا جو برپا کیا۔ اس نے کہا کہ یہ پیغام لانے والا تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ اس کی طرف خدا کی طرف سے یہ پیغام آتا ہے یہ پیغام تم تک پہنچاتا ہے اور اس پر عمل کر کے دکھاتا ہے۔ یہ اس کی روش اس کا اسوہ تمہارے لیے نمونہ بن ہی اس صورت میں سکتا ہے کہ یہ تمہارے جیسا انسان ہو۔ اگر یہ فوق الفطرت یا فوق البشر ہو اور وہ کچھ کام کرے تو وہ تمہارے لیے نمونہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم تو ہر قدم پہ یہ کہہ دو گے کہ صاحب! اس کا کیا ہے یہ تو کوئی عام انسان نہیں ہے یہ تو خدا کا رسول ٹھہرا اور ہم تو آدمی گنہگار ٹھہرے۔ صاحب! ہم ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ یعنی سنت رسول □ کے اتباع کی اس قدر تاکید بھی اور رسول کو فوق الفطرت اور فوق البشر ماننا بھی!! ارے! فوق البشر جو ہے اس کی تقلید اس کا اتباع اس کی روش کے مطابق عام انسان عام بشر کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ بقول ان کے اگر میدان جنگ میں مقابل کی فوج کو جب شکست دیتا ہے یا جب شکست کا مقام آ جائے اور کوئی حربہ نہ ہو تو وہ کنکریوں کی ایک مٹھی مارے اور وہ سارے کے سارے اندھے ہو جائیں اور بھاگ جائیں تو سوچیے کہ وہ ہم آپ اور دوسرے انسانوں کے لیے رسول □ کی یہ روش اسوہ کیسے بن سکتی ہے سنت کیسے بن سکتی ہے قابل اطاعت قابل اتباع روش کیسے ہو سکتی ہے؟

### سب سے بڑا معجزہ تو رسول خدا کی اپنی زندگی ہے

یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایک قدم پہ یہ کہتا چلا جاتا ہے کہ معجزات تم طلب کرتے ہو معجزہ رسول کی زندگی ہے معجزہ اس کا یہ پیغام ہے وہ فوق البشر نہیں ہو سکتا۔ اسی کو پھر دوبارہ کہا کہ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا أَنَّهُمْ لِيَاْكُلُوا الطَّعَامَ وَ يَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ (25:20) یہ بات اسی رسول □ کے ساتھ نہیں ہے جتنے رسول □ اس سے پہلے آئے تھے ان کی بھی یہی کیفیت تھی کہ وہ بھی عام انسانوں جیسے انسان تھے وہ بھی بازاروں میں چلا پھرا کرتے تھے وہ بھی اسی طرح سے کھایا پیا کرتے تھے لیکن یہ لوگ اس قسم کے اعتراضات اپنے شکوک رفع کرنے کے لیے نہیں کرتے تھے محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کرتے تھے۔ یہ اپنی



مخالفت کو برابر جاری رکھیں گے تا آنکہ یہ کشمکش تصادم کی شکل اختیار کر جائے گی۔ اب آگے وہ بات واضح کر دی کہ وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً (25:20) وہاں ایک دوسرے کی قوتوں کی آزمائش ہو جائے گی۔ کہا کہ اگر وہ فوق البشر قسم کے لوگ ہوتے اور قدم قدم پہ ان سے معجزات اور کرامات سرزد ہوتیں تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا کہ تم سوچ سمجھ کر اپنے اختیار و ارادے سے ان کی کوئی بات مانتے یا ان کا مسلک اختیار کرتے۔ یہ جو چیز تھی اس سے تو عقل و ہوش ماؤف ہو جاتی ہے لیکن یہ بات کہ عام انسانوں جیسا ایک انسان ہو اور اس کے بعد کہا یہ جائے کہ تم اس کی بات کو پرکھ کر دیکھو کہ وہ غلط ہے یا صحیح ہے ماننے کے قابل ہے یا ماننے کے قابل نہیں ہے ماؤف البشر ہونے کی رو سے نہیں ہو سکتی۔

### معجزہ انسانی عقل کے چراغ کو گل کر دیتا ہے

عزیزانِ من! اصل آزمائش تو انسان کے ایمان کی یہاں پہنچ کر ہوتی ہے کہ کہنے والا عام انسانوں جیسا انسان ہو اور وہ یہ کہے کہ تم یہ نہ مجھ سے کہو کہ میں تمہیں منہ سے آگ نکال کے دکھا دوں۔ تم یہ دیکھو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ بات کیسی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آزمائش کا باعث بن جاتی ہے ورنہ اگر کرامت دکھا کے منوانا ہو تو وہ کسی کے لیے آزمائش کی بات بنتی نہیں ہے۔ کہا کہ یہ ان کا عام انسانوں جیسا انسان ہونا ہی تو وہ چیز ہے جہاں تمہاری عقل و فکر اور ہوش و تدبر کی آزمائش ہوتی ہے کہ سمجھ سوچ کے بات مانتے ہو یا عقل کے چراغ گل کر کے کسی بات کو ماننا چاہتے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ Faith (عقیدہ) اس چیز کا نام نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے کسی کی بات کو یونہی تسلیم کر لیا جائے Faith (اعتقاد) تو اس چیز کا نام ہے اس یقین کا نام ہے Conviction (ایمان) سے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کی رو سے عقل و ہوش کی بنا پر کسی چیز کو قبول کرنے کا نام ایمان ہے اور اگر رسول فوق البشر ہو اور وہ اس قسم کے معجزے دکھا کر تم سے بات منوائے تو وہ پھر عقل و خرد کی رو سے مانی ہوئی بات تو نہیں ہوگی۔ کہا کہ یہ بات ہے کہ رسول عام انسانوں جیسا انسان ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بھیجتے تھے کیونکہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

### استقامت کے میدان میں استہزا کے سخت پتھر کا مقابلہ کرنا ہوگا

رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ مخالفین اپنی مخالفت جاری رکھیں گے تصادم ہوگا اس لیے اَتَصْبِرُونَ وَ كَانَ رَبُّكَ بِصِيرًا (25:20) تم اس چیز پہ استقامت رکھو اور نہایت استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہو۔ ان کی مخالفت سے دلبرداشتہ مت ہو جانا حوصلہ نہ ہارو استقامت سے اپنی بات پہ جمے رہو ان کو یہ باتیں کرنے دو۔ یہ ایسی باتیں کہیں گے اس لیے کہ جس قسم کا معاشرہ تم قائم کرنا چاہتے ہو اس میں ان کی مفاد پرستیوں پہ بڑی خاص زد پڑتی ہے دولت مند طبقے کے اوپر بھی اور مذہب پرست طبقے کے اوپر بھی۔ اس

لیے یہ تو مخالفت کریں گے۔ ان سے دلبرداشتہ نہ ہو جاؤ۔

جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ سخت ترین پتھر جو مخالفت کا آتا ہے وہ استہزا کا آتا ہے یعنی مذاق اڑانا، تمسخر اڑانا۔ دلیل کا جواب تو دیا جاسکتا ہے لیکن تمسخر اور استہزا تذلیل انسانیت کا بڑا ہی بازاری انداز ہوتا ہے۔ رسول اس سطح کے اوپر نہیں اتر سکتا۔ وہ تو اخلاقی انسانیت کے بلند ترین معیار پر ہوتا ہے لیکن دلیل کا جواب جب مذاق اڑانے اور استہزا کے انداز میں دیا جائے تو وہ بہت ہی حوصلہ مندی کی بات ہوتی ہے اسی لیے کہا کہ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا (25:20)۔ کوئی بات نہیں خدا کا قانون مکافات عمل ہر کسی کو دیکھ رہا ہے، بس تم حوصلہ نہ بارو اور دوسری بات یہ ہے کہ رسولوں کے عام انسانوں جیسا ہونے سے انسانی اختیار و ارادہ کی آزمائش ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا نَمُوتُ (25:21) جو لوگ دل میں خیال کیے بیٹھے ہیں کہ انہوں نے کبھی ہمارے قانون مکافات کا سامنا کرنا ہی نہیں وہ دین کو سنجیدگی سے لیتے ہی نہیں۔ ان کی طرف سے یہ بھی ایک مطالبہ آتا ہے کہ رسول کہتا ہے کہ میری طرف فرشتہ وحی لاتا ہے تو ہمارے اوپر فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوتا؟ اور اگلی بات یہ نوری رَبَّنَا (25:21) کی ہے کہ ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھ سکتے؟

### انسان کی ایک نفسیاتی کیفیت کا نفسیاتی طریق پر جواب

آپ غور کیجیے کہ قرآن میں اس کا جواب خالص نفسیاتی طریق پر دیا ہے۔ یہ ہے ہی ایکل Psychological (نفسیاتی) مرض جو اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ آپ خود اپنے دل میں محسوس کر لیں گے کہ وہ کیا بات کہتا ہے یعنی اگر یہ کہتا ہے کہ خدا ہمارے ساتھ کیوں نہیں بات کرتا، ہم یہ کیوں نہیں ملائکہ اترتے، یعنی اس کے اندر خود تکبر نفس ہے یہ خود بڑا بن رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ یہ بات کیوں نہیں ہوتی اور قرآن جواب ہی اتنا دیتا ہے کہ لَقَدْ اسْتَكْبَرُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ (25:21) یہ لوگ اس قسم کی باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ یہ بہت بڑا بنتے ہیں یعنی یہ بات اس کی نہیں کرتے جو کچھ رسول کہتا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول کی بڑائی اس میں ہے کہ یہ کہتا ہے کہ مجھ پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور خدا مجھے پیغام بھیجتا ہے۔ اس پر وہ کہتے ہیں کہ ہم یہ کچھ کیوں نہیں ہوتا۔ اور یہی بات ہے جس کی وجہ سے وَعَتُوا عُتُوًّا كَبِيرًا (25:21) یہ اتنی سرکشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اگر دل سے اس خیال کو نکال دیں اسی سطح پہ آجائیں جس سطح پر رسول کہتا ہے کہ میں عام بشری سطح پہ ہوں اور اس کے بعد پھر جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے اس پر غور و فکر کریں تو یہ صحیح نتیجے پہ پہنچ سکتے ہیں لیکن جب دل میں یہ تکبر ہو کہ ہم میں سے ہی یہ کل کا ایک غریب کا لڑکا، ایک یتیم کا بچہ، ہمارے ساتھ یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا، آج یہ دعوے ہو رہے ہیں کہ صاحب! ہم پرفرشتہ نازل ہو رہے ہیں، خدا ہماری طرف پیغام بھیج رہا ہے تو ہماری طرف وہ پیغام کیوں نہیں بھیج رہا۔ کہا کہ یہ ہے

ان کی سرکشی کی وجہ اور انہی کے انداز کے مطابق کہا کہ یہ کہتے ہیں ہم یہ فرشتے نازل کیوں نہیں ہوتے، بات ان کے ہی انداز کی ہے کہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ یَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حَجْرًا مَّحْجُورًا (25:22) جس دن ان کے تصور کے مطابق کہیں فرشتے نظر آ گئے وہ دن، ان مجرمن کے لیے کسی خوشخبری کا دن نہیں ہوگا۔ اس دن چٹیں مار کے بھاگ جائیں گے اور کہیں گے کہ ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ہم میں اور ان فرشتوں میں کوئی روک حائل ہو جائے جس سے یہ ہم تک نہ پہنچ سکیں۔

### رسول بھی ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتا

یاد رکھیے، قرآن کریم نے واضح انداز میں یہ بتا دیا ہے کہ ملائکہ انسانوں کو نظر نہیں آیا کرتے اس لیے کہ یہ محسوس اور مرئی پیکر نہیں ہیں Visible (قابل دکھائی) چیزیں نہیں ہیں، مادی یا جسمانی نہیں ہیں۔ عام انسان تو ایک طرف رہے، خود نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار ؓ بھی انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ قرآن کریم میں ہے کہ بدر<sup>1</sup> کے میدان میں جماعت مومنین کے لیے ملائکہ بھی نازل ہوئے تھے۔ اس نے وہیں بتا دیا ہے کہ مقصد ان سے یہ تھا کہ وہ مجاہدین کے دلوں میں سکون اور اطمینان پیدا کریں۔ گویا یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی۔ میں اس وقت اس تشریح میں نہیں جانا چاہتا کہ پھر یہ ملائکہ کا نزول کیسے تھا اور وہ اس قسم کی کیفیت کیسے پیدا ہوتی تھی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کریم نے یہیں واضح کر دیا ہے کہ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا (9:26) خدا نے اس قسم کے لشکر نازل کیے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے، نیز (9:40) میں بھی یہی ہے۔ دیگر مقامات میں بھی یہ چیز ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کبار ؓ یہاں مخاطب ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ ملائکہ کو ہم نے نازل کیا تھا، ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے، تو گویا یہ تو الگ بات ہے کہ ان کی پھر کیفیت کیا ہوتی ہے۔ بات میں یہاں یہ کہہ رہا تھا کہ انہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ جب رسول ﷺ اور اس کے صحابہ کبار ؓ کے متعلق قرآن نے کہہ دیا، خدا نے کہہ دیا کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے، تو دوسرے انسان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم انہیں دیکھتے تھے۔

جیسا کہ میں بتایا کرتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں 1965ء کی پاک و ہند جنگ میں افسانے مشہور ہوئے تھے کہ سفید گھوڑیوں والے اور سبز عماموں والے آئے ہوئے تھے اور وہاں دریائے راوی کے پل پر دیکھا گیا کہ ہندوستانی فوج کی طرف سے ہوائی جہاز سے بم گرتا تھا، وہ اٹھا کے اُن کی طرف پھینک دیتے تھے اور اس جنگ میں اتنے آئے ہوئے تھے اور ہم نے یہاں دیکھا اور فلاں حضرت صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں ہاں ہاں یہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے جا رہے ہیں، جنگ میں آسمان سے مدد کے لیے فرشتے اتر رہے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں بھی میں نے یہ لکھا تھا کہ خدا کی طرف سے کوئی تقویت کا سامان، اس کی نصرت، اس کی رفاقت،

الگ چیز ہے، حق کی خاطر اٹھنے والے کے ساتھ حق کی تائید ہوتی ہے لیکن یہ چیز کہ آسمان سے جو فرشتے اترتے تھے انہیں عام انسان دیکھتے تھے، یہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن تو رسول ﷺ اور اس کے صحابہ ؓ سے کہہ رہا ہے کہ وہ فرشتے نازل ہوئے تھے، تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی طرف نازل شدہ فرشتوں کو وہ تو نہیں دیکھ سکتے تھے اور ہم دریائے راوی کے کنارے ان فرشتوں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ افسانے تھے جو بنائے اور سنائے جا رہے تھے۔

① یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے۔

### فرشتوں کے متعلق ارشادِ خداوندی

قرآن نے خود کہا ہے کہ تو ملائکہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ ان کی کیفیت یہ نہیں ہوتی، وہ مادی پیکر نہیں ہوتے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ تم کہتے ہو کہ ملائکہ ہم پہ کیوں نہیں نازل ہوتے، ہم کیوں نہیں ان کو دیکھتے۔ انہیں بتایا گیا کہ تمہارا تصور یہ ہے کہ موت کے وقت فرشتے آیا کرتے ہیں، تو موت کے وقت جو فرشتے تم کہتے ہو آیا کرتے ہیں آج تم یہ خود کہہ رہے ہو کہ ہماری طرف کیوں نہیں آتے، جب تمہاری طرف تمہارے تصور کے مطابق آتے ہیں، تو اس وقت جان کیوں نکل رہی ہوتی ہے، اس وقت تمہاری کیفیت یہ ہے کہ وَ يَقُولُونَ حَجْرًا مَّحْجُورًا (25:22) اس وقت تم بھی تمہارے حوالی موالی بھی یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! یہ حضرت جی، یہ موت کے فرشتے، کچھ وقت کے لیے تو دور ہو جائیں، ہٹ جائیں۔ اس وقت تمہاری کیفیت یہ ہے اور آج یہ کہہ رہے ہو کہ صاحب! فرشتے ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے، یعنی اندازہ لگائیے قرآن کس طرح سے اس قسم کے جہلا کی باتوں کو کاٹتا ہے۔

### انسان کا نامہ اعمال ساتھ ساتھ مکافاتِ عمل کے ترازو میں تولایا جاتا ہے

بات فرشتوں کے آنے اور نہ آنے کی نہیں ہے بات تو یہ ہے کہ وَ قَدْ مَنَّآ إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنْثُورًا (25:23) تم نے کام کس قسم کیے ہیں۔ ہمارے سامنے تمہارے کام ہوتے ہیں اور ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ وہ نتائج ہوتے ہیں جو تمہارے سامنے آتے ہیں اور یہ اعمال جو تم جیسے لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ گرد و غبار کی طرح فضا کی پہنائیوں میں اڑا دیئے جائیں گے یعنی ان کا کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ تخریبی اعمال کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے کئی مقامات میں ان قوموں کے ان افراد کے اعمال کے متعلق کہا ہے، جنہیں وہ یکسر کافر یا مشرک کہہ کر پکارتا ہے انہیں تو چھوڑیے۔ ایسے لوگ جو اپنی دانست میں سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے نیکی کے کام کر رہے ہیں اور وہ

اپنی دانست میں اپنے ہی تصور کے مطابق اسے نیکی سمجھ رہے ہوتے ہیں قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ خدا کی وحی کے معیار کے مطابق نیکی کے کام نہیں ہیں تو ان کا بھی کوئی نیک نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ سوال یہ نہیں کہ تم اپنی دانست میں کس کام کو اچھا کام سمجھ رہے ہو۔ اس طرح تو دنیا کے ہر اہل مذہب سے پوچھیے نہایت دیانتداری سے وہ اپنے ان باطل اعتقادات، مسالک اور اعمال کو بالکل اچھا، نیک اور حق سمجھتے ہیں۔ اس میں یہ بات نہیں ہے کہ صاحب! وہ بڑا مخلصانہ طور پر اس کو صحیح سمجھتا ہے۔ اس کام کا خدا کی وحی کے مطابق ہونا از بس ضروری ہے۔

### اعمال کے سلسلہ میں انسانی سوچ کا معیار

ٹھگوں کے ہاں یہ عقیدہ یقیناً تھا کہ وہ مسافروں کو گلا گھونٹ کے مارتے تھے ان کا مال لوٹتے تھے اور اس کے بعد دیوی کے چرنوں میں پانچواں حصہ پیش کرتے تھے اور کسی نو جوان کی شادی نہیں ہوتی تھی جب تک وہ ایسا نہ کرے۔ اور جو ایسا کرنے والا تھا اس کو بہت بڑا مقام حاصل ہوتا تھا<sup>①</sup>۔ اس میں کسی منافقت کو دخل نہیں تھا۔ وہ نہایت خلوص دل سے ایسا مانتے تھے۔ ہندو جب گائے کی پوجا کرتا ہے تو وہ کسی کے دکھلاوے کی خاطر نہیں کرتا۔ ہمارے ہاں یہ جتنے قبروں پہ جا جا کر مرادیں مانگتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں، کسی کو دکھانے کی خاطر نہیں کرتے۔ وہ دکھانے والے ٹھیک ہیں، وہ بھی نظر آ جاتے ہیں لیکن عوام جو وہاں جاتے ہیں نہایت خلوص نیت سے جاتے ہیں۔ خلوص نیت تو کسی کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار نہیں ہوتا۔ غلط اور صحیح ہونے کا معیار تو خدا کی دی ہوئی کسوٹی ہے۔ نیک اور غلط کا معیار تو اسوہ رسول اللہ ﷺ ہی ہو سکتا ہے اس کے اوپر پرکھ کے دیکھنا چاہیے کہ کوئی عمل کیسا ہے۔ اگر خدا کی دی ہوئی کسوٹی کے اوپر کوئی عمل خیر یا نیک کام نہیں ثابت ہوتا تو اپنی دانست میں کتنا ہی کوئی کیوں نہ کہے کہ میں تو نہایت نیک نیتی سے ایسا کرتا ہوں، یہ نیک نیتی تو ہر جگہ کسی عمل کے نیک ہونے کا معیار یا ثبوت نہیں ہو سکتی۔ نیک نیتی کے متعلق تو آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ

Sincerity is always a proof of sanity.

تو اس لیے قرآن اسے نہیں مانتا۔

### غلط اعمال کے سلسلہ میں ایک خوبصورت مثال

تم اس بارے میں اپنی دانست میں کیا سمجھتے ہو؟ سنو قرآن کریم نے تو وہاں کہا ہے کہ لَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا (18:105) ان کے ان کاموں کے لیے جن کو وہ اپنی دانست میں نیک سمجھتے تھے، لیکن درحقیقت وہ نیک نہیں تھے ان کے تولنے کے لیے تو میزان کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی اور یہاں کہا ہے کہ وہ عمل فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَنْثُورًا (25:23) بکھرے ہوئے ذرات کی طرح ہیں۔ ذرات بھی اگر کسی ایک جگہ جمع ہوں تو وہ بھی صحرا بن سکتے ہیں ان سے بھی کوئی محسوس شے سامنے آ سکتی ہے لیکن اگر

یہی ذرات غبار کی شکل میں بکھرے ہوئے ہوں تو ان کا کوئی وزن نہیں ہوتا، ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی۔ یہ کیسی عمدہ مثال ہے! یہ ہبَاءٌ تو غبار سمجھ لیجیے۔ منشور کے معنی بکھرے ہوئے بھی ہوتے ہیں لیکن اس میں ایک بڑی لطیف چیز بھی پوشیدہ ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان میں یہ عرب اپنے ہاں عجیب و غریب انداز سے ان چیزوں کو استعمال کرتے تھے۔ ٹھیک ہے یہ جو نثر ہے اس کا مادہ ”نثر“ ہے۔ اس کے عام معنی نظم کے مقابلے میں بکھرنے کے ہی ہیں۔ نظم کے معنی ہیں ”پروئی ہوئی چیز“ اور نثر کے معنی ہیں ”بکھری ہوئی چیز“، لیکن وہ ایسے کچے پھل جو جھکڑ سے خود بخود گر کر گر کر ادھر ادھر بکھرتے تھے ان کو بھی منشور کہتے تھے۔ پکا ہوا پھل تو کام کا پھل ہوتا ہے

① ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے اسی سورۃ الفرقان کا پہلا باب

② نیک نیتی ہمیشہ دانشوری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کچا پھل جو گر کے بکھر جائے کسی کام نہیں آ سکتا۔ ان اعمال کو جن کی شکلیں تو پھل جیسی ہیں لیکن ہیں وہ کچے ہی پھل اور اس طرح سے بکھر گئے ہوئے ہیں وہ کسی کام نہیں آئے۔ یہ اس کی ایسی عمدہ مثال ہے کہ بکھرے ہوئے کچے پھل یونہی گر گئے ہوئے ہیں۔ اب آپ اس تمثیل میں اس مثال میں دیکھیے کہ اس کی شکل اس پھل جیسی ہوتی ہے لیکن کام کسی نہیں آتا ہے۔ یہ ہے ہبَاءٌ مِّنْشُورًا (25:23)۔

دنیا میں خیر و شر کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے

یہ چیز عزیزانِ من! بڑی ضروری ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی کام کو جسے ہم اپنی دانست میں اچھا سمجھتے ہیں وہ فی الواقعہ اچھا ہو۔ دنیا میں خیر اور شر Good & Evil کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ انسان یہیں دھوکا کھاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ دنیا کی کثیر آبادی غلط راستوں پہ چلتی ہے اور ان میں کثیر لوگ وہ ہوتے ہیں جو نہایت دیانتداری سے، خلوص نیتی سے، ایمانداری سے، سمجھتے ہیں کہ یہ اچھا کام ہے۔ یہ بات ہے کہ یونان کے حکما سے لے کر اڑھائی ہزار سال پہلے سے آج تک Good & Evil (خیر و شر) کے فلسفہ پر یہ فلاسفر کسی متعین نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ان کی اتنی اتنی موٹی کتابیں اسی Issue (مسئلہ) پر ہیں۔ یہ اپنی The theory of good & evil (خیر و شر کے نظریہ) میں متعین طور پر نہیں بتا سکتے کہ Good (خیر) کسے کہتے ہیں Evil (شر) کیا ہوتا ہے؟ شر اور خیر میں تمیز کس طرح کی جائے؟ یہ مذاہب کے معاملے میں بڑا اہم مسئلہ ہے۔ میں نے جیسا ابھی عرض کیا ہے کہ عام مذاہب میں آپ دیکھیے کہ نہایت نیک نیتی سے وہ اپنے مسلک کو اپنے اعمال کو بالکل صحیح برسر حق سمجھتے ہیں۔ قرآن ان کا ابطال کرتا ہے یہ غلط ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن نے آ کر یہ کہا کہ یہ بات انسانوں کے ذہن کے فیصلہ کرنے کی نہیں ہے۔ اس کے لیے Objective Standard (خارجی معیار) ہونا چاہیے جو انسانوں کے ذہنوں کا اور ان کی فکر کا تراشیدہ نہ ہو اور ایسا معیار تو جب انسانوں سے باہر اسے آپ خارجی

(Objective) کہیں گے خدا کی طرف سے دیا ہوا یہی ہو سکتا ہے جو انسانوں سے ماورا ہے اور یہی چیز ہے جسے وحی کہتے ہیں۔

### خیر و شر کا معیار صرف وحی مقرر کرتی ہے

عزیزانِ من! ایک Objective Standard (خارجی معیار) جو کسی انسان کے ذہن کا تراشیدہ نہ ہو، کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔ خدا کے ماننے کے معنی صرف یہ ہیں کہ انسانی سوچ کے لیے خیر اور شر کے لیے نیک اور بد کے لیے Good & Evil کے لیے ایک خارجی معیار (Objective Standard) ہونا چاہیے۔ یہ ان فلاسفرز کی بھی اور سائیکولوجسٹ کی بھی Term (اصطلاح) ہے۔ ان دونوں کے ہاں Subjective (اندرونی) وہ ہے جو خود انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہو اور Objective (خارجی) وہ ہے جو ماورائے عقل انسانی سے ملا ہو۔ یہ جتنی Discussion (بحث) ان لوگوں نے خیر و شر کی کی ہے اس میں آخر میں وہ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی Objective Standard (خارجی معیار) ہونا چاہیے ورنہ انسانوں کے ذہن کے تراشیدہ یا وضع کردہ یا پیدا کردہ معیار میں اختلاف ہوتا چلا جائے گا۔ فکر انسانی اس باب میں کبھی ایک نکتے پہ نہیں پہنچ سکے گی اور یہ ہے وہ مقام جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے جہاں خدا کے ماننے کی ضرورت پڑتی ہے۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ اپنی اپنی دانست میں تم لوگ جو اچھا کام، ثواب کا کام سمجھتے ہو، ان میں تو وہ کام ہیں جو خدا کے میزان میں جب آتے ہیں تو ان کے لیے میزان ہی کھڑی نہیں کی جاتی وہ ہبَاءَ مَسْثُورًا (25:23) ہوتے ہیں: بکھرے ہوئے ذرے، گرے ہوئے کچے پھل جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ لہذا اپنے کاموں کو خدا کے معیار کے مطابق پرکھ کر دیکھ اور یہی چیز ہے عزیزانِ من! کہ جب ہم مذہب کی دنیا میں آتے ہیں وہاں یہ جسے آپ خلوص نیت کہتے ہیں، حسن نیت کہتے ہیں، بہت بڑے فریب اور دھوکے کا موجب بن جاتی ہے۔ وہاں تو بالعموم جو ہوتا چلا آ رہا ہے، بس اسی کو ہی آپ معیار قرار دیتے ہیں، لیکن سوال ”ہوتے چلے آئے“ کا نہیں ہے۔ باقی مذاہب کے ہاں غلط بھی تو ہوتا چلا آ رہا ہوتا ہے اور ان کے ہاں تو آپ سے بھی زیادہ عرصے سے وہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ آپ کا یا ہمارا جو مذہب <sup>1</sup> اسلام ہے، یہ تو سب سے Latest (جدید ترین) جو سب کے بعد ملا ہے۔ اگر یہی پیانا نہ ہو، اگر یہی معیار ہو، کہ جو ہوتا چلا آ رہا ہے، جو زمانہ قدیم سے متواتر چلا آ رہا ہے تو ان کے ہاں تو یہ معیار آپ کے معیار سے زیادہ لمبے عرصے سے چلا آ رہا ہوتا ہے۔ اس دلیل کے مطابق ہم ان کو کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ باطل ہیں۔ یہ سن (سال) کوئی دلیل نہیں ہے، یہ معیار کوئی سند نہیں ہے۔ معیار صرف خدا کا دیا ہوا معیار ہے۔ اس کے برعکس وہ معیار خواہ متواتر اسلاف سے چلا آ رہا ہو یا آج کسی کے ذہن کا پیدا کردہ ہو، اس میں کوئی فرق نہیں۔ اسے خدا کی عطا کردہ کسوٹی پر پرکھ کے دیکھ لیجیے جسے وہ سونا کہہ دے، وہ سونا ہے جسے وہ پیتل کہے وہ پیتل ہے۔ معاملہ ختم ہو گیا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ ان کے اعمال کیا نتیجہ پیدا کریں گے!! ان کا کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ تخریبی اعمال کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ اس کے

مقابلے میں پھر قرآن دوسری طرف آیا اور کہا کہ اَصْحَبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيلًا<sup>2</sup> (25:24)۔ اس کے مقابلے میں اہل جنت ہیں۔

### مستقر اور مستودع کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں

یہاں (25:24) میں دو الفاظ آئے ہیں: خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا (25:24)۔ میں نے ابھی خیر اور شر کہا تھا۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اہل

- ① یہاں مراد دین اسلام ہے۔ اسلام دین ہے مذہب نہیں ہے۔ مذہب کا تو لفظ ہی قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔
  - ② اُس دور میں جنتی زندگی بسر کرنے والوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ اُن کی رہائش گاہوں میں جو آسانیاں اور فراوانیاں ہوں گی، وہ تو ایک طرف رہیں، جہاں انہیں محض استراحت (آرام کرنے کے لیے) ٹھہرنا ہوگا، وہ مقامات بھی حسن خوبی کے آئینہ دار ہوں گے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 820 تا 821)۔
- جنت وہ ہیں جن کے اعمال، جن کے کام، خدا کی دی ہوئی کسوٹی پر سچے ثابت ہوئے، ان کا مستقر، خیر ہے۔ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں، عزیزانِ من! الفاظ تو قرآن نے عربی مبین کے استعمال کیے ہیں لیکن اس کے انتخاب میں بھی یہ اعجاز ہے کہ ایک ایک لفظ کے اندر وہ اتنے اتنے اہم مسائل حل کر دیتا ہے کہ عام فکر انسانی بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں بھی بیان نہیں کرتی۔ انہی میں ایک مستقر کا لفظ ہے۔ ہم اس کا عام ترجمہ ٹھکانہ کر دیتے ہیں۔ سمجھنے کے لیے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آخری منزل، آخری مقام ہے۔ عام طور پر مستقر کے یہی معنی ہمارے ہاں لیے جاتے ہیں۔ قرآن تو بہت بڑی حقیقت بیان کر جاتا ہے۔

عزیزانِ من! مستقر کہتے ہیں ”ایسی چیز جو حرکت میں چلی آ رہی ہو اور کسی مقام پہ آن کر رک جائے۔“ یعنی وہ شے جو شروع سے ہی ایک مقام پہ ٹھہری ہوئی ہو، پتھر کی طرح جمی ہوئی، پتھر کے اس مقام کو مستقر نہیں کہتے، بلکہ کوئی چیز جو رواں دواں چلی آ رہی ہو، جیسے پانی چلا آ رہا ہے، کسی مقام پہ ٹھہر گیا تو وہاں وہ اس کو پانی کا مستقر کہیں گے۔ رواں دواں چلے آنے والی جو چیز ہے، وہ کہیں آ کے رک جائے، ٹھہر جائے تو وہ ہے مستقر۔ قرآن نے مستقر اور مستودع کے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِي اَنْشَاَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُوْنَ (6:99)۔ پہلی بات تو یہ کہ خدا وہ ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے آگے بڑھایا۔ یہاں کہا ہے کہ تمہیں پیدا نہیں کیا آگے بڑھایا۔ یہ ”انشاکم“ آیا ہے۔ پھر کہا کہ اس کے بعد تمہارے لیے ”مستقر“ ہے اور ”مستودع“ ہے۔ آگے کہا ہے کہ یہ جو بات ہے، یہ بڑی نکھار ابھار کے کی گئی ہے لیکن سمجھ میں ان کے ہی آئے گی، جو غور و فکر سے کام لیں گے۔

میں یہاں نفس واحدہ کی بات پر تو اس وقت تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں مستقر اور مستودع کے الفاظ لوں گا۔ یہ الفاظ تو دو ہی ہیں



لیکن ہیں عربی زبان کے۔ ان کے مادے (Roots) بالترتیب ”ق ر ر“ اور ”و د ع“ ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ اس میں غور و فکر کی کیا چیز ہے جس کے لیے بتایا ہے کہ یہ بڑے گہرے غور و فکر کی بات ہے۔ غور و فکر کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ نفس اور آفاق میں جوں جوں ہماری نشانیاں بے نقاب ہوتی چلی جائیں گی، قرآن کے برحق ہونے کے لیے وہ ثبوت اور دلیل بنتی چلی جائیں گی۔ غور و فکر یہ ہے کہ نفس اور آفاق میں جسے خدا نے اپنی نشانیاں کہا ہے، جو کائنات کے اندر نظام چل رہا ہے یا جس انداز سے یہ کائنات چل رہی ہے اس میں خود انسانی نفسیات کی جو Psyche ہے سائیکولوجی ہے اس میں تغیرات ہو رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جوں جوں یہ تمہیں سمجھ میں آنا شروع ہوں گے قرآن کے حقائق بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ یہ ہے غور و فکر۔ وہ جو کہتا ہے تو ”مستقر“ اور ”مستودع“ کے اندر کون سی چیز ہے جس پر غور و فکر سے یہ بات سمجھ میں آئے گی؟ پہلے تو شاید نہ آ سکتی اگرچہ ہمارے ہاں بہت پہلے اس قسم کے مفکر گزرے ہیں جنہوں نے اس پر غور کیا تھا لیکن ہمارے دور میں جو بات بڑی واضح ہوئی ہے وہ ہے انسانی تخلیق یا کائنات میں مختلف چیزیں جو جاندار بھی ہیں ان کی تخلیق کا سلسلہ۔

یہ جسے آ Theory of Evolution (نظریہ ارتقا) کہتے ہیں اس کا عام اور سب مذاہب میں پایا جانے والا یہی تصور ہے کہ کس طرح سے خدا نے ایک مٹی کا پتلا آدم بنایا، اس میں سے پہلی چیری، حوا پیدا کی، آگے پھر اس میں سے انسان بنائے۔ وہ ایک جوڑے ہی کی ضرورت تھی۔ پہلے مشکل تو وہیں تھی۔ یہ مشکل حل کی۔ آگے یہ سلسلہ چل پڑا باقی باہر کائنات کی یہ چیزیں بھی یہ جتنے جانور مویشی ہیں وہ سارے اسی طرح کے اسی طرح بنے ہوئے موجود ہیں۔ ذہن انسانی یہیں پہنچ سکتا تھا لیکن آج کی تحقیق یہ کہہ رہی ہے کہ یہ اس طرح سے نہیں تھا۔ زندگی کی ابتدا ایک جراثیم (Single life-cell) سے ہوئی تھی۔ وہ اس کو نفس واحدہ کہتے ہیں یعنی ایک جراثیم واحد جس کے اندر الگ ہو کر نر اور مادہ بننے کی یہ دونوں خصوصیات تھیں۔ بہر حال میرے پاس ارتقا کی تھیوری یا نظریہ کی تفصیل میں جانے کا تو وقت نہیں ہے ان کی ساری تھیوری یہ ہے کہ اس طرح سے یہ چیزیں، یہ جنہیں وہ زندگی کے مختلف پیکر کہتے ہیں، بنے۔ لائف یعنی زندگی کے متعلق سائنس اب تک نہیں بتا سکی کہ اس کی ابتدا کس طرح سے ہوئی۔ یہ بتا ہی نہیں سکے۔ یہی تو وہ چیز ہے جس میں خدائی اختیار آتا ہے۔ زندگی نے آگے بڑھ کر یہ مختلف پیکر کیسے اختیار کیے؟ یہ جراثیم (Single life-cell) جو خوردبین سے نظر آتے ہیں بنے۔ اس کے بعد یہ کیڑے مکوڑے، ریگنے والے، دو پاؤں پہ چلنے والے، چار پاؤں پہ چلنے والے، اس قسم کے جانور، یہ گوریل، قسم کے چمپینزی وغیرہ ملتے جلتے ہوئے انسان سے شکل و شبہت میں اور پھر انسان بنا۔

مستقر کا قرآنی مفہوم

زندگی مختلف منازل سے گزرتی ہوئی، اس پیکر انسانی میں آئی اور اس کے لیے ان کی تھیوری میں یہ ہے کہ ہر جنس یا ہر Species (نوع) ایک مقام پہ آ کے رکتی ہے، وہاں اس کے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اس درجے سے اس منزل سے جس میں وہ ہے، اسے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل بنادیتی ہے اور یہ صلاحیتیں اس کو اگلی منزل میں پہنچا دیتی ہیں، پھر وہ وہاں رکتی ہے، ٹھہرتی ہے اور اس کے بعد پھر وہ ان صلاحیتوں کو لے کر اگلی منزل میں جاتی ہے۔ یہ مستقر کے معنی ہوتے ہیں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ کوئی رواں دواں چیز کسی منزل میں آ کے ٹھہرے اور ”مستودع“ کے معنی ہوتے ہیں ”وہاں سے اسے کسی اور کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ مستودع کرنا آپ جانتے ہی ہیں۔ اس کے معنی ودیعت کے ہوتے ہیں، کسی امانت کو کسی کے سپرد کر جانا۔

عزیزانِ من! اب آپ سمجھے جو اس نے کہا تھا کہ غور و فکر سے بات سمجھ میں آئے گی جو ہم کہہ رہے ہیں۔ آج یورپ کا یہ سائنسٹ وجد میں آ جائے جب دو لفظ اس کے سامنے آئیں گے کہ قرآن چودہ سو سال پیشتر کیا کہہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ هُوَ الَّذِي اَنْشَاَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (6:98)۔ وہ جو پہلا سیل ہے اس سیل سے انشا کم ہوا یعنی زندگی کی ابتدا ہوئی، زندگی کو آگے بڑھایا۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ اس سے آگے نشوونما دے کر اسے آگے بڑھایا۔ بڑھنے کی صورت یہ نہیں تھی کہ یکا یک اگلے پیکر میں یوں پہنچ گیا اور پھر یوں آ گیا، نہیں، یہ بڑھتا گیا، ایک منزل میں اس کو استقرار ہوا، وہ رکا ٹھہرا، وہ اس کا مستقر بنا، مستقل طور پہ ٹھہرنے کا مقام نہیں۔ یاد رکھیے رکنے کا مقام اور اس کے بعد اس مقام کے جو یوں کہیے کہ اس مقام کے جو مستودع ذمہ دار تھے انہوں نے اس امانت کو آگے کسی کے سپرد کر دیا۔ یہ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ<sup>1</sup> (6:98) ہے۔ مستقر کے یہ معنی تو قرآن نے خود واضح کیے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن سمجھنے کا طریقہ ہی یہ ہے، عزیزانِ من! کہ جو لفظ آئے، دیکھیے کہ وہ ان معنی کی کس طرح وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً وہ زمین کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ<sup>2</sup> (7:24)۔ دیکھیے کہ اس آیت کے ایک لفظ ”مستقر“ میں کتنا بڑا اہم مسئلہ ہے جو حل کر گیا ہے۔

### مادی نظریہ حیات قرآن کی تعلیم کے برعکس ہے

ہمارے ہاں کا ایک مادی نظریہ حیات، طبعی نظریہ حیات، سیکولر نظریہ حیات یہ کہتا ہے کہ یہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے زندگی انسانی شکل میں آئی اور یہ اس کا آخری مقام ہے۔ بس یہاں پھر ختم ہو جائے گا۔ یہ موت آئی اور موت کے بعد انسان ختم ہوا۔ بس یہ اس کی آخری منزل ہے آگے کچھ نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ (7:24)۔ انہیں بابا! آخری منزل نہیں ہے، یہ تو صرف مستقر ہے۔ یہ مستقر کب تک کے لیے ہے؟ کیا یہ ابدی طور پہ مستقر ہے؟ کہا کہ إِلَىٰ حِينٍ (7:24) نہیں، ایک مدت تک کے لیے ہے۔ اس طرح وہ مستقر جائے قرار ہوئی جو ایک مدت تک کے لیے ہوتی ہے، فائنل اسٹیج نہیں ہوتا، مستقر آخری ٹھہرنے کا مقام نہیں

ہوتا اور اس سے یہ نظر آیا کہ قرآن کی رو سے نظریہ حیات یہ ہے کہ یہ ارضی زندگی آخری مقام نہیں ہے یہ تو انسانی زندگی کا مستقر ہے۔ اس نے آگے چلنا ہے۔ لفظ مستقر یہ کچھ بتا رہا ہے۔ قرآن زور دیتا ہے کہ ہم نے اسے عربی مبین میں نازل کیا۔ لہذا عربی مبین کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ پھر یہ دیکھیے کہ یہ اپنے معنی کس طرح واضح کرتا ہے تو یہ مُسْتَقَرٌّ وَ مَتَاعٌ اِلٰی حَیْنٍ (7:24) ہے یعنی یہ تسلسل حیات ہے یہ

① اَنْشَاكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (6:98) تمہاری زندگی کی ابتدا ایک جڑوہ حیات (Single life-cell) سے ہوئی (39:6; 4:1)۔ اُس کے بعد فَمُسْتَقَرٌّ وَ مُسْتَوْدَعٌ (6:98) ہے یعنی تم نے ارتقائی منازل طے کرنا شروع کیں اس طرح کہ تمہارا کاروان زندگی کچھ وقت کے لیے ایک منزل میں ٹھہرا۔ پھر اُس منزل نے اُسے دوسری منزل کے سپرد کر دیا (11:6)۔ اس طرح یہ قافلہ منزل بہ منزل آگے بڑھتا گیا تا آنکہ تم مقام آدمیت تک پہنچ گئے (پرویز: مفہوم القرآن ص 311 تا 312)۔

② اب تم نے یہاں ایک مدت تک رہنا ہے اور سامانِ زیست سے ہر ایک نے فائدہ اٹھانا ہے۔ زندگی کا آگے جانا ہے۔ اس ایک لفظ میں قرآن یہ بات کہہ گیا اور فَمُسْتَقَرٌّ وَ مُسْتَوْدَعٌ (6:98) کے دو الفاظ استعمال کیے تو نظریہ ارتقا کی تمام کڑیاں گنا گیا۔

### مستقر کی ایک دوسری شکل مقیل بھی ہے

ان عربوں کے ہاں پھر یہ چیز بھی آئی ہے کہ بعض نوع (Species) ایسی ہوتی ہیں جنہیں زیادہ عرصہ ٹھہرنا پڑتا ہے اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ وہ تھوڑے عرصے میں ہی وہ صلاحیت حاصل کر لیتی ہیں اور آگے بڑھ جاتی ہیں۔ یہ بھی ان کے ہاں کی چیز ہے۔ سینے قرآن کہتا ہے کہ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُسْتَقَرًّا وَ احْسَنُ مَقِيلًا (25:24) ان کے لیے مستقر (یعنی ٹھہرنے کی جگہ) بھی بڑا ”خیر“ ہے، بہت اچھا ہے اور مستقر ہی نہیں یہ مقیل احسن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مقیل کیا ہے؟ یہ دوپہر کو جو آدمی یونہی ذرا کمر سیدھی کرتا ہے، تھوڑا سا جھونکا لیتا ہے جسے قیلولہ کہتے ہیں ذرا سی راحت ہے، وہ مستقر سے بہت چھوٹا عرصہ ہوتا ہے۔ یہ استراحت کا بہت چھوٹا عرصہ ہے جسے مقیل کہا جاتا ہے۔ کہا کہ ان کا مستقر خیر ہوگا اور بعض میں تو یہ صلاحیت ہوگی کہ بس اتنا ہی ٹھہرنا ہوگا جیسے دوپہر کو ”تھوڑی ٹیک لگا لینا اے آدمی“۔<sup>①</sup>

عزیزانِ من! اربابِ فکر و نظر ہی یہ بات سمجھ سکیں گے کہ قرآن کیا کہتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ارتقائی منازل گنا رہا ہے، منازل کے دو درجے گنا رہا ہے۔ مستقر کہہ کے اس کی فائل اسٹیج نہیں کہتا، بلکہ جائے قرار کہتا ہے۔ جائے قرار میں یہ کہتا ہے کہ بعض کے لیے تو ذرا زیادہ لمبا عرصہ ہوگا اور بعض تو ایسا ہی ہوگا جیسے یونہی دوپہر کو کوئی آدمی ذرا سی آنکھ جھپکنے کے لیے ٹھہر جائے یا رک جائے یا استراحت کر لے اور اس کے بعد پھر اٹھ کھڑا ہو اور آگے بڑھے۔ اس وقت کیا ہوگا؟ اس دور میں کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ

السَّمَاءِ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيلًا<sup>2</sup> (25:25)۔

قرآن حکیم کے یہ یوم تشقق السماء بالغمام کے الفاظ غور و فکر کے متقاضی ہیں

عزیزانِ من! یہاں ایک بات سوچنے کی ہے کہ اگر ہر جگہ یہی چیز ہو کہ قرب قیامت میں جب یہ چیز کچھ نہیں رہے گی اس وقت آسمان دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے، زمین پھٹ جائے گی، آسمان گر جائے گا، ہم آپ آج جو ہیں، ہمیں اس سے کیا فائدہ پہنچا۔

① جیسے دو پہر کو انسان استراحتاً (آرام کرنے کے لیے) ٹھہر جاتا ہے۔

② اُس دور میں خدا کے کائناتی قوانین، زندگی بخش اسباب و مسائل کو ساتھ لیے بے نقاب سامنے آئیں گے، اور خدا کے پروگرام کو بروئے کار لانے والی کائناتی قوتوں (Cosmic Forces) کا پے در پے نزول ہوگا (پرویز: مفہوم القرآن، ص-821)۔

اس بات سے وہ ہو جائے گا، اس وقت یہ ہو جائے گا، اور جو اس وقت موجود ہوں گے ان کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اور وہ تو بیک جنبشِ گردشِ زمین نہ رہے گی، نہ زمین پہ رہنے والے رہیں گے۔ یہ واقعات جو بھی ہیں اگر یہ اسی طرح سے ہی ہیں، بہر حال بیان کیے گئے ہیں، تو سمجھ لیجیے کہ کچھ آنے والے واقعات کا ذکر ہے۔

قرآن تو ہمارے لیے کتابِ ہدایت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس زمین کی زندگی میں ہمارے لیے مستقر ہے۔ زندگی آگے چلتی ہے، یہ ہے ہدایت ہماری۔ یہ زمین ہی ایک دن نہیں رہے گی۔ وہ ٹھیک ہے، نہیں رہے گی۔ زمین میں رہنے والوں کے متعلق تو خدا نے کہہ دیا ہے کہ زمین کے ختم ہونے کے ساتھ یہ تو ختم نہیں ہو جائیں گے، وہ تو اس وقت کے بعد بھی آگے چلیں گے، تو اس لیے ہر مقام پہ ان کے معنی یہی نہیں ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یَوْمَ تَشَقُّقُ السَّمَاءِ بِالْغَمَامِ (25:25)۔ یہاں اس کے ترجمے میں کہا کہ جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ پڑے گا تو اس سے کیا چیز آپ کی سمجھ میں آئی؟ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيلًا (25:25) فرشتے اتارے جائیں گے۔ آہستہ آہستہ ان کی تنزیل ہوگی۔ ٹھیک ہے یہ بھی قرب قیامت میں ہوگا تو جو اس دور میں لوگ ہوں گے وہ دیکھ لیں گے۔ اگر قرآن نے یہی بات کہی ہے تو ہمارا اس پہ بھی ایمان ہے۔ جب ایمان ہمارا یہ ہے کہ یہ کائنات ابدی نہیں ہے، اس نے ایک دن ختم ہونا ہے تو ٹھیک ہے آج ہمارے لیے اس میں یہ کیا چیز ہے۔

یہ الفاظ آج ہمیں کیا سبق دیتے ہیں؟

قرآن بتا رہا ہے کہ باطل کے نظام کی جگہ جب حق کا نظام قائم ہوگا، جسے وہ الجحۃ کہتا ہے، اس وقت کیفیت کیا ہوگی؟ کہا ہے کہ انشقاق ہوگا۔ اس کے معنی پھٹ پڑنا ہے۔ عَرَبُ الشَّقَقِ کو طلوعِ سحر<sup>①</sup> بھی کہا کرتے تھے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے! مگر انسان زندگی کی

شبِ تاریک سحر کرنے سکا۔ دورِ حاضر کے انسان کو اقبالؒ (1877-1938) یہ کہہ رہا ہے:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اور قرآن نے جہاں یہ ہے کہا کہ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (97:1)۔ اسی سورۃ کے آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ هِيَ حَتَّى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (97:5)۔ ان میں وہ کیا چیز کہی ہے ”فجر“ اور ”انشقاق“ تو ایک ہی بات ہے: تاریکیوں کا پھٹ پڑنا اور اس میں سے نورانیت کا نمودار ہو جانا۔ یہ وہی ہے جسے قرآن نے وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (39:69) کہا ہے یعنی اس دور میں یہ زمین اپنے پرورش

❶ تاج العروس میں اَلشُّقُّ کے معنی صبح آئے ہیں۔

دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ یہ اس ارض کی بات ہو رہی ہے کہ یہاں یہ کیفیت ہو جائے گی کہ جہاں تاریکیاں ہی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں جب نظامِ خداوندی قائم ہوگا تو یہاں نورانیت ہی نورانیت ہوگی۔ جو سما ہے یہ کائنات کے قوانین ہیں اقدارِ خداوندی ہیں جو خارج سے آتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ غلامِ بادلوں کو کہتے ہیں لیکن قرآن کریم نے ہر جگہ زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرنے کے لیے ہمیشہ آسمان کے بادلوں کو مینہ سے تشبیہ دی ہے۔ کہا ہے کہ اسے اقدارِ خداوندی کی رو سے حیاتِ تازہ اور حیاتِ نوعِ عطا کرنے والے سامان و اسباب ملیں گے۔ جب غلط نظام کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی ایک طلوعِ سحر ہوگا نئے نظام کی نورانیت پھیل جائے گی دنیا میں یہ اقدارِ خداوندی تمام آسائشوں اور راحتِ سامانیوں کے ساتھ اس زمین پر نازل ہوں گی اور نُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيلًا (25:25) یہ فطرت کی قوتیں ہیں جو ان تمام اسباب و وسائل کو لے کر تزییناً آہستہ آہستہ بتدریج آئیں گی، یکلخت نہیں آئیں گی۔

اس دور کی خصوصیت کبریٰ

میں نے کہا تھا کہ عربی زبان کے اندر تَنْزِيلٌ ”تفعیل“ کا باب ہے یعنی آہستہ آہستہ کسی چیز کا اتارنا جانا ہے۔ یہاں کہا کہ یہ دور وہ ہوگا۔ اس دور کی خصوصیت کبریٰ کیا ہوگی؟ عزیزانِ من! اب دیکھیے بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ عظیم چیز ہے ایسی عظیم چیز ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے بیان کیسے کروں گا۔ میں تو وجد میں آ جاتا ہوں۔ اس دور میں کیا ہوگا؟ کہا کہ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ اِلْحَقٌ لِلرَّحْمٰنِ (25:26)۔ آپ کے سامنے بھی قرآن کے نسخے ہیں الفاظ تو بہر حال آسان ہی ہیں سامنے آتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ کون سی چیز ہے جس میں کہتے ہو کہ میں تو وجد میں آ جاتا ہوں۔ میں تو سمجھتا نہیں کہ میں یہ کیسے سمجھاؤں۔ کہا ہے کہ اس دور میں حق پرستی (ملک کے معنی اقتدار اور کنٹرول ہوتا ہے) پورا اقتدار اور کنٹرول لِلرَّحْمٰنِ کے لیے ہوگا۔ بات دو الفاظ میں تو یہ ہے کہ قوانینِ خداوندی کی

کارفرمائی ہوگی، انہیں اقتدار حاصل ہوگا، حق کو اقتدار حاصل ہوگا، ملک یعنی اقتدار اور کنٹرول انہی کا ہوگا۔

### الرحمن یعنی صفت خداوندی کی عظمت پوری طرح کارفرما ہوگی

غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں لِلرَّحْمَنِ (25:26) کہا ہے۔ کنٹرول اور اقتدار ہوگا، حق پر مبنی ہوگا۔ یہ کس کے ہاتھ میں ہوگا؟ بات تو خدا ہی کی ہے۔ یہاں قرآن خدا کی یہ صفت رحمن لایا ہے کہ کنٹرول اور اقتدار رحمن کے ہاتھ میں ہوگا۔ اب نظام خداوندی کی ساری بات سامنے آ جاتی ہے۔ عزیزانِ من! رحمن تو آپ کو پتہ ہے کہ ”رحم“ اس کا مادہ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی اس انداز کی پرورش کرنا جیسے

❶ ثلاثی مزید فیہ کے مختلف ابواب ہیں۔ ان میں ایک باب تَفْعِيلُ ہے۔ ہر باب کے اپنے مخصوص خواص ہیں۔ اس باب سے مصدر تَفْعِيلُ کے وزن پر آئے گا۔ مثلاً تَكْرِيمٌ، تَنْزِيلٌ

رحم مادر میں بچے کی، جنین کی پرورش ہوتی ہے۔ جو بھی صاحب کنٹرول یا صاحب اقتدار ہیں، جن کے ہاتھوں میں بھی کنٹرول ہوتا ہے، جن کے ہاتھوں میں بھی یہاں قوت ہوتی ہے، وہ تو زندگی کو ذبح کر دیتے ہیں، وہ تو گلا گھونٹ کے رکھ دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں اقتدار اور استبداد تو مراد الفاظ ہیں۔ یہاں کہا کہ اس میں خصوصیت یہ ہوگی کہ کنٹرول اور اقتدار اس کے ہاتھ میں ہوگا، جس کا فریضہ نشوونما دینا ہے۔ معاشرے کو بلا اقتدار نہیں چھوڑا جائے گا کہ اس میں فوضیت اور (Anarchy) (بدنظمی) ہوتی ہے۔ اقتدار ہوگا تو ضروری ہے کہ وہ اقتدار حق پر مبنی ہو: يَوْمَئِذٍ اِلْحَقُ (25:26) لیکن جن کے ہاتھ میں اقتدار ہوگا، ان کی خصوصیت کیا ہوگی؟ کہا کہ ان کی خصوصیت رحمانیت کی ہوگی، عالمگیر انسانیت کی ربوبیت اور نشوونما ان کا فریضہ ہوگا۔

### اس سے بھی ایک قدم آگے یعنی وہ رحیم بھی ہے اور رحمان بھی

قرآن رحمت کے مادے سے یا رحم کے مادے سے رحمت والا رحمن کا لفظ لایا ہے۔ قرآن اس میں تو ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ قرآن کریم نے ربوبیت کے لیے نشوونما کے لیے رب کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور رحیم اور رحمن کے الفاظ بھی آئے ہیں رَحِمَتْ رَبِّكَ (43:32) بھی آیا ہے اور ربوبیت بھی آیا ہے۔ عام مقصد تو دونوں کا ہی نشوونما ہے یعنی نشوونما دینا، پرورش کرنا۔ اسی میں فرق کیا ہے؟ اس کے لیے آپ اس کے بنیادی معنی کی طرف آجائیے، رحم کی طرف آجائیے۔ رحم مادر میں بچے کی جو پرورش ہوتی ہے وہ بچے کے کسی کام کا صلہ یا معاوضہ نہیں ہوتا۔ ماں تو بچے سے معاوضہ نہیں مانگتی۔ میں تو ابھی رحم کی بات کر رہا ہوں۔ بچے کی پیدائش کے بعد بھی یہ جو ماں کی طرف سے پرورش آتی ہے، وہ ہے رحمت۔ حقیقت میں وہ اس کا ایک حصہ ہوتا ہے جو رحم کے اندر وہ جنین کی پرورش کرتی ہے۔

### رحم مادر میں بچے کی پرورش کی نوعیت اور ماں کی قربانی

عزیزانِ من! بڑے غور سے سنتے چلے جائیے۔ اس میں بڑی عجیب عجیب چیزیں سامنے آئیں گی۔ ایک تو پرورش وہ ہے کہ آپ اس کی پرورش کریں لیکن اس کا جداگانہ تشخص، انفرادیت Individuality باقی نہ رہے، آپ اسے ختم کر دیں۔ ایک یہ طریقہ ہوتا ہے۔ خدا کا مقرر کیا ہوا کائنات کا عجیب سلسلہ ہے۔ رحم مادر کے اندر بچہ اپنی الگ انفرادیت رکھ رہا ہے، ماں الگ ہے اور اس کے اندر بچہ الگ ہے، اور دونوں کے دونوں ایک لحاظ سے یکساں بھی ہیں، اور ایک لحاظ سے ان دونوں کو یکساں نہیں کہا جائے گا۔ دونوں کے دونوں ایک بھی ہیں: ماں کو بخار ہوتا ہے اس رحم کے اندر بچے کو بخار ہو جاتا ہے، ماں کمزور ہوتی ہے وہ کمزور ہو جاتا ہے، بچے کو اگر آپ نے کیشیم دینا ہوتا ہے تو ماں کو کیشیم کھاتے ہیں، اس میں خون کی کمی ہوتی ہے تو ماں کو فولا زیادہ دیتے ہیں، ماں میں کمی ہوتی ہے بچے میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ اس کو آپ Oneness (ایک پن) کہیں گے لیکن انفرادیت اور تشخص دونوں کا الگ الگ ہوتا ہے۔ بچے کی انفرادیت کو تکمیل تک پہنچاتے چلے جانا، اپنے خون جگر سے ایک دوسری انفرادیت کو اپنی محنت اور کوشش سے مکمل کرتے چلے جانا جس میں پرورش پانے والے کی اپنی محنت اور کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ ہے رحیمی، یہ ہے رحمانیت۔ صرف پرورش ہی تو کوئی چیز نہیں ہے، پرورش تو غلاموں کی بھی کرتے ہیں، پرورش تو ہم بیلوں کی بھی کرتے ہیں، اپنے گدھے کی بھی کرتے ہیں، قربانی کے لیے جو جانور رکھا ہوتا ہے اس کی بھی پرورش ہم کرتے ہیں، محکوموں کی پرورش کرتے ہیں، مظلوموں کی کرتے ہیں، فرعون بنی اسرائیل کی پرورش بھی کرتا تھا، لیکن اس پرورش میں وہ کرتا کیا تھا؟ یہ کہ یُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ<sup>①</sup> (28:4) کسی کی انفرادیت اور تشخص کو پنپنے نہیں دیتا تھا۔ مستبد پرورش دینے والا جداگانہ تشخص کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ پرورش کرتا ہے چارہ ڈالتا ہے، جداگانہ تشخص کو برداشت نہیں کرتا۔ ذرا سی کسی نے سرفرازی کی، سر کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ یہ صرف ماں کی طرف سے پرورش ہے جس میں انفرادیت اور جداگانہ تشخص ہوتا ہے ورنہ ہر پرورش کرنے والا اس کا معاوضہ اس سے مانگتا ہے۔ جس دن وہ معاوضہ دینے کے قابل نہیں رہتا وہ اُسے ”ذبح“ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ ہندو جو گائے کی پرستش کرتے ہیں جب وہ کم بخت بوڑھی ہو جاتی ہے، سوکھ جاتی ہے، ان کو ہانک کر پاکستان کی طرف بھیج دیتے ہیں، یعنی انسان کے Selfish (خود غرض) ہونے کی تو کیفیت یہ ہے کہ اپنی مائیں جن کی وہ پوجا بھی کرتے ہیں، جب وہ بھی دودھ دینے کے قابل نہیں رہتی ہیں ”تے اوہوں قصائی دے حوالے کر دیندے نیں۔“<sup>②</sup> دنیا میں Selfish (خود غرض) انسان یہی کرتا ہے۔

عزیزانِ من! جب تک کوئی دوسرا انسان اس کے کام کرنے کے قابل رہتا ہے وہ اس کی پرورش کرتا ہے، جس دن وہ اس کے کام کرنے کے قابل نہیں رہتا، اسے ذبح کر کے رکھ دیتا ہے، یہ ماں کی پرورش ہے، عزیزانِ من! کہ بچہ اس کا کوئی کام نہیں کرتا اور رحم کے اندر پرورش کی کیفیت یہ ہے کہ اس کو پتہ نہیں ہوتا، احساس نہیں ہوتا۔ پیدا ہونے کے بعد تو بچے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ماں کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ بچہ ہے، میں اور ہوں۔ اب اس بچے کے لیے کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنا خود دودھ میں تبدیل کر کے، اس

جذبے کے ماتحت اس کے جسم میں انڈیلیٹی چلی جاتی ہے کہ اگر وہ دودھ کم پیتا ہے تو ڈاکٹروں کو حکیموں کو دکھاتی پھرتی ہے کہ یہ کم کیوں پی رہا ہے، میرے جسم کا کم خون کیوں لے رہا ہے۔ سردی کی راتوں میں اگر وہ کہیں بستر پہ پیشاب کرتا ہے تو گیلی اور ٹھنڈی جگہ خود سوتی ہے، اس کو گرم بستر میں لٹاتی ہے۔ یہ اس سے کوئی معاوضہ نہیں لے رہی۔ وہ معاوضہ دینے کے قابل ہی نہیں ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس کے تو بس میں نہیں ہوتا، چٹائے جاتی ہے، اپنے سینے سے لگائے جاتی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ

❶ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اُسے جو ہر مردانگی نظر آتے تھے ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا تھا (پرویز: مفہوم القرآن ص 883)۔

❷ تو اُسے قصاب کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

اگر بس میں ہو تو شاید وہ اپنا سینہ چیر کر اندر رکھ لے۔ یونہی میں نے ایک دفعہ یہ کہا تھا، آپ اسے لطیفے کے طور پہ بھی سمجھ لیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ مائیں ہمیشہ بچے کو بائیں ہاتھ کی طرف رکھتی ہیں تاکہ وہ دل کے ساتھ لگا رہے۔ بلا کسی معاوضے کے، بلا کسی معاوضے کے خیال کے، پرورش کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اس انداز سے بچے کی پرورش ہوتی ہے اور یہ ہے وہ پرورش کا انداز جسے قرآن نے بار بار خدا کی رحمت کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ہے انداز پرورش خدا کا۔ میں نے تو کہا ہے کہ ماں یہ کچھ پلاتی ہے۔ خدا کا دیا ہوا یہ نظام ہے کہ جو اس کے خون کو دودھ میں تبدیل کر دیتا ہے اور وہ اس طرح سے پلاتی ہے۔ اسی لیے خدا نے اس چیز کو اپنی رحمت کہا ہے۔ یہ سامان پرورش صفحہ ارض کے اوپر زمین کے اوپر ایسے بکھرا ہوا ہے۔ ہمارے لیے اس قدر وافر ہے۔ ہماری کون سی کاریگری ہے کہ جس کی بنا پہ ہمارے لیے یہ سارا کچھ پیدا کیا ہے۔ دودن پانی نہ ملے انسان ختم ہو جاتا ہے، کوئی جان باقی نہیں رہتی۔ کس نے پیدا کیا ہے وہ پانی؟ کیا یہ ہماری کاریگری کا نتیجہ ہے؟ یہ ہے وہ جسے وہ رحمت کہتا ہے۔ یہ ہے انداز پرورش۔

### ماں کی طرف سے دودھ کی نہروں کے ساتھ شہد کی نہروں کا بھی مہیا کرنا

عزیزانِ من! کیسے تو ایک اور بات بھی عرض کروں۔ پرورش کی بات میں نے کہی کہ ماں دودھ دیتی ہے۔ جنت میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ دودھ کی نہریں بھی ہیں اور شہد کی نہریں بھی۔ دودھ کی نہریں تو ہم نے دیکھ لیا کہ ماں کے چشمے سے بہتی چلی جاتی ہیں۔ یہ شہد کی نہریں کیا ہیں؟ ماں بھی وہی ماں ہے جو دودھ دینے کے ساتھ ساتھ بچوں کے ساتھ ایک شیرینی بھی بکھیرتی چلی جائے۔ اگر ماں کی اس محبت میں شیرینی نہیں ہے، صرف دودھ ہی دودھ ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بچے کی وہ پرورش نہیں ہوگی۔ ماں کی مسکراہٹ، ماں کی بشارت، ماں کے چہرے کی خوبصورتی، ماں کی محبت اس کا اس طرح لپٹانا، یہ شہد کی نہریں ہیں جو دودھ کی نہروں کے ساتھ بہتی چلی جائیں گی۔ جس ماں میں یہ دونوں چیزیں ہوں گی، آپ دیکھیے گا اس کا بچہ جنتی زندگی کے مطابق پرورش پائے گا۔ یہ کچھ محض دودھ دینے سے نہیں ہو سکے



گا۔ دودھ کے ساتھ ماں شہد کے یہ قطرے بھی ٹپکائے تو یہ کچھ ہوگا۔ آج تو مائیں اپنا دودھ بھی نہیں دیتی ہیں ڈبے کا دیتی ہیں۔ ان کو کیا پتہ کہ شہد کے قطرے کیسے ٹپکائے جاتے ہیں۔ یہ ان بچوں سے پوچھیے جنہوں نے ماں سے دودھ بھی لیا ہے اور یہ شہد بھی لیا پھر ان کی کیا نشوونما ہوئی ہے اور کیا ان کی انفرادیت کس قسم کی بنی ہے! یہ ہے جنت کی پرورش۔

### رحمت کے مفہوم کی بہترین مثال ماں کی آغوش اور باپ کا قاعدہ قانون سکھانا ہے

اب آپ نے دیکھا کہ قرآن ہر مقام کے اوپر رحمت، رحمت، رحمت کیوں کہے چلا جا رہا ہے۔ رحمت کی تو مثال ہی ماں کی آغوش میں ملتی ہے لیکن آج بچہ ذرا بڑا ہو جاتا ہے وہاں پھر باپ آتا ہے: او بیٹا یہ نہ کرنا، تمہیں میں نے کہا تھا کہ ادھر نہ جانا، یہ کرو وہ کرو۔ اب یہاں کنٹرول شروع ہوتا ہے، اقتدار شروع ہوتا ہے۔ وہ محبت دیئے جاتی ہے، یہ اس کو قاعدہ قانون سکھاتا ہے، یہ اس پر ایک کنٹرول رکھتا ہے۔

### بچے کی صحیح پرورش رحمت اور الملک کے امتزاج کی رہن منت ہوتی ہے

یہ ماں اور باپ دونوں کے توازن سے، تعامل سے، تعاون سے، گھر کے اندر جو پرورش ہوتی ہے، وہ رحمت اور الملک کا امتزاج ہوتا ہے۔ اگر بچے کو صرف وہ رحمت ہی رحمت ملتی جائے اور یہ بات ساتھ نہ ہو تو نشوونما ناممکن رہ جاتی ہے۔ وہ بچہ جسے انگریزی میں Mother Style (ماں کی طرز کا) کہتے ہیں وہ ”ماں دالا ڈالا“<sup>1</sup> تو بن جاتا ہے۔ یہ ماں دالا ڈالا (Mother child)<sup>1</sup> کیا ہوتا ہے؟ اپنی Protection (حفاظت) کے لیے دوسروں کا محتاج۔ خو Protection (حفاظت) تو اس سے ہوتی ہے۔ یہ جو باپ ساتھ کر رہا ہوتا ہے اس کو چلنے کے لیے چھوڑتا ہے، خطرہ آتا ہے تو وہاں روکتا ہے۔ یہ جو کنٹرول ہے اگر وہ رحمت ساتھ نہ ہو، خالص کنٹرول ہی کنٹرول ساتھ ہو، تو آپ کے ہاں فرعون کی ربوبیت تو آجائے گی، خدا کی نہیں آئے گی۔ ایک مغرب کے فلاسفر نے یہ کہا تھا کہ تم مجھے بتا دو کہ فلاں قوم نے اس قسم کا خدا اپنے لیے تجویز کیا ہوا تھا، میں اس قوم کی پوری معاشرت، نفسیات، سیاست، یہ سب کچھ تمہیں بتا دوں گا۔ وہ بڑی عجیب بات کہہ گیا ہے۔ فرد کی بات نہیں، جو قوم صرف Mother child (ماں کا لاڈلا) بن کے رہ جاتی ہے وہ اپنی حفاظت (Protection) کے لیے نشوونما کے لیے دوسروں کی محتاج بن جاتی ہے یعنی خود کچھ کر کے نہ دینا، دوسروں کی محتاج ہونا۔ جو قوم اس طرح سے پروان چڑھتی ہے، وہ ہمیشہ محکوم رہتی ہے، وہ اپنی حفاظت کے لیے دوسروں کی دست نگر ہوتی ہے، وہ خدا کو بھی ماں کے قالب میں ڈھالتی ہے۔ ہندوؤں کو دیکھیے۔ ماتا ان کے ہاں دھرتی بھی ہے، گائے بھی ماتا ہے، گنی بھی ماتا ہے۔ یہ ان کے ہاں مائیں ہیں۔ انہوں نے Mother land (دھرتی ماتا) کا تصور دیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی مادر وطن کہنے لگ گئے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ کیا بول رہے ہیں۔ ان کے ہاں صرف ماں کا تصور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزار ہا سال سے وہ قوم محکوم چلی آرہی ہے۔ ”جیہڑا جونی والا اونے اینا

نوں اگے لگالیا۔<sup>②</sup> ان میں Self confidence (خود اعتمادی) اور Self reliance (خود انحصاری) پیدا ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے سیکھا ہی یہ ہوتا ہے کہ گائے کا دودھ دوہتے چلے جائیں، سینگ دوسرے کے ہاتھ میں ہوں۔ وہ قوم ہمیشہ نفسیاتی طور پہ محکوم ہوتی ہے، اس کی نفسیات محتاجی کی ہوتی ہے، Self-confidence (خود اعتماد) کی نہیں ہوتی۔ جس قوم نے خالص باپ کی ہی آغوش میں پرورش پائی ہو، ماں کی محبت اور شیرینی نہ ملی ہو، اس قوم میں رحم کا جذبہ نہیں ہوتا۔ جس میں کنٹرول استبداد کا ڈنڈا ہو، وہ یہودیت

① ماں کا پیارا

② جو طاقتور تھا اس نے انہیں اپنا محکوم بنالیا۔

کی قوم ہوتی ہے۔ یہودیوں کے دل میں رحم کا جذبہ ہی نہیں ہے۔ یونہی ان کو شکسپیئر (1564-1616 AD) نے نہیں کہہ دیا تھا کہ کم بخت اپنے ایک پونڈ گوشت کے لیے دوسرے کی جان لے لیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ یہودیوں کے ہاں خدا کا جو تصور ہے وہ باپ کا تصور ہے۔ یہ قرآن تھا جو آیا اور اس نے ماں اور باپ (Father) دونوں کو ملا کے یہ امتزاج کر دیا۔ اَلْمَلِكُ يَوْمَئِذٍ لِّحَقِّ لِلرَّحْمٰنِ (25:26) وہ خدا جس کے اقتدار میں ماں کی سی محبت بھی سموی ہوئی ہے، وہ جو کائنات کی ہر شے کو نشوونما دیتا ہوا، تکمیل کیے جا رہا ہے۔

### انسانی دنیا میں صفات خداوندی کے ظہور کی اہمیت اور اس کی لم

یہ خدا اپنی صفات ہی نہیں بتاتا بلکہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ جو خدا کے نام پر یہاں کوئی نظام قائم کرے گا، اس میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے۔ وہ نظام اس لحاظ سے ظل اللہ علی الارض ہوتا ہے، بادشاہ نہیں ہوتا۔ اس نظام کے اندر خدا کی صفات کا عکس ہونا چاہیے جو خدا کے نام پہ قائم کیا جائے۔ عزیزانِ من! نظام خداوندی تو خیر نہیں، نظام مصطفیٰ ﷺ تو آپ نے سنا ہے۔ کبھی سنا کہ وہ ہوتا کیا ہے؟ وہ یہ ہوتا ہے کہ جس میں خدا کی صفت ملکیت، خدا کی صفت رحمانیت ہو۔ اس نظام میں ان دونوں کا امتزاج ہوگا کہ وہ اقتدار جو ان کا ہوگا وہ خداوندی Values (اقدار) کو نافذ کرنے کے لیے ہوگا، جس سے ہر فرد کی ذاتی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی، اس انداز سے کہ ماں کی سی محبت کے ساتھ چیز آئے گی، بلا صلہ کے وہ وہ نظام یہ چیز دے گا لیکن قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہر فرد مملکت کی ضروریات زندگی کا بلا محنت و مشقت پورا کرنا، ان کا فریضہ ہوگا۔ ان کا فریضہ ہوگا کہ جو کام ان کے ذمے لگایا گیا ہے، باپ کی طرف سے اس کام کو یہ سرانجام دیں، وہ پرورش اس کام کے معاوضے میں نہیں ہوگی وہ پرورش بجائے خویش اس نظام کی ذمہ داری ہوگی جیسی ماں کی محبت کی ہوتی ہے۔ یہ جو کام کریں گے اس لیے نہیں کہ اس کے معاوضے میں ان کو روٹی ملے گی، بلکہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ وہ تو ملے گی ماں کی طرح سے، رحمانیت کی طرح سے، ہر ایک کو

ملے گی، محبت کے ساتھ ملے گی، دودھ اور شہد کی ملاوٹ سے ملے گی اور یہ جو کچھ کرے گا وہ کسی کے ڈنڈے کی وجہ سے نہیں کرے گا۔

### قرآن حکیم انسان کو ڈیوٹی کا نہیں بلکہ تصور دیتا ہے

پھر وہ بات اور سامنے آگئی۔ ایک چیز ڈیوٹی ہوتی ہے۔ وہ تو فریضہ ہوتا ہے جو اوپر سے کسی پر Impose (عائد) کیا جاتا ہے۔ یہ کرنا ہوتا ہے۔ ایک چیز Responsibility<sup>1</sup> ہوتی ہے۔ یہ لفظ انگریزی جاننے والے جانتے ہوں گے کہ Response سے ہے۔ یہ Response کرنا، خود کسی کام کے متعلق لیک کہنا ہے۔ یہ جو قرآن نے ہمیں لیک سکھایا ہے، یہ Response کرنے کی بات ہے

❶ بقول اسٹیفن آرکوے (Stephen R. Covey) یہ Responsibility کا لفظ Response-ability سے ماخوذ ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کہ کوئی کرنے کا کام جو سامنے ہو آگے بڑھ کر خود اس کے لیے لیک کہو کہ ہم اس کام کو ڈیوٹی کے طور پر کریں گے۔ کسی کام کو کرنا اور لیک کہہ کر کسی کام کو کرنا، ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ قرآن اپنے اس نظام میں کہہ رہا ہے کہ افراد کی پرورش اور ان کی انسانیت کی نشوونما تو یوں ہوگی جیسے ماں بچے کی پرورش اور نشوونما، بغیر معاوضے کے تصور کے، محبت کے ساتھ، شیرینی کے ساتھ کرتی ہے اور افراد جو کام کریں گے وہ اس کو بیگاڑیوٹی سمجھ کے نہیں کریں گے بلکہ وہ ان کے قلب کا تقاضا ہوگا کہ یہ کام ہم نے کرنا ہے۔ یہ اس تقاضے کی طرح کر جائیں گے کہ یہ کچھ کرنا ہے اور جب یہ کچھ کریں گے تو اس کے لیے صلہ کیا ہوگا؟ وہ جو ماں کو بچے سے صلہ ملا کرتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ ماں کو ایک صلہ ملا کرتا ہے۔ وہ بچے کا ہلکا سا تبسم اور مسکراہٹ۔ یہ ماں کی ساری قربانیوں کا صلہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! یقین مانے، مجھے پتہ نہیں کہ کسی اور نگاہ میں یہ بات ہے یا نہیں، بچے کی مسکراہٹ سے حسین شے دنیا میں کوئی نہیں اور اگر سوتے میں بچہ مسکرائے، میری بہنیں اور بیٹیاں ہیں بتاؤ کہ اس سے بھی حسین تر چیز دنیا میں کوئی ہوتی ہے! ماں کی طرف سے شیرینی، بچے کی طرف سے مسکراہٹ، باپ کی طرف سے اس لیے کٹرول کہ کہیں خطرے میں نہ پڑ جائے، یہ اس کے اوپر لیک کہہ رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ تھانیدار کا ڈنڈا ہے بلکہ یہ اس حفاظت کو لینا، اس کے اندر کی آواز ہو جاتی ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! اس نظام کی خصوصیت جس کے اندر قرآن نے کہا ہے کہ اس میں ملائکہ کا نزول ہوا کرتا ہے۔ یہ ہے الْمَلٰٓئِکُ یُوْمِئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ (25:26) جس طرح خارجی کائنات اس کے قوانین کے تابع چل رہی ہے، اسی طرح اس دنیا میں بھی اُسی کا قانون نافذ ہوگا۔ وَ کَانَ یَوْمًا عَلٰی الْکٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا (25:26) اور جنہوں نے اس قسم کے نظام کی مخالفت کی ہوگی، آپ سوچ لیجئے کہ ان کے اوپر وہ دور پھر کس قدر عسرت کا دور ہوگا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الفرقان کی آیت 26 پہ آگئے، 27 سے ہم آئندہ لیں گے۔

اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

Look at the word "responsibility" ..... "response-ability" ..... the ability to choose your response. Highly proactive people recognize that responsibility. They do not blame circumstances, conditions, or conditioning for their behavior. Their behavior is a product of their own conscious choice, based on values, rather than a product of their conditions, based on feelings, (p.71). It is much easier to blame other people, the conditioning or conditions for our own stagnant situation. But we are responsible ..... "response-able" ..... to control our lives and to powerfully influence our circumstances by working on be, on what we are, (p.89). Knowing that we are responsible ..... "response-able" ..... is fundamental to effectiveness and to every other habit of effectiveness (p.93) (Covey, Stephen R. (1994). The Seven Habits of Highly Effective People. London: Simon of Schuster.)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

## ساتواں باب: سورة الفرقان (آیات 27 تا 31)



عزیزانِ من! آج جنوری 1978ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 27 سے ہو رہا ہے: (25:27)۔ آج سب سے پہلے تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس قسم کے نامساعد موسم کے باوجود آپ احباب تشریف لے آئے ہیں۔ ذوقِ قرآنی کی عقیدت کا یہ ایک مظاہرہ ہے جس سے واقعی مجھے خوشی ہوتی ہے۔

### قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظام کی بنیادی خصوصیت صرف دو لفظوں میں

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں وہ نظام وہ معاشرہ وہ الدین جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اور جسے عملاً نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ کے ساتھیوں یعنی والذین معہ ﷻ نے دنیا میں قائم کر کے دکھا دیا، زیر بحث رہا۔ اس کی خصوصیت کبریاٰ وہ تھی جو قرآن میں دو لفظوں میں بیان کر دی گئی: اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمَنِ (25:26) اس دور میں اس نظام میں اقتدار اور کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو افراد معاشرہ کی پرورش ایسے کریں گے جیسے ماں اپنے بچوں کی کرتی ہے۔ یہاں وہ کنٹرول کا لفظ خاص طور پر اس دور میں قابلِ فہم ہے خواہ یہ رزق کے سرچشموں کے اوپر ہو بلکہ اب تو انسانوں کے قلب و دماغ پہ بھی کنٹرول ہوتا ہے۔ تو یہاں ملک کے لفظ میں یہ سب چیزیں آ جاتی ہیں۔ کہا کہ یہ نظام وہ ہوگا جس میں اقتدار کنٹرول اور وہاں کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو افراد معاشرہ کی پرورش ایسے کریں گے جیسے ماں اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے۔ یہاں چار الفاظ ہیں، عزیزانِ من! غور کیجیے اس سے جامع مفہوم کچھ اور بھی ہو سکتا ہے! وہ نظام جو خدا کی طرف سے ملتا ہے جو قرآنی اقدار اور حدود کے تابع متشکل ہوتا ہے اس کے لیے یہ کہنا کہ اس میں حق پر مبنی کنٹرول ہو، Truth (صدقت) پر مبنی کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا کی صفتِ رحمانیت کو مشہود کرنے کے لیے اس نظام کو قائم کریں۔ اور صفتِ رحمانیت یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی پرورش اور نشوونما کی ذمہ داری لیں گے۔ اس میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ ہر ذی حیات اور ہر ذی نفس شامل ہے۔ انہوں نے تو انسانوں سے بھی آگے یہ اعلان فرمایا تھا، اس میں حضرت عمر ♦ (581-644/45) کا وہ اعلان آپ کو یاد ہوگا جس میں کہا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ

سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ آپؐ سے کہا گیا کہ آپؐ نے انسانوں سے آگے بڑھ کر حیوانات تک کو بھی اپنے احاطے کے اندر لے لیا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن میں دابة فی الارض ہے رزق کی ذمہ داری کے لیے تو دابة کا لفظ ہے۔ وہ صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے ہر ذی حیات کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے اس لیے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس حدود مملکت کے اندر ہر ذی حیات اور ہر ذی تنفس کہ جس کو اپنی پرورش اور نشوونما کے لیے ان ذرائع کی ضرورت ہے وہ ہماری ذمہ داری کے اندر آ جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ کہا ہے کہ انسان ہی نہیں بلکہ اگر کوئی کتا بھی، اور یہ کچھ آپؐ مدینے میں بیٹھے ہوئے دجلہ کے متعلق فرما رہے ہیں جو اس دور میں اپنی مملکت کی آخری حد تھی، بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

### ہمارے ہاں نظام ربوبیت کے خدو خال کی نوعیت

یہ ہے وہ چیز جسے قرآن کریم نے الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمَنِ (25:26) کہا ہے اور یہ ہیں اس کے معنی، ورنہ ہمارے نزدیک جیسا میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا ان سب چیزوں کو تو قیامت پر اٹھا کے رکھ دیا جاتا ہے اور پھر وہاں کہا یہ جاتا ہے کہ بس اس دن یہ سب کچھ خدا کے کنٹرول میں ہوگا، گویا اب یہاں کائنات میں خدا کے کنٹرول میں کچھ نہیں ہے، وہ کائنات تو اس نے ابلیس کے کنٹرول میں چھوڑ رکھی ہے اور آپ انتظار کر رہا ہے کہ جب لوگ یہاں آئیں گے تو پھر وہاں انتظام ایسا ہوگا کہ وہاں یہ کنٹرول اور اقتدار اس کا ہوگا، یہاں کوئی رحمن وغیرہ کا اقتدار نہیں ہے۔ آپ پڑھتے رہیں بسم اللہ الرحمن الرحیم، وہ کہتا ہے ٹھیک ہے خدا کی یہ صفات برحق ہیں لیکن یہ وہاں جا کے ملے گا ”اوتھے جا کے ملے گا تہانوں“<sup>1</sup>۔ وہ مسجد کے محراب و منبر کے متولی ہوں یا خانقاہ والے، ان سب کے رزق کی

<sup>1</sup> وہاں جا کر آپ کو ملے گا۔

ذمہ داری آپ پر ہے اور آپ کے رزق کی ذمہ داری خدا پر اور خدا کا وعدہ پورا ہوگا قیامت میں جا کے۔ یہ یہاں کی بات ہو رہی ہے، یہ اس نظام کی بات ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ کے ہاتھوں یہاں متشکل ہوا ہے۔ اور جس کا متشکل کرنا اس امت کا فریضہ تھا، بلکہ یوں کہیے کہ امت کا فریضہ نہیں، وہ تو يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ (83:6) کہتا ہے۔

### انسانوں کا اختیار کردہ نظام ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہے گا

قرآن کہتا ہے کہ وہ خصوصیت کسی خاص امت کی نہیں، جو امت بھی قرآن کو اپنا گائیڈ بنالے گی، اپنا راہنما بنالے گی، اس کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس قسم کا نظام قائم کرے کہ جس میں یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو کہ وہ خدا کی صفت رحمانیت کو پورا کرنے والے ہوں۔ اور جس دن یہ نظام قائم ہوا اس نے کہا ہے کہ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (39:69) یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور

سے جگمگا اٹھے گی، عزیزانِ من! اور یہ ہو کر رہے گا کیونکہ وَعَدَ اللّٰهُ حَقًّا (10:55) یہ خدا کے وعدے ہیں، یہ اس کا قانون ہے، ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ پورا نہ ہو۔ یہ ہوگا نقشہ عزیزانِ من! آج کی اصطلاح جو انہوں نے استعمال کی، پوچھتے ہیں کہ نظامِ مصطفیٰ ﷺ میں صاحب! کیا ہوگا، کیسا ہوگا، کیا صورت ہوگی؟ ان کے نزدیک تو یہ ہے کہ بس وہ جو چار سزائیں دیدیجئے، نظام پورا ہو گیا۔ نظام کا نقشہ، نظام کا تصور اس کی تفصیل، قرآن نے دو لفظوں میں بیان کر دی کہ الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمَنِ (25:26) مگر یہ آیت ابھی آدھی ہے، پچھلے درس میں ہم یہیں تک آئے تھے۔

### قرآن حکیم کی اصطلاح میں کافر کا مفہوم کسی چیز کو چھپا کر رکھنا ہے

اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا (25:26)۔ اور وہ دور، اب پہلے اس لفظ کا ترجمہ یہی لے لیجئے تو انہوں نے کہا کہ کافروں کے لیے وہ دور بڑا ہی سخت ہوگا صاحب! اور کافر کہا: بس مسلمانوں کے سوا یہ ہندو ہوئے، یہ مشرک ہوئے، یہ عیسائی ہوئے، یہ یہودی ہوئے، وہ سب کافر ہیں، بس ان کے اوپر وہ دور بڑا سخت ہوگا۔ کافر کا تو یہ ترجمہ نہیں ہے، یہ تو ہماری اصطلاحیں ہیں۔ قرآن کی اصطلاح تو یہ ہے کہ جو کوئی بھی قرآن کے اس نظام سے انکار کرے گا، سرکشی برتے گا، وہ کافر ہے۔ وہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا یا ہندو کے گھر میں پیدا ہوا، سوال تو یہ ہے ہی نہیں کہ تم شوروں کے ہاں پیدا ہوئے ہو یا برہمن کے پیدا ہوئے ہو۔ کسی کے ہاں پیدا ہونا، کسی قوم کے اندر پیدائش کی رو سے داخل ہو جانا، یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ جو بھی اس نظام سے انکار کرتے ہیں، جو بھی اس سے سرکشی برتتے ہیں، وہ کافر ہیں۔ اگر اس کے بنیادی معنی میں آجائے تو وہ تو بڑی عجیب چیز ہے۔ کفر کے معنی ہیں کسی چیز کو چھپا کر رکھنا، ڈھانپ کر رکھنا، ظاہر نہ ہونے دینا۔ غور فرمایا آپ نے کہ کتنی دور جاتا ہے قرآن۔ اب لیجئے کہ یہ Definition یا اصطلاح جو ہے اس کا عملی مفہوم کتنا وسیع ہو جاتا ہے۔ جو بھی اس نظام کی مخالفت کرنے والے ہیں، سرکشی برتنے والے ہیں، انہوں نے اسے دبا کر رکھا، ڈھانپ کر رکھا کہ ہونہ جائے آشکارا شرع پیغمبر گھیں، یہ جو وہ اقبال کہتا ہے کہ ابلیس کا پورا پروگرام یہ ہے وہ اپنے مشیروں سے اپنے کیبنٹ کے منسٹروں سے کہتا یہ ہے کہ ایک ہی کام کرنے کا ہے: ہونہ جائے آشکارا شرع پیغمبر گھیں، بس، باقی سب ای خیراں ہیگی آں،<sup>۱۰</sup> بس یہ نہ ہونے دینا۔ یہ ہے آشکارا نہ ہو جائے، کفر۔ ان کے لیے یہ لفظ تو عسیر ہے۔

### کسی گتھی کے نہ سلجھنے پر چڑچڑاپن کا پیدا ہونا عسرت کہلاتا ہے

میں نے کہا ہے کہ قرآن کے الفاظ سے تو ایسے ہی آگے نہیں گزر جانا چاہیے۔ یہ واقعی ٹھیک ہے کہ یُسْر کے مقابلے میں عُسْر آتا ہے یعنی آسانی کے مقابلے میں تنگی۔ عسرت کو مشقت سختی کہتے ہیں لیکن اس کے بنیادی معنی تو بڑے گہرے ہیں اور بات سمجھ میں پھر آتی

ہے۔ عسرت ہوتی ہے کہ ”ڈور کی گتھی میں اس قسم کی الجھنیں پیدا ہو جانا کہ وہ سلجھ نہ سکیں اور سلجھ نہ سکنے سے یا سلجھانہ سکنے سے انسان کو جو پریشانی تفکر اور چڑچڑاپن پیدا ہوتا ہے وہ ہوتی عسرت ہے۔ Blind Situation میں آ جانا کہ کوئی راستہ نظر نہ آئے، کوئی شکل، کوئی صورت بھائی نہ دے جسے ہم کہتے ہیں کہ اتنی الجھنیں پیدا ہو جائیں کہ پتہ نہ چلے کہ یہ سلجھیں گی کس طرح سے“۔ دیکھ رہے ہیں آپ اپنے معاشرہ کو کہ کیا ہو رہا ہے، یہی جہنم نہیں ہے جسے وہ کہہ رہا ہے۔ یعنی وہ گتھیاں اس قسم کی پیدا ہو جاتی ہیں کہ پھر وہ سلجھائی نہیں جاتیں، اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں: بسا یدہم قرآن کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں تم نے ”پہلے تے گنجلاں پادیتیاں نے ایس ڈورنوں“<sup>①</sup> تو آپ دیکھتے ہیں کہ یہ بسنت آرہی ہے۔ اس میں یہ بچے کس مصیبت میں ہوتے ہیں، وہ جو ڈور میں ”گنجلاں ہوندیاں نیں“ وہ ان کو سلجھانیں سکتے۔ عجب کیفیت ہوتی ہے۔ آج ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ خود پیدا کردہ گتھیاں اس طرح سے ہم نے سخت کر رکھی ہیں کہ وہ سلجھانے کی لاکھ کوشش کیجیے سلجھ نہیں رہیں۔

آخر کار انسان کو وہ قرآنی نظام جو اس نے ڈھانپ رکھا ہے ظاہر کرنا ہوگا

یہ ہے وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا (25:36) سلجھیں گی تو اس صورت میں کہ اس نظام کو جو تم نے ڈھانپ کر چھپا کر رکھا ہوا ہے اس کو آشکارا کیجیے ساری گتھیاں سلجھ جائیں گی صاحب! گتھیاں تو روشنی میں سلجھا کرتی ہیں، تاریکیوں میں تو نہیں سلجھا کرتیں۔ روشنی تو ایک ہی ہے وہ خدا کی کتاب کی روشنی کو تم لوگوں نے دبا رکھا ہے اور گتھیاں سلجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہی تو ظلم ہے جس کا نتیجہ یہ جہنم ہے۔ سنیے جہنم کی کیفیت۔ کہا کہ وَيَوْمَ يَعْضُ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ يَلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا (25:27)۔

① باقی ہر طرف بھلائی ہی بھلائی ہے۔ رحمت ہی رحمت ہے۔

② اس ڈور میں پہلے سے جھلکیں پیدا کر دیں۔

یہاں وہی ظالم کا لفظ آیا ہے، میں نے اس دن یہ کہا تھا کہ ظالم کے معنی یہی نہیں کہ جو ہم اپنے ذہن میں جس کو ظالم کہتے ہیں یا جنہوں نے ان کو یہ کچھ بنادیا تھا وہ سارے ہی ظالم ہوتے ہیں۔ ظالم کے معنی وہ شخص ہیں کہ جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے، جس مقام پہ کسی کو ہونا چاہیے وہاں نہ اس کو رکھا جائے خواہ نیچے لے آیا جائے خواہ اوپر پہنچا دیا جائے۔ ظالم اس دن اپنی انگلیاں کاٹیں گے اور یہ کہیں گے کہ اے کاش! میں بھی اس کارواں میں شریک ہوتا کہ جس کارواں کے سالار یہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، میں بھی ان کی معیت میں اگر ہوتا تو آج یہ کیفیت تو نہ ہوتی۔ يَوَيْلَنِي لَيْتَنِي لَمْ اتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا (26:28) اے کاش! میں فلاں پارٹی میں شریک نہ ہوا ہوتا، میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس دن یہ بات وہ کہے گا کہ میں اس کارواں میں شریک نہ ہوتا، فلاں کو میں نے اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اب دیکھیے آگئی یہ جو بات ہے کہ لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي (25:29)۔ یہ بات تو واضح طور پہ ہمارے سامنے



آپکی ہوئی ہے، ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے لیکن اس کے آجانے کے باوجود یہ میری پارٹی کے لوگوں نے، میرے ان دوستوں نے جنہیں میں نے خود دوست بنایا تھا، انہوں نے مجھے غلط راستے کے اوپر ڈال دیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ صحیح راستہ واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں آچکا تھا۔

**قرآن حکیم کے ہوتے ہوئے اس قندیل آسمانی کی روشنی سے کون انکار کرے گا؟**

قرآن آنے کے بعد تو عزیزانِ من! کوئی بھی یہ کہہ نہیں سکتا کہ صحیح راستہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اور کم از کم یہ قوم جو مدعی ہے آج بھی گئے گزرے زمانے میں ہر گھر کے اندر تو قرآن کا نسخہ موجود ہوتا ہے اگرچہ تقدس کے اعتبار سے اسے ایسی اونچی جگہ رکھا جاتا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہو، اس کو اس طرح لپیٹا جاتا ہے کہ وہ کوشش کے بغیر کھلے ہی نہ پائے۔ ہے تو ہر گھر کے اندر رکھا ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ پھر اس کے آجانے کے بعد وہ کونسی بات تھی جس نے انسان کو بہکا یا اور دوسرے راستے پہ لے گیا؟

**شیطان کے متعلق غلط تصور کا نتیجہ**

ابھی بات آتی ہے اور میرے خیال میں وہ بات قرآن کا بنیادی عمود ہے، عظیم ترین چیز ہے بلکہ ایک اعلان ہے۔ وہ بات آگے آئے گی۔ یہاں ایک بڑا عمدہ نکتہ آیا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ اے کاش! میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا، فلاں کے ساتھ شریک نہ ہوا ہوتا۔ تو اپنے کسی دوست کی بات کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ **وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا** (25:29) بات اصل میں یہ ہے کہ شیطان ہے جو یہ کچھ کرتا ہے۔ اور ہم نے تو سمجھ رکھا ہے کہ وہ شیطان کہیں یوں باہر ہے اور وہ سب کچھ کرتا رہتا ہے۔ تصور دیکھیے اپنے ذہن میں اس شیطان کا۔ کام تو اس کے ذمے یہی لگا رکھا ہے کہ وہ گمراہ کرتا رہتا ہے لیکن ذرا اس کا تصور اس کی پاورز، اس کی صلاحیتیں، اس کی قوتیں، دیکھیے کہ وہ دنیا میں ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ یا اللہ! اب کبھی غور بھی کیا ہے، غور کیا ہوتا تو ہماری یہ حالت کیوں ہوتی، یہ غور کرنے کے دیئے ہی تو بجھائے جاتے ہیں جس سے یہ سب کچھ منوایا جاتا ہے۔ شیطان کا یہ تصور ہی غیر قرآنی ہے۔

**ہمارے ہاں شیطان کا موجودہ تصور مجوسی یا پارسی مذہب کا پیدا کردہ ہے**

شیطان شیطان صبح سے شام تک ہوتا چلا آتا ہے۔ کبھی سوچا بھی ہے کہ اس کو ہم کن صفات سے متصف کرتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں دنیا میں ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ ہر انسان کو جو گمراہ کرتا ہے وہ ساری دنیا میں ہر انسان کے ساتھ ہے۔ یہ تو (معاذ اللہ) خدا کی صفت ہے: **هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ** (57:4) جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ ارے یہ پوزیشن دے رہے ہیں ہم خدا کے خلاف جو علی الرغم اس کا دشمن ہے جسے ہم کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ تصور کہاں سے آیا؟ یہ جنہیں مجوس کہتے تھے اب ہمارے ہاں تو پارسی کہتے ہیں، یہ ایران کا مجوسی مذہب تھا، جس کا بانی زرتشت تھا، نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں بڑے عروج پہ تھا۔ ایران کی مجوسیت آپ نے

سنی ہوگی، سنی کیا ہے اگر آنکھیں کھلی ہوں تو معلوم ہو کہ یہ سارا جتنا بھی ہم آج مذہب لیے پھرتے ہیں مجوسیت ہے ایران کی۔ اس مجوسیت میں Dualism (ثنویت) کا یہ تصور دیا گیا تھا کہ دو خدا ہیں: ایک نیکی کا، ایک بدی کا، ایک روشنی کا ایک تاریکی کا، ایک اہرمن ایک یزدان، دونوں کو برابر کی مساوی قوتیں دی گئی تھیں، دونوں ایک اکھاڑے میں پہلوانوں کی طرح کھڑے کیے ہوئے تھے، دونوں میں برابر کی کشتی ہوتی تھی۔ اور یہ ان دونوں کی کشمکش تھی کہ ہر دور میں ہر جگہ ہر ثانیہ ہر لمحہ میں قیامت تک جاری رہے گی۔ تو خدا کے مقابلے میں ایک دوسرا خدا کھڑا کیا ہوا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ جو اہرمن تھا ہمارے ہاں وہ شیطان کے تصور میں ذہن میں آیا اور وہ ساری خصوصیات یا صفات جو انہوں نے اہرمن کو دے رکھی تھیں خدا کے مقابلے میں دوسرا خدا وہ ہم نے شیطان کو پہنا رکھی ہوئی ہیں۔ پہلی صفت یہ کہ ساری دنیا میں موجود ہر وقت ہر شخص کے ساتھ، یہ تو خدا کی صفت ہے۔ اتنی بڑی قوت کہ انسان اس کے سامنے بالکل عاجز، کچھ نہیں کر سکتا، قیامت تک کے لیے موجود، مر بھی نہیں سکتا۔ دیکھتے ہیں یہ وہی تصور ہے یا نہیں مجوسیت کا!

عزیزانِ من! پھر ایک بات اور بتا دوں کہ قرآن یا دین یا اسلام اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک پہلے یہ جو باقی غلط مذاہب اور ان کے تصورات ہیں، آپ ان کا مطالعہ نہیں کرتے۔ یہ وہی ہے جسے تقابلی مطالعہ کہتے ہیں۔ جب تک آپ کو یہ معلوم نہیں کہ پہلے کیا عقائد چلے آ رہے تھے، قرآن کے عقائد نکھر کر آپ کے سامنے نہیں آتے۔ یہ تو ان میں سے ایک ایک چیز کی تردید کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک ثانیہ میں اسے Refuse (انکار) کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ اپنا مثبت محسوس (Concrete, Positive) عقیدہ رکھ دیتا ہے۔ اس سے پہلے یہ سمجھ میں آنا چاہیے کہ وہ بات کیا ہے جس کی وہ تردید کرتا ہے۔

### شیطان کے متعلق ہمارے ہاں پائے جانے والے تصور کی حقیقت

میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں شیطان کا یہ تصور ہے کہ اسے ہر انسان کے ساتھ موجود کہا ہوا ہے مگر اصل یہ ہے کہ وہ کہیں باہر نہیں کھڑا ہوتا بلکہ وہ تو ہر انسان کے اندر ہوتا ہے اور ہر انسان کا اپنا اپنا شیطان ہوتا ہے، وہ تو خود ہی شیطان ہوتا ہے۔ جب بھی انسانی جذبات سرکش ہو کر ہدایتِ خداوندی پہ غالب آجائیں، یہ شیطنت کہلاتی ہے۔ یہ انسان کا اپنا فعل ہے، یہ فعل خارج سے کوئی نہیں کرتا، خارج میں کوئی ایسا وجود نہیں ہے جس کو ہم نے اس صفت الوہیت سے نوازا رکھا ہے کہ دنیا میں ہر شخص کے ساتھ اور ہر جگہ موجود ہے (معاذ اللہ)۔ یہ ہر شخص کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اصل یوں ہے کہ انسان کے اندر خدا نے قوتیں دی ہیں، کچھ صلاحیتیں دی ہیں۔ یہ ان صلاحیتوں کا استعمال ہے۔ یہ جو ہدایت ہے اسے آپ ملائکہ کی صفت کہتے ہیں اور جو گمراہی ہے اُسے آپ شیطان کی صفت کہتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ کہہ لیجئے کہ ان صلاحیتوں کو انسان استعمال کس طرح سے کرتا ہے؟ اگر انسان انہیں مفاد پرستیوں کے راستے میں استعمال کرتا ہے، خواہ وہ

مفاد پرستیاں اس کی اپنی ذات کی ہوں یا اپنی پارٹی کی ہوں، مگر ہوں انسانیت کے مقابلے میں، تو جب وہ انہیں اس طرح استعمال کرتا ہے تو یہ بھی شیطن ہے۔ یعنی اس میں وہ اپنے جذبات کی تسکین اس طرح چاہتا ہے کہ وہ صلاحیتیں خدا کی حدود کو تجاوز کر کے پھاند کے استعمال کی جائیں۔ یہ جو انسان اپنی صلاحیت کو غلط انداز سے استعمال کرتا ہے یہ ہے شیطن۔ کبھی تو یہ اپنے اندر کا تقاضا ہوتا ہے، کبھی کسی ساتھی کا تقاضا ہے جو ورغلا دیتا ہے اور عام طور پر بڑے پیمانے کے اوپر جو دنیا میں اس قسم کی سرکشیاں، مفاد پرستیاں، گمراہیاں پھیلتی ہیں وہ ہوتی ہیں۔ یہ ہمیشہ ایک پارٹی کے اندر ہوتا ہے، گروہ کے اندر ہوتا ہے۔ ڈاکو بھی ایک گروہ رکھتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں کے جو ٹھگ تھے وہ ایک الگ کمیونٹی تھی۔ یہ اس دور میں بھی ہے جسے آپ پارٹی سسٹم کہتے ہیں۔ وہ پارٹی کے اندر ہوتا ہے۔ یہ ہے جنہیں کہا ہے کہ تم فلاں کو اپنا حلیف یا دوست نہ بناؤ۔ یہ ہے وہ شیطان، یعنی انسان کا اپنی صلاحیتوں کو غلط طریقے پر استعمال کرنا۔ یہ شیطن ہے اور ان انسانی صلاحیتوں کو حدود خداوندی کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرنا، یہ اسلام ہے۔

### ابلیس یا شیطان کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی ایک خوب صورت حدیث

نبی اکرم ﷺ کا وہ ارشاد گرامی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ وہ ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی صحیح حدیث ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کا ایک ایک ابلیس ہوتا ہے۔ جب آپ ﷺ نے کہا کہ ہر شخص کا ابلیس ہوتا ہے تو صحابہ ﷺ نے پوچھا کہ آپ ﷺ کا بھی ابلیس ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں، میرا بھی ابلیس ہے۔ صحابہ کرام کہنے لگے: جی، پھر آپ ﷺ نے کیا کیا؟ کہنے لگے کہ میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان بنالیا ہے۔ اس سے بہتر اس کی کوئی اور تفسیر نہیں سکتی، عزیزانِ من! میں کہہ رہا تھا کہ سنیے قرآن کیا کہتا ہے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ اے کاش! میں فلاں کو اپنا دوست نہ بناتا اور میری یہ کیفیت نہ ہوتی۔ اس نے مجھے اس طرح سے گمراہ کر دیا۔ یہ اس کے متعلق ہے اور آگے ہے کہ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا<sup>1</sup> (25:29)۔ قرآن کہتا ہے کہ دیکھا شیطان کس طرح سے انسان کو گمراہ کرتا ہے! یہ شیطان کون ہے؟ یہ وہی ہے جس میں پہلے اس نے کہا ہے کہ لَمْ اتَّخِذْ فَلَانًا خَلِيلًا (25:28) میں نے اس کو کیوں اپنا دوست بنالیا، کیوں میں اس پارٹی میں شریک ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ دیکھا، شیطان کیسے انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ یہ تو اس پارٹی کا ذکر ہے، یہ تو اس دوست کا نام ہے، وہ تو اُس کا کام ہے جس نے اس کو یوں گمراہ کیا۔ اے کاش! میں ان میں نہ ہوتا۔ میں ان میں نہ ہوتا، شیطان کو یہ چیز کبھی ہے۔

### لفظ خذولا کا مفہوم

یہاں (25:29) میں لفظ خذول بھی عجیب لفظ ہے، وہ ساتھی تھا۔ آپ یوں ذہن میں رکھیے کہ وہاں بھیڑوں کا گلہ ہوتا ہے، صحرا ہوتا ہے،

بیابان ہوتا ہے، جنگل ہوتا ہے، ہر طرف بھیڑیوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ بھیڑ گلے میں ساتھ رہتی ہے تو محفوظ رہتی ہے۔ بہترین گڈریا تو وہی ہوتا ہے جو بھیڑوں کو گلے کے اندر رکھے۔ اگر بیابان میں کسی مقام کے اوپر جہاں ادھر ادھر ہر جگہ بھیڑیوں کا خطرہ ہو، کوئی بھیڑ ہٹ کر گلے سے الگ ہو جائے تو یہ چیز ہے جسے خذولا کہتے ہیں۔ میں اس کی پارٹی میں شریک ہوا تھا۔ اب جب یہ بتائی آئی ہے تو وہ کم بخت مجھے یوں چھوڑ کے الگ ہو گیا ہے جیسے گلے سے بھیڑ کو الگ کر کے بیابان میں چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ جس کا جی چاہے اس کو چھپٹ کے لے جائے۔ کیا بات ہے شیطان کی مفاد پرستوں کی! پارٹیوں کے اندر یہی ہوتا ہے عزیزانِ من! ہر خطرے کے وقت وہ جن کے ساتھ آپ اتنے اچھے تعلق بنائے بیٹھے ہوتے ہیں وہ یوں چھوڑ کے الگ ہو جاتے ہیں جیسے گلے سے بھیڑ کو الگ کر دیا جاتا ہے کہ جس بھیڑیے کا جی چاہے اس کو چھپٹ کے لے جائے۔ اے کاش! میں اسے دوست نہ پکڑتا۔ وہ تو میرے ساتھ یہ کر گیا ہے۔ اب وہ آیت آتی ہے جس کا تذکرہ میں ابھی کروں گا۔

### امت کے خلاف خدا کی عدالت میں حضور ﷺ کی پکار

عزیزانِ من! یہ وہ آیت ہے جسے میں نے کہا ہے کہ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ (2:256) ہے اور لَا انْفِصَامَ لَهَا<sup>①</sup> (2:256) ہے۔

- ① حقیقت یہ ہے کہ شیطان (یعنی اپنے مفاد کی بنا پر دوست داری کے تعلقات رکھنے والے) کا کام ہی یہ ہے کہ وہ پہلے تو غمخوار اور رفیق بن کر ساتھ چلتا ہے لیکن جب مصیبت آتی ہے تو اپنے ساتھی کو یوں تنہا چھوڑ دیتا ہے جیسے کوئی بھیڑ گلے سے الگ رہ جائے (پرویز: مفہوم القرآن ص 821)۔
- ② آیت کا یہ کٹرا یوں ہے: فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا<sup>①</sup> (2:256) سو جو قوم غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اسے زندگی کا نصب العین بنائے گی، تو سمجھ لو کہ اُس نے ایسے محکم سہارے کو تمام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا (پرویز: مفہوم القرآن ص 100)۔

یہ بنیادی عمود ہے ستون ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ سارے قرآن کا نقشہ یہی ہے اور اب یوں سمجھ لیجیے کہ خدا کی عدالت ہے۔ اس کے حضور یہ سب قومیں آرہی ہیں۔ وہاں نظر آ رہا ہے کہ اس کا رواں کے ساتھ کون تھا، کس نے اس کا ساتھ چھوڑا، کون شیطان اور ابلیس کی سرکردگی میں اپنی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ سارا کچھ وہاں یوں ہے جیسے مقدمہ پیش ہو رہا ہے اور وہاں نبی اکرم ﷺ سامنے آ گئے ہیں۔ نقشہ دیکھیے، عزیزانِ من! قرآن کا اس امت کا نقشہ۔ یہ وہاں موجود ہے۔ ابھی ہم کہہ رہے تھے کہ یہ جو کافر کا لفظ آتا ہے وہ ہندوؤں کے لیے عیسائیوں کے لیے یہودیوں کے لیے آتا ہے۔ سنی، عزیزانِ من! کہ اس جگہ بڑی توجہ سے سنی، اپنی توجہ مرکز کیجیے اس کیفیت کے اندر کہ نبی اکرم ﷺ تشریف لاتے ہیں اور جیسے دور سے آواز دی جاتی ہے کہ وَقَالَ الرَّسُولُ (25:30) رسول کہے گا یَرْبِّ (25:30) اے میرے رب! اے میرے نشوونما دینے والے! میری ایک بات سن لے: یہ جو تیرے سامنے قوم کھڑی ہے یہ جو اپنی نسبت میری طرف کرتی ہے یہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتی ہے یہ جو تیرے سامنے کھڑی ہے پتہ ہے اس نے کیا کیا ہے؟ اِنَّ قَوْمِي

اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (25:30) اس قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

عزیزانِ من! آپ قرآن کا منظر دیکھیے جسے آپ قیامت کا دن کہتے ہیں، اس قیامت کے دن خدا کے حضور اس عدالت کے اندر یہ امت کھڑی ہے۔ یہ سوال ہو رہا ہے کہ تم نے یہ کیوں کیا اور کیسے کیا اور کیا ہوا اور کیا نہ ہوا؟ جیسے کہتے ہیں اعمال نامہ کھڑا ہے، وہ جسے قرآن نے ایک شاہد کہا ہے، سب سے بڑا گواہ، وہ سب سے بڑا گواہ عظیم ہے جو عدالت کی طرف سے آیا کرتا ہے۔ وہ نہ مدعی کی طرف سے ہے نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ وہ ایک شاہد اعظم آتا ہے، دوسرے پکارتا ہے کہ اے میرے رب! آپ ان کے جرائم ایک ایک کر کے کیا گناتے ہیں، میں بتاتا ہوں کہ اس قوم نے کیا کیا ہے؟ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا (25:30)۔ عزیزانِ من! قومی کہا گیا ہے، یہاں میری قوم کہا ہے۔ باقیوں کی جو قومیں ہیں، ان کے بارے میں تو تم جانوں اور وہ قومیں جانیں، ان کا میں بتاتا ہوں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا، انہوں نے وہاں کیا کیا؟ وَقَالَ الرَّسُولُ يَرْبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (25:30) اس قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔ عزیزانِ من! سارے قرآن میں بڑی بنیادی چیز ہے رسول اللہ ﷺ کی طرف، وہ جسے آپ کہتے ہیں، قیامت میں یہ ایک ہی اعلان ہے جو بتایا گیا ہے قَوْمِي (25:30) کہا ہے۔ اپنی قوم کے خلاف کہا ہے جسے آج اپنی امت کہتے ہیں یہ اس کے خلاف اعلان ہے، یہ الزام ہے، یہ دعویٰ ہے کسی اور چیز سے متعلق نہیں کہا۔ سارے قرآن میں آپ دیکھ جائیے یہی کہا ہے کہ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (25:30) میری اس قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ میری اس قوم نے یہ کیا تھا، اس کا یہ جرم تھا۔

### زوالِ امت کی وجہ جواز

اب آپ نے دیکھ لیا، ہم روز کمیشن بٹھاتے ہیں، کمیٹیاں بٹھاتے ہیں، تحقیقات کرتے ہیں، اسبابِ زوالِ امت کے لیے ریسرچ (تحقیقات) ہوتی ہیں کہ اس امت کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ سب کچھ ہم کرتے ہیں۔ قرآنِ زوالِ امت کی وجہ جواز تو ایک فقرے میں کہہ دیا گیا۔ کیا حضور نبی اکرم ﷺ کی اس شہادت کے بعد کسی اور کمیٹی بٹھانے کی ضرورت ہے؟ یہ کمیشن اور کمیٹیاں بٹھا کر گویا (معاذ اللہ) ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا کے حضور پوری امت کے سامنے جو کی جارہی ہے یہ کچھ کافی شہادت نہیں تھی۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ لہذا آؤ ہم کچھ ریسرچ کریں، بات کچھ اور بھی ہوگی یعنی یہ کافی نہیں ہے جو وہاں اعلان کیا گیا ہے۔ عزیزانِ من! اس کے بعد کسی کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَقَالَ الرَّسُولُ يَرْبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (25:30) اور رسول کہے گا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو اپنے خود ساختہ معتقدات کی رسیوں سے اس طرح جکڑ دیا تھا کہ

یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا۔ یہ ہے وہ سبب اور یہ ایک ہی سبب ایک ہی جرم ہے اور رسالت اور رسول اللہ ﷺ کی عدالت خداوندی میں اس شہادت کے بعد کسی اور تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں رہتی، کیا اس سے جرم ثابت نہیں ہو جاتا؟ کیا اس گواہی کے بعد کسی اور تحقیق کی ضرورت ہے؟ عدالت خداوندی میں یہ گواہی پیش ہو رہی ہے اور عدالت خداوندی نے مزید کوئی Question (سوال و اعتراض) بھی نہیں کیا کہ ہاں بھی! یہ بھی ایک بات ہوئی، ہم کچھ اور بھی پوچھ لیں لیکن قرآن میں اور کچھ نہیں ہے بلکہ یہی شہادت کافی ہے۔ تو جرم یہ ہے ہماری ذلت کا سبب یہ ہے۔

### لفظ مہجور کا قرآنی مفہوم

اب یہاں ایک اور بات بھی ہے، عزیزانِ من! جو میں کہا کرتا ہوں۔ مجبوراً کا ترجمہ میں بھی ابھی تک یہی کرتا گیا کہ قرآن کو چھوڑ دیا۔ آؤ عربوں سے پوچھیں کہ وہ مجبور کے معنی کیا لیتے ہیں، پھر سمجھ میں آئے گا کہ اس صاحبِ اعظم ﷺ نے خدا کی بارگاہ میں کہا کیا تھا۔ ہم پرانے لوگوں کو تو یہ معلوم ہے گرنی جزیشن (نسل) نے تو یہ گائے بھینس کے وہ گلے وغیرہ دیکھے تک نہیں۔ یہ اس قسم کی بھینسیں بیل یا اس قسم کی گائے وغیرہ دیکھیں گے جو عام طور پر رسہ تڑا کے بھاگ جایا کرتی ہیں۔ ان کو بھی لے جانا ہوتا ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ کرتے یہ ہیں کہ ایک چھوٹا سا رسہ (Rope) لیتے ہیں اس کا ایک سر اس کے پاؤں کے ساتھ باندھتے ہیں اور دوسرا سر اس کے سینگ کے ساتھ باندھتے ہیں۔ وہ رسہ چھوٹا سا ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جس رفتار سے آزادانہ وہ جانور چلنا چاہتا ہے وہ اسے اتنی رفتار سے نہیں چلنے دیتا۔ اس رسی کی جو لمبائی ہوتی ہے اُس سے وہ اتنی رفتار سے ہی چل سکتی ہے۔ اپنی اس رسی کے ساتھ اس کی آزادی کو مقید کر دیا جاتا ہے کہ وہ چلے تو ہمارے پیانے کی جوری ہے اس کے مطابق چلے اپنی آزادی کی رفتار سے نہ چلے۔ عرب اس قسم کے جانور کو مجبور کہا کرتے تھے۔

ہم نے قرآن حکیم کو کئی ایک رسیوں سے باندھ رکھا ہے

سوچے رسول اللہ ﷺ نے کیا کہا ہے؟ کہا ہے کہ وہاں میری اس قوم نے تیری اس کتاب کو جس کے لیے تو نے آزاد چھوڑا تھا کہ یہ اپنی رفتار سے دنیا میں چلے اس نے اس قرآن کے ساتھ قسم کی قسم کی رسیاں باندھ لیں، قرآن تو باقی رہا لیکن اس کو انہوں نے اپنے پیانے کے مطابق اپنے منشا کے مطابق چلایا، اس قوم نے اسے اپنی رفتار سے آزاد نہیں چلنے دیا۔ یہ ہے جرم، عزیزانِ من! میں کہا کرتا ہوں کہ

اس قوم کو دیکھیے، اس کی اس زبان کو دیکھیے، قرآن کے انتخاب کو دیکھیے، کیا لفظ آتا ہے اور پھر سوچیے کہ ساری کہانی ایک لفظ میں کہہ جاتا ہے یا نہیں! کیا اس قوم نے قرآن کے ساتھ یہ نہیں کیا؟ میں نے جیسا کہا ہے کہ قرآن تو ہر گھر میں موجود ہے، ہر زبان میں اس کے تذکرے ہیں، اس کو کتنا دہرایا جاتا ہے! دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس کو اتنا دہرایا جاتا ہو، ایک ایک رات میں اس کو ختم کیا جاتا ہے لیکن اس کی رفتار کے ساتھ کیا گیا ہے؟ اتنی رسیاں اس پہ باندھی گئی ہیں کہ جس منشا کے مطابق ہم چاہیں بس اتنا ہی یہ چلے، اس سے آگے نہ چلے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ پرچہ ابھی پریس میں ہے، چھپ نہیں سکا، میں چاہتا تھا کہ طلوع اسلام کا اگلا پرچہ اس درس سے پہلے آ جائے۔ یہ عجیب اتفاق ہے اس میں میرا ایک بڑا اہم مقالہ آ رہا ہے: ”قرآن کریم کے خلاف گہری سازش“، وہ خطرناک سازش قرآن کریم کی اسی آیت ہی کی تفسیر ہے کہ وہ کون کون سی رسیاں ہیں جو ہم نے اس قرآن کے پاؤں میں باندھ رکھی ہیں کہ جسے ہم چاہتے ہیں یہ اتنا ہی چلے جتنا ہم چلانا چاہتے ہیں، اپنی آزادی سے نہ چلے۔ قرآن بھی باقی رہا، یہ بھی نہیں ہوا کہ صاحب! ہم بالکل کافر ہو گئے، اس کو چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ اس میں یہ کیا۔ میں نے بتایا ہے کہ کس کس قسم کی رسیاں باندھی ہیں، تفصیل آپ کو اس میں ملے گی۔ چند فقروں میں عرض کروں: یہ رسیاں ہمارے عقائد کی ہیں، یہ رسیاں ہمارے مسالک کی ہیں، یہ رسیاں وہ ہیں جو ہمارے مذہب کی ہیں جسے ہم اسلام کہتے ہیں۔ اب یہ دین نہیں رہا، یہ تو مذہب ہو چکا ہے۔

### قرآن حکیم کے ساتھ سب سے بڑی اور پہلی گہری سازش: اس کے متن میں شکوک و شبہات

یہ عقائد قرآن کریم میں کیا ہیں؟ سورۃ بقرہ کی پہلی آیت کے بعد یہ ہے کہ ذَلِكَ الْكِتَابُ لِأَيُّبٍ فِيهِ <sup>①</sup> (2:2) یہ الکتب ہے۔ اس میں کوئی چیز شک و شبہ کی نہیں ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ <sup>②</sup> (2:2) یہ اس صورت میں ہدایت دے سکتی ہے جب اس کے منجانب اللہ ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ اس کی کسی ایک چیز کے اندر بھی ذرا شک پیدا ہوا تو پھر یہ ہدایت نہیں دے سکتی۔ شک اور یقین دو متضاد چیزیں ہیں۔ عزیزانِ من! کہیں ذرا سا بھی شک آ جائے، پورے کے پورے یقین کے پہاڑ کو گرا کے رکھ دیتا ہے۔ یعنی یہ دو چیزیں اکٹھی ہو ہی نہیں سکتیں، یہ نہیں کہ تھوڑا سا شک آ جائے تو چلیے 1% شک ہے، 99% یقین ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یقین باقی ہو ہی نہیں سکتا، رہ ہی نہیں سکتا اگر اس میں ذرا سا شک ہو۔ پہلی چیز جو اس قرآن کے خلاف ثابت کی گئی، وہ یہ ہے کہ خود اس کے متن میں شکوک پیدا کیے گئے کہ رسول اللہ ﷺ تو قرآن کو اس طرح دے کے ہی نہیں گئے تھے۔ یہ کتاب کی شکل میں تھا ہی نہیں۔ یہ کتاب دینے والا جہاں سے اسے الکتاب کہہ کر اس کی ابتدا کرتا ہے، اس میں جو پہلا ہی ورق ہے، اس کا پہلا

لفظ یہ ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتَابُ (2:2)۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں نہیں، یہ کتاب تھی ہی نہیں۔ آپ حیران ہوں گے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ پکی روٹی والوں کی باتیں نہیں ہیں۔ آپ کے ہاں جن احادیث کی کتابوں کو صحیح ترین، مستند ترین کہا جاتا ہے، یہ ان کی روایات ہیں کہ یہ اس شکل میں تھا ہی نہیں، رسول اللہ ﷺ اس طرح مرتب کر کے دے ہی نہیں گئے تھے یا اللہ! یونہی کوئی پتوں پہ کوئی ہڈیوں کے اوپر، کوئی کھجوروں کے پتوں کے اوپر، کوئی ادھر ادھر تھوڑا بہت لکھا ہوا تھا۔ اور یہ جو کچھ بھی تھا، ایسا ہی لکھا ہوا، وہ رسول اللہ ﷺ ایک تھیلے میں ڈال رکھتے تھے، اس کے اندر ڈالتے چلے جاتے تھے اور وہ تھیلا تھا جو دے گئے تھے۔ یا اللہ! چلیے، بھئی! تھیلا ہی سہی۔ بعد میں ہی سہی، اس تھیلے کو یعنی قرآن کریم کی اگر یہ ترتیب نہ رہے جو اس ترتیب میں دیا ہوا ہے، تو کیا ہو؟ اس کی ایک الگ کہانی ہے۔

① تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو (1:5) وہ ہمارے اس ضابطہ قوانین کے اندر محفوظ ہے (15:9) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن (Psychological Complex) (پرویز: مفہوم القرآن، ص-2)۔

② یہ ضابطہ قوانین، سفر زندگی میں اُن لوگوں کو انسانیت کی منزل مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص-2)۔

### قرآن حکیم کو مختلف ادوار میں ترتیب دیئے جانے کی کہانی

عزیزانِ من! کتاب کو ترتیب کے ساتھ ایک بنیادی دخل ہوتا ہے۔ کتاب کے معنی ہی اس کی ترتیب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تو وہ جو ایک جھولے (تھیلے) کے اندر یہ سارا کچھ کر کے، مخلوط شکل میں رکھا جائے تو اس میں کسی ترتیب کا سوال ہی نہیں ہے جو وہاں دے گئے تھے۔ پھر کیا ہوا؟ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بھی یہ نہیں ہے کہ یہ جو پہلی چیز ہے جو ضابطہ ہے، اس مملکت کا آئین ہے بھئی! اس کو تو ہم نے مرتب شکل میں نہیں پایا۔ وہ تو بعد میں ایک جنگ ہوئی تھی، اس جنگ کے اندر قرآن کے بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تو حضرت عمر ♦ (581-644/45AD) کو خیال پیدا ہوا کہ اگر یہ لوگ اس طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن تو ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق ♦ (573-634AD) سے کہا کہ بھئی! قرآن کو کچھ مرتب کرالینا چاہیے۔ انہوں نے کہا یا اللہ! تو بہ تو بہ جس کام کو رسول اللہ ﷺ نہیں کر گئے، میں کیسے کروں!! یعنی ڈر گئے کہ یہ تو بدعت ہوگئی۔ جو حدیث کی صحیح ترین کتابیں ہیں، آج ان کی جو صحیح ترین حدیثیں ہیں ان کو مانا جاتا ہے۔ بہر حال بڑے مباحثے کے بعد وہ حضرت عمر ♦ کو تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے سخت گیر تھے، تو وہ Prevail (چھا) کر گئے اور انہوں نے کہا کہ ہاں کرنا چاہیے۔ وہ پھر یہ نہیں کہ حافظ اتنے ہیں، خود یہ بھی خلفا جو ہیں یہ خود حافظ قرآن ہیں



ان کو بتایا جاتا ہے اور اگر قرآن کا حافظ ہے تو قرآن تو کسی ترتیب کے ساتھ اس نے حفظ کر رکھا تھا۔ ان حافظوں نے یا انہوں نے بھی یونہی ٹکڑے ٹکڑے یاد کر رکھے تھے!! حافظ قرآن شروع سے آخر تک جس کو آپ کہتے ہیں کسی ترتیب کے ساتھ انہوں نے حفظ کیا ہوا تھا۔ وہ حفاظ کی جماعت کو بٹھاتے، وہ ترتیب کے ساتھ بولتے جاتے یہ لکھتے جاتے۔ بات ختم ہوئی۔ کہا کہ نہیں، یہ نہیں کیا۔ ان کو نہیں بلایا ایک کمیٹی بٹھائی اور وہ بھی حضرت زید بن ثابت ♦ کو ان کا چیئر مین بنایا، ان میں سے کسی خلیفہ کو نہیں بنایا، ان کو بنایا اور انہوں نے ڈھنڈورا پیٹا کہ آؤ، جس جس کے پاس اس قرآن کا کوئی ٹکڑا ہے، لاؤ۔ جناب! وہ لاتے گئے اور وہ دیکھتے گئے۔ اپنی طرف سے کہتے ہیں کہ بڑی پکی شہادتیں بھی وہ لیتے تھے، سب کچھ بھی کرتے تھے۔ یعنی اس طرح سے جو ٹکڑے تھے، ہڈیوں کے، کھجور کے پتوں کے، یہ سارا کچھ وہ لاتے گئے اور یہ جمع کرتے گئے۔ یوں کتاب بنی، جمع کرتے گئے تو اس میں یہ دیکھا۔ یہ ان کے نزدیک صحیح ترین حدیثیں ہیں جنہیں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ صاحب! اس کے اندر دو آیتیں نہیں مل رہیں۔ ایک تو وہ آیت ہے کہ جس میں یہ تھا کہ بچے کو ماں کتنے مہینے تک دودھ پلائے۔ یہ چھوڑ دیجیے۔ یہ اہم نہیں۔ دوسری زنا کی آیت رجم ہے۔

### زنا کی سزا رجم کے متعلق آیت بکری کھا گئی

یہ کہتے ہیں کہ دوسری زنا کی آیت رجم تھی۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو بہت بڑا قانون ہے۔ وہ آیت ”اُس قرآن“ میں تھی ہی نہیں۔ حضرت عمر ♦ (581-644/45AD) نے کہا کہ ہم تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس آیت کو پڑھا کرتے تھے مگر یہ ”اس قرآن“ میں ہے ہی نہیں۔ ڈھونڈ یا پڑی (تلاش شروع ہوئی) پتہ لگایا کہ کیا ہوا؟ ڈھونڈتے ڈھونڈتے انہوں نے کہا کہ حضرت عائشہ صدیقہ □ کے پاس جانا چاہیے کہ وہ تو رسول اللہ ﷺ کے گھر میں تھیں، انہیں پتہ ہوگا۔ ان کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں بیٹا! ٹھیک ہے قرآن میں یہ آیت تھی، یہ کھجور کے پتے لکھی ہوئی تھی وہ پتہ اندر کمرے میں حضور ﷺ کے پلنگ کے پائنتی کی طرف رکھا ہوا تھا۔ جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی، تو ہم سب تو جو گھر والے تھے وفات کے زمانے میں پریشان ہو گئے، گھر کے اندر نفسا نفسی کی سی کیفیت ہوئی۔ باہر میری بکری بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اس پریشانی کے عالم میں رسی تڑائی، اندر بھاگ کے گئی، اور وہ پتہ کھا گئی۔ ختم ہو گیا یعنی وہ جو دو آیتیں ہیں ان کا وجود ہی دنیا سے ناپید ہو گیا۔ حضرت عمر ♦ سے لوگوں نے کہا کہ آپ ♦ شہادت دیتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پڑھا کرتے تھے، حضرت عائشہ □ کی شہادت ملی کہ یہ آیت تھی، بکری کھا گئی ہے تو کیا ہوا؟ آپ اسے قرآن میں کیوں نہیں رکھ دیتے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، جی! اگر میں نے قرآن میں رکھ دیا تو لوگ کہیں گے کہ عمر ♦ نے قرآن میں اضافہ کر دیا۔ توبہ، توبہ!! میں ایسا کام کر سکتا ہوں!!! انہوں نے کہا کہ یہ تو حکم ہے کہ زنا کی سزا سنگسار ہے۔ موجودہ قرآن میں یہ نہیں ہے۔ یہ تو حکم کی بات

ہے تو اس کو رکھو۔ آپ ♦ نے کہا کہ نہیں اس کا وایا میڈیا درمیانی راستہ نکالتے ہیں: قرآن میں تو یہ نہ رکھی جائے لیکن حکم اس کے مطابق چلے۔ تو اب یہ جو کہتے ہیں کہ زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے یہ اس قرآن میں نہیں ہے جو ہمارے آپ کے پاس جو امت کے پاس متواتر چلا آتا ہے یہ وہ آیت ہے جو بکری کھا گئی تھی اور قرآن ہے کہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ ذَلِكَ الْكِتَابُ لِأَيُّبَ فِيهِ (2:2) یہ وہ الکتب ہے جس میں کوئی چیز شک و شبہ نہیں ہے۔ یہ اتنی سی جو ایک روایت ہے کیا یہ کم شک و شبہ کی روایت ہے؟ یہ تو کسی ایک یا دو آیتوں کے متعلق بات ہوئی۔ پتہ نہیں کہ اور کتنی ایسی ہیں۔ پہلی چیز ترتیب قرآن کے سلسلے میں خلش کی ایک رسی یہ رکھ دی تو یہ رسی یوں باندھی۔ اب موجودہ قرآن کی رسی وہی ہے جو ان آیتوں کے بغیر ہے۔

### قرآن حکیم کے حروف پر نقطے بھی نہ تھے

ہمارے دور کے مفسر مودودی صاحب<sup>①</sup> فرماتے ہیں کہ جو قرآن دیا گیا ہے وہ اس طرح سے ہے کہ اس کے حروف پر نقطے نہیں تھے۔ بات سمجھ میں یوں نہیں آئے گی۔ آپ ذہن میں ذرا تصور کیجیے: ب ت ث عربی زبان کے حروف (Letters) ہیں۔ ان پہ آپ نقطے نہ دیجیے اسی طرح سے لائین ڈال دیجیے اور انہیں پھر پڑھیے کہ یہ کیا ہے؟ اسی طرح ج ح خ، ذ ر ز، س ش، ص ض، ط

① سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979)

ظ، ع، غ، بغیر نقطوں کے رکھ لیجیے اور پڑھیے۔ یہ کہتے ہیں کہ نقطے ہی نہیں تھے۔ دیکھا، پھر ایک نقطہ کہیں ادھر سے ادھر ڈال دیجیے معنی میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے عزیز ان من! ب کی شکل یوں اور ت یوں لکھا ہوا ہو تو کوئی اسے باب پڑھے گا، کوئی اسے بات پڑھے گا۔ سیدی سی بات ہے عربی زبان کی گرامر میں ایک بڑی چیز ہے جس کو اعراب کہتے ہیں۔ یہ آخر میں جا کے وہ زبر زیر پیش ہوتی ہے یہ معنی کی بنیاد ہے جو آخری چیز ہے۔ یہ اس قسم کی چیز کسی اور زبان میں نہیں ہوتی۔ یہ عربی کی خصوصیت ہے یہ ایک زبر اور زیر کے فرق سے فاعل سے مفعول، مفعول سے فاعل یہ کچھ بن جاتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ان کے اوپر اعراب بھی نہیں تھے۔ چل بھئی! تھیلے میں ڈالے ہوئے یہ ٹکڑے اس طرح انہیں جمع کیا ان کے اوپر نہ نقطے نہ ان کے اوپر اعراب بعد میں جا کے کہیں حجاج بن یوسف کے زمانے میں بنی امیہ کے زمانے (661-750AD) میں جا کر وہ کہتے ہیں کہ اس کے اوپر نقطے بھی لگے اعراب بھی لگے۔ یعنی وہ لگانے بیٹھ گئے اور یہ کچھ کیا۔ یعنی جیسے علما کے ذہن میں آئی جتنی جتنی رسیاں جی چاہیں انہوں نے قرآن کو باندھ دیں۔ یہ جو قرآن آپ کے نقطے والا ہے اعراب والا ہے یہ حجاج بن یوسف کے دور میں ہوا۔ اس کے درمیان ایک عقیدہ اور ہو گیا کہ یہ قرآن ایک ہی قرآن نہیں تھا یہ اللہ تعالیٰ نے سات زبانوں

(سبعۃ احرف) میں نازل کیا تھا۔

## قرآن حکیم سات زبانوں میں نازل ہوا تھا، چھ کو جلا دیا گیا

یہ جو مودودی صاحب لکھتے ہیں یہ ان کا نہیں ہوتا۔ میں اس لیے نام لیتا ہوں کہ آپ لوگوں کو معلوم کرنے میں ذرا آسانی ہو جائے کہ یہ آج بھی آپ کے ہاں کے یہ عقائد چلے آ رہے ہیں اور یہ مفسر ہیں جو اپنی تفسیروں میں یہ لکھتے ہیں کہ یہ جو قرآن تھے یہ ایک ہی قرآن نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے سات زبانوں میں نازل کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی سات زبانوں میں دیا تھا۔ حضرت عثمان ♦ کے زمانے (645-656 AD) تک سات زبانوں میں ہی تھا۔ حضرت عثمان ♦ نے چھ زبانوں والے قرآن کو اپنی صوابدید کے مطابق جلا دیا اور ایک باقی رکھا۔ یہ جو آپ کے پاس قرآن ہے ان سات میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سات زبانوں والا نازل کیا تھا۔ لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان ♦ نے بغیر اس کے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہو یا رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا ہو یہ ان کے الفاظ ہیں خود ان چھ کو جلا دیا، ایک باقی رکھا۔ یہ ہے وہ ایک جو آپ کے ہاں ہے۔ اس مذکورہ مقالے میں 'عزیزان من! دھیان سے پڑھیے۔ میں نے ان کا ایک ایک سطر کا حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک باقی رہ گیا۔ گھروں تین سیر کرن والے نکلے: دو اندھے اک نوں دسدا ای نہیں۔ جنوں دسدا نہیں اونوں دتے پیسے دو کھوٹے: ایک چلدا ای نہیں، جیہڑے چلدے نہیں، اونوں نے خریدے دو کو کڑو: اک گلدا ای نہیں۔ جیہڑا گلدا نہیں اونوں لگے تین جنے کھان: دو بھکے، اک رجدا ای نہیں۔<sup>1</sup> معاذ اللہ معاذ اللہ۔ خدا نے سات قرآن اتارے چھ تو جلا دیئے جو باقی رہا اس میں حضرت عثمان ♦ نے کہا کہ اس میں غلطیاں رہ گئی ہیں۔ انہوں نے کہا: ٹھیک کر دیجیے۔ کہنے لگے: یہ عرب آپ ٹھیک کر لیں گے۔ پھر اس میں لکھا یہ ہے کہ گیارہ غلطیاں تو حجاج بن یوسف نے ٹھیک کی تھیں۔ خدا کہہ رہا ہے: ذَلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (2:2)۔ یہ کہہ رہے ہیں: یہ ہے وہ کتاب۔ اچھا جی، جیسا تیسرا یہ ہے پیسہ۔ چلیے ہے تو سہی۔ کہا: نہیں آپ کو پتہ نہیں ہے وہ تو دو آیتیں ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں، حکم انہی کا ہے۔

## قرآن کی پانچ سو آیات منسوخ ہو گئیں

عقیدہ یہ ہے کہ اس موجودہ قرآن کے اندر ایسی آیات ہیں جن کو پڑھا تو جاتا ہے لیکن ان کا حکم منسوخ ہو گیا ہوا ہے۔ چل بھی معاملہ ہی ختم ہوا۔ قرآن میں تو یہ کہیں بھی لکھا ہوا نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے آپ روز قانون کے متعلق دیکھتے ہیں کہ ایک قانون بنتا ہے، حکومت اس قانون میں کچھ ترمیم کرتی ہے، تو اس کے لیے اپنے ہاں کسی قانون کو منسوخ کرتی ہے کہ فلاں حکم اس حکم کی رو سے منسوخ

کیا جاتا ہے اس کی جگہ یہ حکم نافذ ہوگا۔ اس قسم کی کوئی چیز قرآن میں نہیں ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے اور فلاں آیت نے اس کو منسوخ کیا ہے۔ یہ کہیں سارے قرآن میں نہیں ہے۔ ارے تم کہہ رہو کہ کتنے حکم منسوخ ہو گئے ہوئے ہیں اپنے ذہن میں عزیزانِ من! زیادہ سے زیادہ کا نقشہ لگا لیجیے اور پھر پوچھیے کہ کتنے حکم؟ جواب ہوگا پانچ سو حکم منسوخ ہو گئے ہوئے ہیں۔ یہ ان علمائے کرام نے کیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ رسیاں ہیں جن میں قرآن باندھا جا رہا ہے دیکھتے ہیں یہ قرآن جو مجبور ہوا جا رہا ہے۔ اس بھینس کو بھی تو ہم کچھ اجازت دیتے ہیں ہم اسے اتنی بھی اجازت نہیں دیتے: پانچ سو آیتیں منسوخ ہیں سات زبانوں والے قرآن میں سے ایک باقی رہا جو باقی رہا اس میں غلطیاں تھیں جو غلطیوں والا ہمارے پاس ہے اس میں سے کچھ آیتیں ہیں جو اس کے اندر نہیں آئی ہیں باہر تھیں جو ہیں ان میں سے پانچ سو منسوخ ہیں۔

کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے عزیزانِ من! جب میں یہ باتیں بیان کرتا ہوں: قرآن سے یہ آیتیں منسوخ ہیں انہوں نے بعد میں خود بتانا شروع کیا کہ یہ آیت ہم نے اس آیت کی رو سے منسوخ کرائی ہے۔ وہ آگے چلتے چلتے آیتیں ختم ہو گئیں جن کی رو سے منسوخ کرائی

① گھر سے تین سیر کرنے نکلے دو تھے اندھے اور تیسرے کو نظر ہی نہیں آتا تھا۔ جسے نظر نہیں آتا تھا اسے دیئے دو سکے وہ بھی تھے کھولے: ایک چلتا ہی نہیں تھا۔ جو سکے چلتے نہیں تھے انہوں نے ان کے خریدے دو مرغ: ایک گلتا ہی نہیں تھا۔ جو مرغ گلتا نہیں تھا اسے تین جوان کھانے لگے: ان میں دو تھے بھوکے اور ایک تھا وہ جس کا پیٹ ہی بھرتا نہیں تھا۔

تھیں اور بعض پھر بھی منسوخ شدہ باقی رہ گئیں۔ اب کیا کیا جائے؟ اے گھوڑا مک گیا۔ آپ کو پتہ ہے گھوڑا مک گیا والی گل جیہڑی میں کہی سی۔ ① نہیں معلوم تو سنو۔ اس نے کہا: سردار جی! ایک گھوڑا ہمیں بھی دے دیجیے۔ اس نے کہا: او گھوڑا تو تم لے لو گے گھوڑا جو ہے بڑا سرکش شریہ ہے سوار کو پہچانتا ہے اناڑی کو بیٹھنے نہیں دے گا۔ کہنے لگے: سردار جی! ہم کوئی اناڑی نہیں ہیں باپ دادا سے سواری کرتے چلے آ رہے ہیں بے شک وہ کم رفتار ہی ہووے۔ اب یہ ہمارے بچے اگلے پنجابی کیا سمجھیں گے کہ گھوڑا کیا ہوتا ہے تے سیر کی ہوندی اے۔ ② ٹھیک ہے اس نے دے دیا گھوڑے پہ بیٹھ گیا گھوڑا چلا اس نے ایک پیچھے سے قدم مارا۔ اس کے لیے تو وہ زین سے سرین پہ مارا دوسرا اس نے جو تھا وہ گردن سے کنوتیوں کے اوپر تیسرا مارا کنوتیوں سے نیچے۔ اس نے کہا کہ دیکھا میں نے کہا تھا کہ نہیں چڑھنا۔ کہنے لگے: جی میں کیا کروں گھوڑا ای مک گیا اے۔ ③ یعنی آگے گھوڑا ہی ختم ہو گیا ہے اس میں میرا کیا قصور ہے معاذ اللہ۔ پانچ سو آیتیں منسوخ کیں۔ جو آیتیں باقی رہ گئیں جن کو منسوخ کرنا تھا یعنی جو ناخ آیتیں تھیں وہ ختم ہو گئیں۔

قرآن حکیم کی آیات کو حدیث منسوخ کر سکتی ہے اور دو سو سال بعد جمع کی جانے والی احادیث کی ماہیت

اب کیا کیا جائے؟ کہنے لگے: جی، کوئی بات نہیں۔ عقیدہ یہ وضع کیا کہ قرآن کی آیت کو حدیث بھی منسوخ کر سکتی ہے بس مسئلہ حل ہو گیا اور احادیث کے مجموعے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہیں۔

میں آپ کو یہ بتا دوں کہ حدیث کسے کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے کوئی دواڑھائی سو سال بعد، انفرادی طور پر، کچھ لوگوں نے جنہیں امام بخاریؒ اور مسلمؒ کہتے ہیں، جو باتیں اس زمانے میں لوگوں میں تھیں کہ حضور ﷺ نے ایسا کہا تھا، بغیر کسی پہلے Written record (تحریری ریکارڈ) کے زبانی، اسی لیے ان کو روایت کہتے ہیں، انہوں نے لوگوں سے پوچھ پوچھ کے جمع کیں۔ وہ<sup>4</sup> کہتے ہیں مجھے کوئی چھ لاکھ کے قریب اس قسم کی باتیں ملیں، ان میں سے پانچ لاکھ ستانوے ہزار کے متعلق تو میں نے خود محسوس کیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتیں اور باقی جو ہیں جن کے متعلق انہوں نے اپنے صوابدید کے مطابق سمجھا کہ یہ ہو سکتی ہیں، وہ اپنے ہاں جمع کیں یعنی جو ان کی

① گھوڑا ختم ہو گیا والی بات جو میں نے بتائی تھی۔

② اب یہ ہماری اگلی نسل کے بچے پنجابی کیا سمجھیں گے کہ گھوڑا کیا ہوتا ہے اور سیر کیا ہوتی ہے؟

③ یہ گھوڑا ہی ختم ہوا۔

④ یہ اشارہ امام محمد اسلمیل بخاریؒ (260-194ھ) کی طرف ہے جن کا وطن بخارا تھا۔ انہوں نے کل چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے 2762 (مکررات حذف کرنے کے بعد) اپنے مجموعے میں درج کیں۔ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور (2005)، ص 187 تا 242، ابواب 7 اور 8۔

صوابدید کے مطابق ہو سکتی ہیں وہ ہیں جو سب سے صحیح ترین حدیث کی کتاب ہے اس میں جو جمع ہیں۔ یہ ان جامع حدیث کا اپنا قول ہے۔ ان کی صوابدید کے مطابق ہے جو انہوں نے سمجھا کہ یہ ان میں سے ہو سکتی ہیں، اسی لیے حدیث کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث نہیں کہتے۔ قول منسوب الی الرسول کہتے ہیں یعنی وہ بات جس کو منسوب کیا جاتا ہے رسول اللہ ﷺ کی طرف، اسی لیے حدیث سے پہلے لکھا ہوتا ہے قال رسول اللہ (حضور ﷺ نے کہا) اور آخر میں لکھا ہوا ہوتا ہے: اوکما قال رسول اللہ یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو۔ حدیث کے متعلق یہ چیز ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ یہ جو حدیثیں ہیں، یہ بھی قرآن کی آیتوں کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ پھر ایک اور رسی باندھی گئی۔

## فقہ کی تاریخ اور اس کی حیثیت

اس کے بعد ہمارے ہاں کے فقہ والے حضرات آئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ قرآن اور احادیث کی روشنی میں جو اسلام کے احکام ہیں

وہ ہمارے ائمہ کرام نے مرتب کر دیئے ہیں۔ یہ جوان کے مرتب کردہ احکام ہیں ان کو فقہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی سارے مسلمانوں کے ایک ہی نہیں ہیں یہ مختلف فرقوں کی اپنی اپنی الگ الگ فقہیں<sup>1</sup> ہیں۔ یہ جو فقہ ہے اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ نہ ہمیں حدیث کی طرف جانے کی ضرورت ہے اور نہ قرآن کی طرف۔ قرآن اور حدیث میں سے جو کچھ احکام آنے والے تھے وہ اس فقہ کے اندر موجود ہیں۔ اب اس فقہ کے اندر کئی ایسے احکام ہیں جو قرآن کے خلاف جاتے ہیں۔ امام ابو الحسن کرخی فقہ حنفی کے بہت بڑے امام ہیں۔ ان کا یہ فیصلہ ہے کہ جب آپ دیکھتے ہیں کہ فقہ میں اور ان میں ٹکراؤ ہوتا ہے یہ ہمارے خلاف جاتی ہے فیصلہ یہ ہے کہ ہمارے کسی امام کا کوئی فیصلہ یا قول اگر حدیث یا قرآن سے ٹکرائے تو پہلے تو کوشش کرو کہ قرآن کی ایسی یا حدیث کی ایسی تاویل کی جائے کہ وہ اس فقہ کے مطابق ہو جائے۔ اس کی تاویل کی جائے کچھ جسے کھینچنا تانی کہتے ہیں کی جائے تاکہ وہ اس کے مطابق ہو جائے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو یہ سمجھیے کہ قرآن کی آیت منسوخ ہے عمل امام کے قول یا فیصلہ کے مطابق ہوگا۔ آپ اس مقالہ میں دیکھیں گے ایک ایک چیز کا حوالہ موجود ہے۔ دیکھتے ہیں کہ ایک رسی اور پڑی۔

1 ان نکات کی مزید تشریح و تہنیں کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ حج، 2005، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، ص 303 اور فٹ نوٹ 1۔

## اپنی اپنی احادیث اور اپنی اپنی فقہ کی روشنی میں لکھی گئی قرآنی تفاسیر کی حالت

اس کے بعد ہمارے ہاں تفاسیر آئیں۔ تفاسیر میں تو پوچھو ہی نہیں بس قرآن کی آیت اوپر لکھی ہوئی ہوتی ہے جیسے خط کے اوپر 786 کو بسم اللہ کے حروف سمجھ کر لکھتے ہیں اور نیچے جوجی میں آئے بکتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن کی آیت اوپر ہوتی ہے اور اس کے نیچے وہ قصے اور کہانیاں اور اسرائیلیات اور یہودیوں کے اور مجوسیوں کے اور اس کے اور اس کے اور ہر ایک کی سند میں کوئی نہ کوئی روایت، کوئی نہ کوئی کسی بزرگ کا قول اور اس کا یہ سارا کچھ یہ سب کچھ تفسیری ہے۔ عقیدہ یہ کہ جو کچھ ان کتب تفاسیر میں آ گیا ہے اس سے الگ اگر کوئی شخص آج سمجھتا ہے تو وہ تفسیر بالرائے ہے یہ اس کی اپنی رائے ہے۔ اس کو قطعاً مانو۔ یہ ملحد ہے بے دین ہے بدعتی ہے منکر ہے تو قرآن وہ ہو گیا کہ جوان تفاسیر کے اندر آ گیا۔

فرمایے، عزیزانِ من! کہ ایک بالشت کے برابر بھی وہ رسی باقی رہتی ہے جو اس طرح اس بھینس کے گلے میں باندھی گئی ہو تو وہ پھر بھی اتنی باندھتا ہے۔ میں اور تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اور تفصیل میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جو مقالہ میرا ہے اس کو آپ دیکھیے گا وہ

پہلی تاریخ<sup>①</sup> کو آجائے گا۔ یہ آپ دیکھیے گا کہ اس کے بعد آپ کے ہاں جو قرآن جس کی اتنی عظمت ہے وہ باقی کیا رہ جاتا ہے اور اس کے بعد پھر آپ کی سمجھ میں یہ اعلان آجائے گا، اعلان نہیں بلکہ جو فریاد ہے وہ آئے گی کہ وَقَالَ الرَّسُولُ يَرْبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (25:30) یہ قرآن مجبور بھی تو وہاں موجود ہے اتنی رسیاں بندھی ہوئی ہوں گی، اور اس کے بعد کتنا بڑا فریب یہ دیا جائے گا کہ صاحب! جتنا اس قرآن کا تذکرہ ہوتا ہے کسی کتاب کا نہیں ہوتا، چومتے ہیں سر آنکھوں پر رکھتے ہیں، سر پر رکھتے ہیں اونچا رکھتے ہیں، ایک ایک رات میں اس کا شبینہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس قرآن کا ہوتا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ جو شکایت پیش کر رہے ہیں، خدا کے حضور میں وہ ہے قُرْآنَ مَهْجُورًا (25:30)۔ وہ یہ ہے قرآن مجبور۔

### قرآن حکیم کی بعثت کا مقصد اور ضرورت

آپ نے دیکھا کہ عدالت خداوندی میں جرم کیا عائد کیا جا رہا ہے؟ رسول اللہ ﷺ جیسا شاہد اعظم ہے جس کو قرآن نے خود شاہد کہا ہے، وہ خدا کے حضور شہادت دے رہے ہیں اور اس شہادت کو Accept (قبول) کیا۔ کیوں نہ Accept کیا جائے، شہادت دینے والا تو صادق امین ہے وَقَالَ الرَّسُولُ يَرْبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (25:30) اور یہ کہنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہ ماجرا کسی ایک نبی کے ساتھ مخصوص نہیں رہا: كَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ (25:31)۔ اے

① فروری 1978ء کا ماہنامہ طلوع اسلام

رسول! یہ ماجرا تمہارے ساتھ ہی نہیں گزرا۔ آپ سے پہلے بھی جتنے رسول اور نبی آئے، ان کی امتوں نے ان کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ اور یہ چیز ہے جو قرآن بتاتا ہے کہ اب قرآن اور حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد کیا تھا، اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ قرآن کہتا ہے کہ پہلے جتنے نبی یا رسول آئے تھے جو دین لائے تھے وہ ہماری طرف سے آئے تھے، انہوں نے جو کتاب پیش کی تھی، وہ ہماری دی ہوئی کتاب تھی، ہمارا ہی تجویز فرمودہ دین تھا، اپنی طرف سے کوئی رسول نہیں لایا تھا لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ اب اس آسمان کے نیچے ان میں سے کوئی کتاب اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ وہی دین جو چلا آ رہا تھا اپنی صاف منظرہ شکل کے اندر مکمل کر کے منظرہ کر کے، ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خدا لے لے اور اس کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم کر دے۔ یہ تھا خدا کا پروگرام یعنی پہلے نبیوں کی کتابوں کے ساتھ ان کی امتوں نے جو کچھ کیا، اس کو مٹا کر اس کی جگہ ایک کتاب عظیم دی، جس میں صدائیں، خدا کے فرمان، وحی خداوندی، مکمل شکل میں، محفوظ شکل میں رکھ دی گئیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اے رسول! یہ کچھ پہلی

امتوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ قرآن کے متن کی حفاظت کا ذمہ تو خدا نے لے لیا ہے۔ اس امت نے کہا کہ ہاں صاحب! لیتے پھرے آپ متن کو (معاذ اللہ) ٹھیک ہے۔ سنبھی رکھو! قرآن دامت جبرہا ہیگا اے۔<sup>①</sup> متن کے متعلق بھی میں نے عرض کر دیا ہے کہ اس کے متعلق بھی اتنے شبہات پیدا کیے جارہے ہیں کہ یہ متن بھی پتہ نہیں وہ ہے یا نہیں ہے، لیکن بہر حال جو کچھ بھی ہے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے قرآن تو صرف ان الفاظ کا ہی نام نہیں ہے قرآن تو ان الفاظ کے مفہوم کا نام بھی ہے۔

### مہجور قرآن کا یہ عمل آج بھی جاری و ساری ہے

آپ نے دیکھا ہے کہ کتنی رسیاں باندھی گئی ہیں! کہا کہ یہ چیز تمہارے ہی ساتھ نہیں ہوئی، ہرنبی کے ساتھ ہوئی عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ (25:31) یہ لوگ مجرم تھے خدا اور رسول کے دین کے دین کی کتاب کے۔ یہ کرتے کیا تھے؟ یہ مجرم وہی کچھ کرتے تھے جو پہلی قوموں کے ساتھ خدا نے کہا ہے۔ کیا کرتے تھے؟ (22:52)۔ قرآن کا بڑا اہم حوالہ ہے۔ یہاں بھی یہ ہے کہ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ (25:31) ہرنبی کے ساتھ یہ ماجرا ہوا ہے۔ وہاں (22:52) میں ہے کہ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ (22:52) تم سے بھی پہلے کوئی نبی رسول ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو۔ کیا ماجرا ہے؟ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى الْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ (22:52) اس کے بعد شیطان نے، یہی شیاطین نے اس کی وحی کے اندر خود کچھ ملا دیا۔ انہوں نے یہ کیا تو پھر کیا ہوتا رہا؟

① قرآن کریم کے اس متن کو سنبھالے رکھو۔

کہا کہ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكُمُ اللَّهُ أَلَيْتِهِ (22:52) تو خدا یہ کرتا رہا کہ جب کسی نبی کی امت نے اس کی کتاب کے ساتھ یہ کیا، ہم نے اور رسول بھیج دیا۔ اس رسول نے آ کے جو کچھ انہوں نے اس کے اندر کیا تھا اس کو الگ کر دیا ہمارے حکم سے اور پھر وحی کو منظرہ شکل میں دے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر یہ کیا، ہم نے پھر ایک رسول بھیج دیا اور اب یہ رسول بھیجا کہ جس کے بعد کوئی دوسرا رسول نہیں آنا ہے اس لیے اس کتاب کے متعلق خدا نے یہ کہہ دیا کہ اس کی حفاظت کا ہم ذمہ لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے جی، کتاب کا ذمہ لے لیا کہ یہی خدا کی طرف سے آئی تھی۔

### قرآن حکیم کے علاوہ مثلہ معہ کا عقیدہ

لیکن سن رکھیے! عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن ہی خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوا: مثلہ معہ اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی نازل ہوا تھا۔ ارے قرآن تو بار بار چیلنج دیتا ہے کہ تم اس کی مثل کہیں سے ایک آیت لے آؤ، کہیں سے دس آیتیں لے آؤ۔ تم



کہتے ہو کہ اس کی مثل، اس کے ساتھ اور بھی نازل ہوا تھا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے، یہ کتاب محفوظ ہوگئی، اس میں بھی تو ہم نے ملاوٹ کرنے کی جرأت کی، اس کے ساتھ اور بھی کچھ اس کی مثل، اس قرآن جیسا اور بھی نازل ہوا تھا۔ بھئی، وہ کیا چیز ہے؟ کہنے لگے کہ یہ حدیثیں جو ہیں: وہی جو میں نے ابھی پیش کیں۔ مثلاً معہ تو وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ پہلے یہ مجرم کرتے رہے کہ اس کی وحی میں یہ ملاتے رہے، قرآن کے اندر تو یہ داخل کرنا جو ہے یہ ممکن نہیں تھا، اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا تھا، انہوں نے کہا تھا کہ رکھتے پھرئیے یہ کتاب مکمل ہے ہی نہیں، اس کی مثل اس کے ساتھ اور نازل ہوا تھا اور وہ ہے یہ صاحب! تو یہ اگر اس کے ساتھ ملا نا نہیں تو اور کیا ہے؟ ملانا ہی نہیں ہے بلکہ جو میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، عقیدہ یہ ہے کہ یہاں اس خارج از قرآن وحی جو ان کا عقیدہ ہے اس میں اور قرآن کے اندر کی وحی میں ٹکراؤ ہو، دونوں ایک دوسرے سے متضاد چلیں، تو حدیث کو سمجھو محکم ہے اور قرآن سمجھو منسوخ ہے۔

پوچھا گیا کہ صاحب! اس کی مصلحت کیا تھی کہ قرآن ایک دیا اور پھر قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ جو اور ہونا چاہیے تھا وہ قرآن سے باہر رکھ دیا، وہ الگ کیوں دیا؟ کہا کہ بھئی! اسی قرآن کے اندر وہ کچھ بھی داخل کر دیا جاتا، امت کے پاس ایک محفوظ کتاب تھی، جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا، وہ تو آجاتی اس کے اندر کیوں نہیں رکھ دیا گیا؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ اس کی مصلحت اور حکمت آپ اپنے ذہن سے سوچیے اور وہ آپ کا ذہن ہی کیا جو اتنی بڑی چیز کو سوچ سکے۔ ہمارے تو چھوٹے چھوٹے سے ناریل ہیں، ان کے اندر وہ چیز آ کیسے سکتی ہے۔ حکمت اس کی یہ بتائی مولانا مودودی صاحب<sup>1</sup> نے کہ اگر اسے بھی قرآن کے اندر رکھ دیا جاتا تو قرآن انسائیکلو پیڈیا آف بریٹینکا جتنا ہو جاتا۔ چکیا ای نا جاندا تہاڑے کول۔<sup>2</sup> دیکھا حکمت کی بات، مصلحت کی بات! اتنا بڑا ہو جاتا، شکر کروں گے ہو۔ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ (25:31)۔ یہ قرآن ہے، عزیزانِ من! دشمن دین کے خدا کے رسول کے مجرم وہ یہ کیا کرتے تھے اور خدا نے رسول سے کہا کہ کوئی بات نہیں، اے رسول! تمہیں اس سے کبیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًّا وَنَصِيرًا (25:31) یہ یاد رکھو! ہدایت صرف خدا کی ہدایت ہے، نصرت صرف اس کی ہے، وکفی، یہ کافی ہے، کسی اور چیز کی اس کے ساتھ ہادیّا ہدایت کے لیے ضرورت نہیں، اور اس کے بعد آگے پھر کفار کا اعتراض ہے کہ اس رسول پر سارے کا سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہ ہوا تاکہ ہمیں معلوم ہو جاتا کہ ہم سے کیا کیا باتیں منوائی جائیں گی۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ عزیزانِ من! ہم الفرقان کی آیت 31 تک آگئے 32 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ



---

❶ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979)

❷ (اتنا بھاری ہو جاتا کہ) آپ سے اٹھایا ہی نہ جاتا۔

## آٹھواں باب: سورة الفرقان (آیات 32 تا 34)



عزیزانِ من! آج فروری 1978ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 32 سے ہو رہا

ہے: (25:32)

### نبی اکرم ﷺ پر مختلف اعتراضات کا ذکر اور آپ کی عملی زندگی

سابقہ آیات میں ان لوگوں کے اعتراضات کا ذکر کیا جا رہا تھا جو نبی اکرم ﷺ کے انقلابِ آفریں پیغام کی مخالفت کرتے تھے۔ عجیب عجیب قسم کے وہ اعتراضات تھے۔ کبھی یہ اعتراض تھا کہ یہ رسول کس قسم کا ہے؟ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، ہماری طرح کھاتا پیتا ہے، قرآن نے یہ کہا کہ یہ جو تمہارے ذہن میں تو اہم پرستیاں ہیں کہ رسول کوئی مافوق الفطرت، کوئی فوق البشر قسم کی چیز ہونا چاہیے، اسے نکال دیجیے۔ یہ تو رسول ہے، یہ تو قاصد ہے، یہ تو پیغامبر ہے، خدا کا پیغام تم تک پہنچاتا ہے۔ دیکھو یہ کہ وہ پیغام کیا ہے اور پھر سب سے بڑی چیز یہ کہ اس نے اس پیغام پر عمل کر کے دکھانا ہے۔ وہ عمل تمہارے لیے نمونہ بننا ہے تو یہ اسی صورت میں بن سکتا ہے کہ یہ تمہارے ذہن میں ہو کہ جب ایک ہمارے جیسا انسان یہ کچھ کر کے دکھا سکتا ہے تو وہ ناممکن العمل پروگرام نہیں ہے۔ انسان اسے ممکن بنا سکتا ہے، اسے مشکل کر سکتا ہے۔ اگر رسول یا اس کے ساتھی جو وہ جماعت ہے، وہ فوق البشر ہوں، فوق الفطرت قوتوں کی رو سے، وہ اس قسم کا نظام قائم کر کے بتا دیں تو دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ کیسے بن سکتا ہے؟

### خلافت راشدہ کے دور کے متعلق ہمارا عملی تصور اور خدا کا فرمان

قرآن نے تو بار بار یہ کہا ہے کہ نبی کی زندگی تمہارے لیے بطور نمونہ ہے۔ اب ایک طرف آج ہمیں جب اس دور کے سارے واقعات اور داستانیں سنائی جاتی ہیں کہ انہوں نے چند سالوں کے عرصے میں وہ کچھ کر کے دکھا دیا، تو اکثر آپ نے سنا ہوگا کہ یہ کہا کرتے

ہیں کہ صاحب! ان کا کیا پوچھتے ہیں جی، وہ تو خدا کے رسول تھے ان کا کیا پوچھتے ہیں جی، وہ تو صحابہ کبارؓ تھے۔ کیا ہم ان جیسے ہو سکتے ہیں؟ ”جی اسی تے بندے بشر ہوئے جی“<sup>①</sup>۔ یعنی یہ انہی کے لیے تھا وہ یہ کچھ کر گئے اور باقی ہمارے لیے تو یہ ہے کہ اس کا ختم پڑھا کریں مردوں کو بخشو ایا کریں۔ تو وہ تو ہم نہیں ہو سکتے صاحب! دیکھیے صاحب! اب تو نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد تو جب کبھی کسی دور میں خلافت راشدہ کے انداز کا ایک نظام قائم کیا جائے گا، تو پھر اس کی مخالفت میں کہا جاتا ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ”ایا ز قدر خود را“، نفیاً سند آپ اور خلافت راشدہ کی قسم کا نظام کر لیں گے، معاذ اللہ تو بہ تو بہ جیسے کہا جاتا ہے۔ تحت الشعور کے اندر وہ چیز اب بھی بٹھی ہوئی ہے۔ اور وہ اس لیے ہی ہے کہ قرآن قدم قدم پہ کہہ رہا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے معجزوں کا مطالبہ کر رہے ہیں، حضور ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن یا خدا یہ کہلوار ہا ہے کہ ان سے کہو کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں بابا، میں جو کہتا ہوں اس پہ غور کرو، میں جو کرتا ہوں اسے دیکھو۔ معجزوں کے ذریعے سے اگر یہ کچھ ہوا تو بس وہ تو میری ذات تک رہے گا، اس سے آگے تو بات نہیں چلے گی اور یہ تو قیامت تک کے لیے چلنے والا ایک نظام ہے، ایک پیغام ہے۔ وہ اس پہ زور دیتا چلا آ رہا ہے۔ سارا قرآن یہی چیز کہتا چلا آ رہا ہے کہ یہ انسانوں کے لیے ہے، رسول ایک انسان تھا، رسول کے ساتھی انسان تھے، انہوں نے یہ کر کے دکھا دیا لہذا قیامت تک کے انسان اس کو کر کے دکھا سکتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو ان کا یہ تھا اور قرآن میں یہ بات کہی۔ ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اچھا اگر اس کی طرف فرشتے آتے ہیں اس کو خدا کی طرف سے وحی آتی ہے یہ باتیں کرتا ہے ہمارے سامنے خدا کیوں نہیں آتا، ہم پہ فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے؟ اس قسم کے اعتراضات تھے جو وہ کرتے چلے آ رہے تھے اور پچھلی آیات میں ان کا ذکر آ رہا تھا۔

### قرآن حکیم کے نزول کے متعلق کفار کے اعتراضات اور خدا کی طرف سے ان کا جواب

اسی قسم کا اعتراض ایک اور بھی ہے جواب سامنے آ رہا ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (25:32) یہ قرآن کی بات جو تم ہمیں روز کہتے ہو کہ اب یہ حکم آیا ہے اب یہ تقاضا ہے اب یہ یہ چاہتا ہے، تو ہمیں ایک ہی دفعہ سارے کا سارا بتا دو اور پھر یہ کہ پورے کا پورا قرآن ایک ہی بار تمہارے پاس کیوں نہیں آ جاتا۔ ایک ہی بار تم کیوں نہیں بتا دیتے کہ ہم

① جی، ہم تو بندہ بشر ہیں۔

نے کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا تا کہ ہم ایک دفعہ فیصلے کریں:

یہ سسک سسک کے مرنا غم بھر میں بلا ہے

ایک دفعہ سارا کچھ بتاؤ ہمیں۔ قرآن نے اس کا جواب نبی اکرم ﷺ کو دیا۔ کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن ایک ہی

دفعہ سارا نازل نہیں ہو رہا، تیس سال کے عرصہ میں یہ قرآن نازل ہوا، اس کی تکمیل ہوئی۔ کذلک جواب ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ اسی طرح سے ہے جیسا کہ کہتے ہیں، یہ بتدریج نازل ہو رہا ہے۔ یہ بتدریج نازل کیا جا رہا ہے، ہمارے پروگرام کے مطابق ایسا ہو رہا ہے، یہ بائی چانس کچھ ایسی بات نہیں، اتفاقی بات نہیں ہے کہ یہ یونہی اس طرح بتدریج نازل ہو رہا ہے، کذلک لکھا ہم کر رہے ہیں، یہ ہماری مشیت کے مطابق ہے، ہمارے پروگرام کے مطابق ہے۔

قرآن حکیم کے الفاظ اور اس کا پروگرام موتیوں کی ایک مالا کی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں

قرآن حکیم کہتا ہے کہ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلاً (25:33)۔ یہ پروگرام جو قرآن دے رہا ہے، اسے بتدریج قائم ہونا ہے۔ یہ فساد نہیں جو یونہی برپا کیا جاسکتا ہو، یہ انقلاب ہے جس سے قلب و نظر کی تبدیلیاں ہونی ہیں۔ ایک ایک اسٹیج پر ایک ایک قدم پر پروگرام کا ایک حصہ آئے گا، اُسے سمجھایا جائے گا، اس کے لیے انہیں آمادہ کیا جائے گا، پھر اس کے اوپر عمل کیا جائے گا۔ اس میں ایک ایک کڑی پر عمل کیا جائے گا۔ اب آگے وہ چیز ہے جسے وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلاً (25:33) کہا گیا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ یہ یونہی نہیں ہے کہ اسے یونہی کھیر دیا گیا ہے، اس میں سے کبھی یہ آیت آگئی، کبھی وہ آیت آگئی۔ یہ صورت نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ قرآن کا یہ اس قسم کا پروگرام ہے جس کی ایک کڑی میں سے دوسری کڑی خود بخود آگے نکلتی چلی جاتی ہے۔ یہ جو ہے یہ ترتیل یا رتل ہے، یہ ایک کڑی میں پروئے ہوئے موتی جس طرح سے باہمی مربوط ہوتے ہیں اس کے لیے عرب یہ لفظ بولتے تھے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ موتی ہوتے تو الگ الگ ہیں لیکن جب وہ لڑی میں پروئے جاتے ہیں تو وہ تو ایک مربوط ہار بن جاتا ہے، ایک لڑی بن جاتی ہے۔ کہا کہ یہ اس طرح سے ہے کہ ایک کڑی میں سے دوسری کڑی نکلتی چلی جائے۔ پورا پروگرام ہمارے سامنے ہے لیکن وہ پروگرام اس طرح سے تکمیل تک پہنچنا ہے کہ جب اس کے ایک حصے پر عمل ہو جائے گا اسی میں سے پھر وہ بات آگے چلے گی اور اگلی کڑی سامنے آجائے گی۔ پہلی چیز یہ ہے، پھر اس کے اوپر انہیں سمجھایا جائے گا، اس کے بعد اس پر عمل کیا جائے گا، اتنی کڑی کے اوپر یہ ہوگا۔ پھر اس کے بعد اس میں سے اگلی بات نکلتی گی۔ تو یہ چیزیں اتفاقی یا بائی چانس نہیں ہوں گی۔ ایک کڑی میں جو کچھ کیا جائے گا، اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس میں سے پروگرام کی اگلی کڑی سامنے آئے گی۔ یہ بڑا سائنٹفک طریقہ ہے۔

صحیح پروگرام کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بتدریج دیا جائے اور اس تدریج کی کیفیت یہ ہو جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ یہ کسی سائنسدان سے پوچھیے جو کسی لیبارٹری میں کام کر رہا ہو۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑا فارمولا ہوتا ہے اور اس نے اس پر عمل کر کے آہستہ آہستہ آخر تک پہنچنا ہوتا ہے۔ پہلے درجے پر وہ ایک چھوٹی سی چیز ہے کہ وہ دو چیزوں کو ملاتا ہے۔ اس میں سے پھر ایک اور چیز پیدا ہوتی ہے، اسے پھر آگے کسی اور چیز کے ساتھ ملاتا ہے، اس میں کچھ اور تبدیلیاں پیدا کرتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے تو اس میں سے آگے کچھ اور پیدا ہوتا

ہے۔ یہ جو طریق ہوتا ہے جس میں سے کسی ایک درجے یا کسی ایک Step (قدم) سے اگلا قدم خود بخود نکلتا ہے، یہ جو اس طرح سے ایک تدریج ہوتی ہے اسے قرآن کی رو سے ترتیل کہتے ہیں۔ زراعت کی مثال قرآن عام طور پر دیتا ہے۔ اس میں ترتیل کی کیفیت عجیب ہوتی ہے۔ اس پودے کو آپ دیکھیے کہ اس پودے کی جو نشوونما ہوتی ہے اس نشوونما میں خود بخود ایک اگلی اسٹیج اس پودے میں آتی چلی جاتی ہے۔ ذرا سی کونپل ہوتی ہے پھر آگے بڑھتی ہے، ذرا ذرا سی پتیاں نکلتی ہیں، کونپل بڑھتی ہے، شاخیں ادھر ادھر نکلتی ہیں، پھر ان میں سے شکوفے آتے ہیں، پھر پھول بنتے ہیں پھر پھل بنتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ چیز یکبارگی نہیں ہو جاتی، وہ تدریج ہوتی ہے اور اس تدریج کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کچھلی کڑی جب تکمیل تک پہنچتی ہے تو اسی میں سے اگلی کڑی نکل آتی ہے۔ یوں یہ چیزیں ایک نظام کے تحت، ایک پروگرام کے ماتحت، ترتیل، شروع سے آخر تک پہنچتی ہیں۔ اسے ترتیل کہا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں ترتیل کے معنی قرآن حکیم کو مختلف آوازوں کے ساتھ پڑھنے کا نام ہے

ہمارے ہاں تو بہر حال اس کے معنی لیے جاتے ہیں ”آرہانال پڑھنا قرآن شریف“<sup>①</sup> اور پھر وہ قاریوں کے طائفے آتے ہیں، وہ کانوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے ہوتے ہیں، گاگا کے قرآن پڑھتے ہیں۔ تو وہ اسکو کہتے ہیں: ترتیل سے قرآن کا پڑھنا۔ اب تو سوال قرآن کے پڑھنے کا رہ گیا۔ ٹھیک ہے جی، کوئی اسے تحت اللفظ پڑھتا ہے، کوئی اسے گا کر پڑھتا ہے۔ قرأت ہی کی آپ کے ہاں علم کی ایک الگ شاخ ہو گئی ہے۔ اس کے بھی چھ سات طریقے ہیں۔ وہ مختلف تجوید کے طریقے ہیں، اس کے لیے الگ مکتب کھلے ہوئے ہیں۔ وہاں یہ بھی اتنا ہی پڑھایا جاتا ہے کہ قرآن کو ترتیل کے ساتھ، قرأت کے ساتھ، کس طرح پڑھنا چاہیے۔ یہ حجازی لے ہے، یہ مصری لے ہے، بہر حال چھوڑیئے اس قصے کو، ورنہ میں بتاؤں کہ یہ لے ہیں کیا حقیقت میں؟ یہ رہ گئی بات ترتیل کی۔ جسے اس نے کہا یہ تھا کہ اس کے اندر ربط باہمی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک کڑی جب تکمیل تک پہنچے گی تو اسی کے اندر سے اس کی اگلی کڑی نکلے گی اور یہ جو مسلسل کڑیوں کا یوں نکلتے چلے جانا ہے اسے ترتیل کہا جاتا ہے۔

① قرآن شریف کا سر کے ساتھ تلاوت کرنا، گا کر تلاوت کرنا۔

جس پروگرام نے انقلاب نمودار کرنا ہو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ تدریج ایک ایک کڑی سے اگلی کڑی تک لے جاتا ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ ایک تو یہاں آیا ہے رَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا (25:33)۔ دوسرے مقام پہ بھی آیا ہے بات وہاں واضح ہوتی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ . قُمِ اللَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا . نَصْفَهُ ۚ اَوْ اَنْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا . اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا . اِنَّا سَنُلْقِيْ

عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا. إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيْلًا. إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا

(73:1-7)۔ کیا کیا چیز اب عرض کروں! بات سامنے آگئی، منزل کی۔ آپ کوئی قرآن شریف اٹھا کے دیکھ لیجئے، اس میں یہ ترجمہ دیا گیا ہے

کہ اے کملی والے! اٹھ۔ اور پھر وہ کملی والا تو آپ کو معلوم ہے کہ جس طرح سے پھر عام ہوا ہے۔ یہ اب ہمارے ہاں کی نعتوں میں، وعظوں

میں، نبی اکرم ﷺ کے متعلق سب سے زیادہ جو چیزیں پیار محبت سے عظمت و احترام سے کہی جائے وہ ہے 'کملی والا'۔ کملی والے مجھے کملی

میں چھپالے۔ یعنی آپ کے ہاں یہ بعض چیزیں ایسی مسلمات بن گئی ہیں کہ اس کے متعلق کبھی کھڑے ہو کر سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی

۔ اور وہ خدا رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے یَا أَيُّهَا الْمَوْمِلُ (73:1) اے کملی والے! اٹھ، بھئی خدا کیا کہہ رہا ہے؟ کہہ رہا ہے کہ اے کملی

والے! تو وہ اوپر کملی لیے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے: جی، دیکھیں خدا پیار اور محبت سے کہہ رہا ہے کہ اے کملی والے! آجا۔ اور پھر آپ کے ہاں

کے یہ سارے جو صوفی اولیا بنتے ہیں یہ سارے کملی اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر اس سے ایک داستان بنی کہ جب رسول اللہ ﷺ پہ پہلی

وحی آئی تو رسول اللہ ﷺ آئے وہ ایک قصہ گھڑا کہ آپ ﷺ غار حرا میں چلے جایا کرتے تھے۔ ہفتوں مہینوں وہاں جا کر رہا کرتے تھے۔

اب میں کیا کیا عرض کروں کہ کیا کیا چیزیں ہمارے ہاں بنی ہوئی ہیں صاحب! یہ ان کے سادھوؤں، سنیا سیوں، جوگیوں، کی جو چیزیں

تھیں وہ در آئیں، عیسائیوں کے جو راہب تھے ان کے ہاں کی چیزیں آئیں، یہودیوں کے ہاں کے یہ جتنے بھی طریقے تھے وہ آگئے مثلاً وہ

غاروں میں چلے جاتے تھے، باہر جنگلوں میں چلے جاتے تھے، تپسیہ گیان دھیان کرتے تھے، ان کے مکاشفہ کرتے تھے، اور اس طرح سے ایک چیز

وہ خود پیدا ہو جاتی تھی، ہمارے ہاں بھی بعد میں جب تصوف آیا ہے تو تصوف میں بھی یہی ریاضتیں اور چلے شروع ہوئے۔ اور یہ غاریں ہیں، یہ

سارے وہاں سے آئے ہوئے ہیں۔ اب انہیں اس کی سند چاہیے تھی کہ بھئی! قرآن نے تو یہ چیز کہیں نہیں کہی۔ قرآن میں تو خدا ان کی

رہبانیت کے متعلق کہتا ہے کہ ہم نے ان پر یہ رہبانیت فرض نہیں کی تھی۔ انہوں نے خود ہی اس کو اختراع کر لیا۔ یہ انسانی اختراع ہے۔ قرآن

یہ چیز کہتا ہے لیکن یہ تو جو یہاں اب آپ کے ہاں تصوف تھا وہ تو شریعت والوں سے بھی بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ اب یہ سند کہاں سے لائیں؟

وہ سند یہ ہے جناب! کہ دیکھیے نبی اکرم ﷺ نبوت ملنے سے پہلے غار حرا کے اندر بیٹھتے تھے۔ وہاں جا کے وہ تپسیہ کرتے تھے، گیان

دھیان کرتے تھے، تفکر ہوتا تھا، غاروں میں جا کر Meditation (مراقبہ، استغراق) ہوتی تھی یعنی وہ اپنے ہاں کی جو خانقاہیت ہے، اُسے

سند اور دلیل بہم پہنچانے کے لیے یہ ایک غار کا جو قصہ تھا، اپنے ہاں گھڑا اور اس کے بعد سند یہ ہوئی کہ یہ الگ تھلگ تنہائیوں میں، خلوتوں

کے اندر، خواہ وہ غاروں میں ہو، خواہ وہ حجروں میں ہو، اس کے اندر تپسیہ گیان دھیان تزیکیہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیے کہ نبوت مل

جاتی ہے۔ یعنی حضور ﷺ کا وہ جو خلوتوں میں، بقول ان کے جا کے گیان دھیان ریاضت چل کر ناک تھا، اس کے نتیجے میں نبوت ملی۔

وحی کے مقابل کشف والہام کا عقیدہ

اس کے بعد یہ کہ بھئی! ٹھیک ہے، ہم نبوت تو نہیں کہتے، ہمیں اس کے نتیجے میں خدا کی طرف سے کشف ہوتا ہے، الہام ہوتا ہے۔

نام دوسرا رکھ لیا۔ وہ پروسیس (طریقہ) وہی بتا دیا کہ اس طرح سے خلوتوں کے اندر ریاضتیں چلے کیے جائیں تو اس کے بعد دیکھ لیا کہ رسول اللہ ﷺ ذرا اونچے مقام کے چلے کیا کرتے تھے، اونچے مقام کی بات ان کو مل گئی جسے یہ نبوت کہتے ہیں۔ یعنی یہ بھی لوگوں سے ڈرتے ہوئے وہ لفظ نہیں لے کے آتے، ورنہ مقصد تو وہی ہوتا ہے کہ ہم اسی طرح سے یہ سب کچھ کرتے ہیں اور یہ عین وہی طریقہ ہے۔ یہ سنت رسول اللہ ﷺ کی پیروی ہے جو ہم غاروں میں جا کے حجروں میں بیٹھ کے ریاضتیں کرتے ہیں، چلے کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ان کو وہ نبوت کی وحی ملی، ہمیں یہ الہام ملتا ہے، یہ تصوف کا الہام ہے، یہ ولایت کا مقام ہے۔

عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے اس کے پیچھے ایک عجیب سازش آتی ہے۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔ انہوں نے اپنے ہاں نبوت کو یہ جو ولایت یا کشف یا الہام یا تصوف ہے، اسی کی ایک کڑی بتایا ہے۔ فرق جو آگے جا کے کیا ہے وہ Quantitative ہے یعنی وہ کثیت کے لحاظ سے ہے کہ یہ چھوٹے پیمانے کا کشف ہے، چھوٹی سی سطح کا ہے وہ (نبوت) ذرا بڑی سطح کا ہے، یہ دونوں Qualitatively (صفاتی لحاظ سے) ایک ہی چیز ہے، یہ خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔ بات ساری یہ ہے کہ نبی کو رسول کو وہ علم ملا تو اس نے اس کو وحی کہا، ہمیں وہ علم ملتا ہے، ہم اسے الہام یا کشف کہتے ہیں اور یہ بھی ذرا احتراماً ہے کہ ہم وہ بات ہی نہ کہہ دیں ورنہ بات تو وہی ہے۔

بھئی! یہ کیسے ملا؟ کہنے لگے: جیسے رسول ﷺ کو ملا۔ انہیں کیسے ملا تھا؟ غاروں میں جایا کرتے تھے وہاں جا کے آپ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ عبادت کیا کرتے تھے یعنی اسلام تو ابھی آیا نہیں تھا، تو یہ عبادت کیا تھی؟ کہ جی وہ غاروں میں جاتے تھے یعنی وہ غارِ حرا ایسا مسلمہ آپ کے ہاں آ گیا ہوا ہے کہ کوئی شخص اس کے اوپر Question (سوال و اعتراض) کرنے کو تیار نہیں، کوئی سوچنے کو تیار نہیں، اور تو چھوڑ دیجیے عزیزانِ من! عربوں کی تاریخ میں یہ بات نہیں ملتی کہ اس قوم میں اس کا تصور بھی تھا۔ وہ تو صحرائین قوم تھی، باہر پھرنے والی قوم تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق نبوت سے پہلے قرآن نے یہ کہا ہے کہ وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَلْهُ (93:7) تم تلاش حقیقت میں سرگرداں پھرا کرتے تھے، ہم نے تمہیں صحیح راستہ دکھا دیا۔ یہ تلاش حقیقت کیا چیز تھی؟ غور تھا، فکر تھا، تفکر تھا۔ آپ ﷺ ہر چیز کے اوپر کھڑے ہو کر غور کیا کرتے تھے کہ کائنات کیسے وجود میں آ گئی ہے، شمس و قمر کس طرح، لیل و نہار کا اختلاف کیسے ہو رہا ہے؟ یہ سارا سلسلہ یہ نظام کائنات کس طرح چل رہا ہے؟ یہ چیزیں تھیں، یہ غور و فکر تھا۔ یہ تو عربوں کے مزاج کے خلاف تھا کہ وہ غاروں کے اندر چلے جائیں۔ صحرائین قوم میں غاروں کے اندر نہیں جایا کرتیں۔ عربوں کی تاریخ میں کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ ان میں سے کسی نے بھی یوں کیا ہو۔ ان کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ حضرت اسماعیل ♦ سے لے کر اُس وقت تک کسی نے بھی اس طرح غاروں میں جا کے تپسیہ کی ہو، لیکن ان کو تو خدا دے۔ یہ لوگ تنکے رکھ کر پل سے ہاتھی گزارتے ہیں کہ جی وہ آپ غاروں میں جایا کرتے تھے، اب



وہ سب مانتے ہیں کہ جایا کرتے تھے تو ٹھیک ہے ہمارا غاروں میں جانا سنت رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے۔ غاروں میں جا کے کچھ ملا کرتا تھا؟ کہ جی ہاں، ملا کرتا تھا۔ ٹھیک ہے جی، ہمیں وحی نہیں ملی، خاتم النبیین ﷺ جو حضور ﷺ ہوئے ہیں، ہمیں کشف والہام ملتا ہے، پروسیس (عمل) وہی ہے، پھر اس کے بعد ہم بھی مکلی اوڑھ کے آتے ہیں۔

### غارِ حرا میں وحی کے نزول کی روایت

آپ کو پتہ ہے کہ داستان کا وہ اتنا ٹکڑا ہی نہیں ہے کہ وہاں آپ ﷺ غارِ حرا میں اسی طرح سے یہ کیا کرتے تھے۔ آگے یہ ہے کہ ایک دن جبریل آگئے۔ اس نے آن کے یہ کہا کہ پڑھ۔ گویا کاغذ کے اوپر لکھا ہوا کچھ تھا، جو سامنے رکھا کہ پڑھ۔ اندازہ لگائیے۔ کہا کہ جی، میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس لانے والے کو یا بھیجنے والے کو اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ لکھا ہوا بھیج دیا، بڑی مشکل ہوگئی۔ اب یہ اس کاغذ کو لے کے واپس کیسے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں، یہیں کچھ کام کر لیتے ہیں۔ انہوں نے سینے سے لگایا، زور سے بھیچا تو آپ ﷺ کو پڑھنا آ گیا۔ انہوں نے پڑھ لیا۔ چلیے، پڑھا دیا، پڑھ لیا۔ اس کے بعد آپ کے ہاں یہ پہلی وحی کی داستان، بخاری جیسی کتاب کے بھی شروع میں ہی تفصیل سے ملے گی۔ وہاں سے آپ ﷺ کا نپتے ہانپتے بھاگے ہوئے گھر آئے۔ ملاحظہ فرمائیے وہ عظیم القدر ہستی کہ جس کے لیے پہلے نبی سے لے کر آخری نبی تک رشد و ہدایت کا ایک سلسلہ چلا آ رہا تھا اور آخر میں آ کر قیامت تک کے لیے نبی بنانا جس سینہ مطہر کا مقصود تھا، ان کی کیفیت یہ ہے کہ پہلی وحی آتی ہے تو بھاگے ہوئے چلے آ رہے ہیں، ڈر رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، آ کے بیوی سے کہہ رہے ہیں کہ جلدی سے میرے اوپر کچھ وہ مکمل اوڑھاؤ۔

اب یہاں آئی وہ بات: اوڑھاؤ، مجھے سردی لگ رہی ہے۔ جاڑا لگ رہا ہے، میں ڈر رہا ہوں۔ بننے والا نبی ہے۔ اس کی یہ کیفیت اس وحی کی رو سے ہے کہ ڈر رہا ہے، بیوی کہہ رہی ہے کہ آپ ﷺ کے لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، آپ ﷺ تو بڑے خدا ترس ہیں، آپ ﷺ تو اللہ والے ہیں، غریبوں کا بھلا کیا کرتے ہیں، تو آپ ﷺ کے ساتھ خدا ایسا نہیں کرے گا۔ یعنی نبی کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ میرا تو خدا کے ساتھ ایسا تعلق ہے، میں تو بھلے کرتا ہوں، وہ میرے ساتھ یہ کچھ نہیں کرے گا۔ بیوی بتا رہی ہے کہ ڈرو نہیں۔ پھر یہ بات کیسے ہوئی کہ یہ ہوا کیا ہے؟ وہ کہنے لگی: چلو، میرا ایک چچا کا بھائی ہے، اُسے ورقہ بن نوفل کہتے ہیں۔ وہ مکے میں تورات کا، عبرانی کا، ایک بہت بڑا عالم تھا۔ وہ کہنے لگی کہ چلو، ان کے پاس چلیں۔ آپ ﷺ کو وہاں لے گئے۔

### آپ ﷺ کی ورقہ بن نوفل کی طرف سے نبوت ملنے کے سلسلے میں روایات

عزیزانِ من! آپ سنتے جا رہے ہیں۔ کیجیے شوق ہو رہا ہے یا نہیں؟ نظر آ رہا ہے کہ کس طرح سازش سے انہوں نے یہ بات بنائی۔ یہ

بات خود عیسائیوں کی بنائی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ وہ کس کے پاس لے کے جا رہی ہے؟ عیسائی عالم کے پاس جو جی لینے کے پیمانے پر خدا کے معیار کے مطابق اتر رہا ہے تو جی شروع ہوئی ہے۔ اسے کچھ علم نہیں ہو رہا کہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ عیسائی عالم کے پاس آپ ﷺ کو بیوی لے جا رہی ہے۔ ان کے پاس لے گئی اس نے ساری بات سنی۔ سننے کے بعد اس نے کہا کہ آپ ﷺ کو مبارک ہو میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ وہی ناموس اکبر جبریل ♦ ہے جو اس سے پیشتر انبیاء کے پاس آیا کرتا تھا۔ آپ ﷺ تو خدا کے نبی ہیں نبوت آپ ﷺ کو مل رہی ہے۔ مجھے تو یہ نظر آ رہا ہے آپ ﷺ کو نبوت مل رہی ہے۔ ورقہ کے اس سرٹیفکیٹ دینے پر آپ ﷺ نے تسلیم کیا (معاذ اللہ، معاذ اللہ) کہ مجھے نبوت مل رہی ہے۔ اس ورقہ بن نوفل کو اتنا یقین تھا کہ یہ وہی ناموس جبریل آپ کی طرف آیا اور آپ ﷺ وہ نبی ہونے والے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس کو ایمان لانا چاہیے تھا۔ وہ ورقہ آخر تک مرتے دم تک ایمان نہیں لایا۔ جس کی شہادت پر رسول اللہ ﷺ نے (معاذ اللہ) اپنے آپ کو نبی ﷺ سمجھ لیا، وہ مرتے دم تک عیسائی رہا۔ کہنے لگا کہ مجھے پتہ ہے کہ یہ قوم تمہارے ساتھ ظلم و ستم کرے گی اور تمہیں یہاں سے نکال بھی دے گی تو آپ ﷺ نے کہا کہ یہ آپ کو کیسے معلوم ہے۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے پہلے نبیوں کے ساتھ بھی یہ ہوتا رہا تمہارے ساتھ بھی ہوگا مجھے معلوم ہے تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ میں اس وقت اگر زندہ رہا تو میں پھر تمہاری اس وقت مدد کروں گا۔ جب یہ قوم تمہارے ساتھ یہ کرے گی۔ آج وہ اسلام نہیں لارہا آج وہ ایمان نہیں لارہا اور کہہ رہا ہے کہ میں اس وقت تمہاری مدد کروں گا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک کتنا گہرا نشتر ہے کہ ایک عیسائی عالم ان کو کہتا ہے کہ تو نبی ہونے والا ہے تو آپ ﷺ مان گئے میں نبی ہوں (معاذ اللہ، معاذ اللہ)۔ اس کے اوپر ان لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ورقہ بن نوفل نے آپ ﷺ کو فریب ہی دے دیا ہو جسے جُل دے دینا، بہکا دینا کہتے ہیں اور آپ ﷺ سمجھ بیٹھے کہ میں نبی ہوں (توبہ توبہ استغفر اللہ) لیکن یہ جو کہانی ہے اس سے تو یہ نتیجہ نکالنا بالکل Natural (فطری) ہے۔ ارے وہ اگر سچ مچ نبی سمجھتا تو پہلی چیز یہ ہے کہ وہ ایمان کیوں نہ لے آتا۔ وہ تصدیق کر رہا ہے کہ آپ ﷺ خدا کے نبی ہیں۔ خود یہ کہہ رہا ہے مگر ایمان نہیں لارہا۔ ان لوگوں نے یہی تو اعتراض کیا ہے۔

### مستشرقین کی طرف سے من گھڑت قصے ہمارے ہاں کے لٹریچر کی زینت بن گئے

آپ کے ہاں کے یہ جو مستشرقین ہیں ان کو تو آپ گالیاں دے کر کتابیں چھپوا کر اعلان کر دیتے ہیں مگر یہ بخاری شریف کی پہلی ہی حدیث ہے جس میں تحریر ہے کہ گھر آئے تو وہ جو کملی تھی وہ اوڑھادی۔ میں نے کہا کہ ایک تو کملی وہاں غارِ حرا میں ہوتی تھی اور یہ پہلی وحی کے بعد جو ”اوکا مباچڑھیا جنوں کیندے ہیگے نیں“<sup>①</sup> وہ جو اس طرح حضور ﷺ کو اس داستان کی رو سے پکپی آئی اس وقت جو کمبل اوڑھا ہے تو پھر اس کے بعد ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ یہ جو کمبل اوڑھنے کی ادا تھی وہ خدا کو بہت پسند آگئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اللہ میاں

بھی (معاذ اللہ، معاذ اللہ) مزالے لے کے دیکھ رہے ہوں گے، مگر قرآن ہے کہ یوں مخاطب کرتا ہے کہ **يَا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ** (73:1)۔ خدا کی طرف سے نبوت ملی، ایک پروگرام ملا۔ یہ رہبانیت نہیں تھی، جہاں ایک فرد غلطو توں میں جا کر، تنہائیوں میں جا کر اپنے لیے تزکیہ نفس کرتا ہے۔ مذہب تو یہ سکھاتا ہے، اسلام تو دین تھا، یہ تو ایک نظام تھا، یہ جماعت چاہتا تھا، اس میں پہلا مرحلہ جماعت سازی کا ہوتا ہے، اپنے ساتھ اس قسم کے لوگ ملائیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے یہ اعلان کیا تھا کہ **أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ** (6:163)۔ اب یہ جو اسلام لانے والی جماعت ہے، اسے لے لیجیے۔ سب سے پہلے تو میں اس پر شہادت دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے پیغام عام کرنا شروع کیا، اس پیغام و پروگرام کو پہنچانا شروع کیا، جس پر قرآن نے بتایا کہ **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** (2:129)۔ وہ ان کو کتاب خداوندی کی تعلیم دیتا ہے، ان کو Rationally سمجھاتا تھا، اس کی حکمت سمجھاتا تھا The why of سمجھاتا تھا Reason دیتا تھا، دلائل دیتا تھا، براہین پیش کرتا تھا۔ اس طرح اس کی تعلیم عام کرتا چلا جاتا تھا۔ اس طرح اُس کے ساتھ ایک ایک دودو کر کے جو لوگ اس پیغام کی صداقت پر یقین رکھتے تھے جسے ایمان کہتے ہیں، وہ ساتھ ملتے تھے اور اس طرح سے **وَيُزَكِّيهِمْ** (2:129) وہ ان کا تزکیہ نفس کرتا تھا۔

### تزکیہ نفس کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! تزکیہ نفس میں نے کہا اور دھیان غاروں کے اندر گیا۔ ہمارے ہاں تو اب پیری مریدی میں ان کے ہاں تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ تزکیہ کے معنی ہیں Growth and Development یعنی انسان ذات کے ساتھ نشوونما کرتا چلا جاتا تھا اور یہ ہے مقصود۔ اگر یہ ہو تو پھر اسلام لانے والی بات ہے اور اس کے لیے وہ چیز ضروری ہے جو قرآن نے کہی ہے یعنی تزکیہ نفس، قلب و نگاہ کے اندر ایک تبدیلی۔ مفکر قرآن علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938ء) تو یہاں تک بھی کہہ گیا ہے کہ

① جسے پکپی لگنا کہتے ہیں۔

② اے رسول! فریضہ رسالت کی عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد تیرے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ تُو ایسے رفقاء سفر تیار کرے جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو (تاکہ یہ کارواں، شاداں و فرحاں، منزل مقصود کی طرف قدم بڑھاتا چلا جائے۔ اس قسم کا عمل تزیل سالار کارواں کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔) (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1374)۔

خرد نے کہہ بھی دیا 'لا الہ' تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

(ضربِ کلیم)

یہ دل و نگاہ کو مسلمان بنانے والے تھے۔ انہوں نے خرد کو درمیان سے الگ نہیں کر دیا تھا، یہ تصوف نہیں تھا، بَعْلَمُھُمُ الْکِتَابَ وَ الْحِکْمَةَ (2:129) وہ انہیں کتاب خداوندی کی تعلیم دیتا تھا اور اس کی غرض و غایت بھی بتاتا تھا۔ اور اس کے بعد ہے کہ وَ یُزَکِّیْھُمْ (2:129) ان کی ذات کی نشوونما کرتا تھا۔ یوں کہیے کہ وہ کتاب کی تعلیم دیتا تھا، وہ عقل و برہان کی رو سے سمجھاتا تھا اور اس طرح سے ان کی ذات کی نشوونما کرتا تھا۔ یہ تھا پروسیس، یہ تھا پروگرام۔ اس طرح ایک ایک دودو کر کے جماعت بناتا تھا۔

## قرآن حکیم کی روشنی میں منزل کی حقیقت

اب آئیے کہ یہ منزل کیا چیز ہے؟ عزیزانِ من! آپ پھر کہیں گے کہ یہ کچھ نئی بات کر دیتا ہے۔ نہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ عربی لغت آپ کے ہاں موجود ہے۔ انہیں نہیں دیکھنا، تو میرے لغت کے اندر آپ دیکھیے، عربوں کی زبان کے حوالے موجود ہیں کہ ان عربوں کے ہاں اس کے معنی کیا تھے؟ کیا بات تھی یہ جسے منزل کہا ہے! وہ قافلوں میں سفر کرتے تھے اور تو کوئی ان کے ہاں سفر کا طریقہ ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ قافلوں میں سفر کرتے تھے۔ اس قافلے میں جو کارواں سالار تھا، وہ شخص بہت بڑی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے۔ کارواں سالاری بہت بڑی چیز تھی۔ آج کا وہ ڈرائیور یا گاڑی کا ڈرائیور، وہ تو کارواں سالاری ہوتی تھی۔ اونٹ کا جو کجاوہ ہے اس میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کجاوے کے دائیں بائیں دو سواریاں بیٹھتی ہیں: ایک ادھر اور ایک اُدھر۔ ان سواریوں کے انتخاب میں پہلی ضروری چیز تو یہ ہے کہ ان کا وزن یکساں ہونا چاہیے، قریب قریب برابر ہونا چاہیے، ورنہ اگر ان کے وزن میں فرق ہوگا تو وہ کجاوہ سیدھا نہیں رہے گا، خود اونٹ کو بھی تکلیف ہوگی۔ آرام دہ سفر وہی ہے کہ دونوں سواریاں فزیکلی (جسمانی طور پر) بھی یکساں ہوں۔ یہ پہلی چیز تھی۔ اب جو سفر ہے وہ دو تین گھنٹے کا تو ہوتا نہیں تھا، وہ سفر تو مہینوں کا ہوتا تھا۔ اب ایک اونٹ کے اوپر یہ صرف دو شخص بیٹھے ہوئے ہیں، انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے پورا پورا دن، ہفتوں مہینوں۔ تو سیدھی بات ہے کہ ان میں خیالات اور مزاج کا بھی امتزاج ہونا چاہیے، موافقت ہونی چاہیے، مطابقت ہونی چاہیے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو وہ آپ کو میر تقی میر (1721-1810AD) کا واقعہ یاد ہے۔ اس زمانے میں اکے<sup>1</sup> چلا کرتے تھے۔ دلی سے آگرہ کے لیے وہ بیٹھ گئے۔ اکے میں دو تین سواریاں ہوتی تھیں۔ ایک سواری یہ تھی۔ امیر آدمی تو پورا اکا کر لیتے تھے۔ یہ غریب آدمی تھے، سواریاں مل کے کرتے تھے۔ میر صاحب بھی بیٹھ گئے، دو سواریاں اور بیٹھ گئیں۔

### ۱ یکے ناگے

اب اکے نے چلنا شروع کیا۔ اب وہ جو سواریاں تھیں انہوں نے میر صاحب سے باتیں شروع کیں۔ تھوڑا وقت تو میر صاحب نے برداشت کیا۔ وہ ذرا آگے نظام الدین اولیاء تک ہی ابھی پہنچے ہوں گے تو اکے والے سے کہا کہ بھئی! ٹھہر لینا میاں۔ یہ اپنے پیسے لے

لو تم مجھے یہاں اتار دو۔ اس نے کہا کہ میرا صاحب! کیا ہوا؟ کہا کہ نہیں، کچھ نہیں ہوا، اتار دیجیے۔ کہنے لگے: پھر بھی بتائیے کہ کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ بھائی! میں نے آگرے تک پہنچنے کے لیے اکا لیا تھا، زبان خراب کرنے کے لیے نہیں لیا تھا۔

میرا صاحب کو تو ان کی باتیں سننے سے زبان کی خرابی کی احتیاط برتنا پڑی۔ یہ جو سفر کا ساتھی ہوتا ہے اور ساتھی بھی وہ جس نے سارا دن اکٹھے رہنا ہے اور مہینوں بھر تک چلنا ہے اس کے لیے یہ کتنا ضروری ہے کہ وہ جو اس کے ساتھی ہوں ان میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ موافقت اور مطابقت رکھنے والے ہوں۔ بہترین کارواں سالار وہ سمجھا جاتا تھا جو پہلے ان دو ایسی ہی سواریوں کا صحیح صحیح انتخاب کرے اور پھر جو ارباب کارواں بنتے ہیں وہ جو قافلے کی پوری سواریاں ہیں ان کے متعلق بھی صحیح انتخاب کرے کہ کوئی اس قسم کا آدمی درمیان میں نہ آجائے جو خواہ مخواہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے فساد ہی پیدا کرتا رہے، سازشیں کرتا رہے۔ یہ سارا کچھ اس کو کرنا پڑتا تھا۔ یہ جو قافلے کے اندر سواریوں کا انتخاب تھا اسے عرب اپنے ہاں ترمیل کہا کرتے تھے اور ایسا کرنے والا مزمل کہلاتا تھا۔

وحی کے پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عمل ترمیل کی ضرورت ہوتی ہے

وحی کا پروگرام آیا تو اس کے بعد عمل ترمیل شروع ہوا اور یہ ہے جو خدا نے کہا کہ يٰۤاَيُّهَا الْمُؤْمِنُ (73:1) اوکارواں سالار! او سواریوں کا صحیح انتخاب کرنے والے! اب تمہاری اجتماعی زندگی شروع ہو رہی ہے اس جماعت کے اندر جو تمہارے ہاں ارکان آرہے ہیں ان کا صحیح انتخاب کرنے والے! تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کے ساتھ اس طرح سے ہم فکر ہم خیال قلب و نگاہ کی صحیح تبدیلی والے! یوں جو قافلے کے اندر تم انتخاب سے اپنے ہاں کارواں بنا رہے ہو، عین اس دنیا کے سفر میں نئے کارواں بنانے والے کارواں سالار! ہمیں پتہ ہے کہ تمہارے سامنے بہت بڑا پروگرام ہے۔ اب قرآن کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب برپا کر کے نظام خداوندی کی عملی تشکیل کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ یہ بڑا اہمیت طلب اور صبر آزما مرحلہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (73:5) ایک کمر توڑ دینے والا پروگرام تمہارے سپرد کیا گیا ہے، بہت بڑا پروگرام ہے اور اس پروگرام کے لیے پہلا درجہ یہ ہے کہ جو قرآن تمہیں دیا جاتا ہے اس کی روشنی میں ایک ایسی جماعت بناؤ کہ جن کے اندر قلب اور نگاہ کی ہم آہنگی ہو۔ یہ اس قسم کی جماعت بنانے والے کو مزمل کہا جاتا ہے۔ کہا کہ پروگرام اتنا بڑا یعنی قَوْلًا ثَقِيْلًا ہے تمہارے سامنے بہت بڑا وزنی، بہت بڑا بھاری پروگرام ہے۔

یہ پروگرام کیا تھا؟ اب آپ کہیں گے کہ آگے چلا گیا ہے۔ اگلی ہی سورۃ میں ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (74:1)۔ کیا بات

① اے وہ کہ جس کے ذمے عالم انسانیت کو سنوار کر ایک جہان نو کو وجود میں لانے اور اس طرح حق کے نظام کو ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1379)۔

ہے! وہاں بھی یہی ترجمہ کیا جاتا ہے: وہی کملی اوڑھنے والا، وہی لحاف اوڑھنے والا۔ ہمارے ہاں اس کا بھی یہی ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ چیز تھی جو کبھی گئی۔

انسانیت کو زندگی کے حقیقی مفہوم سے آشنا کرنے والی عظیم ہستی مدرثر اور خداوندی پروگرام عربوں کے ہاں جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں بھی خزاں کا موسم ہے پورے خزاں کے موسم کے بعد جب ایک پتی بھی کہیں درخت پہ نہ رہے تو اس میں سے پھر نئی زندگی کا پیغام لانے والے بہار کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ یہ خزاں کے بعد نئے شگوفے پھوٹنے کی نئی بہار لانا، عربوں کے ہاں تدشیر کا عمل کہلاتا تھا۔ یہاں مدرثر کہا کہ اے وہ کہ جو کائنات کے خزاں دیدہ باغ کے اوپر بہارِ نولانے کا پیغام لے کے آئے ہو! قُمْ اٹھ۔ وہاں ہے کہ قُمْ (74:1)۔ یہ مدرثر تھا اور یہاں ہے قُمْ (74:1) اٹھ۔ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (73:5) بہت بڑا پروگرام ہے۔ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا<sup>1</sup> (73:7)۔ یہاں سَبْحًا طَوِيْلًا آیا ہے۔ اب سچ سے ہوئی تسبیح۔ تو ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ سَبْحًا طَوِيْلًا معنی لمبی لمبی تسبیحیں۔ تو پروگرام بتایا کہ راتوں کو اٹھ کر یہ لمبی لمبی تسبیحیں کیا کرو: قُمْ اَلَيْلًا اِلَّا قَلِيْلًا (73:2)۔ آپ تفسیریں اور ترجمے دیکھ لیجیے گا اور پھر وہ حدیثیں بھی کہ حضور ﷺ ساری ساری رات کھڑے رہا کرتے تھے عبادت میں پاؤں سوچ جایا کرتے تھے۔ رات کو تو یہ کرتے تھے۔ دن کو کیا کرتے تھے؟ کہا کہ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (73:7) لمبی لمبی تسبیحیں پھیرا کرتے تھے قصہ ختم ہوا۔ کہا کہ دن کا یہ پروگرام ہے۔

عزیزانِ من! سچ کے معنی ہوتا ہے ”کسی مقصد کے حصول میں پوری پوری توانائیوں سے کوشش کرنا۔ وہ گھوڑا جو دوڑتے وقت تیرنے والے کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں آگے بڑھاتا ہے اور پوری قوت کی چال چلا کرتا ہے“ عربوں کے ہاں اسے سچ کہتے تھے۔ ”یہ جو تیراک پورا ہاتھ یوں کر کے تیرتا ہے“ اسے سچ کہا کرتے تھے۔ یہاں کہا کہ دن میں تیرا پروگرام اتنا ہے کہ پوری توانائیوں کے ساتھ تجھے مصروفِ عمل رہنا پڑتا ہے سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ پروگرام کی اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ دن میں تو اس (نافذ) کرنے کے لیے اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لیے یہ سب کچھ کیا جائے۔ جو بڑا پروگرام ہے اس میں پھر رات کی تنہائیوں میں اگلے دن کے پروگرام کے لیے سوچا جاتا ہے۔ یہ تھا جو رات کو ہوا کرتا تھا۔ کہا کہ تھوڑا حصہ رات کا سو بھی لیا کرو دن میں بڑے لمبے لمبے کام اور پروگرام تمہارے ذمے ہیں اور وہاں یہ کہا کہ تیری بے تابی تمنا کا تقاضا تو یہ ہے کہ کسی طرح سے شباشب پورا ہو جائے لیکن یہ شباشب پورا ہونے والی بات نہیں:

① پھر یہ بھی کہ دن میں تجھے مخالفتوں کے جھوم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں تیرے سامنے اتنے کام ہوتے ہیں کہ تجھے سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے (لہذا جن امور کے لیے قدرے سکون کی ضرورت ہو ان کے لیے دن میں وقت ہی نہیں مل سکتا) (پرویز: مفہوم القرآن ص 1375)۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب  
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

یہی رسول ﷺ کی بے تابی تمنا کہ سارا دن کام ساری رات اس کے اوپر غور و فکر نہ کھانے کی سوجھتی ہے نہ پینے کی نہ صحت کا خیال۔ وہ جو صبر طلبی عشق کو جانتا تھا وہ کہہ رہا ہے کہ تھوڑا بہت سو بھی لیا کرو بڑا مہاجر ہے بڑا المہاجر گرام ہے اس میں دن رات لگے گا فوری شباشب نہیں ہو جائے گا۔ یہاں ہے عزیزانِ من! وَ رَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلاً (73:4) قرآن پر یہ عمل تدریجی طور پر ہوگا۔ یہ ہے وہ ترتیل، مربوط کڑیاں، ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی آئے گی۔ یہ اس لیے ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہم اس کو نازل بھی اسی طرح آہستہ آہستہ بتدریج کر رہے ہیں کیونکہ اس کے اوپر عمل بھی ترتیل کرو یعنی ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی، دوسری کے بعد تیسری کڑی۔ جو پروگرام بھی ایک سوچے سمجھے نقشے کے مطابق عمل میں لایا جائے گا، اس کا طریقہ ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کرو اور پھر کہا کہ یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں اس میں یہ بات نہیں ہے کہ یونہی ہم نے جب ایک آیت نازل کر دی اس کے بعد پھر دوسرا قصہ لے آئے اس کے بعد ایک اور چیز لے آئے۔ وہ یوں نہیں ہے کہ وہ ریسلنگ (کشتی) کی طرح، ایک بڑے بکس کے اندر، بہت سی کنڈلیاں ڈال کے ان کو گنڈا کر دیتے ہیں، تو پھر کوئی ایک نکالتے ہیں۔ یہ اس طرح سے قرآن کی آیتیں نہیں آئی ہیں۔ یہ ایک پروگرام کے ماتحت مربوط ہے۔ پورے کا پورا قرآن عزیزانِ من! الحمد سے والناس تک یہ مربوط کتاب ہے لیکن:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا (اقبال)

یہ تو گہرے غور و تدبر کی بات ہے کہ قرآن کے اندر ایک آیت کا دوسری آیت کے ساتھ نظم ہے ایک سورۃ کا دوسری سورۃ کے ساتھ ربط ہے۔ تو دین کا یہ پروگرام آپ کے سامنے ہو تو پھر پتہ چلتا ہے ورنہ اگر یہ چیز نہ ہو تو واقعی یہ بڑا بے ربط سا نظر آتا ہے۔

### تفہیم آسمانی کا باہمی ربط مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی نظر میں

آپ کو تو شاید یاد نہ ہو مجھے تو یاد رکھنا پڑتا ہے دیر کی بات ہے کہ کراچی کے ریڈیو اسٹیشن سے جو درس قرآن ہوتا تھا، صبح وہاں بہت بڑے علامہ صاحب مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب تھے۔ ان کا درس ہوتا تھا۔ قرآن کی یہی بات آگئی کہ کسی نے پوچھا ہوگا کہ جی یہ کیا قصہ ہے آدم کا؟ قصہ آ رہا ہے اس کے بعد دیکھیے قریش کا ایک واقعہ آ رہا ہے درمیان میں لوط ◆ کا بیان آ رہا ہے پھر نوح ◆ کا سفر آ رہا ہے پھر آسمان کے ستاروں کا ذکر آ رہا ہے کہ یہ اس طرح کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں اصل میں بات یہ ہے کہ یہ تم سمجھتے نہیں ہو کہ یہ قرآن جو ہے اس کے نزول کا طریقہ کیسے تھا، یوں سمجھو جیسے دسترخوان پہ باپ بھی بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور ساتھ بچہ کھانا کھا رہا ہوتا ہے اور باپ وہ کھانا بھی کھا رہا ہوتا ہے اور ان کو بتاتا ہے کہ بیٹا! دیکھو، بیچ بولنا چاہیے اور فریب نہیں دینا چاہیے، تو بچے کے ہاتھ سے شور بے کا وہ ایک چھینٹا دسترخوان پہ پڑتا ہے انگلیاں بھی اس کی دانتوں سے کٹ جاتی ہیں تو باپ کہتا ہے دیکھو بیٹا! طریقے سے کھاؤ ذرا احتیاط سے کھاؤ، تم نے سارا دسترخوان خراب کر دیا اور اس طرح سے اب اس کو ذرا اچھی طرح سے پونچھو اور پھر وہی کہہ دیکھو بیٹا میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ کہنے لگے قرآن شریف کچھ اس طرح نازل ہوا ہے۔ یہ کہ اللہ میاں نے دسترخوان تے نال بٹھایا اے نبی

نوں۔<sup>①</sup> (معاذ اللہ، معاذ اللہ)۔ میں اس سے زیادہ کیا کہوں وہ جو کہہ گیا ہے کہ

مکتب و مِلّٰ و اسرارِ کتاب  
کویرِ مادرِ زاد و نورِ آفتاب<sup>②</sup>

پیدائشی اندھا ہے اور سورج کی روشنی ہے، کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جو قرآنِ کریم کے نزول کی حکمت بالغہ یہ بیان فرمائیں کہ وہ یوں تھا۔ وہ بچے کو ساتھ بٹھایا ہوا درمیان میں یہ باتیں بھی ہوتی تھیں تو اس کے متعلق بھی تو کچھ کہنا ہوتا تھا۔ وہ یہ کہتے تھے اور پھر اس کے بعد اپنی بات کہ اتنے میں بچہ کچھ اور انگلی کاٹ لیتا تھا، پھر اس کے بعد اس کے متعلق کہتے، دیکھا زبان کاٹ لی تم نے۔ میں نے کہا تھا آہستہ آہستہ نوالہ چبایا کرو اور پھر یہ چیز میں کہہ رہا تھا کہ وہ قومِ عاد کے ساتھ کیا ہوا، وہ میں پھر قصہ باقی اب سناتا ہوں تمہیں (معاذ اللہ، معاذ اللہ)۔

### قرآن حکیم کے تعلیمی ربط کے سلسلہ میں قندیل آسمانی کی اپنی شہادت

اب بات آگئی وَ رَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا (25:32) ہم نے اس کو نازل بھی کیا ہے ایک خاص ربط قائم رکھتے ہوئے، کڑی درکڑی اور تمہیں بھی اس کے اوپر جو پروگرام تمہارے سامنے ہے اس پر عمل کرنا ہے: وَ رَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا (25:32) قرآن کی تمام تعلیم، باہدگر مربوط ہے اور ایک خاص نظم و ضبط کے ساتھ سلسلہ در سلسلہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک مسلسل پروگرام کو اسی ترتیب کے ساتھ سامنے آنا چاہیے تھا۔ اسی لیے تم بھی وَ رَتَّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا (73:4) اس قرآن کے اوپر کڑی بہ کڑی، درجہ بہ درجہ، منزل بہ منزل اس طرح سے عمل کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ تو کہا کہ اس لیے یہ سارا قرآن ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہو گیا۔ ان کو بتائیے کہ یہ ایک انقلابی پروگرام ہے، فساد انگیزی نہیں ہے، تمہارے جذبات کو بھڑکا کے یہاں میں نے خونی زبانیں نہیں کرائیں، میں نے تو قلب و نظر کے اندر ایک انقلاب پیدا کرنا ہے، میں نے تو عالمگیر انسانیت کے اندر ایک انقلاب پیدا کرنا ہے، اور وہ سب سے پہلی چیز ہے کہ انقلاب برپا کرنے والوں کے اندر میں نے ایک انقلاب پہلے پیدا کرنا ہے۔ یہ ہے میرے نزدیک عملِ ترمیم جو میں نے بتایا ہے: ایک ایسا کارواں تیار کرنا ہے جس نے نوعِ انسانی کے لیے امامت کا کام دینا ہے اس لیے یہ کام بتدریج ہوگا، ٹھیک ہے:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک<sup>③</sup>

لیکن وہ بات غلط ہے یہ تو غالب<sup>③</sup> تھا۔ وہ جو بے تابی تمنا تھی کہ

① اللہ تعالیٰ نے دستِ خوان پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بٹھالیا ہے۔

② اس کا اگلا ہی شعر ہے: دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد دینِ ملائی، سبیل اللہ، فساد (جاوید نامہ: اقبال)

③ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869AD)

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک



انہیں پتہ تھا کہ ہم جنیں گے تیری زلف کے سر ہونے تک۔ یہ تھا اعتراض یہ تھا اس کا جواب۔

### عمل پیہم کے استحکام کی خاطر قلبی سکون کی اہمیت اور تیز رفتاری کا دور

اس کیفیت کے درمیان میں یہ ہے کہ لُنْثَبَتْ بِهِ فُؤَادُكَ (25:32) اس طرح سے خود تیرے دل کو بھی تثبیت حاصل ہوتی رہے تقویت حاصل ہوتی رہے استحکام حاصل ہوتا رہے۔ یہ بڑی چیز تھی۔ یہ کس طرح سے حاصل ہوتا ہے؟ کہا کہ کسان سے پوچھیے کہ بیج بونے کے بعد پانی دینے کے بعد دھوپ کا انتظام کرنے کے بعد اس کی حفاظت کرنے کے بعد پھر وہ ہر روز جب آتا ہے تو تریلا ہے جس طرح سے یہ پودا بڑھ رہا ہوتا ہے یعنی سارا دن ساری عمر اس پودے کے اوپر آپ بیٹھے رہیں کبھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ بڑھتا کیسے ہے اور بڑھ رہا ہوتا ہے غیر محسوس غیر مرئی طور پر لیکن کسان کی آنکھ جب آ کے دیکھتی ہے کہ اب اس میں یہ چیز ہوئی پوچھیے کہ اس سے اس کے دل کو کتنی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس کی کوششوں کا نتیجہ سامنے آ رہا ہوتا ہے۔ اگرچہ آ رہا ہوتا ہے ابھی اس شکل میں کہ باقی دنیا کو نہیں معلوم ہو رہا ہوتا اسے پتہ ہوتا ہے اور اگر کبھی وہ یہ دیکھے کہ صاحب! پندرہ دن یا مہینے کے بعد تو یہ پودے میں ہونا چاہیے تھا اگر وہ یہ چیز نہ ہو تو اسی دن وہ مایوس ہو جاتا ہے یا تو اس کو سنوارنے کی کچھ کوشش کرتا ہے۔ نہیں ہوتا تو مایوس ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ نتیجہ اس کے پروگرام کے مطابق نکلتا چلا جا رہا ہے تو اس سے حقیقت میں تقویت قلب حاصل ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ پروسیس ایسا ہے کہ ہوگا تو تدریجاً لیکن ہر منزل ہر قدم ہر درجہ یہ بتا دے گا کہ تمہارا قدم واقعی منزل کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اس سے تمہارے قلب کو تقویت حاصل ہوگی۔ اس لیے قرآن کو ہم بھی بتدریج نازل کر رہے ہیں تم بھی اس پروگرام کو بتدریج منزل تک پہنچاؤ۔

ایک دن میں نے وہ بات چھیڑی تھی کہ یہ جو ہمارا نوجوان طبقہ ہے ان میں ایک تو عمر کا تقاضا ہوتا ہے ایک یہ ہمارے ہاں <sup>①</sup> Age of speed ہے یہ دور ہی رفتار کا ہے۔ ہم ان ہوائی جہازوں کو دیکھ دیکھ کے یہ کہہ رہے تھے مگر اب تیز رفتاری کی تو کیفیت یہ ہے کہ کوئی تصور میں بھی نہیں لاسکتا تھا کہ Sound (آواز) سے بھی زیادہ رفتار سے ہوائی جہاز تیار ہوا ہے۔ یہ جو چاند اور مریخ کی طرف جانے والے ہیں ان کی رفتار کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ان چیزوں کا اثر انسان کے ذہن پہ بھی ہوتا ہے۔ ہماری جنونو جوان نسل ہے وہ اس دور میں ہی آئی ہوئی ہے۔ ان کا ذہن بھی اتنی تیزی سے کام کر رہا ہے۔ وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ صاحب! یہ جو قرآن کا پروگرام ہے آپ درس دیتے ہیں قرآن کی تعلیم کو بھی عام کرتے ہیں یہ سب کچھ ہے لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا بھئی! یہ دیکھیے بیزاری کتنی تیزی سے پیدا ہو رہی ہے۔ اب آپ یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے تو تغیر نفس ضروری ہے اس کے لیے نفسیاتی تبدیلی ضروری ہے کتاب و حکمت کی تعلیم ضروری ہے اس کے بعد ایسے افراد آئیں گے کہ جو وہ نظام قائم کریں گے۔ وہ کہتے ہیں: خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک:

① رفتار کا زمانہ

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

(غالب)

جب تک تم یہ اس قسم کے آدمی تیار کرتے رہو گے اس وقت تک تو صاحب! وہ خاک ہو جائیں گے یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا۔ وہاں تو کسی طرح سے بس وہی اسپید کی سی بات ہے۔

عزیزانِ من! جو تغیرِ نفس ہے اس کا علمائے نفسیات سے پوچھیے۔ یہ بڑا لمبا وقت لیتا ہے۔ آپ کسی سائیکالٹرسٹ (نفسیاتی امراض کے ماہر) کے پاس ایک چھوٹی سی شکایت لے جا کے دیکھیے۔ وہ مریض کہتا ہے کہ راتوں کو نیند نہیں آتی، دماغ چکر کھاتا رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کتنی جیسے Sitting کہتے ہیں، وہ دیتے ہیں۔ ایک ایک Sitting دو دو گھنٹے کی بھی ہو سکتی ہے، برسوں لگ جاتے ہیں ایک مریض کے اوپر اور وہ تو پھر بھی انہوں نے یہ جو طبیعی اعصاب ہیں Nerves ہیں ان کی اصلاح کرنی ہوتی ہے۔ جس طبیب نے نفسیاتی اصلاح کرنی ہو قلب و نگاہ میں تبدیلی لانی ہو سوچے کتنا وقت اس کے اوپر لگتا ہے۔ آپ تیزی کر کے دیکھ لیجیے، جھکڑ تو چل جائیں گے، بادِ نسیم نہیں چلے گی۔ تو قرآن کا پروگرام ہے قلب و نگاہ کی تبدیلی پیدا کرنا۔ اس کے لیے ہے کہ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلًا<sup>1</sup> (73:4)۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ یہ جو اعتراضات کرتے ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں، تم بھی دیکھ رہے ہو، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم بالکل مطمئن رہو اور ان کی باتوں سے نہ گھبراؤ۔

### قرآن کی مخالفت کا جواب خود قرآن حکیم دیتا ہے

اب دیکھیے کہ اعتراض کا جواب کون دے رہا ہے؟ کہا کہ وَ لَا یَاْتُوْنٰکَ بِمِثْلِ اِلَّا جِئْنٰکَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا (25:33) یہ جو اعتراض بھی کرتے ہیں، ہم اس کا جواب دیتے ہیں اور نہایت عمدہ توازن برقرار رکھتے ہوئے حق و صداقت کے ساتھ حسین ترین طریقے سے جواب دیتے ہیں۔ وہ ایسا واضح اور مدلل ہے کہ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہاں تفسیر کا لفظ آیا ہے، ہم قرآن کی تفسیر کرتے ہیں، ہم اس کا جواب دیتے ہیں۔

خدا کیوں جواب دیتا ہے وہ خود کیوں تفسیر کر رہا ہے غور طلب بات ہے۔ قرآن میں یہ ہے کہ اے رسول ﷺ! تم دلدراشتہ نہ ہو۔ جو تمہارے خلاف یہ کہتے ہیں یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے، یہ ہماری کتاب پہ اعتراض کرتے ہیں۔ جب ہماری کتاب پہ اعتراض ہے تو ہمارا

① راتوں کو ان مجالس میں تو انہیں قرآن کو اس طرح سمجھا کہ اس کا حسن ترتیب اور نظم و ربط ابھر کر ان کے سامنے آ جائے۔ پھر اسی ترتیب اور نظم و ضبط کے ساتھ اسے عمل میں لاتے چلے جاؤ۔ (ہم نے قرآن کو جس حسن ترتیب و تناسب کے ساتھ مربوط کیا ہے (25:22) اسی حسن نظم و ترتیب کے ساتھ تم اس پر عمل کرتے چلے جاؤ۔) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1374)۔

فریضہ ہے کہ ہم جواب دیں۔ کیا بات ہے صاحب! ہم اس کا جواب دیں گے اور یہ ہے وہ چیز کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ یہ تفسیر کرنی ہی

مصنف کو چاہیے۔ کہتا ہے کہ ہم اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو نازل کیا ہے۔ دوسری جگہ (75:19) میں کہا۔

### نبی اکرم ﷺ نے قرآن حکیم کتابی شکل میں نوع انسانی کو دیا تھا

بات پیچھے سے چلی آرہی ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ<sup>①</sup> (75:17)۔ یہ جو کہتے ہیں کہ قرآن کو جمع نہیں کیا گیا، اکٹھا نہیں کیا گیا تھا، صحیح نہیں ہے۔ میں نے پچھلے درس<sup>②</sup> میں بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کے متعلق یہ بات آپ کے ہاں چلی آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس کو ایک مرتب شکل میں جمع کر کے ایک جگہ کتاب کی صورت میں نہیں دے کر گئے تھے یہ کتاب یونہی بکھری ہوئی سی تھی، کچھ ہڈیاں تھیں، کچھ پتے تھے جن پہ یہ لکھی گئی تھی:

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

آپ ﷺ وہ ایسے ہی چھوڑ گئے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ اس کے متعلق میرا ایک مضمون آرہا ہے۔ یہ اسی پرچے<sup>③</sup> میں میرا ایک خصوصی مقالہ آیا ہے: ”قرآن کے خلاف گہری سازش“۔ اس میں یہ ساری چیزیں آئی ہوئی ہیں اسے دیکھ لیجیے گا۔ میں یہاں یہ کہہ رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ تو خود ایک طرف، جس نے اس کو کتاب کہہ کر پکارا ہے وہ یہ الفاظ ہیں: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ (2:2) یہ ایک کتاب ہے۔ پہلی چیز پھر عربوں کی آجائے کہ یہ عرب منتشر اوراق میں، لوہے کا کڑا ڈال کے ایک طرح سے ان کی شیرازہ بندی کر کے اکٹھا کرتے تھے۔ اب بھی آپ نے دیکھا ہوگا وہ اس قسم کے کوئی پیڑ سے بنے ہوئے آتے ہیں جس میں وہ لوہے کے چھلے ہوتے ہیں تو وہ منتشر اوراق میں عام پور پر لوہے کا چھلا ڈالتے تھے ہرن کی پتلی سی کھال تھی وہ اس کے اوپر لکھتے تھے اور اس کے بعد منتشر اوراق میں لوہے کا ایک چھلا ڈالتے تھے۔ جب منتشر اوراق میں لوہے کا چھلا ڈال دیتے تھے تو پھر ان اوراق کو کتاب کہتے تھے۔ یہ تو عربی زبان کے خلاف ہے کہ آپ کتاب کہیں اور کہیں کہ منتشر اوراق تھے اور وہ بھی کوئی ہڈیوں پہ، کوئی پتوں کے اوپر، کوئی کاغذوں کے اوپر تھے۔

### کتاب مبین کا جمع کروانا اس کی وضاحت کرنا اور اسے محفوظ رکھنا خود خدا کے ذمہ ہے

کتاب کو دینے والا جو خود مصنف ہے وہ کہتا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ (75:17)۔ اوبھئی! اس کا یہ جمع کر دینا بھی ہمارا ہی ذمہ ہے ہم نے اس کو مرتب کتاب کی شکل میں دینا ہے عزیزانِ من! آپ کے مضامین کے جواب اب ہوتے ہیں جو کتاب کے Chapters

① قرآن کا جمع کرنا اور بحفاظت رکھنا ہمارے ذمے ہے۔

② دیکھیے اسی کتاب کا ساتواں باب

③ ماہانہ مجلہ طلوع اسلام فروری 1978ء

(ابواب) ہوتے ہیں آپ ان کی ترتیب بگاڑ دیجیے۔ آپ دیکھیے کہ کتاب کا سارا مفہوم گڈ ہو جاتا ہے۔ یہ خدا نے اپنے ذمہ لیا تھا اور

اس کے بعد ہے کہ **ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ** (75:19) اس کی توضیح اس کی وضاحت ہمارے ذمے ہے۔ بیانہ کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو ابھار کر نکھار کر واضح طور پر بیان کرنا۔ یہ لفظ بیان جو ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں: مبین بینات کتاب مبین یہ سب اسی سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ** (75:19)۔ نازل بھی ہم نے کیا اور اس کو جمع بھی ہم نے کرایا اور اس کے بعد اس کی وضاحت ہمارے ذمے ہے۔ یہی ہے قرآن کی وضاحت جو میں نے کہا ہے یہ اس نے خود کہا ہے کہ تشریف آیات کے ذریعے ہم قرآن کے ایک مقام کی دوسرے مقام سے وضاحت کرتے ہیں۔ قرآن یوں سمجھ میں آتا ہے۔

### قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے والوں کے لیے بتویب القرآن نہایت مفید ثابت ہوگی

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ میں نے تو قرآن کے ساتھ شغف رکھنے والے غور و فکر کرنے والے احباب کی محنت کو بچانے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ میری ”بتویب القرآن“ ہے کہ ایک مقام پہ اس میں جو کچھ قرآن نے کہا ہے اسے اکٹھا کر دیا ہے۔ اس میں یہ کیا گیا ہے کہ سارے قرآن میں اس کے متعلق کہاں کہاں کیا گیا ہے۔ یہ ہے قرآن کا انداز۔ **وَ أَحْسَنَ تَفْسِيرًا** (25:33) نہایت صحیح توازن رکھے ہوئے مدلل اور واضح تفسیر نہ اس میں کمی ہے نہ زیادتی ہے اس میں توازن ہے۔ حسن کار انداز سے ہم نے خود اس قرآن کی تشریح کر دی ہے اور کہا کہ اسی لیے جو اعتراض تم پہ کیا جاتا ہے اس کا جواب ہم دیتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اعتراض ہماری کتاب پہ کیا جاتا ہے جواب ہمارے ذمے ہے۔ کہا کہ ان لوگوں کی کیا کیفیت ہے؟ اس کے لیے یہ بڑی اہم آیت آرہی ہے۔

### جہنم کی اصل حقیقت اور اہل جہنم کی پہچان

جہنم کے متعلق میں متعدد دروسوں میں بار بار اس کی حقیقت کو واضح کرتا چلا آ رہا ہوں۔ قیامت کا جہنم ہے، اخروی جہنم ہے مرنے کے بعد کا جہنم ہے۔ یہ برحق ہے جنت جہنم پر ہمارا ایمان ہے۔ قرآن اس زندگی کے اندر بھی آپ کو جہنم کی زندگی بتاتا ہے۔ قرآن کریم پہ غور کیجیے گا ان لوگوں کی علامت بتاتا ہے جن کو وہ اہل جہنم کہتا ہے جو یہاں بھی جہنم کی زندگی بسر کر رہے ہیں: **وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى** (17:72) جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں کا بھی اندھا ہوگا۔ یہاں کا جہنمی وہاں کا بھی جہنمی ہوگا۔ یہ آیت جہنمی کی علامت بتا رہی ہے کہ **وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ** (7:179) یہ شہری ہوں یا یہ خانہ بدوش صحرائی بدو ہوں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی زندگی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ یہ اہل جہنم ہیں۔ وہ بتا دیتے ہیں کہ جہنم میں رہ رہے ہیں ان کی یہ جہنم کی زندگی اتنی بڑی اہم علامت یہ پہچان لینے کی ہے کہ یہ جہنم کی زندگی بسر کرنے والے کون ہیں؟ کہا کہ **لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا** (7:179) ہم نے ان کو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت دی تھی یہ اس سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سے کام نہیں لیتے تھے۔ **وَلَهُمْ**

أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا (7:179) ہم نے انہیں آنکھیں دی تھیں کہ راستے میں دیکھ کے چلو۔ یہ اندھا بن کے راستے کے اوپر چلتے ہیں وَلَهُمْ أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا (7:179) ہم نے انہیں کان دیئے تھے کہ بات کو سنو پھر اسے پرکھو۔ یہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ ہیں اہل جہنم۔ قرآن کہتا ہے کہ أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ (7:179) یہ انسان، شکلیں تمہیں انسانوں کی نظر آتی ہوں گی۔ یہ انسان نہیں، حیوان ہیں اور تاکید کے لیے کہا ہے کہ بَلْ هُمْ أَصْلُ (7:179) حیوان بھی اپنی جبلت (Instinct) کے مطابق تو چلا جاتا ہے، یہ کجخت ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ کن کو اہل جہنم کہہ رہا ہے؟ انہیں جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سے کام نہ لیں، اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں، اپنے کانوں سے نہ سنیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ جہنم کے داروغے ان سے پوچھیں گے کہ بھئی! تم جو اس طرح سے جہنم کے اندر دھکیلے جا رہے ہو تم نے کون سا اتنا بڑا جرم کیا تھا؟ ذرا ہمیں بتاتے تو جاؤ۔ وہ سپرنٹنڈنٹ جیل پہلے دیکھ لیتا ہے کہ بھئی! کس جرم میں ملوث تھے، جو تم یہاں قید میں آئے ہو، جہنم کا داروغہ پوچھے گا کہ کیا جرم تھا جو یہاں آئے ہو؟ سنیے ان کا جرم، انہوں نے کہا کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ (67:10) اگر ہم بات کو گوش طلب سے سنتے اور اس پر غور و فکر کرتے تو کبھی جہنم میں نہ آتے۔<sup>1</sup> قرآن یہ کہنے کے لیے آیا ہے۔ وہ تو مومن کی نشانی ہی یہ بتاتا ہے۔

### ایمان کا انگریزی ترجمہ Faith غلط ہے

یہ سورۃ الفرقان کی 72 ویں آیت کے اندر ہے۔ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ مومن کون ہوتے ہیں۔ آپ مومن کی Definition سننا چاہتے ہیں، اہل جہنم کا بھی ذکر ہم نے سن لیا۔ ہمارے ہاں ایمان کا ترجمہ Faith کیا جاتا ہے۔ Faith تو بالغیب ہے جو آنکھیں بند کر کے کسی چیز کو مان لینا ہے۔ یہ ایمان مسلمہ ہے جو چلا آ رہا ہے۔ ہمارے ہاں ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ یہ وہ ہے جس میں آدمی کی فکر غور عقل شعور کا کوئی دخل نہ ہو، بس وہ آنکھیں بند کر کے مان لینا ہے، بس اس کا نام ایمان ہے، آؤ قرآن سے پوچھیں کہ وہ ایمان والے کسے کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ (25:73) مومن وہ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (25:73) وہ انہیں بھی آنکھیں بند کر کے، کان بند کر کے، اندھے بہروں کی طرح، نہیں مانتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایمان کس کو کہتے ہیں۔ اس کا Faith ترجمہ ہی غلط ہے، اس کا وہ ترجمہ عیسائیت کا

① اس کی مکمل تفصیل و تشریح کے لیے ملاحظہ کیجیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، پارہ 29 (مکمل)، ادارہ طلوع اسلام

رجسٹرڈ لاہور، 2006، سورۃ الملک، ص 29 تا 96

تصور ہے۔ اس کا ترجمہ Conviction ہے اور Reason (حکمت) پر مبنی ہے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ آپ میں سے اہل علم اس کو

Appreciate (پسند) کریں گے۔ Reason (حکمت) کسے کہتے ہیں؟ Reason (حکمت) کی دو لفظوں کے اندر Definition (تعریف) یہ ہے: To think objectively یعنی کسی بات کے سوچنے میں بھی اپنے داخلی جذبات کو دخل نہ دینا۔

### اہل جہنم کی آنکھیں سامنے کی بجائے پیچھے کی طرف ہوں گی

یہ قرآن ہے اب اہل جہنم کی بات تو ہم نے دیکھ لی کہ وہ الَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ (25:34) جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ کس طرح لے جائیں گے؟ کہا کہ سیدھے منہ آدمی جاتا ہے تو پھر آنکھیں سامنے ہوتی ہیں راستہ دیکھتا چلا جاتا ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں، اوندھے منہ والے لوگ، آنکھیں رکھنے کے باوجود نہ دیکھ سکنے والے ہوں گے۔ دوسری جگہ (33:66) میں ایک اور لطیف پیرائے میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ کہا کہ انسان کے دیکھنے والی آنکھیں تو سامنے کی طرف ہوتی ہیں مگر يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ (33:66) جہنم میں اہل جہنم وہ ہیں کہ جن کے چہرے الٹا دیئے جاتے ہیں ان کی آنکھیں ان کے سامنے کی بجائے گدی میں لگی ہوئی ہوتی ہیں، پیچھے کی طرف لگی ہوئی ہوتی ہیں؟

### قدامت پرست یا ماضی پرست اقوام کی حالت زار

یہ پیچھے کی طرف آنکھیں کیا ہیں؟ یہیں اس نے واضح کر دیا ہے کہ سامنے آنکھیں ہوتی ہیں تو آپ کا حال بھی روشن ہوتا ہے پاؤں کے نیچے آپ دیکھتے ہیں، مستقبل بھی روشن ہوتا ہے، سامنے کا راستہ بھی روشن ہوتا ہے۔ اگر آنکھیں پیچھے لگی ہوئی ہوں تو ماضی تو آپ کا روشن ہوتا ہے، حال اور مستقبل دونوں تاریک ہوتے ہیں۔ ماضی پرست، قدامت پرست، اسلام پرست، اقوام مذہب پرست ہوتی ہیں۔ ان اقوام کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کا ماضی تو بڑا روشن ہوتا ہے: فلاں حضرت صاحب نے یہ فرمایا جی فلاں نے یہ کچھ کہا، اوجی وہ دور سبحان اللہ نور علی نور تھا، وہ دور جی ایمان والوں کا تھا۔ ان کا سارا قصہ ماضی کا قصہ ہوتا ہے، ماضی سارا روشن ہوتا ہے، ہمیشہ ماضی کی طرف دیکھیں گے اور اپنے زمانے کو بھی گالیاں دیں گے۔ تو آنے والوں کا اس سے پھر بدتر ہوگا کہ ہر آنے والا دور پہلے دور کے مقابلے میں بدتر ہے، ماضی روشن ہے، ہر اہل مذہب کے ہاں آپ پچھلوں کی کہانیاں سنائیں گے۔

کوئی بھی مذہب ہو آپ دیکھیے کہ اس کے پیروکار ہمیشہ پچھلوں کے دور کو بتائیں گے کہ وہ صحیح انقلاب برپا کرنے والا دور تھا۔ میں کیا عرض کروں اس آیت کے ساتھ ہی قرآن اگلا ٹکڑا ملا کر لے آیا، ورنہ جس<sup>①</sup> نے اتنا انقلاب آفریں دعویٰ کیا تھا، اُس نے یہ نہیں کہا تھا

① یہ اشارہ نبی پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

کہ یہ پچھلا دور وہ تھا اور وہ تھا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ میرا زمانہ سب سے بہتر ہے۔ کیا بات ہے اس دور کی! یہ حضور ﷺ نے فرمایا مگر انہوں

پہلے دور کے انسان اور آج کے انسان میں فرق

عزیزانِ من! بکری جس قسم کی پہلے دن بکری تھی، آج کی بکری بھی ویسی ہی بکری ہوگی۔ پہلے دور کا انسان غاروں میں رہتا تھا درختوں کی ٹہنیوں پہ شاخوں پہ رہتا تھا، پتوں سے جسم ڈھانتا تھا، یہی گھاس پھوس یا کچا گوشت کھاتا تھا۔ وہاں سے انسان چلا ہے آج چاند<sup>2</sup> پہ پہنچ رہا ہے۔ کیا کاریگری ہے؟ کیا دونوں کا فرق ہے؟ حیوان اپنی زندگی کا تجربہ یا علم آگے منتقل نہیں کر سکتا، انسان اپنی زندگی کے تجربے کو آگے منتقل کر سکتا ہے، ہر دور کا ہر فرد اپنی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا جو تجربہ یا علم ہوتا ہے وہ آگے منتقل کرتا ہے۔ یہ جو علم یا تجربہ منتقل ہوا ہے، Snowball (تودہ برف) کی طرح یہ علم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس علم کی دیوار پہ ہر آنے والا دور ایک ردہ رکھتا ہے، دیوار اوپر ٹھتی ہے۔ یہ انسانوں کے نسل بانسل کا Accumulative knowledge (مجموعی علم) ہے جو آگے منتقل کیا ہوا ہے۔ آج کا انسان

② یاد رہے کہ 2 دسمبر 1942ء کو ایٹم (Atom) توڑا گیا۔ اس کے 15 سال بعد روس نے 4/ اکتوبر 1957ء میں اسپینک نامی مصنوعی سیارہ پہلی بار خلا میں بھجوا کر ایک عالم کو وسط حیرت میں غرق کر دیا۔ 2 بی سال بعد 28 فروری 1959ء میں امریکا نے پہلا منجر سیارہ خلا میں بھیجا۔ (حوالہ: خورشید عالم: خلا کا عالمی کردار، طلوع اسلام، فروری 1968ء، ص 40 تا 47)

غاروں میں بسنے والے کے مقابلے میں چاند میں جا کر بس رہا ہے۔ یہ کسی ایک فرد یا ایک دور کی کارگیری نہیں ہے یہ Accumulative knowledge (مجموعی علم) ہے۔ جب Knowledge (علم) کی Accumulation ہوگی تو علم و عقل کے اعتبار سے ہر زمانہ پچھلے زمانے سے آگے ہوگا۔ قرآن نے اسی لیے کہا ہے کہ قرآن سمجھنا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ سَنُرِيهِمْ اٰیٰتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) ہم ان کی اپنی دنیا میں انسانوں کے نفوس کے اندر اور باہر کی خارجی کائنات میں اپنی نشانیاں بے نقاب کرتے چلے جائیں گے اور ہر بے نقاب ہونے والی نشانی اس بات کی شہادت بنے گی کہ قرآن نے جو کہا تھا واقعی حقیقت ہے۔ خدا خود کہتا ہے کہ اس کے حقائق کا طریقہ یہ ہے۔ اس سے اس طرح وہ ثبوت تک پہنچیں گے کہ یہ جتنی بھی کائنات میں چھپی ہوئی ہماری مضمّن نشانیاں ہیں یہ بے نقاب ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ کیسے بے نقاب ہوتی ہیں؟ انسانی علم کے ذریعے سے بے نقاب ہوتی ہیں، فکر کے ذریعے سے بے نقاب ہوتی ہیں۔ اس علم و فکر کے اعتبار سے ہر آنے والا دور آگے ہوتا ہے۔

### انسانی عقل اور فکری علم کو صرف قرآنی سوچ ہی جلا بخشتی ہے

اگلی بات یہ ہے کہ وہ جو علم و فکر ہے قرآن کی روشنی میں اس سے کام لے کر جب آگے چلا جائے گا تو پھر انسانیت کی زندگی بھی منور ہوتی چلی جائے گی لیکن آنکھیں بند کر کے زندگی میں رہنا، اوندھے منہ چلنا، گدی کے پیچھے آنکھوں کا ہونا، اس سے آپ کے ہاں کا ماضی ہی ماضی روشن ہوتا چلا جائے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ ان حضرات کے ماضی کا روشن ہونا ٹھیک ہے۔ ان کی زندگیاں اپنی تھیں کیونکہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ (2:141) یہ لوگ تھے اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے کام کر کے چلے گئے۔ ان کے کاموں کا ان سے مواخذہ ہوگا، ان کا ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں۔ وَ لَا تُسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:141) ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ کہا کہ جہنم یہ ہے کہ پیچھے کی طرف کا دور روشن مگر یہ دور بھی تاریک، مستقبل بھی تاریک اور وہ تو قرآن کہتا ہے کہ جو اپنے دور میں زمانہ حال (Present) میں اندھا ہوگا تو وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهِ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ (17:72) یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا ہوگا۔

### امروز و فردا کے حالات انسانی سوچ کے لیے تازیانہ ہوتے ہیں

یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم صحیح راستے پہ جا رہے ہیں یا نہیں پہلا ٹیسٹ یہ ہے کہ آیا آپ کے ہاں کا امروز روشن ہے یا نہیں۔ جس کا امروز روشن نہیں ہے، اس کا فردا بھی روشن نہیں ہے:



وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا  
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے  
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا  
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

(اقبال: ضربِ کلیم)

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ (17:72)۔ یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ جہنم یہ ہے کہ جس میں اوندھے منہ چلیں گے، گدی کے اوپر آنکھیں ہوگی ہوئی ہوں گی۔ یعنی وہ اوندھے منہ، کشاں کشاں، جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔ اُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَ اضْلُّ سَبِيلًا (25:34) یہ وہ لوگ ہیں جو صحیح راستے سے بہت دور جا پڑے ہیں اور جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ انہیں اس مقام پر لے جائے گا۔ رہنے کی اس قدر بدترین جگہ ہے اس قدر گمراہی کی طرف لے جانے والا راستہ ہے۔ اس کا فائدہ تو انہی کو ہوگا جو عقل و بصیرت سے کام لیں۔ اس کے برعکس اگر عقل و فکر سے کام نہ لیا جائے اور اندھی تقلید کے اندر آگے چلا جائے تو وہ انہیں بدترین مقام پر لے جائے گا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الفرقان کی آیت 34 تک آگئے اور اس کے بعد اگلی آیات میں پھر قرآن یہ بتاتا ہے کہ یہ کشمکش جو پیچھے سے ہوتی چلی آئی تھی، کیا تھی؟ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



## نواں باب: سورة الفرقان (آیات 35 تا 40)



عزیزانِ من! آج فروری 1978ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 35 سے ہو رہا ہے: (25:35)۔

### قرآنِ حکیم کے تدریجی نزول کی حکمت

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں مخالفین کے اس اعتراض کے جواب میں کہ سارے کا سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا کہ ہمیں معلوم ہو کہ بالآخر ہمارا مقصد، منتہی، مطلوب و مقصود ہے کیا، نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے جواب دیا گیا تھا کہ یہ قرآن ایک پروگرام کے لیے نازل ہو رہا ہے، تمہیں بتدریج دیا جا رہا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس کی پہلی کڑی پر پہلے عمل کیا جائے گا تو اگلی کڑی پھر سامنے آئے گی۔ جس منزل تک بتدریج پہنچنا ہو اس کا طریق کار ہی یہی ہوتا ہے اور کیونکہ انبیائے کرام ؑ کے سامنے تو ایک عظیم الشان انقلاب ہوتا ہے، فساد برپا کرنا ہو تو اس کے لیے نہ کسی تدریج کی ضرورت ہے، نہ ترتیب کی ضرورت، وہ تو ایک جھکڑ چلتا ہے اور جہی تو وہ کہتے ہیں کہ یہ شباشب ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے، گرد کی طرح اٹھتا ہے، آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتا ہے لیکن انقلاب نے تو ایک قلبی تبدیلی پیدا کرنا ہوتی ہے، ایک عظیم انقلاب پیدا کرنا ہوتا ہے اور وہ بتدریج ہی منزل تک پہنچا جاسکتا ہے۔ یہ جو پروگرام ہے، میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تدریجاً دیا جاتا ہے۔

ان تدریجی مراحل میں یہ انقلاب لانے والا پیغامبر کرتا کیا ہے؟ یہ نہیں کہ وہ اس نظام کی کڑیاں سنوارتا ہے۔ نظام تو مشیت کے سامنے پہلے ہی ہوتا ہے، اس کے ذہن میں بھی ہوتا ہے۔ خارجی دنیا میں انقلاب لانے کے لیے فساد برپا کرنے کے لیے نہیں، فساد برپا کرنے کے لیے تو یونہی ہلا اور ڈگا ڈگا کیا جائے، فساد برپا ہوتا ہے۔ انقلاب لانے کے لیے ایک جماعت تیار کرنا ہوتی ہے اور تیار

کرنے کے معنی یہ نہیں کہ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں دی جاتی ہیں اور ان کو نشانہ بازی سکھائی جاتی ہے، نہیں بلکہ خود ان کے قلب و ذہن میں ایک انقلاب پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ سارا جواب ابتدائی مرحلہ ہے وہ اس پیغمبر کے لیے ہوتا ہے کہ **وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ** (2:129) وہ پہلے انہیں قانون کی تعلیم دیتا ہے ان کو پروگرام کی غایت سمجھاتا ہے اور اس کے بعد ان کی انسانی صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے ان کے اندر تغیر نفس کرتا ہے ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ جب یہ جماعت تیار ہو جاتی ہے تو اس کے بعد پھر وہ جو ٹکراؤ کی صورت ہے وہ نہیں پیدا کرتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ ٹکراؤ کے بغیر ہی یہ انقلاب برپا ہو جائے لیکن مفاد پرست جماعتیں تو اس طرح سے انقلاب نہیں پیدا ہونے دینا چاہتیں۔ ان کی تو ساری مفاد پرستیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ ٹکراؤ کے لیے آتی ہیں خواہ وہ ہجرت کر کے مکے سے مدینے ہی کیوں نہ چلا جائے وہ اس کے پیچھے آتی ہیں، یورش کر کے آتی ہیں، لشکر کشی کرتی ہیں، میدان جنگ میں آتی ہیں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے اس نے صرف سپاہ تیار نہیں کرنا ہوتی، اس نے انسان تیار کرنے ہوتے ہیں۔ اس کا پروگرام انسانیت سازی کا ہوتا ہے۔ اس دوران میں وہ ہم گل، ہم رنگ، افراد تیار کرتا ہے۔

آپ کو یاد ہے میں نے پچھلی دفعہ وہ کچھ بتایا تھا جو سورۃ مزمل کے اندر کہا گیا تھا کہ راتوں کو تھوڑا جاگا کرو۔ **إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا** (73:5) وہ ایک بہت بڑا بارگراں یعنی ایک انقلاب برپا کرنے کا کام تمہارے ذمہ کیا جا رہا ہے۔ **إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا** (73:7) تمہارے ذمے دن میں اتنا بڑا پروگرام ہوتا ہے کہ راتوں کو کچھ تھوڑا سا آرام بھی کر لیا کرو۔ اسی سورۃ میں ہے کہ تمہارے ساتھ **وَ طَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ** (73:20) دوسرے ساتھی بھی ہیں تو اکیلا نہیں ہے کہ راتوں کی تنہائیوں میں، حجرے میں بیٹھا ہوا، مصلے کے اوپر تسبیح پھیر رہا ہے۔ آپ کے ہاں سبحا طویلا کے معنی یہی کیے جاتے ہیں: سبح بھی اور سبحاً طویلاً بھی ہزار ہزار دانے کی لمبی تسبیح پھیرا کرتا ہے وہ یہ ہوتا ہے۔ مگر یہاں کہا کہ اس کے ساتھ اس کے جو ساتھی ہوتے ہیں ان کے متعلق ہے کہ **عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَّرْضِيٌّ ۖ وَ آخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَنْتَعُونَ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ ۚ وَ آخَرُونَ يَقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ** (73:20) اوبھئی! یہ تمہاری جماعت ایسی ہے کہ ان میں کمزور بھی ہوتے ہیں، کچھ بیمار بھی ہو جاتے ہیں، کچھ وہ بھی ہوتے ہیں جنہوں نے اپنا کچھ کاروبار بھی، کام کاج بھی کرنا ہوتا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ میدان جنگ میں بھی ان کو ٹکنا ہوتا ہے، تو اگر صورت یہ ہو کہ وہ سارا دن اس پروگرام کی عملی تشکیل کے لیے لگے رہے اور ساری رات پھر اس پروگرام کی ترتیب کو تدریج کو کڑیوں کو، سیکھنے سمجھانے میں، سلجھانے میں، لگے رہے تو اس طرح سے کتنے دن یہ بات چلے گی؟ یعنی خدا کو یہ کہنا پڑا کہ راتوں کو سو بھی لیا کرو۔ یہ ہے پروگرام جس کے لیے کہا کہ **قَوْلًا ثَقِيلًا** (73:5) یہ اتنا بڑا پروگرام تھا۔ جس وقت اس پروگرام کی تکمیل کے بعد یہ سبکدوشی ہوئی ہے تو خدا نے کہا ہے کہ **وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۚ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ** (94:2-3) ذمہ داریوں کے بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ خدا

نے تمہارے رفقا کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح تمہارا وہ بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ یعنی خدا نے تیرے اوپر سے وہ بوجھ اٹھالیا جس نے تیری کمر کو توڑ رکھا تھا۔

## وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ مَقَامِ بلند کس طرح حاصل ہوا؟

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں تو انبیائے کرام □ اور خود نبی اکرم ﷺ کی شان میں جو نعمتیں پڑھی جاتی ہیں، جو قصیدے پڑھے جاتے ہیں، ان کے مقام کی عظمت کو ہمارے سامنے لایا جاتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ قرآن کریم ان کے متعلق کہتا ہے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (94:4) اس سے بڑی نعت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم نے تمہارے ذکر کو بلند یوں تک پہنچا دیا۔ یہ ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح بلند یوں تک پہنچا تھا؟ اس نے کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا؟ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا، ادھر سے آیا، پیغام پہنچایا، پھر اگر کوئی معرکہ ہوا، تو اس کے فرشتے آئے، انہوں نے سر کر دیا، اس کے ذمے بھی ہوا تو کوئی معجزہ دکھا دیا۔ بس یہ دکھایا جاتا ہے۔ یہ چیزیں جس کے ہاتھوں سے رونما ہونی ہوں، اس بارگراں سے اس کی کمر ٹوٹے گی مگر ہمارے ہاں اس پتہ بوجھ ہی کوئی نہیں ہوگا۔ ادھر سے ایک حکم آیا، ساتھ ہی اس کے اس حکم کی تعمیل کرنے والے وہ فرشتے آگئے، معجزے آگئے، تو اس کے اوپر بارگراں کیا ہے؟ وہ بارگراں جس کے متعلق خود خدا کہتا ہے کہ اس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔ قَوْلًا ثَقِيلًا (73:5) یہ اتنا بڑا وزنی پروگرام ہے جو تمہارے سامنے ہے۔ یہ انبیائے کرام □ انقلاب آور ہستیاں ہوتی تھیں۔ یہ وعظ کہنے والے نہیں ہوتے تھے، تسبیحیں پھیرنے والے نہیں ہوتے تھے۔ یہ بہت بڑا انقلاب ہوتا تھا جسے لانے کے لیے یہ آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اے رسول! تیرا نام عزت و تکریم سے لیا جانے لگا، تیرا چرچا دور دور تک پھیل گیا۔ تو شرف و مجد انسانہ کی معراج کبریٰ تک پہنچ گیا اور قرآن کا پیغام بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔

## قرآن حکیم میں تاریخی حقائق بیان کرنے کا مقصد

عزیزانِ من! یہ کچھ کہنے کے بعد اب آئیے زیر نظر آیت کی طرف۔ اس میں یہ کہا کہ حق و باطل کی کشاکش کا یہ سلسلہ کچھ نیا نہیں۔ یہ شروع سے ہی چلا آ رہا ہے مثلاً وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيرًا<sup>1</sup> (25:35)۔ ویسے تو قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جہاں وہ ایک دعویٰ کرتا ہے، اس کی صداقت کی شہادت میں تاریخ کی داستانیں یا واقعات، انبیائے کرام اور سابقہ اقوام کی داستانیں پیش کرتا ہے اس لیے کہ اصل کے اعتبار سے تو یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ یہ حق و صداقت کی بنیادوں پر ایک انقلاب برپا کرنے کے لیے آتے تھے، مفاد پرست قوتیں اس کی مخالفت کرتی تھیں، بالآخر حق و صداقت کو کامیابی ہوتی تھی۔ یہ تھا جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ زمان و مکان کے Context (سیاق) کے اندر یہ چیز جگہ بدلے گی، حالات بدلیں گے، انسان بدلیں گے لیکن اصل

حقیقت یہی ہے جو حضرت نوح ﷺ سے نبی اکرم ﷺ تک چلی آئی۔ قرآن کریم تاریخ کے ان واقعات کو اس لیے بتاتا ہے۔ مخالفین سے یہ کہتا ہے کہ تم ان تاریخی واقعات کو جانتے ہو۔ ابھی ابھی بات آئے گی کہ تم تو ان کی اجڑی ہوئی بستیوں میں صبح و شام گزرتے ہو ان کے کھنڈرات کے اوپر لکھی ہوئی ان کی داستانیں پڑھتے ہو تو اس کے بعد بھی تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو وہی کچھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ اس کے لیے وہ سابقہ داستانیں دہراتا ہے اور ادھر جو اس پیغمبر کے ساتھی ہوتے ہیں قرآن نے ان کا تثبیت قلب کہا ہے۔ خود رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ لَنْ تُنْشِئَ بِهِ فُؤَادَكَ (25:32) اس کے خوشگوار نتائج سے تمہیں بھی تثبیت قلب حاصل ہو، مجموعی حاصل ہو کہ واقعی حق کی علمبردار جو جماعتیں ہیں مشکلات کا سامنا تو انہیں کرنا پڑتا ہے لیکن آخر الامر کامیابی اور کامرانی انہی کے حصے میں آتی ہے۔ ادھر تو یہ یقین ہوتا ہے اور ادھر مخالفین کو یہ تنذیر اور تنبیہ ہوتی ہے کہ اگر تم نے اس روش کو نہ بدلا تو تمہارا انجام بھی یہی ہوگا جو اقوام سابقہ کا انجام ہوا ہے۔ یہ ہے جو قرآن اس کے ساتھ واقعات بیان کرتا ہے۔ انبیائے سابقہ میں سے ہر ایک نبی اپنے مقام کے اوپر اسی قسم کا انقلاب برپا کرنے کے لیے آیا تھا۔

### قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ ﷺ اور فرعون کی داستان کو کیوں نمایاں حیثیت حاصل ہے؟

ان داستانوں میں صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰ ﷺ اور فرعون کی کشمکش کو بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ

① ہم نے موسیٰ ﷺ کو ایک ضابطہ حیات دیا تھا اور (چونکہ اس کے پیشِ نظر ہم بڑی سخت تھی اس لیے) ہم نے اس کے بھائی ہارون ﷺ کو بھی اُس کے ساتھ کر دیا تھا تاکہ وہ اس کا بوجھ بٹائے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 823)۔

ہے کہ انسانیت کے سینے کا کا بوس بن کر جو تین لعنتیں سوار ہوئیں وہ بڑی ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ یوں کہیے کہ اگر ان Categories (اقسام) میں تقسیم کرنا ہو، حصوں میں بانٹنا ہو تو وہ تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں: پہلی چیز ملوکیت کی لعنت۔ اس کا ترجمہ بادشاہت نہیں ہے۔ ملوکیت انسانوں کی انسانوں پر حکومت ہے، خواہ اس کی شکل اور نام کچھ بھی ہو۔ دوسری چیز مذہبی پیشوائیت۔ ملوکیت کی حکمرانی انسانوں کے اجسام پر ہوتی ہے، وہ ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالتا ہے، وہ انسان کے ایک پیکر جسم کو حوالات میں بھیجتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت ان کے قلب و دماغ کو اپنی زنجیروں میں جکڑتی ہے، یہ بڑی سخت قسم کی غلامی اور محکومی ہوتی ہے۔ یہ دوسری قسم کی لعنت ہوتی ہے اور تیسری قسم نظامِ سرمایہ داری کی لعنت ہے، جو ان کو بھوکوں مارتی ہے یعنی وہ نظامِ درحقیقت ان کو اس قسم کی غلامی کے لیے تیار کرتا رہتا ہے، انہیں سرکس کے شیر کی طرح بھوکوں مارتا ہے پھر وہ اشارے کے اوپر جوجی میں آئے ان سے کراتا رہتا ہے۔ یہ حقیقت میں تینوں کی ملی بھگت ہوتی ہے ان میں سے ایک ایک لعنت بھی انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لیے کچھ کم زور آ رہی ہیں لیکن جہاں یہ تینوں اکٹھی ہوئی ہوں تو آپ سوچے

کہ ان کے نیچے تڑپتی پھڑکتی انسانیت کا کیا حشر ہوگا۔ حضرت موسیٰ ﷺ کے زمانے میں یہ تینوں لعنتیں بیک وقت بیک زماں اکٹھی ہو گئی تھیں: فرعون کی ملوکیت، ہامان کی مذہبی پیشوائیت، قارون کا سرمایہ داری کا نظام، اور ان کے تابع بنی اسرائیل کی قوم۔ اور یہ تھا وہ انقلاب جس کے لیے حضرت موسیٰ ﷺ کو تیار کر کے بھیجا جا رہا تھا۔<sup>1</sup> آپ سوچتے ہیں کہ حضرت موسیٰ ﷺ ایک محکوم قوم کا فرہے، وہاں سے ”بھاگا“ ہوا ہے اور اس کے ذمے یہ اہم پروگرام عائد کیا جاتا ہے کہ جاؤ فرعون کی طرف کیونکہ اِنَّهُ طَغٰی (20:24, 43) وہ تو ساحل نا آشنا ہو چکا ہے سیلاب بن چکا ہوا ہے جاؤ اس کی طرف۔ یہ مقام نبوت ایسے ہی نہیں ملا کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے اور پھر اس کے بعد ساری دنیا ان کے حضور سجدہ ریز ہو اور قیامت تک ان کی مدح و ستائش کرتی رہے۔

### نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی داستانِ موسیٰ ﷺ کے جہادِ زندگی کی ہی مثل تھی

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ انبیائے کرام کیا کرنے کے لیے آتے تھے۔ اب سمجھ میں آیا جو کہا تھا کہ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا تَقِيْلًا (73:5) تم پہ ایک بہت بارگراں بھاری بوجھ والا پروگرام عائد کیا جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم میں اکثر و بیشتر مقام پر نبی اکرم ﷺ یا جماعتِ مومنین کو جب اس پروگرام کی یاد دہانی کرائی گئی تو ساتھ حضرت موسیٰ ﷺ کا واقعہ بطور شہادت، بطور صداقت پیش کیا گیا۔ ہم یہاں بھی پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے یہ کہا تھا کہ یہ قرآن اس لیے تدریجاً نازل ہو رہا ہے کہ تیرے ذمہ ایک بہت بڑا پروگرام ہے جس کی کڑیاں طے کرنا ہیں اور اس کے بعد آگے ہے کہ وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗ اَخَاهُ هٰرُونَ وَزِيْرًا ۝ فَقُلْنَا

1 اس مکمل داستان کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ طہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005۔  
اَذْهَبَا اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا<sup>1</sup> (25:35-36) اور یہاں بھی جو سورۃ مزمل میں پچھلی دفعہ آپ نے دیکھا تھا کہا کہ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا تَقِيْلًا (73:5)۔ اس کے بھی آخر میں جا کے کہا گیا ہے کہ اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا لَا شَهِدَا عَلَيْكُمْ كَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا<sup>2</sup> (73:15)۔ یہاں بھی وہی بات کہی گئی ہے کہ جس طرح فرعون کی طرف ہم نے اپنا ایک رسول بھیجا تھا اے اہل عرب، اہل دنیا! تمہاری طرف اسی قسم کا ایک رسول بھیجا جا رہا ہے۔ تو گویا یہاں بھی یہی چیز کہی گئی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مختلف مقامات پر جہاں پوری اہمیت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا پروگرام سامنے لایا گیا ہے اس کے بعد صاحبِ ضربِ کلیم ﷺ اور فرعون کی اس آویزش کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔ ابھی میرے ذہن میں بات آئی کہ سورۃ ابراہیم 14 ویں سورۃ کی ابتدا ہی اس سے کی گئی ہے کہ الرَّٰفِعُ كَتَبَ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (14) یہ کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ تو نوعِ انسانی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ یہ تاریکیاں کیا ہیں؟ یہ روشنی کیا ہے جس کی طرف

پھر یہ رسول انسانیت کو لاتا ہے؟ وہ بتایا کہ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ<sup>3</sup> (14:5)۔ یہ وہی الفاظ ہیں: موسیٰ ♦ کو بھی ہم نے اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا تاکہ وہ انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ ♦ کی یہ جو کشمکش کی داستان ہے وہ تو بڑی تفصیل سے قرآن کے اندر آئی ہے اور وہ یہی داستان ہے: ملکیت مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری میں جکڑی ہوئی انسانیت۔ یہ تاریکیوں کے اندر تھی۔ اس میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت ہو تو اس کے بعد ”ایناں بیچاریاں نوں فیر کوئی سمجھدا ای نہیں“ کچھ دکھائی نہیں دیندا“ کچھ نظرای نہیں اونداء“<sup>4</sup> تاریکی یہ ہے۔ روشنی کی طرف لے آؤ بڑی چیز ہے۔

- 1 ہم نے موسیٰ کو ایک ضابطہ حیات دیا تھا اور (چونکہ اُس کے پیش نظر مہم بڑی سخت تھی اس لیے) ہم نے اس کے بھائی ہارون کو بھی اس کے ساتھ کر دیا تھا تاکہ وہ اس کا بوجھ بٹائے۔ ہم نے ان دونوں بھائیوں سے کہا تھا کہ وہ اس قوم کی طرف جائیں جو ہمارے قوانین کی (کھلے بندوں پوری سرکشی کے ساتھ) تمکذب کرتی ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 823)۔
- 2 اے رسول! تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ نہ یہ مقصد جس کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے کوئی نیا مقصد ہے اور نہ ہی مخالفین کا ایسا انجام کوئی نرالا انجام ہے۔ اس قسم کی انقلاب آفرینی کے لیے سابقہ انبیائے کرام آتے رہے اور اسی قسم کا انجام ان کے مخالفین کا ہوا۔ ان میں موسیٰ ♦ کے ہاتھوں کا لایا ہوا انقلاب اور فرعون کا انجام بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے اس مقصد کے لیے تمہیں ان لوگوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ تو ان کے اعمال کی نگرانی کرے اور دیکھے کہ یہ کون سی روش اختیار کرتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص 1376)۔
- 3 اسی سچ (14:1) کے مطابق ہم نے موسیٰ ♦ کو اپنے ضابطہ قوانین کے ساتھ بھیجا۔ وہ بنی اسرائیل کو موت کی تاریکیوں سے نکال کر زندگی کی روشنی کی طرف لے آئے۔
- 4 ان بیچاروں کو کوئی کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے۔ انہیں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا، کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

### قوموں کی موت و حیات کا راز، فساد اور انقلاب کے قرآنی مفہوم سمجھنے میں مضمحل ہے

میں یہ عرض کر دوں بار بار میں اس چیز کو کہتا ہوں کہ یہ انقلاب فساد نہیں ہوتا۔ فساد کی تو قرآن نے سخت مذمت کی ہے لہذا جب تک فساد اور انقلاب میں فرق نہیں سمجھا جائے گا کسی قوم کی حالت نہیں بدلی جاسکتی۔ فساد تو بنی بنائی عمارتوں کو کھنڈرات میں تبدیل کرتا ہے انقلاب ان کھنڈرات سے نئی عمارت کی تعمیر کرتا ہے۔ یہ بڑا لمبا پروسیس ہوتا ہے۔ اس کا ایک پہلا حصہ وہ ہے جو غیر محسوس ہوتا ہے اور لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ کچھ ہو رہا ہے۔ قلب اور دماغ کی تبدیلی غیر محسوس ہوتی ہے اندر ہی اندر یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ پروگرام کا یہ حصہ یہ پیریڈ یہ عرصہ حقیقت میں دوسرے حصے کے مقابلے میں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اس حصے میں صلاحیتیں برومند ہو جاتی ہیں ان کی نشوونما ہو جاتی ہے اندر تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ پھر ان کو عملاً بروئے کار لانے کا وقت آتا ہے۔ وہ محسوس ہوتا ہے وہ ٹکراؤ ہوتا ہے مسالہ تیار ہوتا ہے

یوں سمجھیے کہ کسی کے پاس یہ ہتھیار اوزار اسلحہ اور ساری چیزیں تیار ہوں، فوج ٹرینڈ ہو، یہ انتظامات مکمل ہوں، پھر میدان جنگ میں جانا ہو تو اس وقت یہ میدان جنگ کا مرحلہ پہلے مرحلے کے مقابلے میں آسان ہوتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کے متعلق حضرت موسیٰ ﷺ کی بات مثال کے طور پر سامنے آئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسی کی وضاحت سے یہ پروگرام جو حضور ﷺ کے سامنے تھا، سمجھ میں آئے گا۔

سورۃ طہ میں (20:15) سے بات ہو رہی ہے۔ طور کی چوٹیوں کے اوپر، جہاں انہیں کہا جا رہا ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ، وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے، بڑے لطیف پیرائے میں ایک بات یہاں قرآن نے کہی ہے۔ وہ ہے الساعۃ کی بات۔

### الساعۃ قرآن حکیم کی ایک بنیادی اصطلاح ہے

قرآن کی ایک اصطلاح الساعۃ ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے بتایا تھا کہ جب کوئی بات تیزی سے نمودار ہو کر سامنے آ جائے، تو وہ الساعۃ ہوتی ہے۔ یہ جو انبیائے کرام ؑ کے ہاتھوں پروگرام نمودار ہوتا ہے، اس کا پہلا حصہ جب ختم ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس نے مرنے یعنی محسوس طور پر جب سامنے آنا ہوتا ہے، وہ ہے مرحلہ جہاں الساعۃ کہا جاتا ہے۔ وہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ جو تینوں انسانیت کی ہڈیاں توڑنے والی قوتیں تھیں، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت یعنی ہامانیت اور قارونیت، یہ جو کچھ اندر ہی اندر ایک لمبے عرصے سے کر رہی تھیں، ان کے لیے حضرت موسیٰ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكْثَادٌ أُخْفِيهَا (20:15)۔ الساعۃ کی اندر ہی اندر یہ تیاریاں بہت عرصے سے ہو رہی تھیں۔ محکوم قوموں میں بھی اگر تھوڑا سا احساس بیدار ہو جائے تو ایک وقت آ جاتا ہے جب انہیں محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ ہمیں کس حالت تک پہنچایا جاتا ہے۔ کہا کہ إِنَّ السَّاعَةَ (20:15) وہ الساعۃ آنے والی ہے۔ أَكْثَادٌ أُخْفِيهَا (20:15) اس سے پیشتر وہ نگاہوں سے پوشیدہ تھی اب ہمارا پروگرام یا ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ وہ نمودار ہو کر سامنے آ جائے۔ کیا بات کہی ہے خدا نے! کہ اس الساعۃ کی تیاریاں تو ایک عرصے سے ہو رہی تھیں۔ محکوم قوم پہ آہستہ آہستہ اتنے مظالم ہو رہے تھے کہ وہ اب اس اسٹیج پر پہنچی ہے، یہ مظالم ایک عرصے سے ہو رہے تھے، ادھر ایک عرصے سے حضرت موسیٰ ﷺ کی اسی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے بھی تربیت ہو رہی تھی۔ یہ نہیں ہے کہ یہ سارا عرصہ جتنا ہے وہ جنگلوں میں بکریاں ہی چراتے پھرتے تھے۔ اگر اتنے عظیم پروگرام کے لیے کسی کو تیار کرنا ہے تو اس کام کے لیے ان کو اس لیے نہیں رکھا جائے گا کہ جاؤ بارہ بجے تک بکریاں چراؤ۔ اصل یہ ہے کہ مصر میں فرعون کی نگاہوں کے نیچے رہتے ہوئے وہ اس قسم کی تیاریاں کر ہی نہیں سکتے تھے، وہ کرنے ہی نہیں دیتا تھا۔ کون کرنے دیتا ہے اس قسم کی تیاریاں! ان کی سی آئی ڈی کی نگاہیں تو گھروں کے اندر تک ہوتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہاں سے نکل جائے۔ کہا کہ أَكْثَادٌ أُخْفِيهَا (20:15) اب وہ وقت آ گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مرنے کی طرح سامنے آ جائے۔ اتنا پہلا عرصہ جو ہوتا ہے وہ اس کی تیاریوں کا عرصہ ہوتا ہے۔ بڑے



خوبصورت انداز میں کہہ گیا ہے۔ اس<sup>①</sup> کو تو انداز ہی خوبصورت نصیب ہوا تھا کہ

بَا نَشْءٍ دُرُوشِی در ساز و دَمَا زن

یہ جو تیاری کی اسٹیج ہے وہ اسے نشہ درویشی کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ یہ اندر کی نشوونما اور صلاحیت اور تغیر ہے۔

بَا نَشْءٍ دُرُوشِی در ساز و دَمَا زن

چو پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن<sup>②</sup>

اس پروگرام کے لیے جو پختہ شدن ہے دوران میں بانشہ درویشی ساز، قسم کا فقر اور استغنی لازم ہے۔ اور یہ جو اندر کے تغیرات کی تمام تیاریاں ہیں ان کے ساتھ یہاں چوں پختہ شوی کہا ہے۔ جب اس کے اندر پوری Maturity (پختگی) حاصل ہو جائے تو اس کے بعد بر سلطنتِ جم زن ہے جو متضاد موقوفوں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دے۔

## قرآنی انقلاب کا مقصد و منتہی

یہ ہے وہ السَّاعَةِ اٰتِیَةٌ اٰكَاذُ اُخْفِیْہَا (20:15)۔ اور ساتھ ہی میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ قرآن ہے۔ اس نے اتنا ہی نہیں کہا

① یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

② جب تک انسان میں اپنی ذات (سیرت) کی پختگی پیدا نہ ہو جائے اسے مصاف زندگی میں متضاد موقوفوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ زندگی نام ہے:

زیرِ خاکستر شرار اندوختن شعلہ گردیدن نظر با سوختن (مثنوی اسرار خودی)

زندگی نام ہے: اپنی ذات کی مضر حرارتوں کو جو جسم کی خاکستر کے نیچے چھپی اور دبئی رہتی ہیں، کبجا کرتے چلے جانا اور اس طرح چنگاریوں کے مجموعہ سے شعلہ بن کر دوسروں کی نظروں کو جلادینا۔

کہ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ السَّاعَةِ یعنی وہ جو انقلاب ہے اب نمودار ہو جائے دو الفاظ کا آگے اضافہ کر دیا۔ فساد اور انقلاب کا جو مقصد و منتہی و ماحصل ہے اس کو بھی بیان کر دیا۔ کہا کہ یہ کاہے کے لیے کیا؟ اس لیے کہ لَتُجْزَی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (20:15) تاکہ ہر فرد کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے۔ یہ مقصد ہے اس انقلاب کا۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر دو اور بھی بڑے واضح الفاظ آئے ہیں۔ (20:112) میں کہا تھا کہ اس انقلاب کے بعد کیا چیز حاصل ہوگی؟ اس سے بھی پہلے (2:62) میں اس نظام کے تابع رہنے والے مومنین کی جماعتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ (2:62) نہ بیرونی خطرہ ہوگا نہ ان کو کسی قسم کی دلی افسردگی ہوگی، حزن بھی نہیں ہوگا، ملال بھی نہیں ہوگا، خوف بھی نہیں ہوگا۔ وہ اس بات سے مامون ہوں گے۔ یہ کس چیز کی سیکوورٹی (ضمانت) ہوگی؟ سنئے عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ وَمَنْ یَعْمَلْ مِنَ الصَّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ<sup>①</sup> (20:112)۔ اس پروگرام

پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَلَا يَخَافُ (20:112) ان کو کسی قسم کا خوف نہیں رہے گا۔ کس بات سے خوف نہیں رہے گا؟ اس کے لیے کہا کہ ظُلْمًا وَّ لَا هِضْمًا (20:112) نہ دھاندلی اور بے انصافی کا، Exploitation (سلب و مہب) کا۔

یہاں ہضمًا کا لفظ آیا ہے۔ آپ دیکھیں کہ ہم بھی کہتے ہیں کہ ہضم کر گیا۔ یہاں ظلم اور ہضم آیا ہے۔ ظلم تو عدل کے خلاف دھاندلی اور نا انصافی ہے جو قانون کے خلاف ہوتی ہے اور ہضمًا Economid یعنی معیشت کی چیز ہے۔ یہ وہی ہے جو وہاں (20:15) میں کہا تھا کہ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ ملے۔ یہاں کہا ہے کہ کسی کو بھی نہ دھاندلی کا، بے انصافی کا، لاقانونیت کا، ڈر ہوگا اور نہ ہی یہ ڈر ہوگا کہ اس کی محنت کو کوئی دوسرا ہضم کر جائے گا۔ یہ ہے اس انقلاب کا وہ مقصد، لیکن یہ پہلا مرحلہ ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اس انقلاب کی تیاری کا مرحلہ ہوتا ہے اور یہی اس تیاری کے مرحلے میں سورۃ مزمل میں کہا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کتنی زیادہ مشقتیں اٹھانا پڑتی ہیں، صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں، یہ بڑا المباصرہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں نبی اکرم ﷺ کی یہ جنوبت کی تیس سال کی زندگی ہے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے: 13 سالہ مکی زندگی اور اس کے بعد 10 سالہ مدنی زندگی۔

ہماری تاریخی کتب نبی اکرم ﷺ کی شان میں مغربی مفکرین کی گستاخیوں کے لیے اسلحہ خانہ ہے مغربی مفکرین، مورخین، مستشرقین کے لیے نادانستہ یا دانستہ طور پر ہماری تاریخی کتب نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخیوں کے لیے اسلحہ خانہ ہیں اس لیے کہ ہم نے ان کو تاریخ اس قسم کی دی ہے کہ وہ بھی اگر اس نتیجے پہ پہنچ جائیں تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ ہم نے خود ان کو یہ میٹرل (مواد) دیا ہوا ہے۔ یاد رکھیے، یہ لوگ جو کچھ ہمارے خلاف یا نبی اکرم ﷺ کی شان اقدس میں گستاخیاں لکھتے ہیں یہ اپنی طرف سے کچھ وضع نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کی وہ کتابیں ہیں جنہیں ہم بڑا ہی قابل استناد، معتمد علیہ، مقدس گنتے ہیں، یہ سارا

❶ اور جو شخص خدا کے ضابطہ قوانین کی صداقت کو تسلیم کر کے صلاحیت بخش کام کرے گا۔

میٹرل (مواد) ان میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو پہلی مکی زندگی تھی، یہ تو واقعی ایک اللہ والی زندگی تھی، ایک مذہب پرست انسان کی زندگی تھی، عبادتیں کرتے رہتے تھے، نفل پڑھتے رہتے تھے، تسبیحیں پھیرتے رہتے تھے، لوگوں کو وعظ کرتے رہتے تھے، نصیحتیں کرتے رہتے تھے کہ بھئی! بھلے ہو جاؤ، برائیاں نہ کرو۔ یہ سب کچھ تو بڑی ٹھیک ٹھاک زندگی تھی۔ یہ کچھ کرتے کرتے انہوں نے پلٹا کھایا۔ یہ جتنے بھی مغرب کے مورخین آپ دیکھیں گے، انہوں نے جو حضور ﷺ کی لائف پر کتب لکھی ہیں، ان میں اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جب مدینے پہنچے تو وہاں جا کر ان کو بہت سے حالات سازگار نظر آئے، کچھ اپنے ساتھی ساتھ لے گئے، کچھ وہاں کے لوگ ساتھ ملے۔ حالات وہاں سازگار تھے، ان کے مقابلے میں عیسائی اور یہودی تھے جو سپاہ گری اور فوج کے فن سے واقف نہیں تھے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ قریش کے مقابلے میں ان کو سر کر لینا کچھ مشکل نہیں۔ ان کے دماغ میں مملکت بنانے کا خیال ابھرا اور اس سے انہوں

نے فائدہ اٹھایا۔ یہ ہے تاریخ جوان کو پیش کی جاتی ہے۔ ہم کہہ دیتے ہیں کہ متعصب عیسائی ہیں۔ آپ کے ہاں بھی اگر آپ دیکھیں گے تو مکی اور مدنی زندگی اسی طرح تقسیم کی ہوئی ہے۔ معاف کیجیے اگر میں اسے بتائے بغیر آگے چلوں تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔

### مودودیؒ کے نزدیک حضور ﷺ کی زندگی کا عکس

عزیزانِ من! وہ مورخین، مفکرین اور مستشرقین تو پھر غیر ہیں، دشمن ہیں، انہوں نے تو یہ کہنا ہے اور یہ جو میں اب آپ کو اپنوں میں سے بتا رہا ہوں کہ یہ کیا کہتے ہیں یہ غیر بھی نہیں کہہ سکے۔ مجھے پھر مجبوراً نام لینا پڑتا ہے۔ مودودی صاحب<sup>①</sup> نے بھی حضور ﷺ کی زندگی پیش کی ہے۔ انہوں نے 1941ء میں اپنی جماعت بنائی۔ اس میں اچھے اچھے لوگ جمع ہوئے۔ 1956ء میں انہی کے ہاں کے بڑے بڑے اکابرین میں سے ایک گروہ ان سے الگ ہوا اور الگ ہونے سے پہلے انہوں نے ان پر اعتراضات کیے۔ سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے جماعت بنائی ہے تو آپ بڑے بلند آہنگ اصول دیتے تھے: مساوات کے، احترامِ انسانیت کے، دیانت کے، تقویٰ کے۔ ہم ان اصولوں کو دیکھ کر آپ کے ساتھ ہوئے تھے۔ اب جو یہاں آپنچے ہیں اور آپ کے سامنے حصولِ اقتدار کا مقصد آ گیا، تو آپ نے ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور جو کچھ دوسری سیاست میں ہوتا ہے وہی کچھ آپ کرنے لگ گئے ہیں۔ وہ سارے اصول ہی ختم کر دیئے بالائے طاق رکھ دیئے۔ آپ کو پتہ ہے کہ انہوں نے اس کا جواب کیا دیا۔ یہی ہے وہ مقام جہاں میں نے کہا ہے کہ کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ کہنا پڑتا ہے جواب یہ ہے لکھا ہوا موجود ہے۔ کہا کہ میں نے اگر یہ کیا ہے تو کوئی انوکھی بات نہیں کہی، میں نے تو اتباعِ سنتِ رسول اللہ ﷺ کیا ہے۔ اچھا جی! کہا کہ آپ نے دیکھا نہیں کہ رسول اللہ ﷺ مکی زندگی میں مساواتِ انسانیتِ احترامِ آدمیت کے نہایت بلند و بالا اصول دیتے رہے اور آپ ﷺ نے کوشش بھی کی کہ کچھ مساوات کے نمونے بھی دکھا دیئے جائیں۔ وہاں مکی

① مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)

زندگی میں آپ ﷺ یہ سارے اصول پیش کرتے رہے۔ مدینے کی زندگی میں آ کر جب مملکت ہاتھ میں آئی، تو ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر آپ ﷺ نے کہا کہ مملکت میرے خاندانِ قریش کے اندر رہے گی۔ مساواتِ انسانیت کے سارے اصول بالائے طاق رکھ دیئے۔ میں نے اگر یہ کیا ہے تو کیا جرم کیا ہے۔ (یا اللہ) سنیے عزیزانِ من! یہ مکی اور مدنی زندگی کو یوں تقسیم کیا جا رہا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ اس قسم کی گستاخی کی حد تک تو کوئی مغربی مستشرق بھی نہیں پہنچا تھا۔ یہ اس شخص ﷺ، معاف رکھیے میں شخص کہہ رہا ہوں اس ذاتِ اقدس کے متعلق کہہ رہا ہے جو ان تمام مخالفین کے بھرے مجمع میں ان کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ ﷺ کے دعوے کی سچائی اور صداقت کا ثبوت کیا ہے کہہ رہی ہے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (10:16) میں

نے تو اس دعویٰ کرنے سے پہلے بھی تمہارے اندر اپنی ایک عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس عمر سے اندازہ نہیں لگا سکتے ہو کہ وہ زندگی ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُونَ (10:16) عقل و فکر سے کام لے کے دیکھو۔ وہ شخص جو اپنی زمانہ قبل از اسلام کی زندگی یوں پیش کر رہا ہے۔ اسے تو یوں کہیے کہ اَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (6:163) تو وحی آنے کے بعد حضور ﷺ نے کہا ہے تو اس سے بھی پہلی زندگی بحیثیت صرف ایک انسان کے دشمنوں کے سامنے اپنے دعویٰ نبوت کی صداقت میں پیش کر رہے ہیں اور کوئی اس کے خلاف ایک انگلی نہیں اٹھا رہا ان کے متعلق (معاذ اللہ! معاذ اللہ) یہ کہنا کہ مکی زندگی کے اندر تو وہ اس قسم کے بلند و بالا اصول پیش کرتے رہے تاکہ لوگ اس طرح سے ساتھ آجائیں اور جب مملکت ہاتھ میں آئی تو کہا کہ یہ تو میرے خاندان قریش میں رہے گی باہر نہیں جائے گی۔ عزیزان من! رسول ﷺ تو ایک طرف رہا ایک شریف انسان کی زندگی بھی اس طرح حصوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ جو کیریکٹر ہے وہ تو ایک Indivisible Unit (نا قابل تقسیم وحدت) ہوتا ہے۔ شہد کا ہر قطرہ میٹھا ہوتا ہے اس کے الگ الگ حصے نہیں کیے جاسکتے۔

### نبوت کی زندگی کا پہلا دور اندرونی تبدیلیوں کا دور ہوتا ہے

یہ جو نبوت کی زندگی ہے اس میں بھی حصے نہیں ہوتے۔ یہ جو انقلاب لانے کے لیے پہلا دور ہوتا ہے وہ اندرونی تبدیلیوں کا دور ہوتا ہے جماعت سازی کا دور ہوتا ہے انسانیت سازی کا دور ہوتا ہے۔ منزل تو کہا ہی اس لیے تھا۔ میں نے پچھلی دفعہ <sup>①</sup> کہا تھا کہ منزل تو بہترین قافلہ سالار ہے جو چن چن کے افراد کا رواں کو اپنے ساتھ ملاتا ہے ان کی ایک ایک چیز کی نگہ پرداخت کرتا ہے۔ یہ قافلہ بنانے کی تیاری انسانیت کی تیاری اپنے ساتھیوں کے قلب و نگاہ کے اندر ایک تغیر پیدا کرنا تھا۔ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ (2:129) کا دور تھا۔ یہ اکیلے رسول ♦ کا کام نہیں تھا یہ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ ☐ کا کام تھا۔ یہ جو والذین معہ ☐ تھے یہ ان کی تیاری کا

① اسی کتاب کے آٹھویں باب میں۔

دور تھا اور یہ بھی نہیں کہ مکہ مدینے میں جا کر پھر یہ دور ختم ہو گیا۔ یہ دور تو آخر تک آگے چلتا رہا ہے لیکن بہر حال اس دور میں جسے ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر نظر کچھ نہیں آتی یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ سماعت تو آ رہی تھی لیکن وہ نگاہوں سے پوشیدہ تھی وہ یہ تیاریاں تھیں یہ کیریکٹر بنایا جا رہا تھا اس قسم کے انسان تیار کیے جا رہے تھے۔

### مخالف قوتوں کی طرف سے مخالفت کی وجہ جواز

اس تیاری کے اندر تو پ و تفنگ کی تو باری ہی نہیں آتی اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کچھ کرنے کے بعد پھر وہ اگلا مرحلہ آتا ہے جب مخالف قوتیں یہ بھانپ لیتی ہیں کہ یہ تو ایک نیا نظام قائم کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو وہ پھر میدان میں آ جاتی ہیں بلکہ قرآن

کریم نے تو دوسری جگہ خود ان کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ جو کچھ یہ انسانیت کش مظالم و جرائم کرتے ہیں وہ اپنا نتیجہ اندر اندر پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ (21:11) میں ہے۔ یہ بڑی اہم آیات ہیں۔ اپنی قوت کے نشے میں بدست ہو کر یہ نہیں محسوس کرتے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا نتیجہ ایک دن تباہی ہوگا۔ اندر ہی اندر یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ جب وہ اگلا مرحلہ آتا ہے جب یہ تیار ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ ہو گیا۔ یہ وہی ہے جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ حکیم صاحب یا ڈاکٹر صاحب کے پاس جا کر مریض کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ صاحب! رات کو تو اچھا بھلا سویا تھا اور صبح اٹھا ہے تو اتنا شدید درد اٹھا ہے صاحب! کہ ہوش نہیں آ رہا، پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ وہ جب ایکسرے کے نیچے اس کو رکھ کے دیکھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ راتوں رات شبشب نہیں ہوا، یہ تو برسوں سے گردے کے اندر پتھری پیدا ہو رہی تھی۔ اگر ساتھ کے ساتھ اس قسم کا چیک اپ کراتے رہتے، تو پہلے ہی پتہ چل جاتا لیکن وہ جو آخر میں اس چیز کے ناقابل برداشت ہونے کا ایک وقت آتا ہے، اسے Pain (درد) کہتے ہیں۔ یہ یونہی نہیں آ جاتا۔

### مکافاتِ عمل انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے

قرآن یہ کہتا ہے کہ ان کے گردوں کے اندر پتھریاں تو برسوں سے بنتی چلی آ رہی ہیں، ریت جمع ہوتی چلی آ رہی ہے مگر ان کو محسوس نہیں ہوتا اس لیے کہا کہ وَكُمْ قَصْمًا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَ أَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ (21:11)۔ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ کتنی ہی قومیں ایسی گزریں جنہوں نے ظلم اور دھاندلی کی اور اس کے بعد دونوں نظموں میں کہا کہ ان کا نام و نشان مٹ گیا اور ان کی وارث دوسری قومیں ہو گئیں۔ پہلے تو وہ بات جو آخر میں ہوئی ہے، یہ بیان کی۔ قرآن کا بڑا عمدہ انداز ہے۔ اسے Graphic (گرافیاں) انداز کہتے ہیں اور اس کے بعد کہا کہ ایک عرصہ سے یہ جو قومیں تھیں انہوں نے ظلم و ستم اور ہضم و فریب پر کمر باندھ رکھی تھیں Exploitation (لوٹ کھسوٹ) ہو رہی تھی، دھاندلی ہو رہی تھی، جو کچھ اس کا نتیجہ اندر اندر ہو رہا تھا، اسے یہ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ کہا کہ فَلَمَّا أَحْسُوا بَأْسَنَا (21:12) جب محسوس طور پر ان کے سامنے وہ چیز آئی تو اذًا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ (21:12) پھر اس سے بھاگے۔ کیا انداز ہے!

بھاگے وہاں سے اور سنیے قرآن کیا کہتا ہے؟ کہا کہ یہ بھاگ کر جا رہے تھے اور پیچھے سے ہمارا قانونِ مکافات آواز دے رہا تھا کہ لَا تَرْكُضُوا (21:13) بھاگو نہیں، بھاگ کے کہیں نہیں جاسکتے، چاروں طرف ہمارے قانونِ مکافات کی زنجیروں کی باڑیں لگی ہوئی ہیں، بھاگ کے نہیں جاسکتے: لَا تَرْكُضُوا (21:13)۔ مت اس قسم کی بیکار کوشش کرو، بھاگ کر نہیں جاسکتے۔ پھر کیا کرو؟ اس کے لیے کہا کہ وَارْجِعُوا إِلَى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ (21:13) واپس آؤ، کہاں واپس آؤ؟ وہاں واپس آؤ، جہاں تم دوسروں کی محنتوں کے اوپر اپنی عیش

سامانیاں تیار کیا کرتے تھے آؤ وہاں۔ وَ مَسْكِنُكُمْ (21:13) آؤ ان محلات میں کہ جن کی رنگینیاں مزدوروں اور محنت کشوں اور کمزوروں اور محتاجوں کے خون کی رہیں منت تھیں آؤ ان محلات کے اندر۔ کاہے کے لیے آؤ؟ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ (21:13) تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ جو کچھ ایسا تم نے بنا کے رکھا ہوا تھا کہاں سے لیا تھا؟ آؤ ادھر۔ کیا انداز ہے قرآن کا! قَالُوا يُوَلِّينَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ (21:14)۔ وہاں پہنچ کے پھر وہ کہیں گے کہ ہاں واقعی ہم نے ظلم کیا، ستم کیا۔ لیکن اس وقت اس تاسف سے کیا ہو سکتا تھا؟ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو پھر وہ پلٹ نہیں کرتے۔ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوُهُمْ (21:15) اور وہ وہاں چیخ و پکار کرتے رہیں گے کہتے رہیں لیکن یہ تو وقت گزر گیا۔ وہ کچھ کہتے رہیں گے۔ حَتَّى جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَمِدِينَ (21:15)۔ کیا بات ہے! ایک لفظ کہنے سے جیسے کہتے ہیں تیری تسلی نہیں ہوئی۔ وہ یہ کچھ چیخ و پکار کرتے رہیں گے تاکہ تم دیکھو تاریخ سے پوچھو کہ وہ ایسے ہو گئے جیسے ایک کٹی ہوئی فصل ہوتی ہے: حَصِيدًا (21:15) جیسے کٹا ہوا کھیت، جس میں نشوونما کی صلاحیت باقی نہ رہے۔ میں نے کہا ہے کہ جیسے تسلی نہیں ہوئی۔ خَمِدِينَ (21:15) بجھا ہوا شعلہ ہوتا ہے جس میں زندگی کی حرارت ختم ہو جائے۔ یہ ہوتا ہے عزیزانِ من! یہ ہے انقلاب جو یہ پیغمبر لاتے تھے۔ نہ تو ان کے اس دین کا نام نقلیں پڑھنا اور تسبیحاں پھیرنا تھا، نہ ان کے اس انقلاب کا نام یہ فساد انگیزیاں تھیں جن میں تخریب ہی تخریب ہوتی ہے لہذا وہ تو ان کے سامنے تھا پروگرام یہ تھا، ان کا پروسیس یہ تھا: پہلے انسانوں کی تیاریاں ہوتی تھیں:

چو پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

پختہ ایک فرد نہیں ہوتا والذین معہ ساتھ ہوتے ہیں جو پختہ ہوتے ہیں۔

اس جیسے پروگرام کی تکمیل کے لیے حضرت موسیٰ ♦ کے ساتھ حضرت ہارون ♦ بھی تھے

یہ ہے وہ پروگرام جس کے لیے پہلی آیت میں کہا گیا کہ بہت بڑا کمر شکن بارگراں اتنا عظیم پروگرام تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اس واسطے آہستہ بڑھو، بتدریج اس کے اوپر چلو۔ ہم تمہاری بے تابی تمنا کو جانتے ہیں لیکن صبر طلبی، عشق کا تقاضا کچھ اور ہے۔ اس میں بڑا وقت لگے گا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں نے عرض کیا کہ یہاں پھر دہرایا کہ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيرًا<sup>1</sup> (25:35)۔ یہاں تھا کہ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ وَالَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ (94:2-3) اے رسول! ہم نے تمہاری کمر سے وہ بوجھ اٹھالیا جو تمہاری کمر کو توڑ رہا تھا۔ یہاں حضرت ہارون ♦ کو ساتھ وزیر کہا ہے۔ اب اس سے آپ اس مرحلہ یا اس پروگرام کی دقت طلبی کا اندازہ لگائیے کہ ایک نبی، وہ بھی حضرت موسیٰ م جیسا، اکیلا کافی نہیں ہے، ایک اور نبی اس کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ کاہے کے لیے دیا جاتا ہے؟ اس کے لیے یہی لفظ وزیر ہے۔ وزیر کے معنی ہیں ”بوجھ اٹھانے والا“۔ دوویں رل کے بوجھوں چک لوتی جنوں اسی کہواں گے۔<sup>2</sup> یہ بوجھ بٹانے والا وزیر ہے۔ یہ وہی ہے جو ابھی میں نے لفظ پڑھا ہے کہ وِزْرَكَ الَّذِي أَنْقَضَ

ظَهَرَ كَذِبَ (94:2) بوجھ بٹانے والا وزیر۔ ایک یہ ہوتے ہیں دوسروں کا بوجھ بٹانے والے اک ساڈے وی وزیر ہوندے نیں اپنا وی بوجھ دوسریاں تے پادین والے۔<sup>3</sup>

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن  
ملا کی ازاں اور مجاہد کی ازاں اور  
پرداز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں  
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

(اقبال)

### تکذیب دین کا مفہوم

ایک حضرت ہارون ♦ وزیر تھا ایک ہمارے ہاں وزیر ہوتے ہیں۔ کہا کہ جاؤ اس قوم کی طرف۔ وہ ہمارے قانون مکافات کو جھٹلا رہے ہیں۔ یہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ یہ تکذیب کا لفظ بڑا عجیب ہے۔ عربی زبان کے اندر اس کے معنی ہوتے ہیں: اپنے عمل سے اپنی روش سے یہ ثابت کرنا کہ یہ دعویٰ جھوٹا ہے جو کیا جا رہا ہے۔ یہ دعویٰ قانون مکافات کیا ہے؟ کہ ظلم کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے ظالم پنپ نہیں سکتا۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ (6:21) یہ قانون ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ یہ ہے خدا کی آیت۔ ظالم ظلم کیے چلا جاتا ہے پنپتا چلا جاتا

① ہم نے موسیٰ کو ایک ضابطہ حیات دیا تھا اور (چونکہ اس کے پیش نظر ہم بڑی سخت تھے اس لیے) ہم نے اس کے بھائی ہارون کو بھی اس کے ساتھ کر دیا تھا تاکہ وہ اس کا بوجھ بٹا سکے (پرویز: مفہوم القرآن ص 823)۔

② جسے ہم کہیں گے کہ دونوں مل کر بوجھ اٹھالیں۔

③ ایک ہمارے ہاں بھی وزیر ہوتے ہیں جو اپنا بوجھ بھی دوسروں پہ لا دیتے ہیں۔

ہے پھلتا پھولتا چلا جاتا ہے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے بعد جب اسے کہا جائے کہ بھئی! ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے کہنے لگا کہ جاوئے جاؤ دیکھتے نہیں ہو وہ بھی اس طرح سے پنپتا جاتا ہے پھر دیکھنے والے بھی جو اس کے ساتھی ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ یونہی باتیں ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں اگر کچھ اچھا انتظام کر لیا جائے سیاست کی مہرہ بازیوں کی خامی نہ رہ جائے تو کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ جو چیز ہے کہ اپنے اس طرز عمل سے یہ بتا دینا کہ وہ جو دعویٰ ہے قرآن کا یا خدا کے قانون کا کہ یہ نہیں ہو سکتا یہ اس کی تکذیب ہوتی ہے کہ نہیں وہ جھوٹا ہے۔ یہ ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے تکذیب کر رہے تھے جھٹلا رہے تھے اور ایک لفظ میں پھر یہ کہا کہ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيرًا<sup>1</sup> (25:36)۔

سابقہ قوموں کے تذکرہ کا مقصد ان کے انجام کو ظاہر کرنا ہوتا ہے

عزیزانِ من! چونکہ ان کی تفصیل دوسرے مقام پہ دی گئی ہیں، جب وہ ان چیزوں کو ضمناً لاتا ہے تو یہ آخر میں جو نتیجہ تھا، وہ دو لفظوں میں بیان کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ہر مقام پہ تفصیل دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کہا کہ **فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيرًا**<sup>①</sup> (25:36)۔ اور اس کے بعد باقی قوموں کے متعلق بھی جو کچھ کیا، وہ سامنے آیا۔ **وَقَوْمُ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً**<sup>②</sup> (25:37)۔ قومِ نوح کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔ ضمناً یہاں **كَذَّبُوا الرُّسُلَ** (25:37) آیا ہے۔ ویسے تو قرآن کریم نے جہاں سلسلہ انبیائے کرام □ کا ذکر کیا ہے حضرتِ نوح ♦ سے اس کی ابتدا کی ہے لیکن یہ بتایا ہے کہ اس سے پہلے بھی اس قوم کے اندر سول آگئے تھے کیونکہ یہ **كَذَّبُوا الرُّسُلَ** (25:37) ہے کہ اس قوم نے رسولوں کو جھٹلایا تھا اور حضرتِ نوح ♦ کے زمانے میں تو پھر وہ غرق ہو گئی تھی تباہ ہو گئی تھی۔ یہ بعد کی توبات نہیں ہے۔ **أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً**<sup>③</sup> (25:37) وہ قوم غرق ہو گئی، تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے متعدد مقامات پہ یہ باتیں آچکی ہیں۔ ہم نے اس داستان کو بھی ان کی تاریخ کو ان کے انجام کو انسانوں کے لیے اس بات کی علامت بنا دیا کہ اس قسم کی غلط روش کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے۔

آیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی محسوس شے سے اصل حقیقت کو پالینا، جیسے دور سے کہیں بیابان میں، جنگل میں دھواں نظر آئے تو ذہن میں ہوتا ہے کہ نیچے آگ ہے اور آگ ہے تو کوئی انسان بھی ہے۔ یہ اس چیز کی آیت ہو جاتی ہے جس پہ انسان نتیجے پہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ان کے غرق ہونے کو ہم نے بھی دوسرے لوگوں کے لیے آیت بنا دیا تاکہ اس سے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ **وَاعْتَذَرْنَا**

① ہم نے ان مخالفین کو بھی اُسی طرح تباہ کر دیا جس طرح ہم اُس قسم کی مجرم قوم کو تباہ کیا کرتے ہیں۔

② اور اسی طرح (اُن سے پہلے) قومِ نوح کا بھی ماجرا ہے۔ اُنہوں نے بھی اُن رسولوں کی تکذیب کی جو اُن کی طرف ہمارا پیغام لے کر گئے تھے۔ چنانچہ (اسی قسم کی کشمکش کے بعد) ہم نے انہیں غرق کر دیا (اور اس طرح) اُن کے انجام کو دوسرے لوگوں کے لیے اپنے قانونِ مکافات کی) نشانی بنا دیا (پرویز: مفہوم القرآن ص-823)۔

③ ہم نے انہیں غرق کر دیا اور اس طرح ان کے انجام کو دوسرے لوگوں کے لیے اپنے قانونِ مکافات کی نشانی بنا دیا (پرویز: مفہوم القرآن ص-823)۔ **لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا**<sup>①</sup> (25:37)۔ اب یہاں یہ بات آگئی کہ جو ظالم ہیں ان کے لیے یہ ایک الم انگیز سزا ہوتی ہے یہ اس کا انجام ہوتا ہے۔ تاریخ کی یہ داستان اس بات کی آیت بن جاتی ہے۔

ابھی میں عرض کروں گا کہ قرآن کا اور تاریخ کا فلسفہ کیا ہے؟ یہاں کہا کہ **عَادًا وَثَمُودًا وَاصْحَابَ الرَّسِّ** (25:38) اسی طرح اور تو میں بھی جیسے قوم عاد، قومِ ثمود، اصحابِ الرس ہیں ان کا بھی یہی انجام ہوا۔ یہ جو اصحابِ الرس ہیں ان کا ذکر بھی قرآن میں دو مقام پہ آیا ہے۔ ایک یہاں ہے اور دوسرا سورۃ ق (50:12) میں ہے۔ اس قوم کی تفصیل قرآن نے نہیں دی۔ انہیں عام طور پر کنوؤں والے



گڑھوں والے کہا جاتا ہے لیکن اس کے مادے (Root) کے اعتبار سے بنیادی معنی ہوتے ہیں ”غلط باتیں وضع کر کے پھر ان کو پھیلاتے چلے جانا۔“ اس میں تو بہت سی قومیں آجائیں گی۔ ڈرن والی گل نہیں۔ اسی تے کسے قوم آج وی نہیں اوندے ہیگے۔<sup>②</sup> میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں تو اس نوشتہ تقدیر میں ایسا مرفوع القلم کر دیا ہے کہ ہم مٹ گئے ہیں۔ اب اسی کتھے رڑکدے وی نہیں ہیگے، کہ چلو ہو نہیں تے ظالماں وچ ای ساڈا شمار ہو جائے، مٹ مٹای چکے ہوئے ہیگے۔<sup>③</sup> یہاں آیا ہے اصحاب الرس یعنی غلط باتیں وضع کرنا اور پھر ان کو سچ کر کے پھیلاتے چلے جانا۔ عجیب چیز ہے مادے کے اعتبار سے اور میں سمجھتا ہوں کہ قرآن نے اسی لیے کسی متعین قوم کے متعلق یہ بات نہیں کہی، ذہنیت ہی کے متعلق بات کہی ہے، روش کے ہی متعلق بات کہی ہے اور آگے کہا کہ وَ قُرُونًا بَيْنَ ذَلِكَ كَثِيرًا (25:38) اور ان کے درمیان کئی اور قومیں آئیں جن کا انجام بھی یہی ہوا۔

یہاں کہا ہے کہ وَ كَلَّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ وَ كَلَّا تَبَرَّنَا تَتَبِيرًا (25:39) ان سب کے یہ تاریخی واقعات، ہم نے تمہارے لیے بیان کیے ہیں۔ یہ قرآن کریم کی بڑی اہم چیز ہے کہ تاریخ کی اہمیت کتنی بڑی ہے! خدا کی طرف سے توحی ہے، تو انہیں آئے ہدایت آئی اس نے پروگرام دیئے لیکن وہ کہتا ہے کہ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ (24:34) ہم نے تمہاری طرف یہ کھلے کھلے احکام بھیجے، ضوابط بھیجے، قانون بھیجا، وحی بھیجی، ہدایت بھیجی، وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ (24:34) اور اس کے ساتھ ہی اقوام سابقہ کی تاریخ بھی نازل کی۔ تاریخ منزل من اللہ ہے۔ یہ ولقد انزلنا آیا ہے۔ یعنی پہلے دو چیزیں نازل کی ہیں: آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ (24:34)۔ آیت مبینہ اور اقوام سابقہ کی تاریخ۔ تو یہ برابر کی اہمیت رکھنے والی بات آگئی۔ یہ بڑی چیز ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ ہے ہی انسان کی خصوصیت۔ حیوان کی تاریخ تو کیا ہو سکتی ہے!

① جو لوگ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں، آخر الامر وہ خود ہی الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

② ڈرنے والی بات نہیں ہے۔ ہمارا شمار تو کسی قوم میں بھی نہیں ہوتا۔

③ ہم تو کہیں رڑکتے بھی نہیں ہیں کہ چلو کہیں اور نہیں تو ہم ظالموں میں ہی شمار ہونے لگیں۔ ہم تو لسیا منسیا ہو چکے ہیں۔

جیسی بکری پہلے دن تھی، ویسی بکری آج کے دن ہے لیکن جیسا انسان عاروں میں بسنے والا تھا، چاند پہ جانے والا انسان ویسا نہیں ہے۔ قرن باقرن اور صدیوں کے ارتقائی مراحل طے کر کے انسانیت آگے آرہی ہے۔ پھر اس کے اندر مختلف قسم کی قومیں آرہی ہیں، روشیں آرہی ہیں، نظام آرہے ہیں، ٹکراؤ ہو رہا ہے، کوئی الٹا ہے تو کوئی چڑھتا ہے۔ یہ ساری، جتنی بھی انسانیت کی مسلسل داستان ہے، بڑی عجیب چیز ہے۔ اس میں ایک ہی چیز ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں پیش کرتا کہ یہ اکبر<sup>①</sup> نے فلاں سال میں تخت نشینی کی اور بابر<sup>②</sup> فلاں سال مر گیا۔ ہماری اس طرح کی مرتب تاریخ کو اقوام افراد کی روش سے، نظام سے، عروج و زوال کے ٹکراؤ سے واسطہ نہیں ہے۔ اسی لیے

جتنی اقوام کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے اس نے ان کے تاریخی سن یا مقام زیادہ نہیں دیئے۔ دیا اس نے یہ ہے کہ اس قوم نے اس قسم کی روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا؛ دوسری قوم نے اس کے خلاف اچھی روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ یوں خوشگوار نکلا اور اس کے بعد کہا ہے کہ یہ سنت اللہ ہے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (33:62) یہ خدا کی روش ہے اس کے مطابق یہ ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہمارے ساتھ اس کا تعلق محض خبر کا نہیں ہے تاریخ کا تعلق ہے۔ یہ صرف معلومات (Information) ہی نہیں ہے کچھ اور ہی بنیادی اہم چیز ہے۔

### قرآن تاریخی واقعات سے اقدارِ خداوندی کی اہمیت کو واضح کرتا ہے

ہمارے ہاں جو History (تاریخ) پڑھائی جاتی ہے وہ صرف Informatory (معلوماتی) ہوتی ہے مثلاً اکبر<sup>1</sup> کس سال تخت نشین ہوا اور بابر<sup>2</sup> نے کس سال فلاں کو شکست دی۔ قرآن کہتا ہے کہ تاریخ یہ ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام قائم کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ جب بھی کوئی قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ یہ Philosophy of History (فلسفہ تاریخ)۔

### قرآن کے نزدیک تاریخ انسانوں کے تابع ہوتی ہے

قرآن کی رو سے بات دوسری طرف چلی جائے گی ہمارے دور میں فلاسفی آف ہسٹری ایک خاص Subject (مضمون) بن کے سامنے

1 اکبر شہنشاہ ہمایوں کا بیٹا (1542-1605 AD)؛ ہندوستان میں تیسرا شہنشاہ (1556-1605) جو عمر کوٹ صوبہ سندھ پاکستان میں پیدا ہوا اور 13 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

2 بابر حقیقی نام ظہیر الدین (1483-1530 AD) باپ کی طرف سے منگول ماں کی طرف سے چنگیز خان سے متعلق ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی پہلا شہنشاہ (1526-1530) جس نے سلطان ابراہیم لودھی (1517-1526 AD) کو شکست دی۔

آیا ہے۔ فلاسفی آف ہسٹری یعنی ہسٹری آف فلاسفی نہیں فلسفے کی تاریخ نہیں تاریخ کا فلسفہ۔ ویسے تو ہیگل<sup>1</sup> (1770-1813) کو اس کا امام کہا جاتا ہے یہ اس نے پیش کیا ہے اور واقعی اس کی کتاب اس قابل ہے کہ اس کو یہ کہا جائے کہ فلاسفی آف ہسٹری میں اس کا بہت بڑا درجہ ہے اور اسی کے فلسفے پر کارل مارکس نے بھی اپنا معیشت کا نظام دیا ہے۔ یہ ہے فلاسفی آف ہسٹری۔ کارل مارکس (1818-83) کے ہاں دلیل جو ملتی ہے وہ Historical Necessity (تاریخ و وجوب) کی ہے۔ Necessity (وجوب) فلسفے میں اس دور کو کہتے ہیں جسے انسان ٹال ہی نہ سکے جو ہو کر رہے۔ اب میں اسے دو لفظوں میں عرض کر رہی دوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ احباب اتنے حصے کو توجہ سے سن رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ کسی دور میں جس قسم کا معاشی نظام قائم ہوگا اسی قسم کی وہ قوم بن جائے گی۔

انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو تبدیل کیے بغیر خود کچھ اور ہو جائے۔ اسکے لیے وہ اس قسم کا معاشی نظام پیش کرتے ہیں۔ جس قسم کے انسان تھے اس قسم کا معاشی نظام تھا، سو وہ اس قسم کے انسان تھے۔ گویا وہ انسانوں کو اس قسم کے معاشی نظام کے تابع رکھتے ہیں، جس کے بنانے اور بدلنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔

ہیگل کا فلسفہء تاریخ انسانی اختیار و ارادے کو سلب کر لیتا ہے

جب ان سے پوچھا گیا کہ صاحب! اس قسم کا یہ نظام کون بنا دیتا ہے جس کے سامنے انسان بھی مجبور ہوتا ہے، تو اس کے لیے ان کے پاس کوئی Explanation (وضاحت) نہیں تھی، صرف Historical Necessity (تاریخ کا تقاضا یا وجوب) کی ایک اصطلاح تھی: صرف یہ کہ تاریخ ایسا چاہتی تھی اس نے ایسا کر دیا۔ پہلی چیز تو اس میں یہ رہی کہ انسان اس تاریخ کے ہاتھوں مجبور ہو گیا جس کے بنانے، بگاڑنے، تبدیل کرنے میں اس کا کوئی ہاتھ ہی نہیں ہے۔ انسانیت تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ان کے ہاں کا فلسفہء تاریخ<sup>2</sup> ہے۔

① Hegel, Georg Wilhelm Friedrich (1770-1831AD) German Philosopher. His main works, including Encyclopaedia of Philosophical Sciences (1817) and the Philosophy of Right (1821), proposed that truth is reached by a continuing dialectic: an initial thesis, when found unsatisfactory, generates an antithesis: these interact to form a Synthesis, which may itself constitute a new thesis. Marx and Engels adapted the theory. (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited, p . 715)

② ہیگل کا فلسفہ: اس کے فلسفے کے خطوط یہ ہیں: (۱) تمام کائنات ایک مسلسل تغیر کا نام ہے۔ یہاں کوئی شے جامد (Static) نہیں۔ ہر شے میں ہر آن تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ (۲) اشیاء در حقیقت تصورات (Ideas) کا مظہر ہیں لہذا یہ کائنات دنیائے تصورات (World of Ideas) ہے۔ (۳) جو کچھ اشیاء کے متعلق اوپر کہا گیا ہے وہ درحقیقت تصورات کے متعلق ہے یعنی یہاں کوئی تصور اپنی مکمل حالت میں نہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

قرآن حکیم انسان کو مجبور محض قرار نہیں دیتا

ایک قرآن کا فلسفہء تاریخ بھی ہے۔ ہمارے ہاں ابن خلدون<sup>1</sup> نے اپنے مقدمے میں اس کی وضاحت کی ہے لیکن یہ فلسفہ تو قرآن نے دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ انسان Determined (مجبور و مقہور) ہے یعنی انسان مجبور محض ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بات انسانیت کے خلاف ہے۔ انسان کسی خارجی قوت کے تابع مجبور نہیں ہوتا، اس میں اتنی بڑی قوتیں اور صلاحیتیں ہیں

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ہر تصور نام تمام ہے۔ اس لیے اس میں ہر آن تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ (۴) زمانہ سلف میں اشیاء اور تصورات کو جامد تسلیم کیا جاتا

تھا، اس لیے ان کے متعلق منطق (Formal Logic) کی رو سے گفتگو کی جاتی تھی۔ اس اندازِ منطق میں صغریٰ اور کبریٰ دونوں مستقل ہوتے تھے اور اس سے مستقل نتیجہ مرتب کر لیا جاتا تھا لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہاں کی کوئی شے مستقل اور جامد ہے ہی نہیں، یہ اسلوبِ منطق بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ اس کی جگہ اب ایک نیا منطق آنا چاہیے۔ اس منطق کا نام ہیگل کی اصطلاح میں جدلیت (Dialectic) ہے۔ اس میں صغریٰ کی جگہ (Thesis)، کبریٰ کی جگہ (Antithesis) اور نتیجہ مستخرجہ کی جگہ Synthesis کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں (۵) ایک تصور (Idea) اپنی ناقص حالت میں سامنے آتا ہے، اسے Thesis کہتے ہیں لیکن اس کی ”نامتائیت“ کو پورا کرنے کے لیے اسی میں سے ایک دوسرا تصور وجود کوش ہوتا ہے جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے، اسے Antithesis کہا جاتا ہے۔ ان دونوں تصورات کی باہمی کشمکش (جنگ و جدل) سے ایک تیسرا تصور پیدا ہوتا ہے جسے Synthesis کہتے ہیں۔ یہ جدید تصور پہلے دونوں تصورات سے متمیز ہوتا ہے۔ اس میں ان دونوں تصورات کے محاسن موجود ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کا مقام ان سے بلند ہوتا ہے لیکن یہ تصور پھر ناقص ہوتا ہے۔

اب یہ ناقص تصور پھر ایک نیا Thesis بن جاتا ہے اس میں سے ایک Antithesis پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دونوں باہمی جدلیت سے ایک نئے Synthesis کی تخلیق کا موجب بن جاتے ہیں۔ کائنات میں ارتقا اسی عمل سے جاری و ساری ہے: انسداد کی کشمکش سے ارتقا۔ (۶) یہ ارتقائی سلسلہ بلند یوں کی طرف جا رہا ہے تا آنکہ ایک دن اس کشمکش مسلسل اور پیکار غیر منقطع سے ایک مکمل تصور کی نمود ہوگی اسے عالمگیر تصور (Universal Idea) یا مطلق تصور (Absolute Idea) کہا جائے گا۔ درحقیقت یہ تمام جنگ و پیکار محض اس لیے ہے کہ یہ عالمگیر یا مطلق تصور اس طریق سے تکمیل خویش (Self-realization) چاہتا ہے۔ اس جدلی ارتقا سے اس کی مضمر کمالات بتدریج مشہور ہوتی جاتی ہیں اور ان کی مکمل مشہودیت کا نام اس کی نمود ذات ہے۔ اسی کو ہیگل روح کا نکت (World-spirit) بھی کہتا ہے۔ (۷) کوئی تصور مجرد شکل (Abstract Form) میں سامنے نہیں آ سکتا۔ تصورات ہمیشہ انسانی جدوجہد کے پیکر میں مشہود ہوتے ہیں۔ اس جدوجہد کو انسانی تہذیب کہا جاتا ہے لہذا اسطور بالا میں جس چیز کو جدلی ارتقا کہا گیا ہے وہ اپنے لباسِ مجاز میں انسانی تہذیب کی کشمکش پیہم ہے۔ ایک ناقص تہذیب سے ایک نئی تہذیب ابھرتی ہے جو اس کی ضد ہوتی ہے۔ ان دونوں کی کشمکش سے ایک تیسری تہذیب منصفہ شہود پر آتی ہے جو پہلی دونوں تہذیبوں کے محاسن کو اپنے دامن میں لیے ہوئی ہے اور ان کی مذمومات کو الگ کر دیتی ہے پھر یہ نئی اور ناقص تہذیب اسی پیکار کی اگلی کڑی بن جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلا آتا ہے اور اسی طرح جاری رہے گا تا آنکہ دنیا پر وہ آخری تہذیب چھا جائے گی جو روح کا نکت کی مکمل نمود کا پیکر ہوگی۔ یہ ہے ہیگل کے نظریہ کے مطابق شاہراہِ زمانہ پر روح کا نکت کی داستانِ سفر! (پرویز: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور 2002ء، ص 277 تا 278)

① عبد الرحمن بن محمد ابن خلدون (1332-1406AD)

کہ یہ خارج کی ان تمام چیزوں کو اپنی منشا کے مطابق تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں، انسان ہی ان کو تبدیل کر سکتا ہے اور ان کی جگہ دوسرا نظام لا سکتا ہے۔ مجبور یہ یہاں ہوتا ہے کہ جب جس قسم کا یہ نظام لاتا ہے اس کے نتائج نہیں بدل سکتا۔ یہ تو اسکے اپنے بس میں ہے کہ جی چاہے سنبھلایا کھالے، جی چاہے اس کو اٹھا کے پھینک دے، لیکن جب یہ سنبھلایا کھالے تو پھر یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے کہ اس کا نتیجہ ہلاکت نہ ہو، حیات آور ہو جائے۔ یہاں انسان مجبور ہوتا ہے وہاں مجبور نہیں ہوتا۔ تاریخ یہ ہے کہ انسان خود ایک نظام قائم کرتا ہے۔ یہ اس کے بس کی بات ہے، خود کرتا ہے لیکن اس نظام کے جو نتائج ہوتے ہیں ان کو الٹ نہیں سکتا۔ سنت اللہ ان نظاموں کے نتائج کا نام ہے۔ انہیں یہ بدل نہیں سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے فلسفے میں ان دونوں میں کتنا فرق آ گیا: وہ کمیونزم کا

فلسفہ ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ یہ قرآن کا فلسفہ ہے کہ انسان ہی نظام بناتا ہے اور انسان چاہے تو ان نظام کو تبدیل کر دیتا ہے۔

## تاریخ انسانی، تاریخ کے نتائج کی امین ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہ ہیں وہ داستانیں جو قرآن نے اقوامِ سابقہ کی بیان کی ہیں کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام بنایا، اس کے ہاتھوں تباہی ہوئی، انقلاب لانے والوں نے اس قسم کا نظام قائم کیا، اس کا نتیجہ خوشگوار یاں ہوا۔ یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ ہم نے قوانین نازل کیے اور ان قوانین کی صداقت کے شہادت کی طور پر تمہارے لیے تاریخ نازل کی کہ تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ ظالم پنپ نہیں سکتا اس کی شہادت کیا ہے۔ راتوں رات تو ظالم تباہ ہوتا نہیں، وہ تو پنپ رہا ہوتا ہے اور اسی سے انسان دھوکے میں آ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس انسان یا اس قوم یا اس نظام کی اس وقت کی حالت کو نہ دیکھو اس قسم کے نظام پہلے گزر چکے ہیں، ان کے نتائج یہ نگاہ رکھو اور تاریخ کا فلسفہ یہ ہے کہ جس نظام نے جو نتیجہ اس وقت پیدا کیا تھا وہ نظام ہر زمانے میں وہی نتیجہ پیدا کرے گا، یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کا تاریخ کا فلسفہ اور اس کے لیے اس نے تاریخ کو اتنی اہمیت دی ہے۔

## نتائج کو قرآنی تاریخ کے معیار پر پرکھنا ہوگا

دنیا کے مذاہب میں آپ کہیں یہ بات نہیں دیکھیں گے کہ خدا کہے کہ ہم نے قوانین نازل کیے اور اسکے ساتھ تاریخ نازل کی۔ تاریخ بھی جو خدا کی نازل کردہ ہوگی، وہی سچی تاریخ ہوگی۔ جب انسان تاریخ بناتے ہیں تو وہ تو پوچھو نہیں کہ پھر تاریخ کیا بنتی ہے۔ وہ تو افسانے ہوتے ہیں اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ **وَ كَلَّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ وَ كَلَّا تَبَرُّنَا تَنْبِيْرًا** (25:39) ہر قوم آئی اور ہم نے اس کے سامنے اس کی پہلی قوموں کی تاریخ پیش کی۔ انہوں نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ وہ اپنی روش پر اڑے رہے اور آخر الامر **تَبَرُّنَا تَنْبِيْرًا** (25:39) ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ہلاک ہو گئے۔ ہر غلط نظام کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اب یہ ساری چیزیں ہیں اور آگے ایک اور قوم کا بھی ذکر ہے۔ کہا کہ **وَلَقَدْ آتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمُطِرَتْ مَطَرِ السَّوْءِ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنها بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا** (25:40) یہ تو بہر حال داستانیں ہیں جو تم انہیں سن رہے ہو۔ عادی اور شہود تو ذرا دور کی بات ہے۔ ایک اور قوم بھی ہے جسے قومِ لوط کہا جاتا ہے۔ اس کی بستیوں کے کھنڈرات تو اس شاہراہ پر واقع ہیں جہاں سے یہ عرب دن رات گزرتے ہیں۔ ان کی داستانیں ان کا انجام تو ان کا آنکھوں دیکھا ہوا ہے۔ **أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنها** (25:40) ان سے پوچھو کہ کیا تم ان کھنڈرات کو دیکھتے نہیں ہو؟ عقل کے اندھو! کیا تم ان کو دیکھتے نہیں ہو؟ کہا کہ یہ ان کھنڈرات کو تو دیکھتے ہیں اور جواب دیا کہ **بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا** (25:40) یہ قانونِ مکافات عمل کو نہیں دیکھ سکتے کیونکہ ان کا اس پہ ایمان

نہیں ہے کہ خدا مردہ قوم کو بھی زندہ کر سکتا ہے اور زندہ اقوام کی یہ کیفیت بھی کر سکتا ہے۔ اصل میں ان کا اس قانونِ مکافاتِ عمل (Law of Requital) پر ایمان نہیں ہے؛ دیکھتے تو ہیں۔

مومن کے دیکھنے اور ایک آرکیالوجسٹ کے دیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے

اب دیکھنے اور دیکھنے میں آپ دیکھیے کتنا فرق ہو گیا! ایک تو آرکیالوجسٹ (ماہرِ حضریات<sup>①</sup>) دیکھتا ہے۔ یہ جو کھدائیاں کر کے نشانات نکالتے ہیں، پھر پرانے شہروں کی اینٹوں سے، ٹھیکریوں سے، وہ اتنا ہی متعین کرتے ہیں کہ یہ اس زمانے کی بات ہے، دو ہزار سال قبل مسیح، چھ سو سال قبل مسیح، فلاں دور کے اندر کی بات ہے۔ یہ اتنا کچھ یہاں بھی ہم نے دیکھا ہے۔ رشتا میں ایک کھدائی ہوئی تھی۔ وہاں بھی دیکھا ہے۔ وہ صرف اتنا ہی دیکھتے ہیں لیکن قرآن ان سے آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے اتنا ہی نہ دیکھو۔ اگر ان کھدائیوں کے بعد بھی دیکھنا ہے، اگر تمہارے پاس کوئی ذریعہ علم ہے تو اس سے یہ دیکھو کہ اس قوم نے کس قسم کا نظام بنایا تھا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا، لیکن قانونِ مکافات پہ تو ہمارے اس دور کا بھی ایمان نہیں ہے۔ ہمارا یہ دور تو ہے ہی میکیا ولی سیاست کا دور: جو جتنا زیادہ شاطر ہو، جتنا زیادہ ہوشیار ہو، جتنا زیادہ چابک دست ہو، وہ سمجھتا ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوتا ہے اور اسکے بعد یہ نظام یا اس قوم کی روش یا اس کے نتائج جب سامنے آتے ہیں تو توجہ اس پہ جاتی ہے کہ کسی جگہ کوئی کمی رہ گئی تھی، کوئی رخنہ رہ گیا تھا۔ یعنی اپنے اس غلط پروگرام میں رخنہ دیکھتے کہ کہاں رہ گیا تھا۔ یہ نہیں دیکھا یا جانا جاتا کہ اس روش اور اس نظام کا حتمی نتیجہ یہ نکلتا تھا جو نکلا ہے۔ وہ دیکھتے یہ ہیں کہ رخنہ کہاں رہ گیا تھا۔ اس کے بعد جب دوسرے آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی تدبیروں میں یہ رخنہ رہ گیا تھا۔ آؤ پہلے ان رخنوں کو بند

① حضریات: علم الآثار

کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کو بند کر لینے دیجیے وہ تباہی جب ہمارے قانونِ مکافات کے عمل کی رو سے آتی ہے تو **مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ** (39:25) وہ وہاں سے آتی ہے جو ان کے عقل و شعور میں بھی نہیں ہوتا۔ عقل و شعور کی رو سے تو وہ مکافاتِ عمل کا ہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ وہ قانون سامنے ہو تو یہ کچھ کریں ہی کیوں! یہ تو ہوتا ہی اس لیے ہے کہ وہ قانونِ مکافاتِ عمل سامنے نہیں ہوتا۔ یہ ہے قرآن کی رو سے اہم سابقہ کی بات۔ یہاں تک قرآن نے یہ دہرایا ہے۔

یہ کچھ بیان کرنے کے بعد قرآن پھر نبی اکرم ﷺ کی طرف آ گیا ہے۔ کہا کہ **وَإِذَا رَأَوْكَ أَنْ يَنْخَذُوكَ إِلَّا هُرُوا** (25:41)۔ بات بھی آگے پھر حضور ﷺ کی طرف پلٹ گئی ہے، اسے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی آیت 40 تک ہم آگئے، 41 ویں آیت سے ہم آئندہ جمعہ کو لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

① یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ تجھے دیکھتے ہیں تو مذاق کرتے ہیں۔

## دسواں باب: سورة الفرقان (آیات 41 تا 49)



عزیزانِ من! آج فروری 1978ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 41 سے ہو رہا ہے: (25:41)۔ اس قدر نامساعد موسم میں بھی آپ احباب کا درس کے لیے جمع ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ فکرِ قرآنِ کریم آپ کے دل کی گہرائیوں میں موجود ہے اور یہ چیز میرے لیے بڑی وجہ مسرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ذوق میں مزید برکت عطا فرمائے۔

### مذہب کی دنیا میں سیرتِ رسول ﷺ کی کیفیت

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ یہ ربیع الاول کا مبارک مہینہ ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے تذکارِ جلیلہ عام ہوتے ہیں اور قرآنِ کریم میں بھی آج کل ہمارے سامنے وہ آیات ہیں جن میں اس کشمکش کا ذکر ہے جو اس پیغام کے عام کرنے سے نبی اکرمؐ اور مخالفین کے اندر برپا ہوئی۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ یہ دین اسلامؐ مذہب میں بدل گیا اس لیے حضور ﷺ کی سیرت کا بھی جو نقشہ سامنے لایا جاتا ہے وہ ایک مذہبی راہنما کا ہوتا ہے۔ یہ تو سب بتائیں گے کہ بڑی سخت مخالفت ہوئی مگر سوال یہ ہے کہ یہ اتنی شدید مخالفت کیوں ہوئی؟ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ جو بتایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ قوم بت پرست تھی آپ ﷺ بت پرستی کو برا کہتے تھے آپ ﷺ اپنے طریقے پر نماز پڑھنا چاہتے تھے وہ اس طریقے پر نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ آپ ذرا سوچیے کہ اسی معاشرے میں انہی قریش کے ساتھ یہودی رہتے تھے عیسائی رہتے تھے مجوسی رہتے تھے۔ وہ اپنے اپنے طریقے پر عبادت کرتے تھے پرستش کرتے تھے۔ انہی کے اندر کچھ لوگ تھے جو حنیف کہلاتے تھے۔ وہ اپنے زعم کے مطابق اللہ کی پرستش کرتے تھے بتوں کی مخالفت کرتے تھے وہ سب کچھ کرتے تھے۔ قریش ان سب کو برداشت کرتے تھے۔ ان کے خلاف وہ کبھی انگلی تک نہیں اٹھاتے تھے۔ ان کی مخالفت میں کبھی بھی کچھ نہیں سننے میں آیا۔ اگر یہی چیزیں تھیں جو رسول اللہ ﷺ پیش کرتے تھے اور یہی باتیں تھیں جو آپ ﷺ ان سے کہتے تھے تو یہ کیا بات ہوئی کہ وہ انہیں تو اس طرح برداشت کرتے چلے آئے کچھ بھی نہ کہا اور یہاں یہ کیفیت ہے کہ تیرہ سال مکے کی زندگی کے اندر پہلے اس قدر کشمکش اس قدر مخالفت رہی اور پھر وہاں سے حضور ﷺ مدینے تشریف لے گئے تو قصہ ختم ہوا۔ اب تو نہ بتوں کو برا کہنے کی بات ہے نہ ان کا نماز



پڑھنا ان کو دکھے گا، تین سو میل کے فاصلے پہ رہائش ہے۔ اس زمانے کے تین سو میل بڑا فاصلہ تھا مگر وہ وہاں سے اٹھ کے ایک یورش کر کے اس زمانے کی نسبت سے اتنی بڑی فوج لے کر مدینے پہ چڑھ دوڑے۔ ایک دن نہیں، دو دن نہیں، ایک لڑائی نہیں، دو لڑائی نہیں، سات سال تک یہ سلسلہ جاری رکھا جب تک کہ مکہ فتح نہیں ہوا۔ یہ کشمکش، یہ یورشیں، یہ حملے، یہ لڑائیاں، یہ جنگ جاری رہے۔ کیا یہ محض نماز پڑھنے کی بات تھی؟ جہاں تک بتوں کا تعلق ہے انہیں تو برا کہنے کے متعلق قرآن میں یہ آیا ہے کہ ان کے معبودوں کو برا نہ کہو، ان کو گالی نہ دو اور حضور ﷺ کی تو سیرت میں ہی یہ بات نہیں تھی۔ جہاں تک بت پرستی کا تعلق ہے قرآن میں تو یہ ہے کہ جب اس جماعتِ مومنین کو، ان لوگوں کو، ملک میں تمکن حاصل ہو جائے گا، قوت حاصل ہو جائے گی، ان کی حکومت ہوگی، تو یہ عیسائیوں کے گرجوں، یہودیوں کے صومعوں، مجوسیوں کے معبودوں، ان بت پرستوں کے مندروں کی حفاظت کریں گے۔ ان کے متعلق تو یہ کچھ قرآن میں تھا۔ تو کیا اس مخالفت و مخالفت کی وجہ تھی؟

### احبار اور ہبان کی طرف سے حضور ﷺ کی مخالفت کی اصل وجہ

عزیزانِ من! وہ جو مخالفت و مخالفت کی اصل وجہ ہے، وہ کبھی زبان پہ نہیں آئی، یہ لاہی نہیں سکتے۔ ہمارا یہ سارا دور، جتنا بھی ہے جیسے میں نے کہا ہے کہ اس میں دین مذہب کی حیثیت میں بدل گیا ہے تو مذہب میں اتنی سی باتیں ہی رہتی ہیں، جبکہ ملوکیت کے سارے دور میں پہلی جو مخالفت کی وجہ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پہ حکومت نہیں کر سکتا۔ کیا دورِ ملوکیت کے اندر یہ بات ان سے کہی جاسکتی تھی؟ حضور ﷺ کا تو پیغام ہی یہی تھا، وہ یہ کرنے کے لیے آئے تھے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ رہے، اس سے ملوکیت کا خاتمہ ہو جاتا۔ حضور ﷺ یہ کہنے کے لیے آئے تھے کہ یہ مذہبی پیشوائیت، یہ احبار اور ہبان، جو کہتے ہیں کہ ہم تمہیں خدا کی طرف لے جاتے ہیں، درحقیقت خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے زیادہ سنگِ گراں یہ بن کے حائل ہوتے ہیں۔ کیا یہ مذہب پرست، احبار و رہبان آپ کو یہ بتاتے ہیں کہ یہ بات تھی جو یہ لوگ حضور ﷺ کے خلاف اٹھے تھے۔ یہ تو اپنی سرمایہ پرستی کی بنا پر سرمایہ داری کی بنا پر غریبوں اور محنت کشوں کے خون کا، آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں۔ کیا اس دور کے اندر جہاں سرمایہ پرستی اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی، یہ کہا جاسکتا تھا کہ حضور ﷺ کا مشن یہ تھا، حضور ﷺ کا پیغام یہ تھا؟ نہ کہا گیا ہے نہ کہا جائے گا، جب تک یہ اسلام دین میں نہیں بدل جاتا۔ یہ تھی وجہ مخالفت۔ اسی لیے قرآن یہاں سے بات نہیں شروع کرتا۔

### انبیائے کرام □ کا انقلابی پروگرام ہی ان کی سیرت تھی

پچھلے دروسوں میں بتایا جا چکا ہے کہ قرآن بات حضرت نوح ﷺ کے زمانے سے شروع کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ ﷺ کے زمانے تک

کے کوائف اور داستانیں ان قوموں کی بیان کرتا ہے اور یہی چیزیں ہیں جن کو وہ وجہِ مخلصیت کہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ انسانیت کے سینے پہ یہ کا بوس سوار تھا۔ یہ انبیائے کرام □ بڑی انقلابی ہستیاں تھیں، وہ یہ انقلاب لانا چاہتے تھے اور یہ وجہ تھی کہ ہر مفاد پرست طبقہ ان کی مخالفت کرتا تھا۔ آج یہ کچھ نہیں کہا جائے گا۔ میلاد کی محفلیں ہوں گی، ان میں نعتیں پڑھی جائیں گی، حضور ﷺ کے زلف، خدو خال، اور گیسو و ابرو کی تعریفیں ہو جائیں گی، پھر اس کے بعد خدا کے ساتھ وہ ایسے مکالمے ہوں گے جیسے (معاذ اللہ) بھولی کھیلنے رہے ہوں۔ آپس میں یہ چیزیں ہوں گی۔ معجزات گنائے جائیں گے: ان سب بتوں کو توڑا گیا اور مجوسیوں کے وہ آتش کدوں کو ٹھنڈا کیا گیا۔ بس یہ سارے قصے جتنے بھی ہیں آپ ہر سال دیکھتے چلے آ رہے ہیں یہی دہراتے چلے جائیں گے۔ یہ چیز کبھی نہیں کہیں گے۔

یہ جو پچھلی آیات کے اندر قرآن نے یہ کہا ہے کہ اے رسول ﷺ! تمہارے ہی ساتھ یہ نہیں ہو رہا۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہر دور کے مجرمین یہی کیا کرتے تھے۔ قرآن صرف غیر مسلم ہونے کی وجہ سے تو کسی کو مجرم نہیں کہہ سکتا۔ ٹھیک ہے کہیے کہ غیر مسلم یہ کیا کرتے تھے۔ اس نے کہا کہ مجرمین یہ کیا کرتے تھے اور عربوں کے ہاں تو جرم تھا ہی یہ پہلی چیز کہ دوسرے کے درخت کے پھل دار ٹہنے کو کاٹ کے اپنے گھر میں لے آنا۔ وہ اسے جرم کہا کرتے تھے۔ اس کے اندر ساری بات یہ کشمکش جو ہم دہراتے چلے آ رہے ہیں آگئی۔ یہ کشمکش کتنی شدید تھی؟ میں کہتا ہوں نبی اکرم ﷺ کی سیرت اس تاریخ کی رو سے نہیں مرتب کرنی چاہیے جو ہمارے دور ملکیت کے اندر مرتب ہوئی ہے اور جو آج تک ہمارے نصابوں میں داخل ہے۔ یہ سیرت قرآن کی رو سے مرتب کی جائے گی جس میں خدا نے یہ کہا تھا کہ تمہارے لیے رسول ﷺ کی زندگی میں اسوہ حسنہ ہے، نمونہ ہے، ماڈل ہے۔

### نبی اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کو قرآن حکیم میں محفوظ کرنے کی اہمیت

خدا کی ذمہ داری تھی کہ وہ ماڈل ہمارے سامنے رکھے ورنہ کسی کلاس کے اسٹوڈنٹس (طالب علموں) کو یہ کہہ دیا جائے کہ صاحب! تم اس ماڈل کے مطابق اپنی کاپیوں کے اندر ایک اسکچ (Sketch) کھینچو ایک پینٹ بناؤ، تصور بناؤ، پینٹ کرو اور ماڈل سامنے نہ رکھا جائے تو آپ سوچیے کہ اول تو وہ بنائیں گے کیا اور اپنے اپنے تصور کے مطابق جو کچھ وہ بنائیں گے وہ ہوگا کیسا؟ وہ ماڈل سامنے رکھنا چاہیے۔ جس خدا نے یہ کہا تھا کہ رسول ﷺ کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے اس خدا نے وہ ماڈل اپنی کتاب کے اندر محفوظ کر کے رکھ دیا ہوا ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں نے قرآن کی رو سے اس ماڈل کو اپنی کتاب ”معراج انسانیت“ میں بتایا۔ وہاں دیکھیے کہ یہ کشمکش کیا ہے اور میں نے تو پھر اپنی ساری کتابوں میں ”جوئے نور“ برقی طور، شعلہ مستور، اور پھر ”حضور ﷺ کی معراج انسانیت“ میں بتایا ہے کہ اصل مسئلہ کیا تھا، مخلصیت کیا تھی، کشمکش کے اسباب کیا تھے، یہ کیا چیزیں تھیں؟ یوں یہ

تاریخ سامنے آئے گی تو ان کی عظمت سامنے آئے گی۔ سوچئے کہ یہ کشمکش کتنی زیادہ سنگین کشمکش تھی، کتنی سخت کشمکش تھی کہ جب یہ مراحل طے ہوئے ہیں تو اس وقت خود خدا نے رسول اللہ ﷺ سے یہ یاد دہانی کرائی کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (94:1)۔ یہ عجیب چیز ہے، عزیزانِ من! کہا کہ اے رسول ﷺ! سوچو تو سہی! یہ سارا کچھ جو اس تیس سال کی زندگی میں، تم برداشت کر گئے ہو، یہ اس لیے تھا کہ ہم نے تمہارے سینے میں کشادہ پیدا کر دی تھی۔ بڑی ضروری ہوتی ہے سینے کے کشادگی۔

میں ابھی عرض کرونگا کہ اس کشادہ کے لیے میدانِ جنگ کے اندر تیر و تفنگ کا مقابلہ ہی مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کے علاوہ بھی کتنی ہی قسم کی چیزیں مخالفین کی طرف سے آتی تھیں اور اس کے لیے کتنے ہی بڑے کشادہ سینہ کی اور کتنے بڑے ظرف کی ضرورت تھی اور پھر کشادگی یہ کیفیت ہے کہ یہ قریش اس قدر تیس سال تک یا کم از کم بیس سال تک اتنی سنگین مخالفت کرتے رہے کہ وہ تاریخ کے مطابق کم از کم بیاسی چھوٹی اور بڑی لڑائیاں ہیں جو انہوں نے لڑیں اور جب مکہ فتح ہونے کے بعد سارے کے سارے پابجولاں زنجیروں میں بندھے سامنے آ گئے اور آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ کہو تمہارے ساتھ آج کیا سلوک کیا جائے تو وہ بھی قریش تھے انہوں نے کہا کہ جو شریف دشمن، دشمن کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بس ٹھیک ہے شریف دشمن کہہ رہے ہو، آج تم اعتراف کرتے ہو کہ تم غلطی پر تھے اور تم نے زیادتیاں کیں؟ انہوں نے کہا کہ ہم اعتراف کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے کہا کہ لَا تَسْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92) تو پھر اب کوئی گرفت تمہارے اوپر نہیں۔

عزیزانِ من! قوت اور اقتدار کا ہاتھ میں ہونا، پابجولاں دشمنوں کا سامنے ہونا اور اس وقت یہ چیز کہنا کہ ہاں جب تم اپنے ان جرائم کا اعتراف کرتے ہو اور آئندہ اصلاح کے لیے تم وعدہ دیتے ہو، تو اب انتقام کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (94:1) کہ اے رسول ﷺ! اس نظام کے قیام میں جن مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے اور اس کی آخری کامیابی میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس سے اثر پذیر اور ملول خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تم ذرا سوچو کہ نبوت ملنے سے پہلے اور اس کے بعد ابتدائی مراحل میں تمہاری پریشانیوں اور تفکرات کا کیا عالم تھا۔ پہلے تم تلاشِ حقیقت میں سرگرداں و پریشاں پھرتے تھے، تمہیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی اور کشادگی کوئی راہ تمہارے سامنے نہیں کھلتی تھی۔ اس مقام پر ہم نے تمہیں وحی عطا کی جس سے زندگی کی تمام راہیں روشن ہو گئیں۔ تمہارے سینے میں اس قدر کشادہ پیدا ہو گئی کہ جو ہم پہلے ناقابلِ تسخیر نظر آتی تھی اس کا سر کرنا ممکن دکھائی دینے لگا۔ تمہاری ہمت اور حوصلے وسیع ہو گئے۔

نبوت کی کشادہ ظرفی کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

عزیزانِ من! پروگرام کے ابتدائی مراحل میں سختی، منزل اور تنہائی سفر کے احساس اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے کمزور رہی تھی اور اس پر برداشت کی یہ قوت کہ تینیس سال تک اس قدر مایوس کن مراحل آئے ہیں کسی مرحلہ میں مایوسی نہیں آئی۔ اس کے لیے بہت بڑا جگر چاہیے اور جب قوت ہاتھ میں آئی ہے تو انتقام کا ذرا شائبہ تک نہیں آیا۔ یہ ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (94:1) نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ وَ وَضَعْنَا عَنكَ وَزْرَكَ ۝ الَّذِي اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (94:2-3) وہ بوجھ کہ جس نے تیری کمزور کر رکھی تھی آہستہ آہستہ خدا نے تمہارے رفقا کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح وہ بوجھ اٹھالیا گیا۔ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ اس بوجھ نے تیری کمزور کر رکھی تھی۔ کیا وہ یہی بوجھ تھا کہ آپ ﷺ بتوں کو برا کہتے تھے، وہ آپ ﷺ کو نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے؟

عزیزانِ من! وہ بوجھ کہ جس نے رسول اللہ ﷺ جیسی ہستی کی کمزور کر رکھی تھی، وہ اس پروگرام کے ابتدائی مراحل میں سختی، منزل اور تنہائی سفر اور کمر شکن ذمہ داریوں کا بوجھ تھا۔ شروع شروع میں کیفیت یہ تھی کہ کوئی شخص سنجیدگی سے تمہاری بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تھا اور ہر طرف سے طعن و تشنیع کی دل خراش آوازیں سواہن روح ہوتی تھیں۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ خدا نے یہ کہا کہ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (94:4) تیرے شرف و مجد بامِ ثریا تک پہنچ گئے۔ رہتی دنیا تک دنیا کو یہ چیز یاد رہے گی۔ اتنی بلندیوں تک تیرا ذکر جا پہنچا! یہاں ذکر کے معنی شرف کے ہیں۔ تیرا شرف اتنی بلندیوں تک پہنچ گیا ہے۔ کس طرح سے پہنچا؟ یہ ایک بڑا ہی اہم سوال ہے۔

### آسانوں کا حصول ہمیشہ خونِ جگر کا متقاضی ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے بات کرتا ہے تو دلیل دیتا ہے وجہ جواز بیان کرتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (94:5-6) سہولت اور آسانی کی زندگی یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں میسر آتی ہے، آہی نہیں سکتی یہ تو بڑی بڑی مشقتوں کے بعد آسانیاں آتی ہیں۔ بڑی بڑی مشقتوں کے بعد آسانیاں آتی ہیں یہ دو دفعہ دہرایا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ پہلی زندگی جو تیرہ سال مکہ کی ہے اس کے اندر آپ کی جو عسرت تھی جو مشقتیں مصیبتیں اٹھانا پڑی تھیں اس کے بعد ہجرت کر کے حضور ﷺ مدینہ تشریف لے آئے تو وہ ادھر کا دور جو مکہ کے اندر رہ کر یہ چیز برداشت کرنے کا تھا وہ ختم ہوا۔ مدینہ میں حالات تو مساعد ہو گئے۔ پہلا تو یہ یسر تھا جو اس عسر کے مقابلے میں آیا۔ اب مدنی زندگی کے اندر ان مخالفین نے پھر ان چیزوں کو جاری رکھا اب پہلے سے بھی زیادہ سخت میدانِ جنگ میں آنا پڑا اور یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد فتح مکہ کے بعد پھر یسر آیا۔ یہ پھر دوسرا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا

(94:6) ہے۔

## ایک نہ ختم ہونے والا پروگرام

اس مقام پہ ہر تذکرہ نویس، ہر مورخ، بلکہ ہر سیاستدان، ہر وہ شخص جو اپنے سامنے پروگرام رکھتا ہے، وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ لیجئے صاحب! معاملہ ختم، پروگرام طے ہو گیا، فتح ہو گئی، کامیابی ہو گئی لیکن یہ پروگرام محض دشمنوں کی مخالفت کو سر کرنے ہی کا تو نہیں تھا، پروگرام تو کچھ اور تھا۔ یہ پروگرام تو اس نظام خداوندی کو اس نظام ربوبیت کو کہ جس میں دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے نہیں مرنے دینا، اس نظام کو عالمگیر بنانے کا پروگرام سامنے تھا۔ یہ جو مشکلات کا مقابلہ تھا وہ سر ہو گئیں، وہ ختم ہو گئیں، تو اسکے بعد جیسا کہ میں نے کہا ہے قرآن کو اس انداز سے دیکھیے، دنیا کا ہر شخص جو اس طرح سے پروگرام کو طے کرتا ہوا آئے گا، کہے گا کہ الحمد للہ صاحب! مشکلات حل ہو گئیں، اب چار دن آرام سے گزریں گے، وہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد جب یہ ادھر کی مشکلات، مخالفتیں سر ہو گئیں، ختم ہو گئیں یعنی فَإِذَا فَرَغْتَ (94:7) اب جو تُو ادھر سے فارغ ہوا تو ہمارے ذہن میں یہ ہے کہ آگے ہونا یہ چاہیے تھا کہ اب چار دن آرام سے سو جا، مگر قرآن کہتا ہے کہ فَإِذَا فَرَغْتَ (94:7) جب تُو ادھر سے فارغ ہو گیا ہے تو فَاَنْصَبْ (94:7) اب جم کر کھڑا ہو۔ یا اللہ! اب جم کر کھڑا ہو۔ بھئی! یہ کاہے کے لیے؟ کہ وَ اِلَى رَبِّكَ فَارْغَبْ (94:8) خدا کے نظام ربوبیت کے لیے اب زیادہ رغبت سے کام کر، جن مشکلات کا سامنا تھا، راستے کے اندر رکاوٹیں تھیں، وہ دور ہو گئیں۔ یہ رکاوٹیں دور کرنا ہی تمہارے لیے مقصود بالذات نہیں تھا۔ یہ جو ایک منزل تک پہنچنے کے لیے راستہ ہموار کیے جا رہا تھا، لو بھئی راستہ ہموار ہوا، اور چلو اب۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ پروگرام یہ نظام یہ مشکلات، یہ سیرت حضور ﷺ کی! یعنی فَإِذَا فَرَغْتَ فَاَنْصَبْ (94:7) لہذا جب تم کچھلی مہم سے فارغ ہو جاؤ تو پھر خدا کے نظام ربوبیت کو مزید وسعت دینے کے لیے ایک تازہ مہم کے لیے تیار ہو جاؤ لیکن اس سارے پروگرام میں ایک بلند حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔ اور وہ یہ کہ ایسا نہ ہو کہ کامیابیوں کے بعد تمہاری توجہ کسی اور طرف منعطف ہو جائے۔<sup>①</sup> یا اللہ! یہ وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ

مکتب عشق کا انداز نرالا دیکھا

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

## پہلے سے بھی زیادہ مشکل پروگرام کی تعلیم و تربیت کا مرحلہ تھا

عزیزانِ من! اب تو اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلہ ہے۔ کہا کہ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَ رَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (110:1-2) جب خدا کی نصرت بھی آگئی، معاملہ فتح بھی ہو گیا، دروازے کھل گئے اور تو دیکھتا ہے کہ لوگ جوق در جوق، فوج در فوج، اب دین کے اندر داخل ہو رہے ہیں تو یہ جشن منانے کا وقت تھا۔ فتح کے معنی یہ ہوتا ہے۔ پھر آرام سے

سوجاؤ کہ شکر ہے الحمد للہ۔ کہا کہ نہیں اب تَوْفَسَّبِحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ <sup>وَقَالَ النَّبِيُّ</sup> إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (110:3) خدا کی ربوبیت عامہ کو عالمگیر بنانے کے لیے اور سرگرداں ہو جا۔ اس عمل کے اندر وَ اسْتَغْفِرْهُ (110:3) اس سے اپنی حفاظت کا سامان طلب کر کہ اب اس کو عالمگیر بننا ہے۔ غور کیجئے ان تمام مشکلات کے سر کرنے کے بعد ایسا نظر آتا ہے کہ پروگرام اب شروع ہوا اور ایک نکتہ اور بھی ہے جو کسی دوسرے وقت عرض کروں گا <sup>2</sup> کہ یہ جو فوج در فوج کہا ہے کہ لوگ اس دین میں داخل ہونے لگ گئے یہ وقت واقعی ایسا تھا کہ یہ جو یوں شباشب فوج در فوج داخل ہوئے تھے ان کی تعلیم و تربیت کا مرحلہ پہلے سے زیادہ مشکل تھا۔ پہلے مرحلے میں ایک ایک فرد آتا تھا۔ اس وقت آتا تھا جب وہ اپنے قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے ان صداقتوں کو سمجھ لیتا تھا پالیتا تھا یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھیں یہ ایک فرد ساتھ ملتا تھا تو یہ Asset ہی Asset ہوتا تھا اور اگر فوج در فوج آنے شروع ہوئے ہیں تو ان کی تو تعلیم و تربیت ایسے نہیں ہوئی تھی اور رسول ﷺ کا فریضہ تھا کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (2:129) اس نے تو تعلیم و تربیت کرنی تھی۔ وَ يُزَكِّيهِمْ (2:129) اور اس طرح سے ان کی ذات کی نشوونما کرنی تھی۔ پہلے افراد تو یہ سب کچھ سمجھ سوچ کر آتا کچھ حاصل کر کے آئے تھے۔ اب یہ لوگ فوج در فوج آئے ہیں اور ایک نیا مرحلہ شروع ہو گیا ہے۔

- ① ان تمام نکات کی مکمل وضاحت کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل) 'ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور 2006ء 'سورۃ الم نشرح' اور سورۃ النصر ص 484 تا 487 اور 588 تا 596۔
- ② اس کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل) 'ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور 2006ء 'سورۃ النصر' ص 588 تا 596۔

عزیزانِ من! یہ ہے وہ سیرتِ طیبہ یہ ہے وہ انقلابِ عظیم۔ سارا قرآن اس تذکارِ جلیلہ سے بھرا ہوا ہے۔ یہ چیزیں ہیں کہ جب آپ کے ذہن میں دین ایک نظام کی شکل میں آئے گا تو یہ ہیں وہ حضور ﷺ کی سیرت کے گوہرِ تابدار کہ جن کو اس طرح سے سامنے لانا ہوگا اور دنیا کو بتانا ہوگا۔ دنیا کو کیا اب تو ہم خود کو بتانے کی ضرورت پیش آئے گی کہ یہ بات کیا تھی۔ میں کہہ رہا تھا کہ یہ جو کشمکش ہے، پچھلی آیات میں اس کا ذکر آ رہا ہے کہ رسول ﷺ! گھبراؤ نہیں، کوئی بات نہیں، صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰ ﷺ اور فرعون کی کشمکش کو یاد کرو، نوح ﷺ اور اس کی قوم عاد اور ثمود اور ان کی برابر کی قومیں یہ ساری اصحابِ الرس، حضرت شعیب ﷺ، حضرت نوح ﷺ، تمام انبیائے کرام □ کی سرگزشتیں بیان کیں۔ لہذا تم دیکھو گے کہ کیا کیا کچھ ان کے ساتھ نہیں ہوا۔ تو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

مزاح اور استہزاء کے فرق کی روشنی میں سیرتِ رسول ﷺ کا مقام بلند

جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ یہ مخالفت و مخالفت میدانِ جنگ میں یہ تیغ و سناں اس قدر جگر پاش نہیں ہوتیں۔ اس میں ایک بات اور

ہے جسے قرآن نے کئی دفعہ ہرایا ہے کہ **وَإِذَا رَأَوْكَ أَنْ يَنْخَضُوكَ إِلَّا هُزُّوا** (25:41) سب سے زیادہ جگر پاش یہ ہے کہ کسی کا مذاق اڑایا جائے۔ عزیزانِ من! تلوار کا جواب تو تلوار اور ڈھال سے دیا جاسکتا ہے۔ جسے قرآن نے استہزاء کہا ہے اس میں عجیب بات یہ ہے کہ استہزاء و کمینگی کی انتہائی سطح پر پہنچا ہوا انسان، مقابلے میں اس حربے پہ آتا ہے کہ جس نے شرافت اور بردباری کی انتہائی سطح پہ کھڑے ہو کر جواب دینا ہوتا ہے وہ اس سطح پہ آ ہی نہیں سکتا۔ یوں برابر کا حریف وہ نہیں ہوتا۔ استہزاء کو ہم تو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ہمارے ہاں تو مزاح اور استہزاء میں بھی فرق نہیں کیا جاتا۔

مزاح وہ چیز ہے جس کے لیے انگریزی میں Humour کا لفظ آتا ہے۔ وہ ایک اچھا لفظ ہے۔ بات کہنی پڑتی ہے۔ ہم لوگوں نے بڑا دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں کی اب جو صحافت ہے اس سے ذرا پہلے ان اخبارات کے اندر کالم ہوتے تھے جنہیں مزاحیہ کالم کہتے تھے۔ اس میں مزاح ہوتا تھا۔ جب فریق مخالف کے خلاف کوئی بات کرتے تھے تو اس میں مزاح ہوتا تھا Humour ہوتا تھا۔ اب آپ دیکھیے گا کہ اس میں یکسر استہزاء ہی استہزاء ہوتا ہے، کچھڑا چھالی جاتی ہے۔ پنجابی اچ دساں: دندیاں چڑھائیاں جاندیاں نیں۔<sup>①</sup> اور اس پست سطح پہ پہنچ کے یہ چیزیں ایک دوسرے کے خلاف ہوتی ہیں، صحافت میں ہی نہیں ہے عام تقریروں میں اور جلسوں میں ایک دوسرے کے خلاف یہ کچھ ہوتا ہے۔ یہ روش ہی عام ہو چکی ہوئی ہے۔ اس مقام پہ دیکھیے کہ مقابل میں یہاں تو یہ ہے کہ وہ ایک چیز کہتا ہے تو دوسرا اسی کے انداز کی دس کہتا ہے لیکن وہاں دیکھیے کہ جہاں یہ سب کچھ کہہ رہے ہوں اور مقابلے میں ذرا سا بھی اپنی سطح سے نیچے نہ اتر جائے۔ قرآن کہتا

① پنجابی میں بتاؤں: کسی پہ خوب ہنسا جاتا ہے مذاق اڑایا جاتا ہے۔

ہے کہ **وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ** (94:4) تیرا شرف و مجد بلند یوں کی طرف جانے والا ہے تیرا قدم اوپر کی طرف جانے والا ہے۔ استہزاء کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ اس کا اثر تو انسان کے اوپر یقیناً ہوتا ہے اور اس کا یہ اثر اس لیے ہوتا ہے کہ آپ نے دلائل و براہین سے جو بات کی ہوتی ہے اسے لوگ ماننے کو تیار ہوتے ہیں لیکن یہ سب براہین و دلائل اس وقت تاریک و کھوکھریہ جاتے ہیں جب جواب میں استہزاء کا ایک فقرہ گس دیا جائے۔ اس نے یہ چیز کہی اور باقی لوگوں نے فقہہ لگایا، تالیاں بجائیں بس معاملہ ختم کر دیا۔ اس سے اس پروگرام پہ بڑا اثر پڑتا ہے اگر معاملہ ان لوگوں سے پڑ جائے جو دلیل کا جواب استہزاء سے دیں۔ عزیزانِ من! یہی وجہ ہے کہ **وَإِذَا رَأَوْكَ أَنْ يَنْخَضُوكَ إِلَّا هُزُّوا** اَهْلَ ذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا<sup>①</sup> (25:41) وہ کہتے ہیں ”اودیکھنا ذرا بھی“ ذرا دیکھنا اس کا حلیہ (معاذ اللہ) یہ ہیں ذاتِ شریف جو کہہ رہے ہیں کہ مجھے خدا نے رسول بنا کے بھیجا، یہ دیکھیے خدا کا رسول!! تالی بجائی اور فقہہ لگایا مذاق اڑایا، اور چل دیئے۔ کسے سنائیں اور کیسے سنایا جائے عزیزانِ من! اس کے لیے آپ سوچے کہ کہا یہ جارہا ہے کہ

اے رسول! اس نظام کے قیام میں جن مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے اور اس کی آخری کامیابی میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس سے اثر پذیر اور ملول خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تم ذرا سوچو کہ نبوت ملنے سے پہلے اور اس کے بعد کے ابتدائی مراحل میں تمہاری پریشانیوں اور تفکرات کا کیا عالم تھا۔ تم تلاش حقیقت میں سرگرداں و پریشان پھرتے تھے تمہیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی اور کشادگی کوئی راہ تمہارے سامنے نہیں کھلتی تھی۔ اس مقام پہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (94:1) ہم نے تمہیں وحی عطا کی جس سے زندگی کی تمام راہیں روشن ہو گئیں۔ تمہارے سینے میں اس قدر کشادہ پیدا ہو گئی کہ جو ہم پہلے ناقابل تسخیر نظر آتی تھی اس کا سر کرنا ممکن دکھائی دینے لگا۔ عزیزانِ من! اس کے لیے کتنا بڑا جگر چاہیے تھا؟ یہ کس قدر تکلیف دہ صورت حال تھی!

آپ ﷺ کے لیے سراج منیر کا لقب بڑا ہی غور طلب لقب ہے

قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کو سِرَاجًا مُنِيرًا (33:46) کہا ہے: چراغ، روشن دیا، بجھا ہوا نہیں، روشن دیا۔ یہ جو روشن ساتھ کہا ہے روشنی دینے والا، ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ یہ چراغ کی بڑی صفت ہے کہ وہ روشنی دیتا ہے۔ عزیزانِ من! جب تک چراغ اپنے آپ کو جلاتا نہیں ہے روشنی نہیں دے سکتا۔ سِرَاجًا مُنِيرًا اس وقت بنتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پہلے جلاتا ہے، جگرسوزیاں ہیں جو اس کے بعد پھر منیر بناتی ہیں۔ چراغ اپنے آپ کو جلائے نہیں تو روشنی نہیں دے سکتا، اور یہ تو اتنے بڑے چراغ تھے اس زمانے میں بھی

❶ یہ لوگ جب تجھے دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور (ایک ایسے انداز سے جس میں استہزاء و استخفاف پوشیدہ ہوں) کہتے ہیں کہ ”اچھا! یہ ہیں وہ جنہیں خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے!“ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 824)۔

کترہ ارض کو انہوں نے منیر بنایا اور قیامت تک کے لیے یہ چراغ جلے اور پھر چراغ کا تو جلتے رہنا ہے۔ یہ کوئی کچھ کم جلتے رہنے کی بات کچھ کم جگرسوزی اور دلدوزی کی بات نہیں بلکہ آپ کی ذاتِ اقدس پر وہ استہزاء تک اترے ہوئے ہیں جبکہ آپ ﷺ نے مقابلے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اِلٰهَتِنَا لَوْ لَا اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا (25:42) یہ تو ہمارے اہلوں سے ہمیں الگ کر دیتا اگر ہم ثابت قدمی سے اپنے مسلک پر جمے نہ رہتے۔ عربی زبان کے اندر ”الہ“ کا لفظ موجود ہے۔ قرآن میں ان بتوں کے لیے خود ”وثن“ (وثن) وغیرہ کے الفاظ بھی آئے ہوئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ الہ ہی کا لفظ یہاں کیوں آتا ہے؟ الہ کے معنی ہی ”صاحب اقتدار“ کے ہیں اور عبودیت کے معنی محکومیت کے ہیں۔

عالمگیر انسانیت کے لیے آزادی کا پیامبر عظیم

میں ابھی عرض کر دوں کہ عید میلاد النبی ﷺ پر ہمارا ایک خصوصی درس ہوا کرتا ہے۔ اس دفعہ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس تقریب سعید پر



میرا خطاب ہو یا درس خصوصی ہو۔ میں اس کا عنوان ہی یہ رکھنا چاہتا ہوں: ”آزادی کا پیامبرِ عظیم“۔ حضور ﷺ نے انسانیت کو آزادی عطا فرمائی۔ کس قسم کی آزادی عطا فرمائی؟ سب سے بڑی نعمت، سب سے بڑا احسان، سب سے بڑا کارنامہ جو حضور ﷺ نے سرانجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے نوعِ انسانی کے لیے آزادی عطا فرمائی۔ میں ابھی سے یہ عرض کر دوں کہ یہ فروری کی بیس تاریخ کو ہے۔ ویسے تو وہ دن ہی عیدِ میلاد النبی ﷺ کا ہے لیکن اس دن کی تو تخصیص نہیں ہے۔ ہمارا درس اب اگلے جمعہ کو ہی آئے گا، چوبیس تاریخ ہوگی۔ تو چوبیس تاریخ کے جمعہ کا صبح کا درس ہوگا، وہ ساڑھے نو بجے کے بجائے دس بجے ہوگا، اور اس میں میرا یہ خصوصی درس ہوگا جس میں موضوع ہے: ”آزادی کا پیامبرِ عظیم“۔ میں اس میں بتاؤں گا کہ وہ کون کون سی زنجیریں تھیں جو انسانیت کو پہنائی گئی تھیں اور جن کو کاٹ کے حضور ﷺ نے انسانیت کو آزادی عطا فرمائی تھی۔ یہ اگلے جمعہ کے صبح کے درس میں ہے۔ کارڈ چھپے ہوئے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہو گیا ہے، ساتھ لیتے جائیے گا اور جو صاحب ذوق احباب ان امور سے دلچسپی رکھیں ان تک پہنچا دیجیے گا تاکہ اس کا اعلان عام ہو جائے۔ اعلان کا کوئی اور ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے اس لیے اسی کے ذریعے اعلان کو عام کیجیے گا۔

آئندہ درس میں عرض کروں گا کہ یہ الہ کیا تھے۔ یہ بتوں کی بات نہیں تھی۔ یہ مختلف الہ تھے جنہوں نے انسانوں کو اپنا غلام محتاج محکوم بنا رکھا تھا۔ ان کی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے یہ پیغمبر ﷺ آیا تھا۔ یہ تھا ان کا اعتراض کہ اگر ہم اپنے ان پروگراموں کے اوپر جم کے نہ رہتے تو اس نے تو آ کے ان کا تختہ الٹ کے رکھ دیا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ سَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا (25:42) انہیں جب ان کے اس غلط نظام کے نتائج میں تباہیوں کا سامنا کرنا پڑے گا تو اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ وہ کون ہے جو صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہ پر چل رہا ہے، وہ کون ہے جس نے ان کے خلاف ظلم کیا ہے اور یہ محسنِ انسانیت ہے جس نے انہیں کس کس غلامی سے چھڑا دیا ہے۔ یہ انہیں اس وقت پتہ چلے گا۔

### الہ کا قرآنی مفہوم

قرآن نے اگلی بات بڑی اہم کہی ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ نہ تو دلیل و برہان پہنچی ہے نہ واقعات اور حقیقت پہنچی ہے۔ یہ تو ان کی مفاد پرستیوں کی خواہشات ہیں، ان کے پست جذبات ہیں جن کی بنا پر یہ سب کچھ کہتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے جذبات ہی کو اپنا ”معبود“ بنا رکھا ہے۔ اَرَايْتُمْ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ<sup>①</sup> (25:43)۔ دیکھیے یہاں وہ لفظ الہ آ گیا۔ ترجمہ یہ ہے کہ تو نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا کہ جس نے اپنے جذبات اپنی خواہشوں ہی کو اپنا الہ بنا لیا۔ ظاہر ہے کہ جو الہ ہے اگر ہم عام معنی کہیں، جس کی پرستش کی جاتی ہے تو یہ تو پھر اپنی خواہشات اور اپنی آرزوؤں اور اپنے جذبات ہیں، جن کی پرستش تو کوئی نہیں کرتا۔ یہ کیا چیز ہے کہ

انسان کا فیصلہ اس کے جذبات کے تابع ہو اس پر جذبات غالب رہیں اور وہ اس طرح اپنے جذبات میں مغلوب رہے؟ یہ تو الہ وہ ہے جس کو اپنے اوپر غالب کر لیا جائے جو اپنے آپ کو دوسروں کے اوپر غالب کر دے وہ اس کا الہ ہو جاتا ہے۔ کہا کہ دیکھا تم نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا کہ جس نے اپنے جذبات اپنی خواہشات ہی کو اپنا الہ بنا لیا۔ وحی تو بہت بڑی چیز ہے۔ عقل و فکر کی رو سے اپنے معاملات کا فیصلہ نہیں کر رہا جذبات کی رو سے فیصلہ کرتا ہے اور جو جذبات سے مغلوب ہو جائے آپ جانتے ہیں کہ اس کے فیصلے کیا ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے تو ان شرا بیوں وغیرہ کی محسوس شکل آتی ہے جس میں سمجھتے ہیں کہ آدمی پاگل ہو گیا۔ وہ بھی کیا ہوتا ہے؟ جذبات تیز ہو جاتے ہیں لیکن یہ شراب تو وہی نہیں ہے جو پیالے کے اندر ڈال کے پی جاتی ہے۔ نشہ لانے والی شرا بیں تو کئی ایسی ہیں جو بڑی غیر محسوس ہوتی ہیں۔ جذبات کا تیز ہو جانا یہ ہے کہ جو حقیقت میں انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ دیوانگی پر لے آتا ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟ یہ پاگل تھوڑے سے وقت کے لیے ہوتا ہے اس کے بعد غصہ فرو ہو جاتا ہے جذبات کی شدت کم ہو جاتی ہے تو نارمل ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کا عرصہ لمبا ہو جائے تو اسے مینٹل ہاسپٹل (پاگل خانہ) میں بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ تو صرف Duration (دورانیہ) کا فرق ہوتا ہے۔ تھوڑے سے عرصے کے لیے ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جو جذبات سے مغلوب ہوتا ہے تھوڑے سے عرصے کے لیے پاگل ہوتا ہے۔ اگر مستقل طور پہ ہوتا ہے تو جیسا کہ میں نے کہا ہے وہ پاگل خانے میں ہوتا ہے۔ کہا کہ جو جذبات سے مغلوب ہو کر باتیں کرے اسے دلیل و برہان کیا کام دے؟ یہ جو مذاق اڑا رہے ہیں اور اس سطح پہ پہنچے ہوئے ہیں یہ جذبات سے مغلوب ہو چکے ہیں۔

❶ سو جو شخص اپنی خواہشات کا غلام اور پرستار بن جائے اسے کون راہ راست پر لاسکتا ہے؟ (پرویز: مفہوم القرآن ص 824)۔

## صرف قرآن حکیم ہی انسانی جذبات کی راہنمائی کرتا ہے

یاد رکھیے انسانی جذبات معیوب چیز نہیں ہے کہ قرآن ان کے پیچھے لٹھ لے کر پھر رہا ہے۔ یہ تو بڑی چیز ہیں۔ جذبے کے بغیر تو کوئی عمل ہی سرزد نہیں ہوتا۔ غیرت کس کا نام ہے؟ یہ ایک جذبہ ہے۔ جسے مال صدقہ جان کہتے ہیں اس میں انسان عقل و فکر کی رو سے کرتا یہ ہے کہ جان بچانے کے لیے مال صرف کر دیا۔ لیکن جب ہم جان صدقہ آبرو کہتے ہیں تو یہاں تو ایک جذبہ کام دیتا ہے۔ جو آبرو کی اہمیت اور قیمت کو جانتا ہے اسے غیرت کہتے ہیں۔ بے غیرت کون ہوتا ہے؟ وہ جس کے دل میں آبرو کو بچانے کے لیے جذبہ نہ ابھرے۔ حق کی خاطر آپ جان دیتے ہیں تو جذبے کے ماتحت دیتے ہیں۔ یہ بڑی چیز ہے۔ بات ساری یہ ہے کہ اگر آپ میں غصے کا ایک جذبہ ابھرتا ہے آپ ایک کمزور ناتواں مظلوم کے سینے میں چھری گھونپ دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک جذبہ ہے۔ اس کے برعکس آپ کے دل میں مظلوم کی حفاظت کا جذبہ ابھرتا ہے آپ اس ظالم کا گلا کاٹتے ہیں۔ یہ بھی جذبہ ہے۔ تو جذبہ بجائے خویش کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو قابلِ مذمت

ہے یا باعثِ تعریف ہے۔ وہ تو ایک تلوار ہے، اگر آپ اس تلوار کو کمزور اور مظلوم کے سینے میں گھونپ دیں گے تو تلوار آپ کے ہاں کی مذموم ہو جائے گی، قابلِ نفرت ہو جائے گی، اگر ظالم کے سینے میں آپ اس کو اتاریں گے تو وہ وجہِ تعریف ہو جائے گی۔ یہ قرآن کی عجیب چیز ہے۔

## مذہب کی دنیا انسان کو نفس کشی کا سبق دیتی ہے

قرآن کے اس تصورِ جذبات کے برعکس، مذہب کی دنیا میں، روحانیت کی دنیا میں، وہ جذبات کے پیچھے لٹھ لیے پھر رہے ہیں۔ نفس کشی کر کے ان کے ہاں سب سے بڑا مرتبہ روحانیت کا ہے۔ ہو جا لکھ مسیت، دے سب دے پیراں تھلے اوں اندا تریا جا، رُک وی نا۔<sup>①</sup>

تھے ہم پوت پٹھان کے، دل کے دل دیں موڑ

شرن پڑے رگنا تھ کے، سکیں نہ تنکا توڑ<sup>②</sup>

(وحید خاں<sup>②</sup>)

① بے قدر و منزلت ہو جا، اس پر کاہ کی طرح ہو جا جو بغیر محسوس ہوئے ہر ایک کے پاؤں تلے روند اجاتا ہے یعنی مدافعت کے جذبات کو روند کر مسجد کی صف کے ٹوٹے ہوئے تنکے کی طرح ہو جا جو نمازیوں کے پاؤں تلے چپنے کی سکت بھی نہیں رکھتا۔

② وحید خاں ایک پنجابی شاعر تھا جو کسی ہندو جوگی کا مرید ہو کر فلسفہ و ہدایت (ویدانت اور وحدت الوجود ایک ہی چیز ہے) کا قائل ہو گیا تھا۔ اس تبدیلی خیال و عقیدہ نے جو اثر اس پر کیا ہے اسے وہ خود اس شعر میں بیان کرتا ہے کہ ”میں پٹھان تھا اور فوجوں کے منہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگنا تھ جی کے قدم پکڑے ہیں یا بالفاظِ دیگر یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود جاری و ساری ہے، میں ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دکھ پہنچنے کا احتمال ہے۔“ کاش وحید خاں کو یہ معلوم ہوتا کہ زندگی نام ہی دکھ اٹھانے اور دکھ پہنچانے کی قوت رکھنے کا ہے۔ زندگی کا مقصد زندگی ہے نہ موت۔ (پرویز: تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور، 1992ء، ص 295)۔

یہ ہے جناب! شرافت کی دنیا میں اس کو بے غیرت نہیں کہتے، تو اور کیا کہتے ہیں! یہ بدترین قسم کی مذمت ہے۔ یہ وہ ہے جسے بے حیا اور بے غیرت کہتے ہیں۔ اس کے اندر مدافعت کا وہ جذبہ نہیں ہوتا۔

## جذبات کو فنا کرنا تو قوتِ عمل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جذبہ بجائے خویش ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی مذمت کی جائے۔ قرآن کی تعلیم کا کیا پوچھتے ہیں، عزیزانِ من! آپ شروع سے تاریخ دیکھ لیجیے گا۔ یہ مذہب کی تاریخ، جو رہبانیت میں یا روحانیت میں آ کر بلندیوں تک پہنچتی ہے، اس میں ہر جگہ آپ کے ہاں نفس کشی کو انسانیت کا بلند ترین معراج بتایا جائے گا۔ قرآن آ کر کہتا ہے کہ جذبات کو الگ کر دیجیے تو انسان کے اندر قوتِ عمل ختم ہو جاتی ہے۔ جذبات تو وہ پانی ہے جو پہاڑوں سے ندیوں کی شکل میں آتا ہے۔ اس سے کہا ہے کہ اس کو ساحلوں کے اندر رکھو، تو دریا ہوگا، اس سے زندگی ملے گی، نشوونما ملے گی، ساحل توڑ دیجیے تو یہ سیلاب بن جائے گا، اس سے تباہیاں ہوں گی۔ پانی تو ایسا وجہ

نذمت نہیں ہے۔ پانی کی رفتار اور روانی ہے جو دیکھنے کی چیز ہے کہ وہ ساحلوں کے اندر مقید رہتا ہے یا بیباک ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم اس باب میں پہلے تو یہ کہتا ہے کہ جب جذبات کسی کے اوپر غالب آ جاتے ہیں تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ اَفْرَعَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ (45:23) یعنی اس کی حالت پہ بھی تم نے غور کیا ہے کہ جو اپنے جذبات سے ہی مغلوب ہو جائے۔ اب الہ کے معنی یہ ہو گئے کہ ”خدا بنالے“۔ جسے ہم کہتے ہیں کہ اپنے جذبات ہی کو خدا بنا لے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ وَ أَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَى عِلْمٍ (45:23) وہ علم کے باوجود غلط راستے پہ چلنے لگ جاتا ہے۔ اس وقت علم کام نہیں دے سکتا، عقل و ہوش ہی نہیں رہتی۔ جذبے میں آ کر تو علم کام نہیں دیتا۔ پھر وَ خَتَمَ عَلَى سَمْعِهِ وَ قَلْبِهِ وَ جَعَلَ عَلَى بَصَرِهِ غِشْوَةً (45:23) اندھا ہو جاتا ہے، بہرہ ہو جاتا ہے، پاگل ہو جاتا ہے، اس کے حواس (Senses) کام ہی نہیں دیتے۔ آپ دیکھ لیجیے۔ شرابی کی مثال تو آپ کے سامنے ہے۔ جو شخص غصے میں ہوتا ہے، وہ پاگل ہو گیا ہوا ہوتا ہے، اندھا ہوتا ہے، بہرا ہوتا ہے، کسی کی سنتا نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہوتا ہے جب جذبات کو اس طرح سے اپنے اوپر غالب کر لیا جائے۔ کہتا ہے کہ فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ (45:23) ایسے شخص کو کون صحیح راستے پہ لاسکتا ہے، جو نہ دیکھے نہ سنے نہ سمجھے جذبات اس کے اوپر غالب آئے ہوئے ہوں۔ آپ اس کو سمجھا ہی نہیں سکتے، پھر تو گویا جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ جذبات کو فنا کر دو، وہ انہیں حدودِ خداوندی میں رکھنا چاہتا ہے۔

### وحی خداوندی سرکش جذبات کو ساحلوں میں محصور کر دیتی ہے

دوسرے مقام پہ قرآن کہتا ہے کہ فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ (28:50) یہ جو تمہاری اس قدر منفعت بخش انسانیت ساز آواز پہ بھی لبیک نہیں کہتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جذبات سے مغلوب ہو رہے ہیں۔ اور آگے ہے وہ بات جو کہنی ہے۔ کہا کہ وَ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ (28:50) اس سے زیادہ غلط راستے پہ چلنے والا کون ہو سکتا ہے جو اپنے جذبات ہی کا اتباع کرتا چلا جائے۔ بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اگلی بات یہ ہے کہ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ (28:50) جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر جذبات کے پیچھے چلتا چلا جائے تو گویا ہدایت خداوندی کے تابع جذبات کے پیچھے اگر چلتا جائے تو وہ چیز ہے جو نفع ہی نفع دیتی ہے، منفعت بخش ہوتی ہے: مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ (28:50) یہ ہے اصل چیز۔ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ (28:50) جذبات کا اتباع کرے گا تو تباہی آئے گی، سرکشی آئے گی۔ ہدایت خداوندی کے ساحلوں کے اندر اس کو محصور رکھے گا تو یہ دریا منفعت بخش بن جائے گا۔ یہ ہے قرآن کی تعلیم۔ یہ جتنے لوگ تباہیاں لانے والے گزر رہے ہیں یہ وہ تھے جنہوں نے اپنے جذبات سے کام لیا یعنی بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ (28:50) رہے خدا کی رہنمائی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کی پیروی کرتے رہے۔ اپنے جذبات کو ہمیشہ ہدایت خداوندی کے تابع رکھنا چاہیے۔ اگر یہ ہے تو جذبات خویش کوئی بری چیز نہیں ہیں جن کا اتباع جرم قرار پا جائے۔

## وحی انسانی جذبات کی کمزوریوں سے ماوراء حقیقت ہے

عزیزانِ من! یہاں سے پھر ایک اور اہم بات سامنے آئی: وحی کا یہ اتباع قرآن نے کیوں ضروری قرار دیا ہے، وحی کے اتباع پہ وہ اتنا زور کیوں دے رہا ہے؟ زور کے علاوہ وہ کہتا ہے کہ یہی ایک راستہ ہے جس سے انسان بھٹکتا نہیں، یہ صرف وحی کا راستہ ہے۔ کیا تخصیص ہے اس راستے کی، کیا خصوصیت ہے اس راستے کی؟ کیا بتاؤں، عزیزانِ من! قرآن کیا کچھ کہتا ہے! معاف رکھیے وہ کہتے ہیں کہ جتنا بلند یوں پہ انسان ہو وہاں اتنی ہی زیادہ ٹھنڈ ہوتی ہے۔ آپ کے مقابلے میں مجھے اس لیے زیادہ ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ عزیزانِ من! وحی کا یہ بڑا عجیب نکتہ ذہن میں آ گیا، جو کہا کہ وحی کی ایسی کیا خصوصیت ہے؟ ہمارے ذہن میں تو یہ ہے کہ صاحب! وحی خدا کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ بس یہ خصوصیت ہے کہ خدا کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ اپنے ذہن سے فیصلہ کریں، کوئی دوسرا فیصلہ کرے، ایک انسان فیصلہ کرے، جتنے انسان جی چاہے فیصلہ کر لیں، مل کے ڈیما کر لیں (جمہوریت) فیصلہ کر لے، سارے اکٹھے ہو کر فیصلہ کر لیں، وہ کہتا ہے کہ انسان جب شعوری یا غیر شعوری طور پہ کوئی فیصلہ کرے گا تو اس کے جذبات کی آمیزش، اس فیصلے کے اندر کسی نہ کسی حد تک ضرور ہو جائے گی۔ خالصتاً جذبات کی آمیزش کے بغیر خالصتاً عقل کا فیصلہ نہیں ہوگا۔ آج اس حقیقت کو سائیکولوجسٹ تسلیم کر رہے ہیں۔ ان سے پوچھیے Psycho Analysis (تحلیل نفسی) والوں سے پوچھیے۔ ان کے پاس جن لوگوں کے Cases آتے ہیں ان میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ ”وہ ان کو ایسا بیان کرتے ہیں کہ جیسا ان میں جذبات کی کوئی آمیزش، ذرا سی رمت بھی نہیں ہوتی، بالکل صاف الگ ہٹے ہوئے ہیں جیسا کہ وہ یہ کچھ کرتے ہیں لیکن جب وہ تھوڑا سا کرید کے ذرا نیچے جاتے ہیں، نظر آتا ہے کہ ”انہیں خود بھی علم نہیں تھا کہ ان کے وہ چھپے ہوئے جذبات اندر ہی اندر کیا کر رہے تھے، ان کے فیصلے کو کدھر موڑ رہے تھے۔“

## انسانی فیصلوں میں انسانی تخیلات کا ہمیشہ دخل رہا ہے

ال Psycho Analysis (تحلیل نفسی) والوں کا کام ہی یہ ہے، عزیزانِ من! کہ وہ مریض کو بتائیں کہ تمہارے اس فیصلے کے اندر تمہارے چھپے ہوئے جذبات کا کتنا حصہ تھا، اس لیے تم جو اپنے آپ پہ مطمئن ہو کہ نہیں صاحب! میں نے یہ جذباتی فیصلہ نہیں کیا، میں نے بالکل عقل و ہوش کی رو سے یہ سارا فیصلہ کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ صاحب! جس کو تم پورا عقل و ہوش سے کہہ رہے ہو، اس کے اندر تمہیں پتہ نہیں ہے جذبات کا کتنا تعلق ہے، اس میں کتنی آمیزش تھی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی وجہ سے انسانوں کو مجرم قرار دے دیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ چیز دراصل یہ ہے کہ جذبات انسان کے قلب کی گہرائیوں کے اندر پیوست ہوتے ہیں، اس کے خون کے اندر حلول کیے ہوتے ہیں، اس لیے شعوری طور پہ ان کو معلوم نہ بھی ہو، غیر شعوری طور پر بھی ان کے اندر کچھ نہ کچھ اس کی

آمیزش ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فیصلہ وہی صداقت پر حقیقت پر مبنی ہو سکتا ہے جس کے اندر ان جذبات کی قطعاً آمیزش نہ ہو اور وہ کہتا ہے کہ کسی انسان کے فیصلے میں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ نہ ہوں اس لیے یہ فیصلہ کسی ایسے مقام سے آنا چاہیے یہ حکم یہ قدر یہ قانون ایسے مقام سے ملنا چاہیے جہاں جذبات نہ ہوں اور کہا ہے کہ صرف خدا کی ذات ایسی ہے جس میں جذبات نہیں ہیں۔ بڑی عجیب چیز سامنے آگئی دیکھیے کس حسین انداز سے وہ سورۃ النجم میں بات کر رہا ہے!

### ستاروں کی شکل میں راہنمائی کا ایک مستقل اور نہ بدلنے والا سہارا

حضور ﷺ کی دعوت یہ تھی کہ وحی کا اتباع کرو۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ وحی کے اتباع سے ہم غلط راستے پہ نہیں پڑ جائیں گے، وہ کسی بھی وقت دھوکا نہیں دے گا، بہکا نہیں دے گا، بھٹکا نہیں دے گا، اس کی ضمانت کیا ہے؟ کہا کہ تم ریگستان کو دیکھو۔ وہاں کسی چیز کا نشان تک نہیں۔ راہروں کو بھی ایک دفعہ کہیں کوئی نشان بنا بھی لیتے تھے کہ یہاں یہ ٹیلا ہے، یہاں یہ تھوڑا سا پتھر ہے، یہاں یہ کوئی درخت وغیرہ ہے، آندھی کا ایک جھونکا آتا تھا تو ریت کے ٹیلوں کے ٹیلے ان کے اوپر چڑھ دوڑتے تھے، سارے نشان ہی مٹ جاتے تھے۔ کہا کہ تم یہ سفر کرتے ہو اور سفر بھی دن میں نہیں کرتے۔ دن میں تو بڑی گرمی ہوتی تھی، تپش ہوتی تھی۔ یہ لوگ راتوں کو سفر کرتے تھے۔ کہتا ہے کہ ان صحراؤں میں سفر کرنا، جہاں راستہ ہی کوئی نہیں، پھر راتوں کو سفر کرنا، روشنی بھی نہیں تھی، تو کہا اس کے باوجود تمہاری کیفیت یہ ہے کہ کبھی تمہارا قافلہ بھٹکتا نہیں ہے، صحیح راستے پہ چلا جاتا ہے۔

کس طرح چلا جاتا ہے؟ وہ ستاروں سے راہنمائی لیتے تھے۔ آج تو بہر حال ہم سڑک پہ جولائٹ سگنل ہیں اس سے راہنمائی نہیں لیتے تو روز ایکسیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیں کیا پتہ ستاروں کی راہنمائی کیا ہوتی ہے، جہازوں کے کپتان آج بھی یہ جانتے ہیں۔ وہ ستاروں سے راہنمائی لیتے تھے۔ کہا کہ بتاؤ، ستاروں سے جو تم راہنمائی لیتے ہو تو کبھی انہوں نے تمہیں دھوکا دیا ہے، کبھی بھٹکایا ہے، کبھی بہکایا ہے، کبھی ایسا ہوا ہے کہ آدھی رات کے بعد یہ تمہارا ساتھ ہی چھوڑ گئے ہوں، کبھی کسی طرح سے بھی ساری زندگی میں؟ تم شہادت دو اس بات کی کہ کبھی ایسا ہوا ہے۔ کیوں نہیں ایسا ہوتا؟ اس لیے نہیں ہوتا کہ ستارے قانونِ خداوندی کے تابع اپنی روش کو قائم رکھتے ہیں اور دوسری چیز یہ کہ ان میں اس کی صلاحیت اور استعداد نہیں ہے کہ یہ اس کی خلاف ورزی کر سکیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خارجی کائنات کی ان چیزوں کی طرف ہم نے وحی کی ہوئی ہے: سماء کی طرف وحی <sup>①</sup> ارض کی طرف وحی <sup>②</sup> شہد کی مکھی کی طرف وحی <sup>③</sup> اور ان میں اس کی استعداد و صلاحیت ہی نہیں کہ اس وحی کی خلاف ورزی کر سکیں لیکن یہ جو تم دیکھتے ہو کہ وہ صحیح محکم راستے پر چلتے رہتے ہیں کبھی دھوکا نہیں دیتے، نہ خود بھٹکتے ہیں، نہ تمہیں بھٹکاتے ہیں، نہ فریب دیتے ہیں، تو یہ کیا چیز ہے؟ چیز یہ ہے کہ یہ وحی کے تابع چل رہے ہیں اور تم یہ مانتے

ہو کہ یہ اس چیز کی شہادت ہے۔ دیکھو: **وَ النَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ** (53:1) یہ ستارہ روز اپنے مقام سے نکلتا ہے ایک خاص سفر طے کرتے ہوئے خاص مقام پہ جا کر ڈوب جاتا ہے۔ جب سے اس کائنات نے آنکھ کھولی ہے یہ اسی روش پہ چلے جا رہا ہے چلتا جا رہا ہے کبھی دھوکا نہیں دیتا کبھی بھٹکا تا نہیں ہے۔ یہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ **مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوَىٰ** (53:2) یہ جو تمہارا ساتھی ہے جو تم سے راہنمائی کی باتیں کرتا ہے یہ بھی تمہیں اس ستارے کی طرح دھوکا نہیں دے گا اور نہ ہی بہکائے گا۔ ستاروں کی روش اس بات کی شہادت ہے۔ اس لیے کہا کہ **وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ** (53:3) جو کچھ تمہیں یہ کہتا ہے اس میں اس کے اپنے جذبات کا دخل نہیں ہوتا بلکہ **إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ** (53:4) یہ وحی کی رو سے تمہیں یہ کچھ کہتا ہے۔ یہ ہے وحی کی خصوصیت۔

### وحی کے اندر انسانی جذبات کا دخل نہیں ہوتا

عزیزانِ من! وحی میں انسانی جذبات کی کوئی آمیزش نہیں ہوتی۔ آپ نے سمجھ لیا کہ وحی Definition (تعریف) کیا ہے اس کی خصوصیت کیا ہے اس وحی کے متعین کیے ہوئے نشانات راہ کیوں ایسے ہیں جس سے انسان بھٹک نہیں سکتا۔ ایک آیت میں بتایا کہ **مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ** (53:3) تمہارا یہ رفیق سفر خود اپنی طرف سے نہیں بات کر رہا یہ اپنی بات نہیں کہہ رہا تم سے بہ حیثیت رسول کہہ رہا ہے۔ کوئی انسان تم سے یہ نہیں کہہ رہا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی طرف سے کہے تو اس میں جذبات کی آمیزش کا شائبہ ہو سکتا ہے۔ یہ اپنی

① **أَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ (41:12)**

② **بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا (99:5)**

③ **أَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ (16:68)**

طرف سے یہ بات نہیں کہہ رہا بلکہ **إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ** (53:4) یہ تو وہی راہنمائی ہے جو اس کی طرف وحی کے ذریعے بھیجی جاتی ہے اور وہ تم تک پہنچاتا ہے۔ لہذا خدا کی وحی کے مطابق چلنے والے ستارے اگر تمہیں دھوکا نہیں دیتے اور صحیح راہنمائی کرتے ہیں تو یہ وحی جو تم تک پہنچا رہا ہے یہ بھی اسی طرح سے تمہاری راہنمائی کرے گا اور کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ اس لیے کہا جا رہا ہے کہ اس کا اتباع کرو۔ عزیزانِ من! پوری کی پوری سورۃ النجم سامنے ہے۔ بہت جی چاہتا ہے کہ میں کہتا چلا جاؤں لیکن اس کے لیے تو بڑا وقت چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے یہ مقام محمدی میں سلیم کے نام خطوط<sup>①</sup> میں اس کی پوری تفصیل لکھی ہوئی ہے۔ بڑی ہی جذب و کیف کے اندر یہ چیز آئی ہوئی ہے اور پوچھو نہیں کہ قرآن میں بھی کہاں کیا کیا کہا گیا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝ ذُو مِرَّةٍ ۝ فَاسْتَوَىٰ ۝ وَ هُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۝** (53:5-9)<sup>②</sup>

عزیزانِ من! میں کیا بتاؤں کہ یہ آپ کو کیا بتاتے ہیں! اور یہ قَابِ قَوْسَیْنِ کیا ہے؟ بہر حال یہ تو باتیں ہی اور ہیں اب تو افسانے رہ گئے ہیں۔ مذہب میں افسانے ہوتے ہیں مذہب کا سامری ہوتا ہے۔ سامری کے معنی ہی داستان گو کہانیاں کہنے والا راتوں کو کہانیاں کہہ کے سنانے والا ہوتے ہیں۔ یہ قَابِ قَوْسَیْنِ (53:5) بڑی عظیم چیز ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اَرَعَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هُوَهُۥٓ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِیْلًا (25:43) ایسے آدمی کی تم راہ نمائی کر سکتے ہو اس کی نگرانی کر سکتے ہو اس کو صحیح راستے پہ لا سکتے ہو اس کی وکالت کر سکتے ہو جو عقل و ہوش میں ہی نہیں

① پرویز (1984)۔ سلیم کے نام جلد دوم (انیسواں خط: مقام محمدی) لاہور: ادارہ طلوع اسلام ص 24 تا 49۔

② یہ (وحی) اُسے اُس خدا کی طرف سے ملتی ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے (اس کی قوتوں کا اندازہ تو تم نظام کائنات بالخصوص ستاروں کی دنیا سے کر سکتے ہو کہ یہ عظیم الجثہ آسمانی کڑے اس کے قوانین میں جکڑے ہوئے کس نظم و ضبط سے اپنی اپنی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح اُس نے جو قوانین وحی کے ذریعے انسانی راہنمائی کے لیے دیئے ہیں وہ بھی اپنی نتیجہ خیزی میں سرموادھڑا دھڑ نہیں ہوتے) (53:5)۔ وہ خدا صرف لامحدود قوتوں کا مالک ہی نہیں وہ زندگی کی مختلف گزرگاہوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے، لہذا اس قابل ہے کہ ایسی ہمہ گیر راہ نمائی دے جو انسان کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کے تمام شعبوں کو محیط ہو۔ (ظاہر ہے کہ جس شخصیت (رسول) کو اس قسم کی وحی کا حامل ہونا ہوا اسے حسن سیرت کی کن رعنائیوں اور علم کی کن بلندیوں کا پیکر ہونا چاہیے؟ چنانچہ اس رسول کی ذات میں پورا پورا توازن پیدا ہوا اور پاکیزگی سیرت اپنی انتہا تک پہنچ گئی۔ (53:6) اس کے ساتھ ہی وہ (وحی کی رو سے) علم کی ان بلندیوں پر بھی جا پہنچا جہاں عقل انسانی کی رسائی ناممکن ہے۔ (53:7 نیز 81:23)

وہاں پہنچ کر وہ حقائق کائنات سے قریب تر اور قوانین خداوندی کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان سے ہم آہنگ ہو گیا (53:8)۔ تو انین خداوندی سے ہم آہنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انسانی دنیا میں خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے خدا کا رفیق بن گیا (8:17)۔ جس طرح تم باہمی رفاقت اور معاہدہ کی پختگی کے لیے دو کانوں کو اس طرح ملاتے ہو کہ وہ ایک ہی قاب (چلہ) والی بن جاتی ہیں اور دونوں مل کر اکٹھا تیر چلاتے ہو خدا کے ساتھ رسول کے عہد رفاقت کی یہی مثال ہے۔ بلکہ اس کی رفاقت اس سے بھی زیادہ محکم اور گہری ہوتی ہے (53:9)۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 1238 تا 1239)۔ ہے۔ اے رسول! کیا تیرے لیے ممکن ہے کہ تو اس قسم کے آدمی کی اس طرح نگہبانی کر سکے کہ وہ تباہی کے جہنم میں نہ گرے؟ تو ایسے شخص کا کبھی ذمہ نہیں لے سکتا، شرابی کو بھی کچھ سمجھانا ہوتا ہے تو جب اس کو بٹھا رکھتے ہیں سلا دیتے ہیں کہ ٹھہر جاؤ بھئی! جب ہوش میں آئے گا اس وقت پھر بات کی جائے گی۔ اس وقت ان لوگوں سے یہ بات کہنا بیکار ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اَمْ تَحْسَبُ اَنْ اَکْثَرُهُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ (25:44) انسان یہ دیکھ کر دھوکا کھا جاتا ہے کہ صحیح شکل و صورت انسان کی سی ہے۔ ٹھیک ہے شراب کے نشے کی منہ سے بوجھ نہیں آرہی، شرابی تو ہے نہیں، یہ خواہشات کا غلام اور پرستار بننا بو والی شراب نہیں ہے۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ شرابی کس قسم کی ہیں۔ اس کی بونہیں آتی، یہ ان دکانوں سے نہیں ملتی، اس لیے کسی پر مٹ اور لائنس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، ان کی بھٹیاں تو دل کی گہرائیوں میں لگی ہوئی ہوتی ہیں، یہ تیار کیا جاتا ہے گٹا گٹ پئے جاتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ کیا تو اس شخص کو سمجھتا ہے؟ یہ دیکھ کہ اس



کی شکل و صورت اچھے آدمیوں جیسی ہے کہ یہ نشے میں نہیں ہے مگر یہ غلط ہے۔ یہ نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ یہ نشہ عجیب قسم کا نشہ ہے: قوت کا نشہ نام نہاد درو حانیت کا نشہ وہ جو آ کے پاؤں چومتے ہیں عزیزانِ من! پوچھو نہیں کہ ”کیڈا اوڈا ٹھرا ہوندا اے جیہڑا او پیندا اے آدمی“ قرآن کہتا ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سنتے ہیں سمجھتے ہیں؟ یہ سنتے سمجھتے نہیں ہیں۔

### بات کو سمجھانے کے لیے قرآن حکیم کا محاکاتی انداز

یاد ہے وہ (67:10) میں اہل جہنم کی بات چلی آرہی تھی کہ وہ نہ سمجھنے والے ہیں نہ سننے والے ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ اس واعظ کو دیکھیے کہ

#### ② کہ دوزخ را مقام دیگرے گفت

یعنی یہ اہل جہنم کی ایسے بات کر رہا ہے جیسے یہ دوسروں کی بات ہے یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی بات کرے۔ وہ باتیں کر رہا ہے اہل جہنم کی کہتا ہے کہ ان کی مت ماری ہوئی ہے۔ باتیں تو اس آیت سے اوپر سے ہوتی چلی آرہی ہیں۔ جہنم کے داروغے پوچھتے ہیں قرآن بڑے محاکاتی انداز میں ان باتوں کو سمجھاتا ہے کہ یہ پوچھتے ہیں کہ صاحب! تم اچھے بھلے شریف آدمی نظر آتے ہو یہاں کیسے حوالات میں آگئے؟ جیل خانے کا داروغہ یہ سپرنٹنڈنٹ دروازے پہنچا ہی ان کو پوچھتا ہے کہ کیوں میاں! تم تو بڑے اچھے بھلے سمجھ دار تھے تو تم کیسے یہاں آگئے؟ انہوں نے کہا کہ تم کہتے ہو کہ ہم سمجھ دار تھے سنو! وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ (67:10) اگر ہم اپنے عقل و ہوش اور علم و عقل سے کام لیتے، نشے میں نہ رہتے، تو کبھی اہل جہنم میں نہ ہوتے۔ نشے کا شمار انسان

① وہ (نشہ) کس قدر طاقتور ہوتا ہے جسے یہ انسان پیتا ہے!

② زدوزخ واعظ کافر گرے گفت حدیث خوشتر ازوے کافرے گفت

نہ اند آں غلام احوال خود را کہ دوزخ را مقام دیگرے گفت

کی بڈیاں توڑ دیتا ہے۔ پوچھو نہیں کہ پھر اس کے بعد وہ جہنم کیا ہوتی ہے اندازہ لگائیے کہا کہ اگر ہم سمجھتے، اگر ہم کہیں غور و فکر سے کام لیتے، تو ہم کبھی اہل جہنم میں سے نہ ہوتے۔ وہ جو سورۃ الاعراف میں قرآن کریم نے بتایا ہے وہ یہ ہے کہ لَّهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا ذَوَّلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا ذَوَّلَهُمْ أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا (7:179) آدمی ان کا دھوکا کھا جاتا ہے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں اس سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں بھی دی ہیں خدا نے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان بھی دیئے ہیں خدا نے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ ہیں اہل جہنم۔ یہاں (7:179) میں بھی کہا اور وہاں (25:44) میں بھی کہا کہ اَلَا كُنَّا نَعْمًا (25:44) یہ عقل و ہوش سے کام ہی نہیں لیتے۔ یہ تو انسان نہیں حیوانات ہیں۔ پھر اُسی وقت کہا کہ نہیں نہیں: بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (25:44) یہ ان سے بھی زیادہ غلط راہ پر چلتے ہیں۔

اختیار و ارادہ کے ہوتے ہوئے عقل سے کام نہ لینے والا جہنم کا ایندھن ہوتا ہے

حیوانات تو پھر بھی اپنی Instinct (جبلت) سے کام لے کر ایک راستے پہ چلتے ہیں۔ یہ انسان تو ان سے بھی گزرے ہیں۔ ہم نے ان کو جبلت نہیں دی کہ اس سے ارادہ سلب ہو جاتا ہے۔ جبلت سے ارادہ نہیں رہتا۔ بکری کو کوئی Choice (اختیار) نہیں ہے کہ وہ چاہے تو پتے کھائے اور چاہے تو گوشت کھا لے۔ اسے چوائس (اختیار) نہیں ہے اس کے لیے جبلت ہے۔ ہم نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنایا ہے جبلت میں تو یہ بات داخل نہیں کی۔ یہ اپنے اختیار و ارادہ کو اس طرح برتا ہے جیسے شرابی برتا ہے۔ اب یہ کیا ہوئے؟ کہا کہ انسان نہیں رہے۔ ہم نے کہا کہ حیوان ہو گئے۔ کہنے لگے: حیوان بھی نہیں رہے۔ اس لیے کہ انسان جب گرتا ہے تو جسے یہ اپنے ذہن میں پستی سمجھتا ہے یا اس سے بھی زیادہ پستی میں جا گرتا ہے حالانکہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (95:4) خلقت کے اعتبار سے تو ہم نے اس کو نہایت متوازن ہیت میں پیدا کیا تھا اسے احسن تقویم دی تھی ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (95:5) یہ کجخت کرنے پہ آتا ہے تو جنہیں یہ اپنے ذہن میں پستی سمجھتا ہے یہ اس سے بھی زیادہ پستی کے گڑھے میں گرتا ہے۔<sup>①</sup> آخر یہ کیا چیز ہے جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے؟

عالم گیر سطح پر انسان کے لیے ذلت و خواری کے سبب کی اصل وجہ

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ سب سے بڑا تند و تیز نشہ انسان پر اپنی حکومت قائم کرنا ہے خواہ وہ کسی شکل کے اندر کیوں نہ ہو۔ بہت بڑا نشہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے قرآن انسانوں کے ذہن سے اتارتا ہے اور وہ کسی انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے انسان سے اپنا حق حکومت منوائے۔ زندگی رہی تو انہی دروس کے اندر میں یہ عرض کرونگا کہ یہ ہے آزادی جو رسول اللہ ﷺ نے

① اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006ء ص 488 تا 494۔

دی تھی جو قرآن نے دی تھی کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر حکومت نہیں کر سکتا سب برابر کی سطح کے اوپر ہیں۔ کہا کہ یہ ہے وہ چیز کہ جو لوگ جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں نشے میں رہتے ہیں وہ حیوانوں کی سطح سے بھی بدتر چلے جاتے ہیں۔

حقائق کو سمجھانے کے لیے قرآن حکیم کا انداز بیان بڑا ہی غور طلب ہے

یہاں (25:44) میں کہا کہ ہم نے حیوانات کی مثال دی ہے جو ہمارے قوانین پہ بلاچوں و چراں عمل کیے ہوئے لگے بندھے چلے جاتے ہیں ان میں مجال سرکشی نہیں ہے۔ کہا کہ حیوانات کو تو پھر بھی چلتے پھرتے دیکھتے ہو کہ اگر انہیں کہیں دھوپ میں گرمی لگے تو وہ

سائے میں چلے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے آگے چلیے۔ وہ جو یہاں کائنات کی جامد چیزیں ہیں انہیں دیکھیے اور سوچیے کہ خدا قانون کی اطاعت کرنے والی کن کن چیزوں کی مثالیں دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ذرا دیکھیے تو اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسُ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنَاهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا<sup>①</sup> (25:45-46)۔ میں نے کہا ہے کہ یہ صحرائیں اس سطح کے لوگ ہیں۔ انہیں بھی یہ سمجھایا جا رہا ہے آج کے آئن سٹائن (Einstein: 1879-1955) کو بھی بات سمجھائی جا رہی ہے۔ بات یہ بتانی ہے کہ خارجی کائنات میں کوئی چیز اپنے اختیار و ارادے سے کچھ نہیں کرتی کیونکہ ان کے اندر جذبات نہیں ہوتے۔ اُسے کہا کہ ذرات چیزوں کے سائے کو دیکھیے۔

بڑی عجیب مثال ہے عزیزانِ من! کہا کہ کیا کسی شے کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ اپنا سایہ اپنی مرضی کے مطابق مقرر کرے؟ نہیں! اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمارا ایک قانون ہے۔ سورج یوں بلند ہووہ جس طرح سے بلندیوں کے اوپر جاتا ہے اس کے مطابق سایہ بنتا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ اتنا ہی نہیں! یہ جو حضرت انسان اتنا پھننے خاں بنا پھرتا ہے بہت صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ ذرا اس سے پوچھیے کہ اگر سورج اس کی Back (پشت) پہ یعنی پیچھے سے نکل رہا ہو تو اس کا سایہ کدھر پڑے گا؟ اسے کہیے تو سہی کہ وہ ذرا اپنا سایہ ادھر ڈال

① (حیوانات تو ایک طرف خارجی کائنات میں بے جان اشیاء تک بھی ایک ہی روش پر چلتی رہتی ہیں) کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا کا قانون کائنات کس طرح (زوال آفتاب کے بعد) سائے کو لمبا کرتا ہے۔ اگر ہم چاہتے تو ایسا قانون بھی بنا سکتے تھے کہ (زمین گردش نہ کرتی اور اس طرح) سایہ ہمیشہ ایک جیسا رہتا۔ (لیکن ہم نے زمین اور سورج کی گردش کا باہمی تعلق اس قسم کا رکھا ہے کہ) ہر شے کا سایہ سورج کی نسبت سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اس طرح سورج اس کے گھٹنے بڑھنے کی دلیل بن جاتا ہے۔ یعنی سورج کے مقام سے ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں وقت پر سایہ کا انداز کیا ہوگا (25:45)۔ (یوں زوال آفتاب کے وقت سے سائے بڑھنے شروع ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ) ہم انہیں آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ (یعنی غروب آفتاب کے ساتھ یہ سائے بھی ختم ہو جاتے ہیں) (پرویز: مفہوم القرآن ص 825)۔

دے۔ اسے اس کا تو اختیار ہے کہ چاہے تو مشرق کی طرف چلا جائے چاہے مغرب کی طرف چلا جائے۔ مگر یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہے کہ مغرب کی طرف جائے تو اپنا سایہ اپنے پیچھے لے جائے۔ کہا کہ جو ہمارا قانون کائنات ہے اس کے سامنے تو یہ بھی اتنا بے بس ہے لیکن جہاں اس کا اپنا اختیار و ارادہ آتا ہے وہاں اس کمبخت کی یہ کیفیت ہے کہ اس کی عقل و ہوش سب ماری جاتی ہے ورنہ اگر وہ ہمارے قانون کے تابع اپنے اختیار و ارادے کو بھی کام میں نہ لائے تو کم از کم اتنا تو دیکھ لے کہ ہم نے جو سائے کا قانون مقرر کیا ہے کس طرح وہ سایہ مجبور ہوتا ہے اس کے اختیار میں ہی نہیں ہے۔ ہزار آدمی مل کے بھی چاہیں کہ اس کے سائے کو دوسری سمت میں الٹا دیں! الٹا ہی نہیں سکتے۔ ہمارا قانون تو اس طرح سے چلتا ہے۔

سائے کے اوپر کیا مثالیں دیتا ہے قرآن! کہا کہ سایہ بھی اس شے کی اپنی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا۔ خارج میں ایک چیز ہوتی ہے جسے سورج کہتے ہیں۔ یہ دیکھیے کہ وہ سورج اس سائے کو متعین کرتا ہے اس سائے کو کہ کتنا لمبا چوڑا، کتنا چھوٹا، کتنا بڑا، کس سمت میں، وہ آہستہ آہستہ ہو جائے۔ جب سورج ڈوب جاتا ہے تو **ثُمَّ قَبْضُتْهُ الْيَنَّا قَبْضًا يَّسِيرًا** (25:46) یہ کتنے آسانی سے اس سائے کو ہم پھر سمیٹ کے ختم کر دیتے ہیں۔ بڑے سے بڑے پہاڑ کو بھی کہو کہ اس کے بعد اپنا سایہ کہیں پھینک کے بتائے، یہ نہیں ہو سکتا۔ اب ”الینا“ پر بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ یہاں کہا کہ **قَبْضُتْهُ الْيَنَّا** (25:46) ہم اس کو اپنی طرف سمیٹ کے لے جاتے ہیں۔ یہاں ”الینا“ ہے یعنی اپنی طرف لے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا مفہوم کیا ہوا؟

### قرآن حکیم کی روشنی میں انا للہ وانا الیہ راجعون کا مفہوم

عزیزانِ من! اسی الینا پر دیکھیے۔ کہا کہ **قَالُوا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ** (2:156)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم اس کی طرف جانے والے ہیں یعنی خدا کہیں ہے اور ہم اس کی طرف جائیں گے، وہ کہیں بیٹھا ہوا ہے۔ جی، الیہ راجعون جو ہوا، کہ اس کی طرف ہم جانے والے ہیں۔ اس کے جو اصل معنی ہیں وہ تو میں اپنے مقام پہ بیان کر چکا ہوں۔ میں یہاں یہ کہہ رہا ہوں کہ ”الیہ راجعون“ کے ان کے ہاں معنی خدا کی سمتیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ **قَبْضُتْهُ الْيَنَّا قَبْضًا يَّسِيرًا** (25:46) سائے کو ہم اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ”قبض“ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کہیں بیٹھا ہوا ہے ”تے سارے سائے جیہڑے میں ایناں نو سمیٹ سمیٹ کے لئی جاندا اے اپنے تخت دے تھلے کہ چلو اوئے چلو اوئے جس طراں بکریاں والا بکریاں لیاندا اے اپنی“<sup>①</sup> الینا کے یہ معنی نہیں ہیں۔

① پھر تمام سایوں (Shadows) کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے تخت کے نیچے لیے جا رہا ہے (اور زبانِ حال سے کہہ رہا ہے) کہ چلو ابے چلو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے بکریاں چرانے والا اپنی بکریوں کو ہانکے لیے جاتا ہے۔

### کائنات کی مثالوں کو بیان کرنے کا مقصد حقائق کو باور کرنا ہے

عزیزانِ من! عربی زبان کے اندر ”الینا“ کے معنی یہ نہیں ہیں۔ کیا عرض کیا جائے یہ قرآن کو کہاں لے گئے ہیں۔ ہمارے قانون کے مطابق یہ جو بسط اور کشادہ ہے یہ سب ان کے لیے ہے۔ یہ ہمارے قانون کے مطابق ہوتی ہے قانون کے مطابق سورج بلند ہوتا ہے اس کی روشنی کی کرنیں ان کے سائے کو متعین کرتی ہیں۔ وہ قانون کے مطابق ڈوب جاتا ہے تو یہ سائے قانون کے مطابق ختم ہو جاتے ہیں دوسرے دن جب سورج چڑھتا ہے تو یہ پھر نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے یسیراً۔ جو کچھ خدا کہتا ہے اسی طرح رات اور دن کی گردش بھی خدا کے اسی قانون کی رو سے واقع ہوتی ہے۔ **وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَ النَّوْمَ سُبَاتًا وَ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا**<sup>①</sup>

(25:47)۔ خارجی کائنات میں ہمارے قانون کی کارفرمایاں دیکھیے تو سہی کہ دن کے بعد رات، رات کے بعد دن آتا ہے۔ رات آرام کے لیے ہے اور پھر وہ اپنی تاریکیوں کی چادر میں ایک لباس کی طرح، کائنات کی چیزوں کو اپنے اندر ڈھانپ لیتی ہے۔ کیا انداز ہیں کہنے کے! <sup>2</sup> اور پھر دن ہے کہ اس میں ہر شے کی نمود ہو جاتی ہے، ہر شے ابھرتی ہے، آنکھیں ملتی ہوئی تمام چیزیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ تم بھی ایسا ہی کرتے ہو۔ خدا کے اسی قانون کے مطابق، زمینی پیداوار کا سلسلہ قائم ہے۔ دیکھو کہ وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ بُشْرًا مِّبْنِ يَدَيْ رَحْمَتِهِ <sup>3</sup> (25:48)۔

خارجی کائنات کی یہ مثالیں، یہ بتانے کے لیے ہیں کہ وہاں تم دیکھو کہ قانون کی خلاف ورزی کہیں نہیں ہوتی، وہ وحی کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں اور تم اس کے متعلق Anticipat (پیش بینی) کر سکتے ہو، پیشین گوئی کر سکتے ہو کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے والے کے متعلق یہ کچھ کہا جاسکتا ہے اور یہی چیز ہے جو وہ یہ کچھ کہتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر کہا ہے کہ مومن کے متعلق تم پہلے سے کہہ سکتے ہو کہ اگر ایسا ہوا تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا کیونکہ اس کا وہ ردِ عمل اس کے اپنے جذبات کے تابع نہیں ہوتا، ہماری وحی کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ جو مثالیں دیتا ہے، کہتا ہے کہ ان ہواؤں کو دیکھو کہ بارش سے پہلے کس طرح سے یہ ایک نئی زندگی کے پیامبر بن کے ہمارے ہاں آتی ہیں۔ ہواؤں کا علم رکھنے والے یہ محکمہ موسمیات والے کتنا پہلے سے اس کے متعلق پیشین گوئی کر دیتے ہیں کہ کہاں کیا ہونے والا ہے، کہاں کیا آنے والا ہے؟

- ① رات کو اس نے تمہارے لیے پردہ پوش بنایا (کہ تم اس کی تاریکیوں کی چادر میں اپنے آپ کو لپیٹ لیتے ہو) اور نیند کو ایسا بنایا (کہ اس میں تمہارا شعور قوی طور پر معطل ہو جاتا ہے اور اس طرح تمہارے اعصاب کو) سکون مل جاتا ہے۔ اس کے بعد دن نمودار ہو جاتا ہے جس میں تم پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہو اور اپنے کام کاج کے لیے ادھر ادھر پھیل جاتے ہو۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 825)۔
- ② اس آیت اور سبابت سبت کے قرآنی مفہوم کے لیے اگلا درس یعنی گیارہواں باب دیکھیے۔
- ③ وہ بارش سے پہلے جو ہر ذی حیات کے لیے سامانِ نشوونما کا ذریعہ ہوتی ہے، خوشگوار ہواؤں کو قاصد بنا کر بھیجتا ہے کہ لوگوں کو جا کر بارش کی خوشخبری دیں۔ اس آیت کے حوالے سے اس کی مزید تفصیل کے لیے اسی کتاب کا گیارہواں باب (آیات 47 تا 52) ملاحظہ کیجیے۔

### انسان کے مقابلے میں خارجی کائنات کی ہر شے تعمیری نتائج پیدا کرتی ہے

معاف رکھیے گا، آپ کہیں گے کہ یہ تو جو بھی وہ محکمہ موسمیات والے کہتے ہیں، بالکل ہی اس کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ جو کچھ یہ جو لوگ کہتے ہیں، وہ تو واقعی اس کے خلاف ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر مشینوں پر چھوڑ دیا جائے تو کبھی ایسی بات نہ ہو، مشینیں سچ بولتی ہیں۔ ”انسان تے ایس مشین نوں وی جس طراں اونکیسی والا اپنے میٹرناں کر دالے اے حال ہو جاندا اے فیر“ <sup>1</sup> جہاں انسان کا ہاتھ بیچ میں آتا ہے یہی ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خالصتاً خارجی کائنات میں دیکھیے کہ ہمارا قانون کس قاعدے کے مطابق، کس اصول کے

مطابق، حسن تعمیر کے نتائج پیدا کرتا چلا جاتا ہے دیکھیں کہ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً (25:48) پہلے ہوائیں آتی ہیں بادل آتے ہیں پانی برساتے ہیں اور وہ پانی مَاءً طَهُورًا (25:48) ہے یعنی ایسا صاف پانی ہے اور پھر جب وہ پانی تمہارے ہاتھوں میں آ جاتا ہے تو پوچھو نہیں کہ تم اسے کتنا گدلا کر دیتے ہو۔ ہم برساتے ہیں تو کتنا پاک صاف کشید کیا ہوا ہر قسم کی کثافتوں سے پاک اور صاف پانی ہوتا ہے اور اس سے ہر قسم کی کثافتیں دور کی جاتی ہیں۔ قرآن نے کئی مقامات پر اس کی مثال دی ہے۔

### سورج کی شعاعوں سے کشید کیے ہوئے پانی کی مثال

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ اس پانی کی مثال ربوبیت کی بڑی عظیم مثال ہے۔ پانی کے اوپر تو انسانی زندگی کا دار و مدار ہے۔ ساری زراعت کا، نشوونما کا، دار و مدار ہی پانی پہ ہے۔ کس پانی پہ ہے، کیا وہ سمندر کا پانی ہے؟ نہیں، وہ پرانی ایک نظم ہوتی تھی:

Water, water, every where

But not a drop to drink

یعنی یہ اتنا بڑا سمندر ہے مگر

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں

وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

وہاں انسان پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستا ہے۔ وہ پانی اس قابل ہی نہیں ہوتا۔ سمندر پانی کا ذخیرہ ہے۔ پانی پہ سارا زندگی کا دار و مدار ہے: جہاں بھی زندگی ہے، خواہ انسان میں ہے یا خارجی کائنات میں ہے، سمندر کا وہ پانی تو موت ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ جناب! اس کا

① جس طرح ٹیکسی والے اپنے میٹر کو کر لیتے ہیں، انسان بھی اس مشین کو اسی طرح کر لیتا ہے تو پھر یہی صورت حال ہوتی ہے۔

② یہ Samuel Taylor Coleridge (1772-1834AD) کی ایک نظم The Rime of the Ancient Mariner کا ایک شعر ہے۔

انتظام دیکھیے، سورج کی کرنیں اسی پانی کو جس کے اندر اتنے زہریلے نمکیات گھلے ہوئے ہوتے ہیں، قابل استعمال بناتی ہیں۔ سائنسدان یہ جانتا ہے کہ وہ پانی فلٹر نہیں ہو سکتا۔ سورج کی کرنوں کی حرارت اس پانی کو کشید کرتی ہے اور اس قسم کی تمام ملی ہوئی زہریلی چیزوں کو نیچے چھوڑ جاتی ہے اور صاف پانی مَاءً طَهُورًا (25:48) کو اوپر کھینچ کر لے جاتی ہیں ڈول بھر بھر کے وہ کرنیں لے جاتی ہیں۔ وہ لے جائیں تو پھر کیا کریں، کہاں رکھیں؟ وہاں کوئی ان کے ہاں ٹینکیاں بنی ہوئی نہیں ہیں۔ وہاں جا کر یہ اوپر چلا جاتا ہے۔ ذرا سی ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جو نیچے سے لے جاتی ہیں، ذرا سی وہ وزنی سی بھاپ بنتی ہے، جس کو بادل کہتے ہیں۔ اب بادل اگر وہیں رہیں، جہاں نیچے

سمندر رہے تو وہ وہیں برسے۔ وہاں سے پھر یہ جو کہا ہے ہوا چلتی ہے۔ قرآن نے ان کو سقا (25:49) کہا ہے۔ ساڈے سقے اوندے نے پئے۔ اے ہن لاہوریئے منڈے تے اے وی نہیں جاندے ہون گے کہ سقا کنوں کیندے نیں۔ ایناں دے گھراج نکا بند ہووے تے سارا ٹھیر پیا سا مر جاندا۔ اے سقا ای ہے نہیں۔ تے اوڈول تے ڈولکیاں لیے ہوئے اس نلکے دے تھلے فیروناں نوں گالیاں دیندے رہندے ہیگے نیں۔ سقا ای کوئی نہیں رہیا، کھوہ ای نہیں رہے ہیگے، تے سقا کی رہنا۔<sup>①</sup> کہا کہ وہ ہمارے سقے آتے ہیں، وہ ان کو لے جاتے ہیں۔ جہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں اس مشکیزے کا منہ کھول دیتے ہیں۔

### مومن کی صفت قانت کا قرآنی مفہوم

کیا بات یاد آگئی، عزیزانِ من! قرآن نے مومن کی صفت قانت<sup>②</sup> بھی بتائی ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ سقے کی بھری ہوئی مشک کا منہ بھی بند ہوتا ہے، ساری مشک سی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ پانی کا ایک قطرہ بھی ادھر ادھر گرنے نہیں دیتا لیکن جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ اس مشکیزے<sup>③</sup> کا منہ کھولتا ہے، اتنا پانی ڈالتا ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے، پھر بند کر دیتا ہے۔ یہ جو پانی کے Preserve (محفوظ) رکھنے کا طریق ہوتا ہے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اتنا ہی دینے کا، جتنی ضرورت ہوتی ہے اسے عربی زبان میں قانت کہتے ہیں۔ مومن

① ہمارے ہاں سقے (ماشکی) آیا کرتے ہیں۔ یہ لاہوری بیٹے تو یہ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ سقا کسے کہتے ہیں؟ اگر آج ان کے گھر نکا بند ہو جائے تو سارا خاندان (پیا سا) مر جائے۔ یہ سقا ہے ہی نہیں۔ پھر وہ ڈول اور برتن لیے اس نلکے کے نیچے رکھے اسے گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ سقا ہی کوئی نہیں رہا۔ کنوئیں ہی نہیں رہے تو سقا کہاں سے آتا۔

② قانت کے معنی تاج العروس کے مطابق یہ ہیں: قوانین خداوندی کو قائم کرنے والا احکام خداوندی کو لے کر کھڑا ہو جانے والا۔ مومنین کے حوالے سے یہ لفظ یوں آیا ہے: اَلْقَانِتِينَ وَالْقَانِتِیْنَ (33:35) ”اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے انہیں صرف وہاں صرف کریں جہاں صرف کرنے کا حکم قوانین خداوندی کی رو سے ملے“ (خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 974)۔

③ بقول تاج العروس سِقَاءٌ قَنِیْتُ اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کو اس طرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو (پرویز: لغات القرآن، جلد سوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور 1961، ص 1390)۔

قانت ہوتا ہے۔ اس کے اندر جتنی صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ انہیں Preserve (محفوظ) رکھتا ہے۔ جہاں وحی کی ہدایت کے مطابق ضرورت ہوتی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کے اس مشکیزے کا منہ کھول دیتا ہے اس کے بعد پھر بند کر کے رکھ لیتا ہے۔ نہ اپنی مرضی کے مطابق ان کو ضائع کرتا ہے نہ اپنی مرضی کے مطابق بند کر دیتا ہے۔ مومن قانت ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہاں مَاءً طَهُورًا (25:48) کہا ہے یعنی اس قسم کا پانی جو خود بھی ہر قسم کی کثافتوں سے پاک اور صاف ہو اور اس سے ہر قسم کی کثافتیں دور ہو جائیں۔ اس کے بعد کہا کہ لَنُحْيِيْ بِهٖ بَلَدًا مَّيِّتًا وَنُسْقِيْهٖ مِّمَّا خَلَقْنَا اَنْعَامًا وَاِنَّا سِیِّ

کَثِيرًا ① (25:49)۔ اور پھر وہاں زمینِ مردہ پہ وہ بارش برتی ہے کہ اس زمینِ مردہ میں آپ زندگی دیکھو۔ اس بارش سے پہلے اس زمینِ مردہ کو کھود کے دیکھو تو زندگی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ قرآن کہتا ہے کہ بارش کے اس پانی کے امتزاج سے آپ دیکھیے کہ پھر زندگی کس طرح قہقہہ بارتسم ریز اس کے اندر سے ابھرتی اور نکھرتی چلی آتی ہے۔ زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ مل جاتی ہے اور اس سے پھر موشی بھی سیر ہوتے ہیں، انسان بھی سیراب ہوتے ہیں۔ کہا کہ اگر وحی خداوندی کو تم اپنے ہاں اس طرح سے استعمال کرو تو دیکھو کہ تمہاری مردہ قوم میں کس طرح سے نئی زندگی ابھرتی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی آیت 49 تک ہم آگئے 50 ویں سے آئندہ لیں گے۔ ②

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



① (بارش سے یہی مقصد نہیں ہوتا کہ اس سے لوگ نہا دھولیں) اس سے ہم مردہ بستیوں کو زندگی عطا کرتے ہیں۔ (نجر زمینوں سے نباتات اُگتی ہیں۔) نیز یہ ہماری بے شمار مخلوق، موشیوں اور انسانوں کے پینے کے کام آتا ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 825 تا 826)۔

② آیات 47 تا 49 کی مزید تشریح اگلے درس (گیارہواں باب) میں کی گئی ہے۔ اُسے وہاں بھی دیکھ لیجیے۔



## گیارہواں باب: سورۃ الفرقان (آیات 47 تا 52)



عزیزانِ من! آج مارچ 1978ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفرقان کی آیت 47<sup>①</sup> سے ہو رہا ہے: (25:47)۔

### گزشتہ سے پیوستہ نفسِ مضمون

سابقہ درس، خصوصی عنوان، بموقعہ عید میلاد النبی ﷺ تھا۔ اس سے پہلے درس میں جو سابقہ آیات ہمارے سامنے آئی تھیں، ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ قوانینِ خداوندی تو ساری کائنات میں جاری و ساری ہیں اور یہی قوانین ہم نے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھی بذریعہ وحی

① گزشتہ درس (منعقدہ 17 فروری 1978ء) میں آیات 47 تا 49 لی جا چکی تھیں تاہم اس درس میں سبب، نیند کی حالت میں انسانی شعور، میموری، حیات بعد الممات، موت کے بعد شعور کا واپس آنا، خواب میں شعور کی کیفیت، شعور کا مربوط ہونا، موت کے بعد کی زندگی کے درمیان وقفہ، چھٹی کے تصور کا نہ ہونا، جمعہ کے روز جمع ہونے کا مقصد، نعمائے خداوندی کا تذکرہ اور حیات بعد الممات کے سلسلے میں زمینِ مردہ کے حوالے سے بھی آیات بار در گری گئی ہیں۔

دیئے ہیں، فرق یہ ہے کہ اشیائے کائنات تو مجبور واقع ہوئی ہیں، انہیں اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ جی چاہے تو ان قوانین کی اطاعت کریں اور جی چاہے تو ان سے سرکشی برت لیں، وہ ان کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ انسانوں کی صورت میں قوانین ہم نے دے دیئے اور یہ پھر ان پہ چھوڑ دیا کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ<sup>①</sup> (18:29)۔ جس قسم کا وہ راستہ اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ بھگتے گا۔

اشیائے کائنات کے متعلق ذکر چلا آ رہا تھا کہ وہ ان قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ کچھ مثالیں پہلے دی تھیں اور اب اسی تسلسل میں اگلی بات آئی کہ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَ النَّوْمَ سُبَاتًا وَ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا (25:47)۔ عام ترجمہ تو یہی کیا جاتا ہے کہ خدا نے تمہارے لیے رات کو لباس بنایا، نیند کو سبات بنایا، نہار کو نشور بنایا۔ اس میں تین لفظ آئے ہیں۔ عام

طور پر یہ ہے کہ رات نیند کو آرام کو اور دن چلنے پھرنے کو لیکن جیسا کہ میں نے اکثر کہا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ سے یونہی آگے نہیں گزر جانا چاہیے، وہ تو ایک ایک لفظ کے انتخاب میں معنی کی ایک دنیا سمیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ رات کو لباس بنایا یعنی ایسی چیز جو کسی کو پلیٹ لے جیسے تاریکی کی چادر کھی جائے گی۔ اس پورے خطے کو جس کے اوپر رات کی تاریکی کی یہ چادر آ جاتی ہے وہ اس کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کے دو معنی ہوتے ہیں: کسی چیز کو ڈھانپ لینا، جیسے تاریکی میں اور تاریکی میں ہر شے خلط ملط ہو جاتی ہے مگر روشنی میں ہر شے اپنے اپنے مقام پہ الگ الگ نظر آتی ہے، معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہے اور تاریکی میں یہ ہر شے خلط ملط ہو جاتی ہے اس میں محسوس اور معلوم ہی نہیں ہوتا، سانپ اور رسی میں بھی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے ان کے ہاں یہ ایک ہی ’لبس‘ کا لفظ تھا، ان کے ہاں التباس بھی تھا۔ یہ لبس خلط ملط ہو جانا اور کسی چیز کو ڈھانپ بھی دینا ہے۔ جب بھی کوئی چیز ڈھانپ دی جائے گی، تو وہ خلط ملط ہو جائے گی۔ رات کے متعلق تو اس نے صرف اتنا ہی کہا ہے۔ رات کے متعلق یہ نہیں کہا وہ آرام کے لیے بنائی ہے۔

### لفظ سبات کا استعمال اور یوم سبت

رات میں اگلی بات یہ ہے کہ وَ النَّوْمِ سُبَاتًا (25:47)۔ نیند کو اس نے سبات بنایا۔ سبات کے معنی اگر آرام لیے جائیں تو میں ابھی عرض کروں گا کہ یہ بات اور گہری ہے۔ نیند کو پوری رات کو نہیں، صرف نیند کو اس نے آرام کے لیے بنایا۔ رات کے سب سے تو کام کیا جاتا ہے، ساری ساری رات کام کیا جاتا ہے۔ رات میں جو حصہ نیند کا ہے اسے اس نے کہا کہ سبات بنایا۔ یہ سبات کیا چیز ہے؟ یہاں کہا ہے کہ سبات بنایا۔ آرام کے لیے تو عربی زبان میں بیسیوں الفاظ موجود تھے مگر یہاں کہا کہ اسے سبات بنایا۔ سبت کے لفظی معنی تو ہوتے ہیں ”کسی چیز کو کاٹ دینا، منقطع کر دینا“، اصطلاحی طور پر یہ لفظ یہودیوں کے ہاں استعمال ہوتا تھا۔ اسے یوم السبت کہا جاتا ہے جسے

❶ پس جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

انگریزی میں Holiday (تعطیل) کہا جاتا ہے۔ یہودیوں کے ہاں تو رات میں عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے چھ دن میں اس کائنات کو پیدا کیا۔ وہ مسلسل چھ دن کام کرنے سے بالآخر تھک گیا تو ساتویں دن اس نے آرام کیا۔ سبت کا لفظ وہ اس معنی میں لیتے ہیں کہ اس نے کام کاج کو یا عمل کو منقطع کر دیا، تو سنت خداوندی کے اتباع میں ہفتے میں ایک دن یعنی Saturday (سنیچر) کا دن یہودیوں کے ہاں یوم سبت کہلاتا ہے۔ ان کے ہاں اس دن ہر قسم کا کاروبار منقطع ہو جاتا ہے، وہ کوئی بھی کام نہیں کرتے۔

### عیسائیوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات نفرت پر مبنی تھے

عیسائیوں کے ہاں موجودہ انجیل میں تو یہ قانون نہیں ہے۔ یہ یہودیوں کے ہی قانون پر تھے لیکن یہودیوں کے ساتھ ان کو سخت

نفرت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ ﷺ کو گرفتار کر لیا تھا، ان کے خلاف مقدمہ چلایا تھا، اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق انہیں صلیب بھی دی تھی۔ جن یہودیوں کی یہ کیفیت تھی، ان کے ساتھ ان کا دوستی کا معاملہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ نفرت اس حد تک تھی کہ جو کچھ یہودی کرتے تھے وہ علی الرغم اس کے خلاف کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ عیسائیوں نے بعد میں یہ چیز اپنے ہاں جاری کی ہے کہ یہودیوں کے علی الرغم یہ کچھ کیا جائے گا۔ مثلاً یہودیوں کے ہاں خنزیر حرام تھا انہوں نے کہا ہم کھل کر کھائیں گے، یہودیوں کے ہاں ختنہ کراتے تھے انہوں نے کہا بالکل نہیں ہوگا، یہودیوں کے ہاں یہ جو زیر نظر بات ہفتے کے دن کی ہے، جسے آپ Saturday (سینچر) کہیں گے، وہ یوم سبت تھا، چھٹی کا دن (Holiday) تھا، مقدس دن Holy day تھا، انہوں نے کہا کہ نہیں ہمارے ہاں اتوار (Sunday) ہوگا۔

### بتوں کے نام پہ دنوں کے نام رکھے گئے

عزیزانِ من! یہ میں کبھی دوسرے وقت بتاؤں گا کہ یہ جو Sunday (اتوار) اور Monday (سوموار) ہے، یہ سورج کا دن اور چاند کا دن ہے۔ یہ سورج (Sun) اور چاند (Moon) دو ہی دیوتا تھے۔ اصل میں ان سے بہت پہلے، جس زمانے میں Christianity (عیسائیت) وغیرہ ابھی نہیں آئی تھی، ان کے ہاں بت پرستی تھی۔ جن قبائل میں یہ رہتے تھے انہوں نے بتوں کے نام پہ دنوں کے نام <sup>1</sup>

① Sunday یعنی Sun (سورج) دیوتا کا دن، Monday (سوموار) یعنی Moon (چاند) دیوتا کا دن، Tuesday (منگل) یعنی Tiu (جرمنی دیومالا میں) جنگ اور آسمان کے دیوتا کا دن، Wednesday (بدھ) یعنی Woden's day یعنی اینگلو سکسن دیومالا میں سالار دیوتا کا دن، Thursday (جمعرات) یعنی Thor's day یعنی Thor اسکنڈینیوٹن ممالک میں گرج کے دیوتا کا دن، Friday (جمعہ) یعنی Day of Frig یعنی اسکنڈینیوٹن ممالک کی دیومالا میں گھر بار اور رسمیاں ازدواجی زندگی کی دیوی کا دن۔

رکھے ہوئے تھے۔ خود مصر میں بھی سورج دیوتا <sup>1</sup> کی پرستش ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے وہ ایک ہی دن جو اس دیوتا کا تھا، وہ اسے Sunday (اتوار) کہتے تھے یعنی Sun (سورج) دیوتا کا دن اور اسی طرح سے Moon دیوتا کا دن یعنی Monday (سوموار)۔ قرآن میں کبھی یہ بات آئی تو میں عرض کروں گا کہ انہوں نے اپنے ہاں یہ کچھ کر رکھا تھا۔

عزیزانِ من! انہوں (عیسائیوں) نے یہ کہا کہ ہم Saturday (سینچر) کو چھٹی نہیں کریں گے بلکہ ان (یہودیوں) کے علی الرغم Sunday (اتوار) کو چھٹی کریں گے تو ان کے ہاں وہ Sunday ایک دن چھٹی کا آ گیا، اور انہوں نے اس کو مقدس دن Holy day قرار دیا۔

## قرآن حکیم نے زندگی بھر کسی دن کو بھی چھٹی کا دن قرار نہیں دیا

قرآن کریم نے کسی دن کو بھی چھٹی کا دن نہیں کہا۔ زندگی کام کرنے کے لیے ہے، چھٹی کے لیے نہیں ہے۔ اس نے کسی دن کو بھی Holy day (مقدس دن) نہیں کہا۔ ہر دن مقدس دن ہے، ہر دن یکساں دن ہے۔ وہ تو ان کے ہاں کے دیوتاؤں کے نام پہ تھے اس لیے ان میں سے دیوتے کی تقدیس کے لحاظ سے وہ اس کو مقدس دن (Holy day) کہتے تھے۔ قرآن کی رو سے کسی ایک دن کو بھی خدا نے مقدس دن (Holy day) نہیں کہا اور ہفتے میں تو ایک طرف رہا وہ تو زندگی بھر میں کسی دن کو بھی چھٹی کا دن قرار نہیں دیتا۔ وہاں چھٹی کا یہ تصور نہیں ہے۔ اس نے تو سبت کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اب اس سبت کی طرف آئیے۔ وہ تو صرف نوم (نیند) کی حالت کو سبوتا کہتا ہے۔ یہ سبت کی حالت نیند کی حالت ہے اور اگر یہ لفظ آپ صرف کام کے منقطع ہونے کے لیے لیتے ہیں تو پھر تو ٹھیک ہے کہ نیند کی حالت میں تو کام نہیں کیا جاسکتا اور جاگتے ہوئے تو خواہ وہ دن ہو یا رات ہو وہ تو کام کے لیے ہے۔ نوم کو سبت کہنے سے آپ نے دیکھا کہ بات کہاں پہنچا دی۔ اس نے کہا کہ نہ صرف یہ کہ ہفتے میں کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ جو کوئی سبت کا ہے جس میں کام نہیں کیا جائے گا اور دھڑ کوئی رات بھی ایسی نہیں ہے جو سبت کی ہو۔ وہ تو نیند کی حالت ہے جس میں عمل منقطع ہوتا ہے یا کوئی کام نہیں کیا جاسکتا۔ جاگنے والا اگر کام نہیں کرتا تو وہ تو موت ہے، زندگی نہیں ہے۔

## نیند کی حالت میں انسانی شعور کی کیفیت

اب آگے بڑھیے تو پھر بات یہ ہے کہ ہم اس دور میں آ پہنچتے ہیں جہاں پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے سبت کا یہ لفظ کیوں استعمال کیا

❶ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ آمن رع (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فاراع (یعنی سورج کے دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ (پرویز: برق طور، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1993ء، ص 4)

ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عربوں کے ہاں اس لفظ کے بنیادی معنی Cut-off (منقطع) کے ہیں یعنی کسی سلسلے کا منقطع کر دینا۔ آپ کو پتہ ہے کہ نیند کی حالت میں ہوتا کیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جو لوگ بھی انسانی علم میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں وہ قرآن کو سمجھ سکتے ہیں اور پھر عالم آفاق میں تو باہر کی یہ ساری Sciences (سائنس کے تمام علوم) آ جاتی ہیں جن کا تعلق Outer World (خارجی دنیا) سے ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم اپنی نشانیاں عالم انفس میں نفوس کی دنیا کے اندر بھی دکھائیں گے۔<sup>❶</sup>

اب ہمارا یہ دور شروع ہوا ہے۔ اس میں نفس انسانی کے متعلق تحقیقات شروع ہوئی ہیں۔ اسے عام طور پہ سائیکولوجی (علم نفسیات) کہا جاتا ہے۔ اس کے ماہرین ان چیزوں کو جو قرآن کہہ گیا ہے Appreciate (پسند) کریں گے کہ نیند کی حالت میں ہوتا کیا

ہے؟ اس حالت میں جسم کا سارا سلسلہ اسی طرح سے ساری مشینری اسی طرح سے سرگرم عمل رہتی ہے: دل چلتا ہے، دوران خون ہوتا ہے، سانس اسی طرح سے چل رہا ہوتا ہے، ہر چیز اسی طرح سے ہوتی ہے۔ کیا چیز ہے جو منقطع ہو جاتی ہے، کیا سلسلہ ہے جو Cut-off (منقطع) ہو جاتا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ جسے آپ بجلی کا کرنٹ کہتے ہیں اُس کا یہ سوچ آپ نے آف کیا ہے تو وہ جو وہاں Positive (مثبت) اور Negative (منفی) کے دو تار آپس میں ملتے ہیں ان کو آپ الگ کر دیتے ہیں۔ آپ نے بجلی کے مکینک کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ جی Cut-out نہیں ہے یعنی یہ اصطلاح ہے کہ وہ دو تار آپس میں جڑتی ہیں تو بجلی کا کرنٹ کام کرتا ہے، یہ Cut-out ہو جاتی ہیں، ان دونوں کے اندر کرنٹ موجود ہوتی ہے مگر اس کا جو دائرہ ہے، سلسلہ ربط ہے، کنکشن ہے، کنٹیکٹ ہے، وہ نہیں رہتا تو بجلی کی کرنٹ (رو) کام نہیں کرتی۔

① یہ مکمل آیت قرآن یوں ہے: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوْ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (41:53) (یہ لوگ قرآن کی صدات سے اس وقت انکار کرتے ہیں تو کرنے دو) ہم ایسے حالات پیدا کرتے جائیں گے کہ ان لوگوں کو خود اپنی قوم میں (نفوس کی دنیا کے اندر) اور اپنے گرد و پیش کی اقوام میں (جب یہ نظام مرکز عرب سے آگے بڑھ کر، اور علاقوں میں پھیل جائے گا) ہمارے قانون کی صداقت کی محسوس نشانیاں نظر آجائیں گی، حتیٰ کہ یہ حقیقت ان کے سامنے نکھر کر آجائے گی کہ قرآن نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہ حق پر مبنی تھا، اور ٹھیک اسی طرح واقع ہو کر رہا۔

(اور یہ چیز صرف اس زمانے کے مخاطبین عرب تک ہی محدود نہیں۔ جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائے گا اور دنیا پر نئے نئے حقائق منکشف ہوتے جائیں گے وہ انسان کی داخلی دنیا سے متعلق ہو یا خارجی کائنات سے، وہ سب قرآن کے دعاوی کی زندہ شہادتیں بنتے جائیں گے اور یوں دنیا رفتہ رفتہ دیکھ لے گی کہ قرآن کی ہر بات حقیقت پر مبنی ہے۔) یہ اس لیے کہ یہ کتاب اُس خدا کی طرف سے ہے جو کائنات کی ہر شے پر نگران ہے۔ اس لیے اُسے خوب معلوم ہے کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ لہذا اس کا ایسا ہمہ گیر علم ہی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ حقیقت ثابتہ ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1124)۔

### نیند کی حالت میں انسانی شعور اعصاب سے لا تعلق ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ نیند کی حالت میں وہ کون سی چیز ہے جو Cut-off (منقطع) ہوتی ہے؟ وہ شعور ہے جو Cut-off (منقطع) ہوتا ہے Consciousness (شعور) نہیں رہتا، دماغ اسی طرح سے کام کر رہا ہوتا ہے۔ دماغ کا کام تو اعصاب کے ذریعے سے جسم کی مشینری کو کنٹرول کرنا ہے۔ وہ مشینری تو اسی طرح سے اس کے کنٹرول میں ہوتی ہے: یہ دل دھڑکتا ہے، دوران خون ہوتا ہے، سانس آ جاتا ہے، پھیپھڑے کام کرتے ہیں، اندر کے سارے اعضا اسی طرح کام کر رہے ہوتے ہیں وہ اس کنٹرول میں ہوتے ہیں اور دماغ کے بھی باقی سارے حصے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک چیز ہے جس کا وہ کنکشن (سلسلہ ربط) Cut-off

(منقطع) ہو جاتا ہے۔ وہ ہے Consciousness (شعور)۔ اس میں شعور نہیں ہوتا۔ شعور کی جوتاریں اعصاب کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہیں ان کو نوم کی حالت میں منقطع کر دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے یہ لفظ ہے Cut-off (منقطع) کے لیے آیا ہوا ہے۔ اب دیکھیے قرآن کیا کہہ گیا ہے؟ یہ (39:42) قرآن کی بڑی اہم آیت ہے اور اس دور میں آ کر یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ یہ کیا کہا ہے؟ اس سے پہلے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہاں کہا ہے کہ اللہ یتوفی الأنفس حین موتہا و الّتی لم تمّت فی منامہا فیمسک الّتی قضی علیہا الموت و یرسل الأخریٰ الی أجلٍ مُّسمًیٰ ۚ ان فی ذلک لآیت لِّقوٰم یتفکروٰن (39:42)۔

قوم ہمیشہ وہ تباہ ہوتی ہے جس کا غور و فکر کا سوچ کام کرنا چھوڑ دے

عزیزانِ من! (39:42) کا مفہوم سمجھنے سے پہلے ابھی جو عالمِ انفس کی بات کی گئی ہے اس کے الفاظ سن لیجیے۔ یہ ہم نے اوپر (41:53) کے حوالے سے بات کی ہے کہا ہے کہ وہ لوگ جو غور و فکر سے کام لیں گے ان کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں اس میں موجود ہیں۔ اگر غور و فکر سے کام لینے کی کوئی بات ہے تو یہ بات ایسی ہے جس میں غور و فکر ضروری ہے۔ غور و تدبیر سے یہ بات سمجھ میں آئے گی جو میں کہہ گیا ہوں اور قرآن کہہ رہا ہے۔ اب جس قوم کے ہاں غور و فکر کا سوچ (Switch) ہی آف (Off) ہو گیا ہو وہ سوچتی ہی نہیں اس کا پیچھے سے پاور ہاؤس ہی ختم کر دیا ہوا ہے یہ بات ان کی سمجھ میں کیسے آ سکتی ہے۔ وہ جو قرآن دینے والا ہے لکھنے والا ہے بتانے والا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ بات صرف ان کی سمجھ میں آئے گی جو غور و فکر سے کام لیں گے۔ یہ اتنی بڑی اہم بات کہہ گیا ہے تو یہ غور و فکر سے کام لینے والوں کے لیے ہے۔ یہ دور غور و فکر کرنے والا آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیند کی حالت میں بھی اور موت کی حالت میں بھی ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے نفس۔ اب (39:42) میں لفظ انفس کہا تھا۔ اس زمانے میں نفس کا لفظ ہے۔

نیند اور موت دونوں حالتوں میں شعور کو روک لیا جاتا ہے

قرآن کے ہاں (39:42) میں کہا گیا ہے کہ نیند کی حالت میں بھی ہم شعور کو اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں، یعنی شعور کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، موت کی حالت میں بھی یہ کچھ کر لیتے ہیں۔ نیند کی حالت کے بعد اسے واپس بھیج دیتے ہیں مگر موت کی حالت میں اسے اپنے ہی پاس رکھ لیتے ہیں اس کو فنا نہیں کرتے۔ نیند کی حالت میں بھی شعور کا وہ سلسلہ اتنے وقت کے لیے Cut-off (منقطع) ہوا ہوتا ہے۔ جس وقت بھی آپ وہ سوچ آن کر دیتے ہیں، یعنی دونوں تاریں پھر جوڑ دیتے ہیں آپ کا سارا شعور اسی طرح سے برقرار ہو جاتا ہے: وہی حافظہ وہی میموری (Memory) وہی واقعات الغرض وہ تمام چیزیں برقرار ہو جاتی ہیں۔

## شعور کے تسلسل کا ہی دوسرا نام میموری (Memory) ہے

عزیزانِ من! اگر اس حالت میں جب شعور کا یہ پچھلا سارا سلسلہ Cut-off (منقطع) کیا تھا؛ جب وہ تمام نقوش جتنے بھی ہیں جنہیں آپ میموری (حافظہ) وغیرہ کہتے ہیں، کہیں وہ غائب ہو گئے ہوتے تو سوچے ہماری کیا حالت ہوتی۔ آج تو اگر آدھی رات بھی آنکھ کھلتی ہے تو شعور آ جاتا ہے۔ اگر میموری (حافظہ) ختم ہو جاتی تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم کہاں ہیں۔ میموری (حافظہ) تو شعور کے تسلسل کا نام ہے یعنی یہ چیز ہے کہ اس کو صرف وہ جو کنکشن تھا اس Cut-off (منقطع) کیا تھا، کرنٹ بدستور رکھی، پاور ہاؤس بدستور رہا، ہم نے اس کو اپنے ہاں رکھا، ضائع نہیں ہونے دیا، فنا نہیں کیا، اس کو نہایت امانت کے ساتھ اپنے پاس رکھا۔ نیند کے بعد اس کو واپس بھیج دیا۔ جب وہ آپ کا سارا شعور واپس آتا ہے تو اس میں وہ آپ کے ہاں کی ساری چیزیں یادداشتیں، میموری (حافظہ)، ہر فکر، تدبر، غور، عقل ہر چیز اسی طرح سے واپس آ جاتی ہے جو نوم کی حالت میں یعنی نیند کی حالت میں ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی، وہ ساری واپس آ جاتی ہیں۔ یہاں (39:42) میں کہا کہ نیند کے بعد جب تم جاگتے ہو تو اسے ہم تمہیں واپس دے دیتے ہیں، موت کی حالت میں اسے کچھ وقت کے لیے اپنے پاس روکے رکھتے ہیں، رہتا وہ اسی طرح سے ہے جس طرح سے یہ نیند کی حالت میں رہتا ہے۔ یعنی موت کی حالت میں شعور خدا کے ہاں اس طرح رہتا ہے کہ اس کی ساری خاصیتیں، خصوصیات، صلاحیتیں، میموری، حافظے، یادداشتیں، یہ سب برقرار رہتی ہیں، فنا نہیں ہوتیں۔

## ”سبات“ کا یہ ایک لفظ حیات بعد الممات کی پوری کیفیت کا ترجمان ہے

قرآن یہ کہتا ہے کہ اسی طرح سے شعور کی کیفیت ہے۔ اسے ہم جو اپنے ہاں رکھتے ہیں تو اس کی بھی یہی کیفیت رہتی ہے ہاں البتہ ادھر نیند کے بعد ہم وہ سب کچھ لوٹا دیتے ہیں جو کچھ تمہارے ہاں ہوتا ہے اور اسی طرح وہ تمام وہاں موت کے بعد لوٹا دیں گے جو کچھ تمہارے ہاں شعور میں ہوگا۔ اب سوچے صاحب! کہ جسے حیات بعد الممات کہتے ہیں اُسے قرآن اس ایک لفظ ”سبات“ میں سمو کر کتنی بڑی اہم بات کہہ گیا ہے۔ عزیزانِ من! سوچے جو اس نے کہا تھا کہ یہ بات غور و فکر کرنے والوں کو سمجھ میں آئے گی کہ میں نے کیا کہا ہے۔<sup>1</sup> اب معلوم ہوا کہ قرآن میں جو الفاظ کا انتخاب ہے، تو یہ قرآن کا معجزہ ہے، عربوں کا تو یہ احسان تھا کہ انہوں نے یہ زبان بنا کے ہمیں دے دی، ہمیں کیا دے دی، معاف رکھیے گا، اُسے دے دی جس نے قرآن نازل کرنا تھا۔ یہ زبان نہ ہوتی تو معلوم نہیں، معاف رکھیے گا، کیا مشکل پڑ جاتی۔ تو یہی زبان تھی جو اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ آج چودہ سو سال بعد اس بیسویں صدی<sup>2</sup> میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے سبات کا یہ لفظ وہاں کیوں استعمال کیا تھا؟ اس نے یہ ”سبت“ کیوں کہا ہے؟ یہ ایک چیز کو ایک رابطے کو کچھ وقت کے لیے

Cut-off کر دینا ہے، وہ کنکشن جو ہے اس کو الگ الگ کر دینا ہے۔ اس رابطے کے Cut-off ہو جانے سے وہ جو شعور ہے وہ نہیں رہا، سبب نوم کے لیے کہا، اور یہاں (39:42) میں کہا کہ موت اور نوم دونوں میں ایک ہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ جو شعور کو پاؤر ملتی ہے جس سے شعور بیدار ہوتا ہے وہ جو کرنٹ ہے جو شعور کو روشنی دیتا ہے صرف وہ منقطع کر دیتے ہیں، دونوں تاروں کو ہم الگ کر دیتے ہیں جس سے شعور معطل ہو جاتا ہے اور کچھ نہیں کرتے۔ کیا بات ہے! میں کیا کیا عرض کروں کہ ایک لفظ میں قرآن کیا باتیں کر گیا ہے: **فَيُؤْمِسُكُ الْيَسَىٰ قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْآخِرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى** (39:42) اور ادھر جو ہم اسے نیند کے بعد بھیجتے ہیں تو یہ ابدی طور پر نہیں بھیجتے، ایک مدت تک کے لیے پھر دے دیتے ہیں، پھر اس کے بعد اسے موت آ جاتی ہے۔ وہ جو ہمارے ہاں کسی پرانے نے یہ بات کہی تھی، معلوم نہیں اس کے ذہن میں یہ بات تھی یا کچھ اور ہے اس نے کہا یہ تھا کہ

خواب را مرگ سبک داں

مرگ را خواب گراں

اس نے بات بڑی پتے کی کی ہے۔ کہا کہ موت اور نیند کی حالت میں، دونوں میں، ایک شے قدر مشترک (Common Denominator) ہے۔ یہ حالت نیند میں تھوڑے وقت کے لیے ہے یا ہلکے انداز کی ہے۔ وہ اس نے سبک کہا تھا یعنی یہ ہلکے انداز کی ہے مگر موت میں وہی کیفیت بھاری انداز کی ہوتی ہے لیکن یہ بات تو قرآن کی ہے۔ وہ جو کہتا ہے کہ یہ جو انفس ہے جو انسان کا شعور ہے نیند کی حالت میں وہ شعور ضائع نہیں ہوتا، ختم نہیں ہوتا، فنا نہیں ہوتا۔ وہ سبب ہے وہ جو دو تاریں مل کر شعور کا شعلہ بیدار کرتی ہیں، اس میں

① **إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ** (39:42) ان حقائق میں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں، حقیقت تک پہنچنے کی واضح نشانیاں ہیں۔

② یاد رہے یہ بات مارچ 1978ء کی 3 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

چمک پیدا کرتی ہیں، وہ سلسلہ اس وقت تک کے لیے منقطع ہو جاتا ہے۔ نیند سے بیدار ہونے کی حالت میں وہ تاریں پھر جڑ جاتی ہیں، شعور اسی حالت میں واپس آ جاتا ہے اس میں کچھ کم نہیں ہوتا۔ یہ بڑی چیز ہے عزیزانِ من! اس میں اس شعور کا سلسلہ معطل رہتا ہے لیکن جب پھر تاریں جڑ جاتی ہیں تو اس میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں واقع ہوتی تو نیند اور موت کی دونوں صورتوں میں، قرآن کہتا ہے کہ ایک ہی کیفیت ہوتی ہے یعنی شعور معطل ہو جاتا ہے۔

نیند کے بعد صرف معلومات ہی نہیں بلکہ احساسات اور جذبات بھی واپس آ جاتے ہیں

جس طرح نیند کے بعد جب انسان جاگتا ہے تو اس کا سارا ماضی اس کے ساتھ ہوتا ہے، پوری Memory (حافظہ) اس کے ساتھ



ہوتی ہے احساسات اور جذبات تک اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جو میموری ہے وہ صرف یہی نہیں ہے کہ معلومات واپس آ جاتی ہیں، یعنی مجھے کل تک جو کچھ معلوم تھا میرا وہ علم واپس آتا ہے، میری محسوسات اور میرے جذبات واپس آتے ہیں۔ حافظہ تو ایسی چیز ہے کہ مثلاً اگر بیس سال پہلے کسی کی ایک بات سے آپ کے دل کو کوئی زخم ہوا تھا، آپ کو صدمہ پہنچا تھا، کوئی ذہنی، قلبی تکلیف پہنچی تھی، بیس سال کے بعد بھی جب آپ کی میموری اس چیز کو واپس لاتی ہے، تو اسی طرح سے انسان کے قلب کے اندر وہی ٹیس اٹھتی ہے مگر یہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ یہاں کے جو اعمال ہیں وہ مرنے کے بعد پھر کس طرح سے بیدار ہوں گے۔

### خواب میں شعور کی نوعیت

قرآن کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کی حالت کو تو تم نہیں سمجھ سکتے، نیند کے بعد کی حالت کو تو سمجھتے ہو۔ یہ تو ہر روز تمہارے ساتھ واقعہ (Event) گزرتا ہے، نیند کے دوران بالکل موت کی سی کیفیت ہوتی ہے، تمہاری کوئی چیز بھی تمہارے ذہن میں نہیں ہوتی: نہ حافظہ، نہ شعور، نہ جذبات، نہ احساسات۔ مجھ سے پوچھیے گا۔ میں ہفتہ بھر یہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ میں ابھی دو لفظوں میں بتاؤں گا کہ Dreams کیا ہوتی ہیں؟ میرے عزیز! بتا دیتا ہوں۔ ہمارے ہاں اس دور کی دو اصطلاحات ہیں جو انہوں نے اس دور میں وضع کی ہیں۔ وہ ہیں: Consciousness اور Unconsciousness، یعنی نفس شعوری اور نفس غیر شعوری یا نفس نیم شعوری۔ نیند کی حالت میں یا جب پیناٹاؤ کیا جائے تو اس حالت میں جب شعور کے اس سلسلے کو منقطع کیا جائے Disconnect کیا جائے، تو یہ کہتے ہیں کہ انسان کے تحت الشعور میں ایک کیفیت ہوتی ہے، وہ کارفرما رہتی ہے اور جسے یہ Dreams (خواب) کہا جاتا ہے، وہ شعور کا فعل نہیں ہوتا، Consciousness کا نہیں ہوتا، وہ فعل Unconsciousness Mind (نفس غیر شعوریہ) کا ہوتا ہے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی، ورنہ میں ابھی عرض کروں گا کہ اس وقت تک خوابوں کے متعلق کیا تحقیق ہوئی ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ شعور میں واقعات کا تسلسل اور ربط قائم ہوتا ہے، جس طرح سینما کی ایک فلم کے اندر مربوط چیز ہوتی ہے۔ Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) کے Store House (کار کباڑ خانہ) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جو وہی فلم ہے وہ اس کو قینچی سے کاٹ کاٹ کر اور ٹکڑے ٹکڑے ملادیا کرتا ہے۔ اس کے Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) میں شعور کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اس فلم کو مربوط کرے۔ اسی طرح سے وہ جو ٹکڑے ٹکڑے ہیں وہ انہیں سامنے لاتا جاتا ہے: گھوڑا ہے، گھوڑے کا اگلا ٹکڑا ہے، تو ریل گاڑی ہے، ریل گاڑی کے بعد دیکھا تو ایک بچھو چلا آتا ہے، اس کے بعد دیکھا آسمان سے کچھ اتر رہا ہے، پھر آسمان سے آگیا ہے۔ وہ ایک مسلسل کہانی کی فلم تھی جس کو اس نے کاٹ کے خلط ملط کیا ہے۔ اسی لیے نیند کا جو شعور ہے، وہ غیر مربوط ہوتا ہے، وہ شعور نہیں ہوتا۔

## شعور کا مربوط ہونا ضروری ہے

شعور اس وقت کہتے ہیں جب وہ مربوط ہوتا ہے اس میں ربط ہوتا ہے۔ یہ جسے پاگل کہتے ہیں اس میں ہوتا کیا ہے؟ اس کے اندر غیر مربوط شعور ہوتا ہے۔ وہ کبھی کچھ کہنے لگ جاتا ہے کبھی کچھ کوئی ایک حرکت کرتا ہے کبھی کوئی دوسری ان میں باہمی ربط نہیں ہوتا اور یہ پاگل خانے یعنی مینٹل ہاؤس والے ہی نہیں ہوتے ہم میں چلتے پھرتے تو ننانوے فیصد پاگل ہوتے ہیں۔ نیند کی حالت جسے آپ شعور کہتے ہیں میں بھی اس کی کیفیت معطل ہوتی ہے۔ آج کے وقت تک کی جو تحقیق ہے اس کے مطابق تو یہ ہے کہ وہ اس کو نفس غیر شعوری کہتے ہیں جو نیند میں کارفرما ہوتا ہے وہ Unconscious Mind (نفس غیر شعوری) ہوتا ہے شعور اس کے اندر نہیں ہوتا۔ وہ Unconscious Mind (نفس غیر شعوری) کی کیفیت ہوتی ہے۔

## موت کے بعد کی زندگی کے درمیان کا وقفہ

خواب کی حالت میں Unconscious Mind (نفس غیر شعوری) کی کیفیت رہتی ہے وہی کارفرما ہوتا ہے شعور نہیں ہوتا۔ تو اب ہم نیند کی حالت سے ذرا آگے پہنچتے ہیں کہ موت ہے یہاں کی Physical Death (جسمانی موت) ہے اور وہ لائف (زندگی) جس میں شعور واپس آنا ہے اس کے دوران جو مدت ہے اس میں اگر Unconscious Mind (نفس غیر شعوری) نے کارفرما رہنا ہے تو پھر اسے کہیے کہ اس قیامت کی زندگی اور اس موت کے درمیان کا جو آپ کے ہاں عذاب و ثواب ہے وہ شاید یہ ہوگا لیکن بہر حال قرآن کریم نے جو کہا ہے وہ یہ ہے کہ موت اور نیند میں ایک قدر مشترک یہ ہوتی ہے کہ تمہارا جو نفس ہے وہ معطل ہو جاتا ہے سلب ہو جاتا ہے۔ اب یہاں یہ نفس شعور یا Conscious Mind ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ یہ نفس شعور ہی کا نام ہے اسی لیے ان لوگوں کو Unconscious Mind (نفس غیر شعوری) کہنا پڑا ہے کیونکہ اس حالت میں شعور نہیں ہوتا اور یہ جو اندر غیر مربوط کیفیت ہوتی ہے شعور تو کہا ہی نہیں جاتا جو غیر مربوط ہوتا ہے وہ جو کوئی غیر مربوط چیزیں ہوتی ہیں مثلاً آرزوئیں بھولے ہوئے افسانے وہ احساسات و جذبات کہ شعوری طور پر یعنی جن کو ہم جان بوجھ کر بھی سامنے نہیں آنے دینا چاہتے خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں یہ تمام چیزیں Unconscious Mind (نفس شعوری) کے اسٹور ہاؤس میں جمع ہوتی ہیں لیکن اس کٹی ہوئی فلم کے ٹکڑوں کی طرح ہوتی ہیں ان میں ربط نہیں ہوتا۔ جب Conscious Mind (نفس غیر شعوری) چھٹی پہ گیا ہوا ہوتا ہے معطل ہوتا ہے اُس وقت Unconscious Mind (نفس غیر شعوری) تو گویا یوں ہوتا ہے کہ جیسے کہیں کہ ”تیری موج ہو جاندی اے“ جیوں ملی نہ ہووے تے چوے نچن لگ پیندے۔“<sup>①</sup>

کاش ایک کالج کی تعمیر کا میرا خواب پورا ہو جاتا

عزیزانِ من! اگر کہیں وہ کالج یا درسگاہ بن جاتا، تو میں اس میں نصاب (Curriculum) کی طرح یہ چیزیں پڑھاتا۔ پتہ نہیں میری یہ آرزو بھی مرنے کے بعد مجھے Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کی طرح ستائے گی۔ یہ چیزیں تو یوں درسگاہوں میں، کالجوں میں سمجھنے کی ہیں۔ قرآن بہت دور اونچالے جاتا ہے اور ہم تو اس دور میں پیدا ہوئے ہیں، خوش قسمت ہیں کہ علمِ انسانی اس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

### موت کے بعد شعور اس دنیا میں واپس نہیں آتا

بہر حال، قرآن کہتا یہ ہے کہ نیند اور موت دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ شعور نہیں ہوتا، یہ معطل ہو جاتا ہے۔ نیند کے بعد یہ شعور لوٹا دیتے ہیں۔ بات شعور کی ہو رہی ہے Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کی نہیں ہو رہی۔ موت کی حالت میں اس دنیا میں وہ شعور واپس نہیں آتا۔ جس طرح نیند کی حالت میں شعور ضائع نہیں کرتا، اسی طرح موت کی حالت میں بھی خدا شعور کو ضائع نہیں کرتا۔ خدا اسے سنبھال کر رکھتا ہے۔ وہ امین ہے بالکل اسی طرح محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ موت کے بعد جب بیداری ہوگی، یہ شعور ہم اسی طرح سے لوٹا دیں گے۔ اب ”سبات“ کے معنی ہمارے سامنے آگئے جَعَلَ لَكُمْ الْيَلَّ لِبَاسًا وَ النَّوْمَ سُبَاتًا<sup>2</sup> (25:47)۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ اس نے سبات کیوں کہا۔ رات کو نہیں کہا۔ رات کو جب تک ہم جاگتے ہیں آپ کا شعور بیدار ہوتا ہے، آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسے وہ کیسے سبات کہہ دے! قرآن میں یہ دو<sup>3</sup> ہی جگہ آیا ہے۔ دونوں جگہ اس نے نوم کو سبات کہا ہے، لیل کو

① تم موج اڑاتے ہو بالکل اسی طرح کہ جب بلی نہ ہو تو چوسے ناخن لگ جاتے ہیں۔ (یہ ہے تمہاری کارفرمائی!)

② رات کو اس نے تمہارے لیے پردہ پوش بنایا (کہ تم اس کی تاریکیوں کی چادر میں اپنے آپ کو لپیٹ لیتے ہو) اور نیند کو ایسا بنایا کہ (اس میں تمہارا شعور Conscious Mind) وقتی طور پر معطل ہو جاتا ہے اور اس طرح تمہارے اعصاب کو سکون مل جاتا ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 825)۔

③ جَعَلَ لَكُمْ الْيَلَّ لِبَاسًا وَ النَّوْمَ سُبَاتًا (25:47) اور وَ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (78:9)

نہیں کہا۔ عزیزانِ من! کیا چودہ سو سال پیشتر کوئی انسان یا اس کی فکر یہاں تک پہنچ سکتی تھی؟ نوم کو سبات کہا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا قرآن کریم تو زندگی اور حرکت یا عمل کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے، وہ تو صرف نیند کی حالت ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ کام سے تمہیں چھٹی مل سکتی ہے کیونکہ کچھ وقت کے لیے اس زمانے میں شعور کو ہم معطل کر دیتے ہیں۔

### قرآن حکیم کے نزدیک چھٹی کا کوئی تصور ہی نہیں

اب یہ جو ہفتہ وار چھٹی کا یعنی ہفتے میں ایک دن کام چھوڑنے کا تصور ہے، یہ یہودیوں کا تصور ہے۔ عیسائیوں کے ہاں تو یہ سارا جیوش

Law ہے انہوں (عیسائیوں) نے بھی چھٹی کا تصور وہاں (یہودیوں) سے لیا ہے۔ قرآن میں چھٹی کا تصور نہیں ہے اس میں کہیں چھٹی کی بات بھی نہیں ہے۔ کیا عرض کیا جائے عزیزانِ من! یہ جو ہمارے ہاں تحریک چلی غالباً اس دور سے پہلے یہ بات ہو گئی تھی کہ یہاں اسلامی معاشرہ ہونا چاہیے اسلامی نظام ہونا چاہیے اسلامی قوانین ہونے چاہئیں۔ اس میں سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ اتوار کی بجائے جمعہ کی چھٹی کی جائے۔ پہلے تو میں نے عرض کیا ہے کہ چھٹی کا یہ تصور ہی قرآن میں نہیں ہے اور پھر یہ چیز کہ اتوار کی چھٹی غیر اسلامی ہے اور جمعہ کی چھٹی اسلامی ہے ایک غیر قرآنی تصور ہے۔ ایک ہی چیز تھی جس کا تصور پہلے سے چلا آ رہا تھا آپ کے ہاں شریعت کے قوانین وغیرہ تو رہے ایک طرف یہ تھی ایک نئی چیز جو آپ کے ہاں اسلامی جمہوریہ مملکت پاکستان میں آئی۔ وہ تھی جمعہ کی چھٹی یہ ایک ہی تبدیلی تھی۔ قرآن میں نہ صرف چھٹی کا تصور نہیں ہے بلکہ یہ جمعہ کے دن کی چھٹی بھی ایک غیر قرآنی تصور ہے۔

جمعہ کے روز جمع ہونے کا ایک مقصد تھا جسے نظر انداز کر دیا گیا

یہ عجیب بات ہے کہ ایک سورۃ 62 ہے اس کا نام ہی سورۃ جمعہ ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يُّومِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوْا الْبَيْعَ <sup>①</sup> (62:9)۔ اے جماعتِ مومنین! اب اس آیت میں یوم الجمعہ آیا ہے یہ نہیں آیا ہے کہ یہ ہفتے میں کوئی ایک Particular day (متعین دن) ہے جسے متعین جمعہ کہا جاتا ہے یہ اجتماع کا دن ہے۔ یہاں کہا ہے کہ جب تمہارا وہ جو سیشن ہے اس کو کال کرنا ہو اور اس کے لیے تمہیں صلوٰۃ کی آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر آ جایا کرو۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن صلوٰۃ کا لفظ کہاں استعمال کرتا ہے؟ وَ اَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ (42:38) جو معاملات باہمی مشورے سے طے کرنے ہیں ان کے لیے جب تمہیں بلایا جائے۔ اسے قرآن نے الصلوٰۃ کہا ہے۔ اجتماع کے دن جب تمہیں مشاورت

① اے جماعتِ مومنین! جب تمہیں ملی اجتماع صلوٰۃ کے لیے آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر آ جایا کرو (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1315)۔  
کے لیے بلایا جائے، نوادی (62:9) آواز دی جائے۔ تو کیا کرو؟ کہا کہ ذَرُوْا الْبَيْعَ (62:9) کام کاج چھوڑ دو اور آ جایا کرو۔ تو گویا معلوم ہوا کہ اس آواز سے پہلے جو وقت ہے قرآن اس میں کام کاج کرنے کی بات کہتا ہے۔ اگر وہ چھٹی کا ہی دن ہو تو یہ کہنے کی ضرورت کیا ہے کہ وہ کام کاج چھوڑ کے آیا کرو۔ ”سبت“ کے دن یہ کہنا کہ کام چھوڑ کے آؤ تو وہ کہیں گے کہ ”تہانوں ایناں وی پتہ نہیں کہ اسی تے چھٹی کتی ہوئی اے کارخانے دی کم کاہدا؟“ <sup>①</sup> یہاں کہا ہے کہ کام کاج چھوڑ کے آ جایا کرو۔ اب ٹھیک ہے جی کہ آ گئے تو اب کیا کیا جائے؟ اس کے لیے کہا کہ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ (62:10) جب صلوٰۃ کا وہ سیشن وہ وقت ختم ہو جائے تو فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ

وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ (62:10) جاؤ، نکل جاؤ، پھر تلاشِ معاش کے اندر کام کاج کرو، کماؤ کھاؤ، اس کے بعد پھر جاؤ۔ وہ تو حکم ہے۔ یوم الجمعہ کے متعلق قرآن نے یہ تصریح کی۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ عالم خیر تھا، اسے پتہ تھا کہ یہ دور آئے گا جس دن یہ کہیں گے کہ سارا دن چھٹی کرو حالانکہ اس نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اس آواز پڑنے پہ کام کاج چھوڑو۔ تو کام کاج تو اس کی رو سے جائز ہو واجب وہ سیشن، وہ وقت، وہ کال ختم ہو جائے تو جاؤ، پھر تلاشِ معاش میں رزق حاصل کرو، کام کاج کرو، اور یہ عجیب چیز میں عرض کروں گا کہ یہ جو فَاَنْتَشِرُوا (62:10) ہے، یہ ”نشر“ ہے۔ نشر یہیں سے ہے جو ہمارے پاس ہے۔

بات سورۃ الفرقان میں یہ چلی آ رہی تھی کہ وَ النَّوْمُ سُبَاتًا (25:47) نیند کی حالت کے اندر کام کاج منقطع ہے اور اس کے فوراً ہی بعد اس آیت کا اگلا آخری ٹکڑا یہ ہے: وَ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا<sup>2</sup> (25:47)۔ اس میں یہ لفظ وہی نشر ہے جو فَاَنْتَشِرُوا (62:10) ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ سارا دن نشر کے لیے ہے۔ ”نشر“ کے معنی پھیل جانے کے ہوتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ فَاَنْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ<sup>3</sup> (62:10) اس نے اتنا ہی نہیں کہا کہ پھیل جایا کرو، بلکہ منایا کرو، وہ کہتا ہے کہ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ<sup>4</sup> (62:10) اس معاش کی فکر میں ادھر ادھر جاؤ، پھر اس وقت روٹی کمایا کرو، قرآن کہیں آپ کو جانے ہی نہیں دیتا، ایسا باندھتا ہے۔ کہتا ہے کہ فَاَنْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ (62:10) وہاں جو اکٹھا کیا تھا وہ تو تھوڑے وقت کے لیے تھا، اب جو پھیلا یا ہے تو وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر رزق حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اور اس کے بعد کہا کہ وَ اذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا (62:10) یہ ذکر خداوندی بہت زیادہ ہے جو تم یوں کرو گے۔ لہذا اب جو تم کا روبرو کر کے لیے نکلے ہو، تو قوانین خداوندی کو ہر وقت اپنے پیش نظر رکھو۔

① آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم نے تو کارخانے کی چھٹی کی ہوئی ہے تو کام کیسا؟

② اس کے بعد دن نمودار ہو جاتا ہے جس میں تم پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہو اور اپنے کام کاج کے لیے ادھر ادھر پھیل جاتے ہو (پرویز: مفہوم القرآن ص 825)۔

③ پھر ارض میں پھیل جایا کرو۔

④ اور تلاشِ معاش میں لگ جاؤ۔

### نعمائے خداوندی کا تذکرہ پانی کے سلسلہ میں نظامِ قدرت

جہاں صاف پانی پینے کے لیے نہیں ملتا تو ان ملکوں سے جا کے پوچھیے۔ ان لوگوں نے اب سمندر کے کنارے بڑی بڑی مشینیں لگا رکھی ہیں تاکہ کسی طرح سے پانی صاف ہو، اگرچہ اس سمندر کے پانی میں بہت مادے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر یہ مادے گھلے (Dissolved) ہوئے نہیں ہوتے، تو سمندر کا پانی فلٹریشن سے صاف ہو جاتا۔ وہ تو اس میں گھلے ہوئے ہوتے ہیں، وہ تو صرف کشید

ہوسکتا ہے کہ پینے کے قابل بنے۔ اور اس میں اتنا خرچ آتا ہے کہ وہ پانی بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ وہ ممالک بڑی مصیبت میں ہیں جہاں یہ پانی نہیں مل رہا۔ قرآن نے اس پانی کو رَحْمَتُهُ (25:48) کہا ہے۔ کہا ہے کہ یہ پانی جو ہم تمہیں جس شکل میں دیتے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے رحمِ مادر میں ماں کے خون سے دودھ جیسی چیز پیدا کر کے بچے کو دودھ پہ دودھ دیتے ہیں۔ اگر وہ اس طرح سے Convert (تبدیل) نہ کیا جائے اور خون کا خون ہی پلایا جائے تو بچہ ایک سانس میں ختم ہو جائے۔ کہتا ہے کہ ہم نے باہر تمہارے لیے کچھ ایسا انتظام کیا ہے کہ سورج کی تمازت (Heat) سے جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ اس کی کرنوں کی حرارت سے عمل کشیدہ (Distillation Process) ہوتا ہے۔ اس عمل کے لیے پانی Boil (ابالنا) کرنا پڑتا ہے یہ اتنا بڑا عمل کشیدہ ہے۔ اگر یہ نیچے اتنا بڑا سمندر ہے تو اس کے اوپر اس سے تیرہ سو گنا بڑا سورج چمکایا گیا ہے۔ یہ اتنا بڑا ہیٹر لگا دیا ہے۔ اس عمل کشیدہ سے پانی سمندر کے اندر اپنی ساری کثافتیں چھوڑ دیتا ہے اور صاف پانی بخارات کی صورت میں لیے چلا جا رہا ہے۔ پھر اس پانی کو بھیجنے سے پہلے وہ بادلوں کا کہتا ہے کہ وہ سقوں کے مشکیزے ہیں جو بھر بھر کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ الفاظ ہیں۔ میں نے کچھلی دفعہ <sup>1</sup> آپ کو بتایا تھا کہ ”یہ بھرے ہوئے مشکیزے“ تو عرب اپنے ہاں کہتے تھے۔ وہ مشکیزہ جو اس طرح سے Tight (کس کر) کر کے باندھا جائے کہ ویسے تو اس میں سے پانی کا ایک قطرہ نہ ٹپکے اور جہاں ضرورت ہو وہاں منہ کھول دیا جائے کہ جتنا پانی چاہیے اس میں سے لے لو وہ اسے قانت کہتے تھے یہ پائپ اور ان کی ٹونیاں تو حال ہی میں ایجاد ہوئی ہیں اس زمانے میں تو یہ بات نہیں تھیں۔ اب بھی جہاں یہ نہیں جانتیں وہاں یہی مشکیزہ اس قسم کا ہوتا ہے اور یہ جو خدا کے قوانین ماننے والے بندوں کی مرد اور عورت دونوں کی قانت <sup>2</sup> صفت اس نے بتائی ہے وہ بڑی عجیب چیز ہے کہ یہ اپنی صلاحیتوں کو اس مشکیزے کی طرح محفوظ رکھتے ہیں جس طرح سے وہ پانی کا مشکیزہ بندھا ہوا ہوتا ہے اور یہ اس Tight کر کے ساری عمر نہیں رکھ چھوڑتے۔ وہ مشک کسی کام کی ہی نہیں ہے اگر اس میں کا یہ پانی نکال کے استعمال میں نہ لایا جائے۔ وہاں تو یہ ہے کہ جہاں ان صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے

1 اس کے لیے دیکھیے سوال باب اور خاص کر اس کے عنوانات ”سورج کی شعاعوں سے کشید کیے ہوئے پانی کی مثال“ اور ”مومن کی صفت قانت کا قرآنی مفہوم۔“

2 (33:35)۔

جتنی ضرورت ہوتی ہے وہ انہیں وہاں صاف کرتے ہیں پھر منہ بند کر کے رکھ لیتے ہیں۔ یہ ہے قانت (25:48)۔ قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ بارش سے ذرا پہلے یہ جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں انہیں بھیج کر ہم تمہیں اطلاع بھی دے دیتے ہیں۔ آج کل تو جو میں کہا کرتا ہوں کہ کوئی چیز بھی اعتماد و بھروسے کی نہیں رہی۔

ہماری Economy (معیشت) اگر بیکلچر ہے زراعت ہے۔ زراعتی ملک کے اندر ہم نے اپنے بچپن میں دیکھا کہ کل تک ہمارے

ہاں جو گاؤں کی زندگی تھی اس میں بڑے بڑے کہتے تھے کہ ہاں بھئی! ٹھیک ہے۔ بھئی! مھکن <sup>1</sup> دی اپنی تاریخ ہوگئی اے۔ اے ہن پہلا پروا چلنا ہیگا اے۔ <sup>2</sup> وہ اُدھر سے جو ہوا آتی تھی انہوں نے اس کے دن گئے ہوئے ہوتے تھے کہ اس کے بعد موسم کی پہلی بارش آجانی ہے اس کے بعد پچھم <sup>3</sup> ہن چلدی پئی ہیگی اے۔ <sup>4</sup> اس کے بعد یہ ہوگا اتنے دنوں کے بعد پھر بارش ہوگی اتنے دنوں یہ بند ہوگا پھر یہ دھوپ آئے گی پھر تیز ہو جائے گی پھر کٹائی کے دن آجائیں گے کاٹنے کے بعد پھر تیز ہوائیں چلیں گی گندم کے سلسلہ میں بھوسا اڑانے کے دن آجائیں گے اور کلاک کی طرح لگے بندھے یہ دن ان زمینداروں کے تجربے میں آئے ہوئے تھے بالکل اسی طرح سے ہوتا چلا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ ہم کہتے تھے کہ ہمارا کاروبار گردشِ افلاک کے تابع چلتا ہے۔ ٹھیک ہے جی اگرچہ شاعر نے انوں گالاں امی کڈ دے رہے۔ ایناں نوں کپی پکائی مل جاندی سی۔ ایناں نوں ہل واہناں پیندا تے پتہ لگدا۔ <sup>5</sup> کہ اس کے لیے گردشِ افلاک کتنا ضروری ہے۔

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے (انشا)

کسی زمیندار توں پوچھ جا کے۔ اینوں وی دیندی اے تے ایہدے پوئوں وی دیندی اے۔ <sup>6</sup> تو وہ جو گردشِ افلاک تھی اس کے تابع ہمارا یہ سارا کاروبار ہوتا تھا۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ اب جو زمانہ الٹا ہے تو گردشِ افلاک ہمارے تابع ہوگئی ہے نہ ہمارا کوئی کام اعتماد کے قابل اور نہ گردشِ فلک پر اعتماد اب پتہ ہی نہیں ہے کہ ہوا کب چلے گی کس قسم کی چلے گی بارش کب آئے گی۔ یہ پرسوں <sup>7</sup> پہلی بارش جو

1 سال بکرماجیت کا گیا رھواں مہینہ ہندوؤں کے سال کا گیا رھواں مہینہ اخیر فروری سے وسط مارچ تک کا زمانہ۔

2 آج بھاگن کی اتنی تاریخ ہو چکی ہے۔ یہ اب پورب کی پہلی ہوا چلے گی۔

3 مغرب

4 اب مغرب کی ہوا چل رہی ہے۔

5 اگرچہ شاعر اُسے گالیاں ہی بکتے رہے۔ انہیں کپی پکائی مل جاتی تھی۔ اگر انہیں ہل چلانا پڑتا تو پھر اس کا بھاؤ معلوم ہوتا کہ.....

6 کسی زمیندار سے جا کر معلوم کرو۔ یہ اسے بھی چین دیتی ہے اور اس کے باپ کو بھی۔

7 یعنی یکم مارچ 1978ء

ہے وہ موسم سرما کی آئی ہے جسے دسمبر میں آنا چاہیے تھا:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا

بارشی پانی کے لیے طہوراً کی تشبیہ

عزیزانِ من! اب نہ فلک ہمارے تابع چل رہا ہے نہ ساڈا کوئی اصول تے ٹھکانہ ہیگا اے نہ اوہدا کوئی اصول باقی رہیا ہے۔ اکو جے ہیگے<sup>①</sup> وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ بُشْرًا ۖ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ (25:48)۔ یہاں لفظ رحمۃ کی کیا بات ہے! اس پانی کو مہر حیات بنانا کہ یہ بلا مزد و معاوضہ ہے ایک پیسہ خرچ نہیں ہو رہا۔ اس کے لیے رحمت کا لفظ آیا ہے اور اس کے لیے کہا ہے کہ و انزلنا من السماء ماءً طهورًا (25:48)۔ یہاں اس پانی کے لیے طہور کا لفظ آ گیا: کشید کیا ہوا پانی۔ کیسی عمدہ تشبیہ ہے اس پانی کو ماء طہور اکہنا! اور عربی زبان میں طہور خود جو چیز پاک اور صاف کثافتوں سے الگ ہوا سے بھی کہتے ہیں اور جو دوسری چیزوں کو پاک و صاف کر دے اس کو بھی طہور کہتے ہیں۔ ایک ہی لفظ میں اسکی دونوں خصوصیات قرآن بیان کر گیا ہے۔ اس قسم کا پانی اس نے دے دیا۔

### حیات بعد الممات کے سلسلہ میں زمینِ مردہ کی مثال

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ اس نے اس قسم کا پاک، صاف کشید کیا ہوا، ہر قسم کی کثافتوں سے منزہ پانی کا ہے کے لیے دیا؟ اس کے لیے کہا کہ لِنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا (25:49) تاکہ اس پانی سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کر دی جائے۔ کئی مقامات پر قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ پوچھتے ہیں کہ اس موت کے بعد جب زندگی کی یہ کیفیت ہوگی تو پھر دوبارہ زندگی کیسے عطا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ ذرا یہ جو زمینِ مردہ ہے اس کو کھود کے بھی دیکھو نیچے تک کہیں تمہیں زندگی کا کوئی آثار نظر آتا ہے؟ اس شے کا ایک چھینٹا ہم دیتے ہیں جو زندگی پیدا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھیے کہ زندگی آنکھیں ملتی ہوئی کس طرح ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ كَذَلِكَ النُّشُورُ<sup>②</sup> (35:9) اور انسانوں کو حیاتِ تازہ اسی قانون کے مطابق ملتی ہے: اس دنیا میں بھی اور اخروی زندگی میں بھی۔ اس نے کہا کہ ہم چھینٹا دیں گے لیکن اسی زمین میں سے یہ طبقہ اٹھتا ہے جس میں اگانے کی صلاحیت ہوتی ہے صرف پانی کی کسر ہوتی ہے باقی سب چیزیں اس میں موجود ہوتی ہیں۔ حیات بعد الممات کے بھی معنی یہ ہیں کہ زندگی کی ساری صلاحیتیں موجود ہوں گی، وہ جو Disconnect (منقطع) ہوا تھا، بس

① نداب فلک ہمارے تابع چل رہا ہے نہ ہمارا کوئی اصول و مقام رہا ہے نہ اس کا ہی باقی بچا ہے۔ اس معاملے میں ہم دونوں ہی یکساں ہو چکے ہیں۔  
 ② وَ اللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُبْرِ سَحَابًا فَسُقْنَهُ إِلَى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (35:9) اللہ تعالیٰ کا قانون ہواؤں کو ایک رخ پر چلاتا ہے۔ وہ سمندر کے بخارات (Vapours) کو بادل کی شکل میں اوپر لے جاتی ہیں۔ پھر ہم اس بادل کو ان مقامات کی طرف بانک کر لے جاتے ہیں جن میں زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ وہاں جب بارش ہوتی ہے تو زمینِ مردہ اس سرسبز زندہ ہو جاتی ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1005)۔  
 وہ سوچ کو آن کر دے گا، زمینِ مردہ میں حیاتِ تازہ پیدا ہو جائے گی۔ کیا مثالیں ہیں اس کی صاحب، زمینِ مردہ کو زندگی عطا کرنے کے لیے! بہت اچھا جی، وہ توجی، جس زمین کے اوپر جا کے پانی پڑے گا اس کو ہی زندگی ملے گی ساڈے کول چپہ زمین نہیں۔ سانوں کی فائدہ ہو یا اوہدا؟<sup>①</sup> کہنے لگے کہ نہیں وَ نُسْقِيهِ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا ۚ وَأَنَاسِي كَثِيرًا (25:49) اسی سے تمہارے پینے کا انتظام بھی ہم



نے کیا ہے اور موشیوں کے پینے کا بھی۔ بارش کا پانی جمع کرو تو وہ دریاؤں ندی نالوں میں آئے سردی کے زمانے میں پہاڑ کی چوٹیوں پہ پڑے تو برف کی شکل میں ہم اس کو Reservoir میں اکٹھا کر چھوڑتے ہیں کہ ابھی تمہیں ضرورت نہیں، گرمی آتی ہے زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو وہی سورج جو سمندر سے پانی اٹھا کے لے گیا ہے اسی کی شعاعیں اس جمع شدہ Reservoir سے پھر پانی بہا کے تمہارے ہاں لے آتا ہے۔ یہ ساری چیزیں بیان کرنے کے بعد کہا کہ وَلَقَدْ صَرَّفْنَاهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوا ۚ فَابْتَلَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا<sup>2</sup> (25:50) کہا کہ یہ ساری چیزیں ہیں۔ یہاں صَرَّفْنَاهُ آیا ہے۔ یہ وہی تشریف آیات ہے یعنی پھیر کر ہم یہ چیزیں آیات کی رو سے لاتے ہیں تاکہ حقیقت تمہارے سامنے محسوس طور پر آجائے۔ یہ جو ہم نے محسوس مثالیں دی ہیں یہ قانون خداوندی کی کارفرمائی تھی۔

خارجی کائنات میں خدا کی حکومت اور اپنی دنیا میں اپنے جذبات کا اتباع: ایک کھلا تضاد ہے ہم یہ چیزیں بار بار پھیر پھیر کر تمہارے سمجھانے کے لیے لاتے ہیں تاکہ یہ بات محسوس طور پر تمہارے سامنے آجائے لیکن اس کے باوجود ہم اتنا کچھ کرتے ہیں پھر بھی اکثریت کی یہ کیفیت رہتی ہے کہ اسکے باوجود وہ اس سے انکار ہی کیے چلے جاتے ہیں۔ باہر کی کائنات میں تو خدا کی خدائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک اس کی کارفرمائی ہے مگر ہماری اپنی جو زندگی ہے اس میں ہم خود ہی خدا ہونگے۔ وہ تو خدا سے مراد یہ ہے کہ وہ جو اپنے یہاں کے خدا ہم نے تجویز کیے ہیں ان کی خدائی کے تابع ہم چلیں گے۔ یہ ہے ابسی أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا<sup>3</sup> (25:50)۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن سے انسان کے اندر ایک سپردگی کا عالم پیدا ہونا چاہیے تھا، جھکنے کا عالم پیدا ہونا چاہیے تھا، یہ اس کی اتنی واضح مثالیں ہیں تو اس سے جب وہ اپنی زندگی کی طرف آتے ہیں تو اس میں سرکشی اختیار ہو جاتی ہے۔

① ہمارے پاس چپہ بھر زمین نہیں ہے اس کا ہمیں کیا فائدہ ہوا؟

② (یہ ہے وہ ہمارا قانون کائنات جسے) ہم مختلف پیراؤں میں (بار بار) پیش کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیں (کہ جب کائنات کی ہر شے قوانین خداوندی کا اتباع کرتی ہے اور اس سے اس قدر تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں تو اگر انسان بھی اُس کے قوانین کے مطابق چلے تو اس کی زندگی بھی خوشگوار یوں کی حامل ہو جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ انہیں قوانین خداوندی سے انکار اور سرکشی کے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 826)۔

③ اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہیں قوانین خداوندی سے انکار اور سرکشی کے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں۔

مختلف مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد انسان کو حقیقت سے آشنا کرانا ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم میں ہے کہ ہم نے بسلسلہ رشد و ہدایت یہ سارا کچھ جو قرآن نے کہا ہے، دیا۔ یہ کوئی بائیالوجی کی زوالوجی کی کتاب نہیں ہے کہ یہ سبق دے رہا ہے۔ وہ تو ان مثالوں سے کسی ایک مقصد تک پہنچانے کے لیے بات سمجھا رہا تھا لہذا بات

اس نے پھر وہیں آ کے کہی کہ یہ جو قوانین ہم نے وحی کے ذریعے انسانوں کو دیئے ہیں ان سے مقصد تو یہ ہے کہ بذریعہ انبیائے کرام □ ہمارا یہ سلسلہ رشد و ہدایت جو شروع سے جاری تھا وہ واضح طور پر انسانوں تک پہنچ سکے۔ قرآن کہتا ہے کہ شروع میں یہ کیفیت تھی کہ ہر قریہ میں ایک رسول آتا تھا ہر بستی میں رسول آتا تھا۔ یہ مواصلات کا سلسلہ ایسا نہیں تھا Communication (مواصلات) کے ذرائع ایسے نہیں تھے جیسے آج ہیں۔ ایک جگہ کی بات دوسری جگہ نہیں پہنچتی تھی۔ اس لیے اس کی ضرورت تھی۔ جوں جوں یہ تمدنی زندگی آگے بڑھتی گئی آپس میں اختلاف اور ارتباس کے سلسلے زیادہ ہوتے گئے تو ہر بستی ہر قوم میں رسول بھیجنے کی ضرورت کم ہوتی چلی گئی تا نکہ وہ دور آ گیا جب گھر کے اندر خاموشی سے کی ہوئی بات چاند پہ بھی جا پہنچے تو کہا کہ اب ضرورت نہ رہی کہ ہم ہر بستی میں الگ الگ رسول بھیجیں۔

### قرآن حکیم کا مکمل ہونا اور پھر محفوظ ہونا بذاتِ خود ختم نبوت کی دلیل ہے

خود اس سورۃ کے شروع میں بھی یہ کہا کہ تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا<sup>1</sup> (25:1)۔ اب یہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت کا موجب ہو گیا تمام اقوام کے لیے ہو گیا تمام ممالک کے لیے ہو گیا: لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (25:1) اور اسی لیے تو ختم نبوت کی بحثیں چلا کرتی تھیں کہ جی! یہ قرآن سے دلیل ہے۔ بہر حال وہ جو میری کتاب ”ختم نبوت“ پہ ہے اس میں میں نے یہ کہا ہے۔ یہ نہ بھی ہوتا تو بھی رسول اللہ ﷺ کے متعلق خاتم النبیین والی یہ بات یہ چیز کہ قرآن تمام اقوام کے لیے قیامت تک کے لیے محفوظ غیر متبدل ایک ضابطہ حیات ہے تو اس کے بعد پھر نبوت کے اجرا کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ یہ مکمل ضابطہ حیات آپ کے پاس موجود ہے محفوظ ہے اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہے اس کو غیر متبدل کہا ہے۔ اسے للعالمین کہا قیامت تک کے نوع انسانی کے لیے کہا تو پھر اور کوئی رسول کا ہے کے لیے آئے گا؟ پیغامبر تو پیغام دینے کے لیے آتا ہے۔ معاف رکھیے وہ جو میں کبھی

① کس قدر فراوانیاں اور خوشگواریاں عطا کرنے والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر وہ کتاب نازل کی جو مستقل اقدار کی حامل اور حق و باطل اور صحیح اور غلط میں امتیاز کر دینے والی ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھیجی گئی ہے تاکہ اس کے ذریعے تمام اقوام عالم کو آگاہ کر دیا جائے کہ ان کے سفر زندگی میں کون کون سے خطرناک مقام آتے ہیں اور ان سے بچ کر چلنے کا طریق کیا ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 815)۔

کبھی کہا کرتا ہوں کہ وہ چٹھی رساں سال اچانک دن ایسا وی اوندائے جدوں اوچھی نہیں پہنچا ندا ہوندا۔ او اوند اہوندا اے عیدی لین۔ ختم نبوت کے بعد جے نبی اون گے او عیدیاں لین اون گے چٹھیاں نہیں لے کے اون گے۔ چٹھی تے آچکی ہوئی اے۔ بڑیاں عیدیاں ملدیاں نے اس قوم کولوں صاحب پوچھونا جاگیراں بنیاں ہویاں ہیکیاں ریاستاں بن جانداں ہیکیاں۔ آپ پاویں ننگے بھوکے

گذارے کرن، عیدیاں دیندے ہیگے، عیدیاں جتھے دیندے نیں سونے دے دروازے کھڑے کردے نیں۔<sup>①</sup> وَلَوْ شِئْنَا لَبعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَذِيرًا (25:51) اگر ہماری مشیت ہوتی تو ہم اس سلسلے کو جاری رکھتے، ہر بستی میں ہر قریے میں رسول بھیجا جاتا تھا۔ اب یہ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (25:1) یعنی مواصلات کا سلسلہ اتنا عام ہو چکا ہوا ہے کہ اب ہر بستی اور ہر قریے میں تو کیا، اس کے بعد کسی رسول کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب قرآن آ گیا ہے جو ہم نے کہنا تھا کہہ دیا۔ اب تَوَوَّ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ (6:115) ساڈیاں گلاں مک گیاں۔<sup>②</sup> کیا لفظ ہے! تکمیل تو اس نے دین کو کہا تھا۔ کلمت کے لیے تمت کا لفظ آیا ہے۔ اب بھی ہمارے ہاں وہ جو پرانے زمانے کی کتابیں اور پارے چھپتے ہیں ان کے آخر میں تمت بالخیر لکھا ہوا ہوتا ہے اس کے بعد ایک لفظ بھی اور نہیں لکھا جاتا۔ یہ کہتے ہیں کہ جی نہیں، اس کے بعد بھی وہ آنے والے آئیں گے۔ کچھ رہ گئی سی گل، اوگروں لکھن والے اون گے۔<sup>③</sup> ہماری مشیت جو شروع سے چلی آرہی تھی تو اس میں یہ نہیں تھا کہ اس کے بعد کچھ رسولوں کا (معاذ اللہ) شک ختم ہو گیا تھا اس لیے ہم نے بھیجے بند کر دیئے، یہ جو ہیں ان کو مہنگے داموں بیچو۔ یہ بات نہیں ہے۔ مشیت کا پروگرام یہ تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب اس کے بعد رسول سے کہا جا رہا ہے کہ پروگرام یہ ہے کہ فَلَا تُطِيعُ الْكَافِرِينَ (25:52) جو ان صدقاتوں کو نہیں مانتے، تو ان کی اطاعت مت کراے رسول! تو ان منکرین صدقات کی بات پر دھیان نہ دے کہ ہر قبیلے میں الگ الگ رسول ہونا چاہیے تھا۔

① سال میں ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ وہ ڈاکیا بھی اس دن خط دیئے نہیں آتا۔ وہ آتا ہے عیدی لینے۔ ختم نبوت کے بعد اگر نبی آئیں گے تو عیدی لینے آئیں گے، خط لے کر نہیں آئیں گے۔ خط تو آچکا ہے۔ صاحب! اس قوم سے بڑی عیدیاں ملتی ہیں۔ آپ ذرا پوچھیں تو جاگیریں بنی ہوئی ہیں، ریاستیں بنی ہوئی ہیں۔ خواہ وہ خود بھوکے رہیں مگر عیدی ضرور دیں گے، جہاں عیدیاں دیتے ہیں وہاں سونے کے دروازے اور کھڑکیاں کھڑے کر دیتے ہیں۔

② ہماری باتیں اختتام کو پہنچیں۔

③ کچھ بات لکھنے سے رہ گئی تھی اسے لکھنے کے لیے بعد والے آئیں گے۔

## رسول کی بعثت کا مقصد

یہ بڑی بات ہے۔ اس کی تشریح کسی دوسرے وقت پر رکھتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کروں کیا؟ ضابطہ تو مکمل ہو گیا، راہنمائی مکمل ہو گئی۔ مقصد صرف یہ ضابطہ ہدایت دینے سے نہیں تھا، نظری طور پر (Theoretically) اس طرح سے Guidance (راہ نمائی)

دے کر رسول بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر اتنا ہی کام ہوتا تو میں نے کہا ہے کہ اگر وہ آسمان سے جیسے وہ لکھی لکھائی کتاب مانگتے تھے خدا بھیج سکتا تھا کسی چٹان پہ بھی لکھ کر دے سکتا تھا مگر اس نے اس کے ساتھ رسول بھیجا اور یہ کہا کہ یہ اس لیے بھیجا ہے کہ یہ اس پہ عمل کر کے دکھائے گا اس کو ایک نظام کی شکل میں متشکل کرے گا تو اس کے بعد قرآن باقی رہے گا رسول چلا جائے گا یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی کہ اس نظام کو اسی طرح سے مسلسل آگے بڑھاتے چلے جاؤ لیکن اس نظام کو متشکل کرنا کوئی پھولوں کی بیج نہیں ہے یہ موت کا پیغام ہے ہر نوع غلامی کے لیے۔ جنہوں نے غلامی کی زنجیریں اتنی اتنی محنت سے تیار کر کے پہنائی ہوتی ہیں وہ کیسے آسانی سے ان کو اتار کے پھینک دیتے۔ یہ تو مسلسل جدوجہد کا متقاضی تھا اور جدوجہد بھی وہ کہ جس کا آخری مرحلہ جا کر میدان جنگ میں تکمیل تک پہنچتا ہے۔ جہاد کا لفظ قرآن کریم نے ”قتال“ کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے اسی لیے ویسے تو یہ جدوجہد زندگی کے ہر سانس میں جاری رہتی ہے یہ آپس کے ٹکراؤ یہ ان لوگوں کے ساتھ کشمکش یہ تصادم یہ تزام ہر گوشے کے اندر ہوتا ہے اور جب آخر میں وہ تنگ آ کے میدان جنگ میں آترتے ہیں تو قرآن نے کہا ہے کہ فَلَا تُطِيعُ الْكَافِرِينَ (25:52) جو اس سے انکار کرنے والے ہیں ان کی اطاعت مت کرو۔ یہ تو مقابلہ کریں گے۔ اگر ان کے نظام کی آپ اطاعت نہیں کریں گے تو خلا تو نہیں ہوگا دوسرے نظام قائم کریں گے تو مقابلہ کریں گے۔ یہ تو مخالفت کریں گے۔

### لفظ کبیر کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اس جدوجہد کے لیے قرآن نے کہا کہ وَ جَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (25:52)۔ یہ بڑی غور طلب آیت ہے۔ اس میں ایک لفظ ہے جس پہ غور ہی نہیں کیا جاتا: وَ جَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (25:52) تم اس کے ساتھ اس کے ذریعے جہاد کبیر کرو یعنی جدوجہد تو مسلسل تھی مگر ایک چیز ہے جسے جہاد کبیر کہا ہے۔ یہ جہاد کبیر کیا ہے؟ قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيرًا<sup>①</sup> (17:111)۔ خدا کی کبریائی کے متعلق بار بار کہا ہے۔ دین

① وہ خدا بلاشریک و سہیم تمام قوتوں کا مالک ہے۔

کے متعلق کہا ہے کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (9:33) دنیا کے ہر نظام کے اوپر یہ نظام غالب آئے گا۔ یہ تمام چیزیں قرآن نے کہی ہیں۔ کبریائی کا لفظ تو تکبیر کے متعلق ہے یعنی یہ جو چیز ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوگا اور اس کے لیے مسلسل جدوجہد ہوگی اور آخر میں ہے یہ جِهَادًا كَبِيرًا<sup>①</sup> (25:52)۔ ذرا یہ دیکھ لیجیے گا کہ یہ جو یہاں کبیر کا لفظ آیا ہے اس کے معنی قرآن خود کیا واضح کرتا ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ قرآن نے کہا کہ ذَلِكُمْ بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ ۚ وَ إِنَّ يُشْرَكَ بِهِ تَكْفُرْتُمْ ۚ (25:52)۔

(40:12) لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کو خدائے واحد کے قوانین کی اطاعت کی طرف بلایا جاتا ہے تو اس سے انکار کرتے ہیں، سرکشی برتتے ہیں۔ جب اس کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو ساتھ ملا دیا جاتا ہے تو اس کے سامنے کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے صاحب! اب ہم مانیں گے۔ کہا کہ **فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ** <sup>(2)</sup> (40:12) اس طرح سے خدا علیّی ہے۔ علیّی کے معنی ہوتا ہے اعلیٰ غلبہ والا ہونا، کبیر ہونا، جس کے اوپر کوئی اور نہ ہو، کبریائی اس کے ہاتھ میں ہو۔ اسی لیے کہا کہ **فَالْحُكْمُ لِلَّهِ** (40:12) حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ ہے دین کا منشا، یہ ہے وہ جو کبیر کا لفظ یہاں آیا ہے۔

میں ابھی بتاؤں گا کہ میں کیوں بار بار اس پہ زور دے رہا ہوں۔ یہ جو آپ کا اب پانچ دفعہ دن میں اللہ اکبر کا اعلان ہوتا ہے تو یہ اللہ اکبر کا کیا اعلان ہوتا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟ اعلان ہی یہ تھا کہ کبریائی، حق حکومت، غلبہ، قوت، اقتدار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا، یہ اعلان چھت پہ ہی نہیں مینار پہ کھڑے ہو کے ساری دنیا کے سامنے اعلان ہے، ایک دن میں اتنی مرتبہ اعلان ہے: اللہ اکبر کہ اللہ سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ یہ تھا کبیر۔ اسی لیے کہا کہ **فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا** <sup>(3)</sup> (25:52)۔ اب آپ نے بات سمجھ لی کہ جہاد کبیر کیا ہوگا: آخری کشش، آخری آویزش، آخری ٹکراؤ، جو خدا کی کبریائی کو ثابت کرنے کے لیے آئے گا جہاد کبیر ہوگا۔

### مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاں جہاد کبیر اور جہاد صغیر کا فلسفہ تعلیم و عمل

آپ کہیں گے کہ یہ بات اتنی واضح ہے تو پھر تم نے بار بار اتنا وقت اسے کیوں دے دیا؟ میں ابھی بتاتا ہوں۔ ہمارے ہاں یہ جو قریب والا نبی <sup>(4)</sup> آیا تھا، کہتا ہے کہ وہ ایک پیغام خاص لے کر آئے ہیں، اور وہ پیغام یہ تھا کہ وہ اُس زمانے میں (معاذ اللہ) یونہی غلطی سے کہہ دیا تھا کہ تلوار کے ذریعے سے جہاد کرو، میدان جنگ میں ان مخالفین کا مقابلہ کرو۔ کہا کہ میں یہ کہنے کے لیے آیا ہوں، مجھے خدا نے

① سرو توڑ کوشش ہے ایسی کوشش جو آخر الامر غالب آ کر رہے۔

② تمام فیصلے خدا اور صرف خدا کے قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ بڑی کبریائی کا مالک اور سب سے ارفع و اعلیٰ ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 1091)

③ لہذا اے رسول! تو ان منکرین صداقت کی بات پر دھیان نہ دے (کہ ہر قبیلے میں الگ رسول ہونا چاہیے تھا۔) اور ان کی بات نہ مان، بلکہ ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے سرو توڑ کوشش کیے جا، ایسی کوشش جو آخر الامر ان پر غالب آ کر رہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 826)

④ یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) کی طرف ہے۔

یہ کہنے کو بھیجا ہے کہ بھئی! اک گل توں بھی کہہ۔ <sup>(1)</sup> اور وہ یہ ہے کہ اب تلوار کے ساتھ جہاد منسوخ ہو گیا ہے۔ میں یہ ایک ہی بات کہنے کے لیے آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ قرآن کریم میں تو جہاد کے متعلق یہ اتنا کچھ آیا ہوا ہے، وہ سارے کا سارا منسوخ ہوا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ پھر یہ جو جہاد والی بات ہے وہ کیا ہوگی۔ اس کے جواب میں کہا کہ تم لوگ سمجھتے نہیں ہو۔ اس نے حکم دیا تھا

کہ جہاد کبیر کیا کرو۔ اچھا جی، پھر اس حکم کے کیا معنی ہوئے؟ حکم کے معنی کے لیے ایک حدیث پیش کر دی۔ وہ بڑا آسان ہے۔ کیا حدیث پیش کر دی؟ کہ نبی اکرم ﷺ ایک جنگ کے بعد فتح کرنے کے بعد جب واپس لوٹے تو آپ ﷺ نے کہا کہ ہم جہادِ صغیر سے فارغ ہو کر جہادِ کبیر کی طرف جارہے ہیں، یعنی اب ہم تبلیغ کیا کریں گے، میدانِ جنگ والا جہادِ صغیر ہے اور یہ تبلیغ والا جہاد ہے، یہ جہادِ کبیر ہے۔ مرزا صاحب <sup>②</sup> نے لکھا ہے کہ اب کہا یہ گیا ہے کہ جہادِ صغیر کا دور ختم ہو گیا ہے، اب جہادِ کبیر کا دور آیا ہے۔ یہ ہے وہ جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ کہاں سے سندیں لائی جاتی ہیں۔ انہوں <sup>②</sup> نے کہا کہ یہ جہادِ کبیر قلم کے ذریعے ہوگا، وعظ کے ذریعے ہوگا، تبلیغ کے ذریعے ہوگا، جو جہاد ہے وہ منسوخ ہو گیا ہے، یہ ہے جہادِ کبیر، جواب کہا گیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اب ہم جہادِ کبیر کی طرف جارہے ہیں، جو جہادِ صغیر ہے وہ دور اب ختم ہو گیا، اور تو اور کسی نے اس <sup>②</sup> سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ بھئی! حضور ﷺ نے اپنی زندگی کے کس ایک جہاد کے بعد یہ بات کہی ہوگی؟ آپ ﷺ کی کیفیت یہ تھی کہ زندگی کے آخری دور کے اندر بھی جنگ تبوک <sup>③</sup> کی طرف آپ ﷺ گئے اور اس جنگ کے لیے آپ ﷺ نے لشکر تیار کیا ہوا تھا کہ اس دوران میں حضور ﷺ کی

① ایک بات تم بھی کہو۔ ② مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908)۔

③ جنگ تبوک کی مہم (رجب 9ھ مطابق نومبر 630ء) اور لشکر اسامہ بن زیدؓ (11ھ مطابق 632ء)۔ ہوایہ تھا کہ جنگ موتہ (8ھ مطابق 630ء) میں موتہ کے مقام پر جیوش اسلامیہ کی پسپائی سے رومیوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے اور انہوں نے اسی وقت سے جارحانہ تیاریاں شروع کر دیں۔ رجب 9ھ میں مدینہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ رومیوں کا لشکر حملہ کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ حضور نے حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ فرمایا کہ دشمن کے حملہ کا انتظار کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس کی طرف سبقت کی جائے۔ مہم کی اہمیت کے پیش نظر حضور نے فوج کی کمان خود سنبھالی اور لشکر شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ تبوک کے مقام پر (جو مدینہ اور دمشق کی قریب نصف مسافت پر واقع ہے) معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی۔ وہاں آپ نے قریب بیس روز تک قیام فرمایا اور گرد و نواح کے رؤسا کے ساتھ امن و اطاعت کے معاہدات کر کے واپس تشریف لائے..... جب آپ جتہ الوداع سے فارغ ہو کر مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ایک جہادِ لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ لشکر تیار ہوا تو آپ نے اس کی سپہ سالاری کے لیے (حضرت زید بن حارثہؓ کے بیٹے) حضرت اسامہؓ کو منتخب فرمایا۔ یعنی دنیا کے عام الفاظ میں ایک غلام ابن غلام کو اس لشکر کا سالار مقرر فرمایا جس میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے اولوالعزم صحابہؓ بطور سپاہی شریک تھے۔ لشکر کی روانگی کے انتظامات ہنوز مکمل بھی ہونے نہ پائے تھے کہ حضور علیہ السلام ہو گئے اور یہ علالت اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ لشکر کی روانگی ملتوی کرنا پڑی۔ اسی علالت میں حضور دنیا سے تشریف لے گئے اور حضرت اسامہؓ کا لشکر روانہ نہ ہو سکا..... حضرت ابوبکر صدیقؓ نے (11ھ مطابق 632ء) کو خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کی روانگی کا حکم دے دیا۔ اس لشکر نے اس مقام کے قریب جاکر ڈیرے ڈال دیئے جہاں جنگ موتہ ہوئی تھی۔ (حوالہ پرویزؒ 1987)۔ شاہکار رسالت لاہور: ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، ماخوذ از ص 166 تا 167)

وفات ہوئی۔ اسامہ بن زید ♦ اس کا جرنیل تھا تو وہ تو زندگی کے آخری سانس تک اس جہاد کے اندر رہے۔ آپ ♦ تو یہی کرتے رہے تو پھر کیا زندگی کے آخری دور جہاد تو جہادِ صغیر ہوا؟ کیا بتائیں، عزیزانِ من! کہ ہم یہ کیا کیا گزری اور آپ نے غور کیا کہ یہ گزری کیوں ہے؟ جواب میں وہ ایک حدیث بتادی۔ پتہ نہیں، جس دور میں جب اس سرتاپا باعمل اور سرتاپا باقوت قوم کو انہوں نے راکھ کا ڈھیر بنانا تھا تو

اس قسم کی حدیثیں وضع کی گئیں: حدیث یہ بنائی کہ جو جہاد بالسیف ہے، تلوار کے ذریعے جہاد ہے، یہ جہادِ صغیر رہ گیا ہے اور جہادِ کبیر یہ رہ گیا ہے کہ وعظ و نصیحت کرو اور کتابیں لکھا کرو۔ ایک حدیث سے سارا قرآن منسوخ کر دیا جب کہ حکم قرآن یہ تھا کہ **وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا** (25:52) ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کیا کرو ایسی کوشش جو آخر الامر ان پر غالب آ کر رہے۔

### ضابطہ حیات کے ساتھ شمشیرِ خارہ شکاف کا نزول بھی

عزیزانِ من! قرآن کی آیت (57:25) دیکھیے، بڑی عجیب چیز ہے۔ اس میں کہا ہے کہ **لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ** (57:25) آؤ ہم بتائیں کہ یہ جو سلسلہ رشد و ہدایت ہے اس کا طریقہ کیا ہے، پروگرام کیا ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ **بِالْبَيِّنَاتِ** یعنی یہ دلائل و براہین کی رو سے باتیں سمجھاتا ہے، دلیل سے بات کرتا ہے ان سے بھی کہتا ہے کہ **هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ** (2:111) اگر اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل لاؤ: **بِالْبَيِّنَاتِ** (57:25) جب لوگ دلائل کے ذریعے سے قائل ہو کے ساتھ ملتے چلے جاتے ہیں تو **أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ** (57:25) انہیں ضابطہ قانون دیا جاتا ہے۔ اس نظام کے قائل ہی نہ ہوں تو پھر اس کے لیے ضابطہ قانون کے معنی کیا ہیں، کچھ نہیں۔ ان کے لیے تو پھر **وَالْمِيزَانَ** (57:25) اور میزانِ عدل ان کے لیے ہے۔ ان کے لیے انصاف کی میزان کھڑی کی جاتی ہے۔ **لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ** (57:25) تاکہ لوگوں میں عدل اور انصاف قائم کیا جائے۔ کتاب یا قانون اس لیے دیا جاتا ہے۔ یہ ہے مقصد قانون دینے کا، انصاف یعنی عدل قائم کرنا۔ یہ بھی دیا گیا تھا۔ کہا کہ اب اس کے بعد وہ لوگ رہ جائیں گے جو اس کی مخالفت کریں گے، سرکشی اختیار کریں گے، وہ اس قانون کے اوپر نہیں آئیں گے، عدل کے خلاف کریں گے، دھاندلی کریں گے، نا انصافیاں کریں گے، بیعت سے وہ نہیں مانیں گے۔ انہوں نے قانون سے سرکشی برتی، تو پھر اس کے لیے کہا کہ اس کے لیے ہم بے بس اور بے کس نہیں ہو گئے، بے چارگی نہیں ہے۔ یہاں وعظ نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ** (57:25) ہم نے اس کے ساتھ شمشیر خارہ شکاف بھی دے دی ہے، ہم نے اسے بھی نازل کیا ہے یعنی انزلنا یہ بھی ساتھ بھیجی ہے۔ یہ قرآن کہتا ہے۔ یہ بڑے الفاظ ہیں صاحب! پھر آگے کہا کہ **فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ** (57:25) اس تلوار کے اندر بڑی سختی ہے۔ ایک طرف کہا ہے کہ بڑی سختی ہے، دوسری طرف کہا ہے کہ **مَنْفَعٌ لِلنَّاسِ** (57:25) نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش بھی ہے۔ سختی ہے ظالم کے لیے، منفعت بخش ہے مظلوم کے لیے۔ شمشیر کی دونوں صفات ہیں۔ کہا کہ ہم نے یہ بھی دے دی ہے، تو یہ وقتی طور پر توبات نہیں ہے۔ سرکشی کا اور دھاندلی کا تو آخری علاج ہی یہ ہے۔ یہ ہے وہ نظام جو قرآن نے قائم کیا تھا۔

جہادِ کبیر کے لیے تلوار اور تلوار کے ساتھ قرآن: یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں

اب اس کے ساتھ کہا ہے کہ **وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا** <sup>①</sup> (25:52)۔ بس یہ ہے عزیزانِ من! وہ جو منفرد کرتا ہے اس قوت کو تلوار کو جو دین کی خاطر اٹھائی جائے اور اس تلوار کو جو ظلم کی خاطر اٹھائی جائے۔ ویسے تو وہ ایک ”حرفِ جار“ ہے یوں تو اس کے کچھ معنی ہی نہیں ہوتے، لیکن یہ تو بڑی اہم چیز ہے یہ جہادِ کبیر ہے جو تلوار کے ذریعے کیا جائے گا۔ کہا کہ یہ کچھ قرآن کے زیرِ سایہ کیا جائے گا اور یہاں اقبالؒ (1877-1938) پھر جس طرح ”جاوید نامے“ <sup>②</sup> میں سمجھا جاتا ہے یاد آتا ہے۔ انہوں نے خاتونِ شرف <sup>③</sup> النساء (مرحومہ) بیگم رفیق کا واقعہ لکھا ہے۔ یہ پنجاب کے گورنر تھے۔ یہ نواب عبدالصمد خان کی بیٹی تھی وہ قرآن کی تلاوت کرتی تھی اپنے ساتھ تلوار کو باندھ لیتی تھی۔ عورت تلوار کو باندھ کے رکھتی تھی۔ مرتے وقت ماں سے کہا کہ میری قبر میں تلوار اور قرآن دونوں چیزیں رکھ دیں اور اس نے یہ بات سمجھائی۔ یہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند

قرآن بھی ایک قوت قانون ہے تلوار بھی ایک قوت ہے یہ دونوں ایک دوسرے کی محافظ ہیں۔ قرآن محافظ ہے تلوار کا کہ بے داغ نہ ہونے پائے، تلوار محافظ ہے قرآن کی کہ وعظ بن کے نہ رہ جائے:

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند

کائناتِ زندگی را محور اند

اور اسی لیے اس نے پھر کہا کہ

مومنوں را تیغ با قرآن بس است <sup>④</sup>

① ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں کیے جاؤ، ایسی کوشش جو آخر الامران پر غالب آ کر رہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 826)۔

② جاوید نامہ 1932ء

③ پرویزؒ نے تصوف کی حقیقت میں ان کی تھوڑی سے تفصیل یوں دی ہے کہ ”انہوں (علامہ محمد اقبالؒ) نے جاوید نامہ میں لکھا ہے کہ پنجاب کے صوبہ دار کی صاحبزادی شرف النساء (مرحومہ) قرآن پاک کی تلاوت کرتیں تو تلوار کو اپنی کمر کے ساتھ پیوست رکھتیں۔ یہ اس کا زندگی بھر کا شعار تھا (ص 255-1992ء)۔

④ مومنوں را تیغ با قرآن بس است تربت مارا ہمیں ساماں بس است

ایک قرآن، ایک کتاب، ایک قرآن کے ساتھ تلوار۔ اب آئیے یہ ”ب“ جو ”حرفِ جار“ میں نے کہا ہے، معنی نہیں ویسے رکھتا: **وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا** (25:52)۔ یہ جہادِ کبیر اس صورت میں بنے گا کہ یہ تلوار ہو، قرآن کے ساتھ ہو، اس کی حدود کے اندر ہو، اس کے قواعد کے ساتھ ہو، اس کی روشنی کے ساتھ ہو۔ جب تلوار اس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اٹھے گی تو **مَنَافِعُ لِلنَّاسِ**



(57:25) نوع انسانی کے لیے حیات بخش ہو جائے گی۔ اگر آپ اس کو الگ کر دیں گے تو یہ پھر چنگیز<sup>1</sup> ہو جائے گی ہلاکو<sup>1</sup> ہو جائے گی:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ تھا قرآن حکیم کا ضابطہ حیات اور اگر یہ ساتھ نہ رہے تو پھر یہ چنگیزی رہ جاتی ہے۔

عزیزانِ من! یہ جتنے میکینک ٹیپ (Magnetic Tapes)<sup>2</sup> لگے ہوئے ہیں ان میں متعین وقت کے لیے ایک ٹیپ چلتی ہے۔ اگر اس متعین وقت سے آگے بڑھ جائے تو پھر وہ ریکارڈ نہیں ہوگی اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ سارے ریکارڈ یہاں پاکستان میں ہی نہیں اس کے بعد امریکہ میں یورپ میں یہ سب جگہ یہ جو درس ہے یہ چلتا ہے۔ اگر درس کا یہ وقت بڑھ جائے اور ٹیپ ختم ہو جائے تو درس ناتمام رہ جاتا ہے۔ اس لیے مجھے ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے درس کا وقت مقرر کرنا پڑتا ہے۔ یہ درس والی بات ہوگئی۔ عزیزانِ من! سورۃ الفرقان کی آیت 52 تک ہم آگئے 53 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



1 ہلاکو خان اور چنگیز خاں کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء ص 310 (فٹ نوٹ 2)۔

2 مراد ہے ریکارڈ کرنے کے آلات

## بارھواں باب: سورة الفرقان (آیات 53 تا 58)



عزیزانِ من! آج مارچ 1978ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 53 سے ہو رہا ہے: (25:53)۔

### کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں

سابقہ آیت فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (25:52) میں لفظ ”کفرین“ آیا تھا اور کہا یہ گیا تھا کہ ان کی اطاعت نہ کرو یہ تمہاری مخالفت کریں گے ان کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد جاری رکھو حتیٰ کہ یہ میدانِ جنگ تک اتر آئیں گے وہاں بھی ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ان کے ساتھ Compromise (مفاہمت یا مصالحت) کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا، اس لیے کہ یہ ایسے دو متضاد نظریاتِ حیات ہیں کہ جن میں باہمی مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ میں کافر یا کافرین کے سلسلے میں یہ عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں کافر کا لفظ کچھ ایسا ہے جیسے گالی ہوتی ہے اور یہ غیر مسلم اسے سمجھتے بھی اسی طرح سے ہی تھے جیسے گالی دی ہو۔ یہ گالی نہیں ہے۔

### کارخانہ قدرت میں اقسامِ تفریق کی ایک حیران کن مثال

انسان دنیا میں پیدا ہوا اور آپ دیکھیے گا کہ پوری نوعِ انسان میں مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں مختلف اقسام تو ایک طرف رہیں، یہاں تو ایک فرد دوسرے فرد سے نہیں ملتا۔ ان میں امتیاز، افتراق، تخصیص اور تمیز پہ آپ نے کبھی غور نہیں کیا کہ اس کے لیے کوئی کتنا بڑا ڈیپارٹمنٹ مشیتِ خداوندی کے اندر ہے اور کتنا Efficient (کارگزار) ہے۔ اس ایک اتنی سی چیز پہ غور کیجیے کہ ایک شخص کے انگوٹھے کی کتنی ہی لکیریں ہیں۔ یہ مقام ایک انچ کے برابر تو ہے مگر یہ دنیا میں کسی دوسرے شخص سے نہیں ملتیں اور یہ جو معصر انسان ہیں، مثلاً آج کی دنیا کے انسان دو ارب سمجھ لیجیے، انہی کی بات نہیں، یہ تو جب سے انسان پیدا ہونا شروع ہوا ہے اس کی آج تک کی بات ہے۔ ذہن میں

لائیے کہ یہ کتنے انسانوں کی بات کر رہا ہے، مثلاً جو اس کا پہلا انسان تھا اور جو آج ہے ان کے بھی دو انگوٹھے ہیں۔ وہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے اور نہ آج کے انسان کے ملتے ہیں یعنی انفرادی تفریق کی کیفیت تو یہ ہے کہ یہ ایک انچ جگہ ہے اور میں کہتا ہوں تصور میں نہیں آتا کہ چند لکڑیوں کے اندر اتنے مختلف ڈیزائن بناتے جانا کہ ایک ڈیزائن دوسرے سے ملے ہی نہیں، معلوم نہیں وہ کتنا بڑا کوئی حساب داں فرشتہ اس کے اوپر لگا رکھا ہوگا اور اس کے بعد Accuracy (عین بعین) کی یہ کیفیت کہ وہ کبھی غلطی نہیں کرتا۔ صاحب! دنیا بھر کے حساب دان بیٹھ جائیں وہ لکڑیوں کو ادھر ادھر ہی کچھ کرنا ہے تو ان سے کوئی ادب کا نہیں، کوئی حساب کا سوال نہیں، چند لکڑیوں میں ہیں ایک انچ کے اتنے سے رقبہ کے اندر اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے انسانوں سے لے کے آج تک کوئی دوا انسان ایسے نہیں جن کی یہ لکڑیوں سے ایک جیسی ہوں اور پھر یہ بھی نہیں کہ ان میں ذرا ذرا سا فرق ہے، کچھ ابھام، کچھ ملتی جلتی سی ہیں۔ نہیں، قطعاً نہیں یعنی انہی چند لکڑیوں سے اس طرح شناخت ہوتی ہے کہ کسی اور طریق سے اس کی متعین طور پر شناخت نہیں ہوتی۔ لکڑیوں سے جو یہ مجرموں کو شناخت کرتے ہیں اس سے بہتر شناخت کا کوئی اور طریقہ ہی نہیں ہے۔ کیفیت تو آپس میں ایک فرد کی دوسرے فرد کے درمیان یہ ہے۔

### قرآن حکیم نے انسانوں کو صرف دو گروہوں میں ہی تقسیم کیا ہے

انسانوں کی اقسام گن لیجیے۔ نسلیں، قبیلے، قومیں، رنگ، زبان، شکل اور شباهت کتنے ہی ہیں جبکہ قرآن کریم نے تمام انسانوں کو دو کیٹگریز (Categories: گروہوں) میں تقسیم کیا ہے، **هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ** (62:2)۔ اللہ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے سو تم یہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہو جبکہ تمام انسان ایک ہی گروہ ہے۔ ان میں سے ایک کو وہ مومنین کہتا ہے، دوسرے کو وہ کافرین کہتا ہے۔ مومن وہ ہیں جو خدا کی بتائی ہوئی صداقتوں کو صحیح مانتے ہیں، کافر وہ ہیں جو انہیں صحیح نہیں مانتے۔ عملی زندگی میں آئیے تو ہمارے ہاں ایک سوسائٹی بنائی جاتی ہے۔ اس سوسائٹی کے کچھ ممبرز بننے ہیں۔ جو ممبر نہیں ہوتے وہ Non-member (غیر ممبر) ہوتے ہیں۔ جس اصطلاح میں آج ہم Non-member (غیر ممبر) کا لفظ استعمال کرتے ہیں قرآن کی رو سے وہی معنی کافر کے ہیں۔ یہ جو ایک جماعت بنی، ایک پارٹی بنی، ایک سوسائٹی بنی، ایک امت بنی، یہ تو ایک جماعت ہوگئی، ایک گروہ ہو گیا۔ انہیں مومنین کہا اور جو اس سوسائٹی کے ممبر نہیں بنے وہ کافر ہو گئے۔ یہ کوئی گالی نہیں ہے، یہ تو ایک واقعہ ہے۔ کسی کو Non-member (غیر ممبر) کہہ دینے سے یہ تو نہیں کہ آپ اسے طمانچہ ماردیتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے، وہ بھی کہتا ہے کہ میں Non-member (غیر ممبر) ہوں تو آپ اگر اس چیز کے متعلق لوگوں سے کہتے کہ بھئی! یہ تو Non-member (غیر ممبر) کے لیے ایک اصطلاح ہے تو کوئی بھی برا نہ مناتا۔ آپ رکنیت کے فارم بھر دیجیے، ممبروں کی صف میں شمار ہو جائیں گے۔ اگر آپ ممبر نہیں ہیں تو آپ Non-members (غیر ممبر) ہیں۔ قرآن کی رو سے

انسانوں کی یہ دوہی کیٹگریز ہیں۔ ضمناً یہ جھگڑا چلا ہوا ہے کہ یہ دو قومی نظریہ کیا ہے اور غیر منقسم ہندوستان میں کیوں یہ اصطلاح وضع کی گئی؟ یہ جھگڑا المباچوڑا ہے مجھے اس سے واسطہ نہیں ہے۔ سوچتے نہیں کہ یہاں تو بنیادی طور پر بات ہی دو قوموں سے شروع ہوئی ہے: **فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَ مِنْكُمْ مُؤْمِنٌ** (62:2) وہ تو شروع سے ہی انسانوں کو مومن اور کافر کی ان دو کیٹگریز میں تقسیم کر رہا ہے اسی کا نام دو قومیں ہے۔

انسانوں کے مابین ٹکراؤ کی وجہ جواز صد اقتوں کی نفی ہے

اب رہی آپس میں ٹکراؤ کی بات تو اس نے کہا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے انسانیت کی جو ساری تاریخ ہے اس کی شاہد ہے کہ ہمیشہ ٹکراؤ انہی نظریات کے اندر ہوا ہے۔ آج بھی آپ ذرا چھوٹی سطح پر آجائے شریف اور بدمعاش انسانوں کی دو کیٹگریز ہیں رنگ نسل زبان وطن کا افتراق کچھ شے نہیں ہے۔ انسان کی خصوصیت کی بنا پر یہ تفریق پیدا ہوئی ہے۔ بعض انسان ہیں ان کی یہ خصوصیات ہیں کہ وہ شریف انسان تھے، بعض لوگ ہیں کہ وہ شریف نہیں ہیں وہ بدمعاش ہیں، غنڈے ہیں۔ ان کی خصوصیت کی بنا کے اوپر آپ ان کو یہ کہتے ہیں اور اس طرح آپ کے ہاں دو کیٹگریز ہو گئیں۔ ایک محلے میں رہنے والے ایک گھر میں بسنے والے ایک قوم کے افراد ان دو کیٹگریز میں بٹ جاتے ہیں۔ تو یہ جو قرآن نے صد اقتیں دی ہیں انہیں نہ ماننے والے کافر ہیں Non-members (غیر ممبران) ہیں۔ مخالفت کرنے والے وہ یہی لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ آویزش رہے گی، کشکش رہے گی، ٹکراؤ رہے گا، تصادم ہوگا، مقابلہ ہوگا۔ یہ ان کے ساتھ جہاد ہے آخر تک ٹکراؤ ہوگا بدر<sup>1</sup> کے میدان میں ہوگا اور احد<sup>2</sup> کے میدان میں ہوگا۔ تو یہ دوہی کیٹگریز ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ سارے انسان بظاہر اکٹھے ایک ہی جگہ رہتے ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ ان دو انسانوں کے اندر دو بنیادی تفاوت کس قدر ہیں کہ یہ دونوں آپس میں مل ہی نہیں سکتے۔

① 17 رمضان 2ھ بمطابق 13 مارچ 624ء

② 14 شوال 3ھ بمطابق 29 مارچ 625ء

اب جیسا کہ اس کا انداز ہے وہ اسے ایک طبعی مثال، ایک محسوس مثال سے سمجھاتا ہے کہ **وَ هُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَ هَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَ حِجْرًا مَّحْجُورًا** (25:53)۔ مثال تو اس نے یہ دی ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ دو سمندر ہیں۔ ایک کھاری ہے ایک میٹھا ہے۔ سمندر سے نیچے اتر کے کوئی اس کا ترجمہ دریا کر دیتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا پردہ ہوتا ہے جو انہیں ملنے نہیں دیتا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بحر کا یہ ترجمہ کرنے میں غلطی کر گئے۔ ایسے دریا تو کوئی نہیں نظر نہیں آتے جو ساتھ ساتھ بہتے ہوں۔ اب تو قریباً سارے کرۂ ارض کی سروے ہو گئی ہے کہ ایسے دو دریا آپس میں چلے جا رہے ہوں جو ایک بہت کھاری ہو اور ایک میٹھا پانی ہو اور دونوں

ساتھ کے ساتھ بہتے چلے جا رہے ہوں اور وہ آپس میں ملے نہیں۔ یہ ایسا نہیں ہے۔

## عربوں کی تمدنی زندگی پر ایک نظر

عربوں کے ہاں یہ جو بحر کا لفظ ہے یہ سمندر کے لیے ہی نہیں بولا جاتا تھا۔ آپ سوچیے کہ یہ بیچارے صحرا میں بسنے والے لوگ تھے۔ ان کے ہاں تو کہیں ”ذرا اگر پانی داچھڑوی کتھے ہوندا ہیگا سی“<sup>①</sup> اور اس کے اوپر چار کھجور کے درخت اگ جاتے تھے تو وہ اسے جنت کہتے تھے۔ یہ مال جسے آپ سب سے بڑا کہتے ہیں جس کے ہاں پانی کا مشکیزہ ہوتا تھا اسے وہ مالدار کہا کرتے تھے۔ پانی کی قدر وہاں معلوم ہوتی ہے۔ یہ تالاب ذرا سا گہرا ہو تو وہ اسے بحر کہتے تھے۔ یہ جو قرآن میں جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (2:25) آتا ہے یعنی باغ یا باغات جن کے نیچے انہار بہہ رہی ہیں۔ ہم تو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ باغ کے نیچے سے نہر کیسے بہہ رہی ہے اور یہاں انہار آیا ہے کہ نہریں بہہ رہی ہیں۔ یہ ہمارے ہاں کا جو نہر کا تصور ہے اس کی رو سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ ”آجنوں اسی آڈاں کینے آں نا“<sup>②</sup> یہ نالیاں جو پانی کی ہوتی ہیں ان کو وہ نہر کہا کرتے تھے۔ سچے تھے بیچارے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ ایسے Concept (تصور) کے اندر انہار کسے کہتے تھے بحر کسے کہتے تھے؟ ہمیں اپنے تصور کے مطابق نہریں بحر اور سمندر نہیں لے آنے چاہئیں۔ جو ذرا گہرائی<sup>③</sup> میں ہو وہ اسے بحر کہتے تھے۔

① اگر کہیں پانی کا تالاب بھی ہوتا تھا۔

② یہ جنہیں ہم نالیاں کہتے ہیں۔

③ کتاب الاشتقاق میں لکھا ہے کہ کشید پانی کو خواہ میٹھا ہو خواہ کڑوا بحر کہتے ہیں۔ دراصل بحر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بہت سا پانی جمع ہو۔ مزید حوالہ جات کے لیے دیکھیے: پرویز (1960)۔ لغات القرآن جلد اول لاہور: ادارہ طلوع اسلام ص 298 تا 299۔

## زمین کے نیچے قدم قدم پر بہتے ہوئے پانی کی کیفیت

اب یہ چیز سمجھ میں آ جاتی ہے کہ پانی کی لہریں (Streams) زیر زمین چل رہی ہیں۔ اوپر والا پانی تو پہاڑوں کے اوپر سے آتا ہے بارش کا آتا ہے انسانوں کے لیے اصل پانی کا جو ذخیرہ ہے وہ تو زمین کی سطح کے نیچے ہے۔ اُسے آپ وہاں دیکھیے۔ یہاں ایک کنواں کھودیں سخت کڑوا پانی نکلتا ہے اب اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ صاحب! یہاں کھودیں میٹھا پانی نکلے گا۔ یہ یہاں کڑوا پانی، نمکین کھاری پانی ہے وہاں یہ میٹھا پانی ہے اور پھر اس کنویں سے ہمیشہ کڑوا ہی پانی ساتھ والے کنویں سے ہمیشہ میٹھا پانی، کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ نیچے وہ دونوں مل جائیں تو چلیے وہ کھاری میٹھا نہ رہے کچھ کڑوا تو تھوڑا بہت ہو جائے ”تلخ“ تے تھوڑا جیا ہو جاوے او“<sup>①</sup> یہ کبھی نہیں ہوتا۔ یہ

اس کی بڑی رحمت ہے، زمین کے نیچے سے یہ جو پانی کی Streams ہیں، لہریں ہیں، پانی کی ندیاں ہیں وہ رواں دواں جاتی ہیں اور اس افراط میں جاتی ہیں کہ اتنے اتنے ٹیوب ویل نصب ہوئے ہوتے ہیں، دن رات چلتے چلتے جاتے ہیں، وہ نیچے سے پانی ختم ہی نہیں ہوتا اور پھر اگلی بات وہی ہے کہ چند ہی قدم کے فاصلے کے اوپر دوسرا کنواں بور کیجیے تو اس سے کھاری پانی نکل رہا ہے اور نکلتا چلا جا رہا ہے، نیچے کی یہ Streams ساتھ ساتھ بہہ رہی ہوتی ہیں، کبھی نہیں ملتیں۔ اسے قرآن نے وَ حَجْرًا مَّحْجُورًا (25:53) کہا ہے۔

اب بات یہاں چلی آئی کہ نیچے وہ پتھر کی چٹانیں یا پتھر کی دیواریں ہیں یا آپس میں اوٹ آڑ اور روک اس قسم کی ہوتی ہے جہی وہ نہیں ملتے۔ اگر وہ کہیں مٹی کی یاریت کی ہوں، تو وہ تو فوراً مل جائیں۔ یہاں کہا ہے کہ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَ حَجْرًا مَّحْجُورًا (25:53) ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے اور جو پردہ ہے وہ پتھر یا ہوتا ہے۔

چودہ سو سال پہلے کی زمین کے نیچے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ اس عرب کی ہو رہی ہیں جو زمین کے اوپر کی باتیں بھی ابھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ بات یہ سمجھائی کہ یہ سارے انسان اکٹھے بستے ہیں، ساتھ ساتھ رہتے ہیں، ساری عمر اکٹھے ہی چلتے ہیں، پھر ان دونوں کے درمیان اتنا بے تفاوت ہے کہ ایک شرافت کا مجسمہ ہے، ایک سر سے پاؤں تک آپ کو غنڈہ نظر آ رہا ہے، ایک ان صداقتوں کو ماننے والا ہے، دوسرا اس سے انکار ہی نہیں بلکہ ساری عمر اس کی مخالفت کرتا ہے، دونوں انسان ہی کے گروہ ہیں، اکٹھے بستے ہیں، اکٹھے رہتے ہیں۔ کہا کہ تعجب کی کون سی بات ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ یہ دو قسم کے پانی ساری عمر ساتھ ساتھ بہتے رہتے ہیں، تو ساتھ ساتھ رہنے میں انسانوں کی یہ بات نہیں ہو جاتی کہ چونکہ ان کو انسان کہا جاتا ہے، اس لیے ہم سمجھیں کہ وہ دونوں ایک ہی خصوصیات کے مالک ہو گئے۔ ان کی الگ الگ خصوصیات ہوتی ہیں، اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ صاحب! یہیں کے رہنے والے ہمیں میں سے یہ قریش، ہمیں میں سے

❶ وہ قدرے تلخ تو ہو جائے۔

عرب یہ لوگ اس زمانے کے کہہ لیجیے، باقی انسان بھی ایک ہی جیسے انسان اور اس کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی ساری عمر مخالفت ہی کرتے گزر گئی، میدان جنگ تک اتر آئے، تو کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔

زندگی کے تسلسل کو ماننے والوں اور اس سے انکار کرنے والوں کے مابین ایک پردہ حائل ہے

یہ جو کہا ہے کہ ان کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے، اب یہاں اس محسوس مثال کے بعد وہ انسانوں کے اوپر یہ مثال لے کر آتا ہے تو دیکھیے۔ کہا کہ وَ اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ ❶ (17:45)۔ اب یہاں لفظ قرأت آیا ہے۔ قرأت کے معنی عام طور پر پڑھنا ہی کیے جاتے ہیں۔ تو قرأت میں یہ ہمارے ہاں کے جو قاری ہوتے ہیں، ان کے نزدیک وہ قرآن کو پڑھنا ہی ہوتا ہے، خواہ اس فن کے حساب سے

پڑھے یا گا گا کر پڑھے، ورنہ عربی زبان میں اس کے معنی Proclamation (اعلامیہ) ہوتا ہے یہ کسی بات کا اعلان کرنا ہے یہ قرآن کا پیغام ہے۔ کہا جب تو اس پیغام کو عام کرتا ہے، تو قرآن پیش کرتا ہے۔ آپ اس کے کچھ بھی معنی لے لیجیے۔ اس کے بعد ساتھ ہی کہا کہ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ (17:45) تم اور وہ لوگ جو زندگی کے تسلسل کو حیات بعد الموت کو نہیں مانتے ہیں ان دونوں کے درمیان حجاباً مَسْتُورًا (17:45) ایک پردہ لٹک جاتا ہے جو عام نگاہوں سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ یہ قرآن پیش کرنے والوں اور اس سے انکار کرنے والوں کی مخالفت کرنے والوں ان دونوں کے درمیان ایک پردہ لٹکتا ہے اور قرآن کا اعجاز ہے کہ یہ پردہ حجاب ہے: حجاباً مَسْتُورًا (17:45)۔ حجاب تو خود دوسرے کو پردے میں لے آتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ حجاباً مَسْتُورًا (17:45) ہے۔ وہ پردہ جو خود مستور ہے چھپا ہوا ہے۔ پردے نے تو کسی اور کو چھپانا ہے وہ تو چھپاتا ہے مگر تمہاری نگاہوں سے خود پردہ چھپا ہوا ہے تو اب انسانوں کے درمیان دو دلوں کے درمیان دو ذہنوں کے درمیان جو پردہ لٹکتا ہے وہ پردہ تو ہوتا ہے لیکن وہ حجاب مستور ہوتا ہے ایک چھپا ہوا پردہ۔ یہ ہے ذہنیتوں کا فرق جسے آپ نہ ماننے کی ایک پہلے سے ہی طے شدہ بات کہتے ہیں: حجاباً مَسْتُورًا (17:45)۔ اس میں یہی حجاب مستور ہے Under ground Current آپ کے ہاں چلتی ہے ہمیں وہ نظر ہی نہیں آتی لیکن جس طرح آپس میں کبھی وہ دو پانی نہیں ملتے، وہ کہتا ہے کہ اس طرح سے ذرا انسان کو دیکھو، تم ان کے سامنے قرآن پیش کرتے ہو۔ وہ تمہارے جیسے بظاہر شکل و شبہت کے اعتبار سے انسان ہی نظر آتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے اور وہ پردہ خود نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

① جب تو ان کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے۔

### چودہ سو سال پیشتر قرآن حکیم کے پیش کردہ حقائق

یہ ٹھیک ہے کہ طبعی طور پر یہ سارے جتنے بھی انسان ہیں وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا ① (25:54)۔ تمام انسانوں کی تخلیق جیسے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں کہا ہے کہ ہر زندہ چیز کی ابتدا ہم نے پانی سے کی ہے۔ پانی حقیقت میں زندگی کی بنیاد ہے۔ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ جہاں بھی یہ سائنسدان جاتے ہیں کہیں وہ چاند پہ جائیں، مرتخ پہ جائیں، جہاں بھی وہ جا رہے ہیں وہاں سب سے پہلے وہ مٹی لیتے ہیں اور مٹی میں دیکھتے ہیں کہ نم ہے یا نہیں۔ اگر اس میں نم ہو تو سمجھتے ہیں کہ یہاں لائف کا زندگی کا امکان ہے اور اگر مٹی میں نم نہ لگے تو وہ کہتے ہیں کہ یہاں آبادی یعنی زندگی Life in any form (کسی بھی شکل میں زندگی) نہیں ہو سکتی۔ چودہ سو سال پیشتر قرآن نے عرب جیسے مقام میں جہاں جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ان کا جو مرکزی شہر بین الاقوامی شہرت کا شہر مکہ تھا، اس سارے شہر

میں سترہ آدمی تھے جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ تعلیم تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے، اس دور میں اس ملک میں ایک ان پڑھ (Unlettered) شخص، جسے امی کہا گیا ہے، وہ یہ بات بتا رہا ہے کہ زندگی کی بنیاد پانی ہے، خود انسان کی ابتدا ایک ایسے جرثومے سے ہوئی ہے جو پانی اور مٹی کے ملنے سے نمود میں آیا تھا۔ قرآن یہ کچھ چودہ سو سال پہلے بتا رہا ہے، پھر یہ Evolution (ارتقا) کی Stages (مراحل) طے کرتا ہوا پیکرِ بشریت تک آیا۔ آج بیسویں صدی میں جا کے کہیں یہ معرکہ آراء سائنس کا انکشاف بتایا جاتا ہے، وہ ایک امی چودہ سو سال پیشتر عرب کے علاقے کے اندر بیٹھا ہوا یہ بات کہہ رہا ہے۔ کیا اس زمانے میں کسی انسان سے یہ ممکن تھا؟ کیا اس کی فکر میں یہ بات آسکتی ہے کہ وہ یہ کہے کہ **هُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا** (25:54) خدا نے اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق انسان کی پیدائش قطرہ آب سے کی ہے۔

### انسانوں کا اصل سوال طبعی طور پر یا قبائلی طور پر تقسیم ہونے کا نہیں

جہاں تک انسانوں کی طبعی زندگی کا تعلق ہے تو یہ ٹھیک ہے کہ ان میں ایک قدر مشترک ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان سب کی نمود اسی سے ہوئی ہے، اسی طرح سے یہ سارے بشر بن گئے ہیں، پھر یہ تمہارے ہاں جو قبیلوں کے اندر تم نے ایک دوسرے کو بانٹ لیا ہے، نسلوں میں بانٹ لیا ہے، اس نے کہا کہ یہ تمہاری تمدنی زندگی ہے جس کی بنیاد تم نے آپس میں ایک دوسرے کو مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ یہ بھی کوئی صحیح تقسیم نہیں ہے۔ وہ بات یہ لا رہا ہے کہ تقسیم تو وہی کفر اور ایمان کی ہے۔ یہ تمہاری تمدنی زندگی کے تقاضے تھے، جن کی وجہ سے تم نے اپنے آپ کو پہلے قبائل میں بانٹ لیا، خاندانوں میں بانٹ لیا، وہ یہ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ خاندان بڑھتا

❶ خدا نے اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق انسان کی پیدائش قطرہ آب سے کی ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-827)۔

کس طرح سے ہے۔ لڑکے کا اپنا خاندان تو ہوتا ہے جو آباؤ اجداد تک اوپر جاتا ہے ”داد کے جنوں کیندے نیں“<sup>❶</sup> جن کو ددھیال کہتے ہیں وہ یہی ہوتا ہے۔ جب شادی ہوتی ہے، ایک دوسرا خاندان ہوتا ہے۔ اس خاندان کا اس خاندان کے ساتھ ارتباط ہوتا ہے۔ اب یہ دو خاندان ملتے ہیں۔ یہ خاندان ملنے کے بعد ذرا پھیلنے میں تو ان کے ہاں یہ قبیلہ بنتا تھا۔ معلوم نہیں یہ پنجابی زبان والے کمبخت، ان عربوں سے بھی پیچھے (Backward) تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگلے ہمارے بچے تو پنجابی بھی نہیں جانتے۔ ہمارے ہاں پنجابی میں ”بیوی نوں کیندے ای قبیلہ سن: آ میرا قبیلہ اے۔“<sup>❷</sup> آپ یہ سن کے حیران ہو گئے ”بیوی نوں قبیلہ کیندے سن“<sup>❸</sup> قبیلہ بنتا ہی بیوی کے ساتھ ہے۔ خاندان ملتا تھا تو یہ اس سے بنتا تھا۔ پھر آگے پھیلتا تھا ورنہ یہ ایک ددھیال والے ہی جو تھے وہ تو اتنے سمٹے ہوئے ہوتے تھے مثلاً چار بیٹے ہوں اور ان چار کی مختلف جگہ شادیاں کی جائیں۔ ”چار قبیلے اوناں دے اون۔“<sup>❹</sup> تو آپ دیکھتے ہیں کہ قبیلہ کتنا بڑا بنتا تھا۔ وہ کہتا



ہے کہ یہ تمہاری تمدنی زندگی ہے۔ انسانوں کی طبعی زندگی کی بھی بنیاد ایک تھی لیکن اب تم نے آپس میں یوں قبیلے بنا بنا کے اور الگ الگ ہوئے۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں۔

بات تو عزیزانِ من! قرآن کریم یوں کر رہا ہے کہ تم نے اپنی تقسیم اس طرح سے کی۔ بات ہی بات میں کتنی بڑی بات کہہ جاتا ہے۔ فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا (25:54)۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے عزیزانِ من! کہا کہ پھر ہم نے تمہارے دور شتے بنائے: نسب کا بھی اور صھر کا بھی۔ نسب آباؤ اجداد کا رشتہ ہوتا ہے اور صھر <sup>5</sup> سسرال کا رشتہ ہوتا ہے۔ قرآن نے دونوں رشتوں کو یکساں اہمیت دی ہے۔ یہ جو صھر ہے میں پھر کہتا ہوں کہ ان پنجابیوں نے کچھ عربوں سے یہ ایسا لیا ”پنجابی اچ صھر اکیندے نے“ <sup>6</sup> وہ یہی ہے جو صھر کا لفظ ہے۔ یہ سسرالی جو بات تھی یہ تو ایرانیوں کے ہاں سے آئی۔ اصل میں وہ صھر جو ہے وہ ”صھر ای ہے“ چہرہ پنجابی اچ ہوندا اے“ <sup>7</sup>

① جسے ددھیال کہتے ہیں۔

② بیوی کو کہتے ہی قبیلہ تھے: یہ میرا قبیلہ ہے۔

③ بیوی کو قبیلہ کہتے تھے۔

④ چار قبیلے ان کے آئیں۔

⑤ تاج العروس، محیط المحيط اور المفردات فی غریب القرآن کے مطابق ”الصَّهْرُ“ قرابت کے معنی میں ہے۔ ان لغات میں اس کے متعین مفہوم کے لیے بہت سے اقوال آئے ہیں لیکن اکثریت کا خیال اس طرف گیا ہے کہ بیوی کے خاندان والے اَصْهَارُ کہلاتے ہیں اور شوہر کے خاندان والے اَخْتَانُ۔ اس لیے صَہْرُ سے مراد وہ رشتہ داری ہے جو شادی کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔ اس لفظ کے مزید اور دیگر مفہام کے لیے دیکھیے: پرویز (1961)۔ لغات القرآن (جلد سوم) لاہور: ادارہ طوع اسلام، ص 1051۔

⑥ (اس رشتے کو) پنجابی میں صھر کہتے ہیں۔

⑦ وہ صھر ای ہے جو پنجابی میں آتا ہے۔

قرآن بات تو یوں ہی طبعی تقسیم کی کر رہا ہے لیکن وہ تو جاتے جاتے ہی بات اتنی بلند کہہ جاتا ہے۔ اس نے دونوں رشتوں کو برابر کا واجب تعظیم بتایا ہے۔ اس میں دونوں رشتوں کا یکساں تعلق ان کے ساتھ بتایا عزیزانِ من! قرآن کی اتنی سی بات کی سمجھ آ جائے تو ہمارے گھریلو تنازعوں میں تو آپ دیکھیے نوے فیصد تنازع ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اگر اس لڑکے کے ذہن میں اپنے ہاں کے رشتے اور بیوی کے رشتے یکساں واجب التکریم ہو جائیں۔

ہر دو طرف سے سسرال کا باہمی احترام جنتی زندگی کی نوید ہے

یاد رکھیے بات میں سے بات نکلتی ہے۔ گھر کی زندگی کو اگر آپ جنت بنانا چاہتے ہیں تو ایک پہلا اصول یہ یاد رکھیے! بیوی کے جوماں

باپ اور اس کے رشتے دار ہیں ان کی کبھی مذمت نہ کیجیے، برائی نہ کیجیے، تحقیر نہ کیجیے ان کے خلاف نفرت نہ لے آئیے۔ یاد رکھیے جتنی محبت آپ کے دل میں اپنے ماں باپ کی ہے اتنی ہی محبت اس کے دل میں اپنے ماں باپ کی بھی ہے۔ جب آپ اپنے ماں باپ کے خلاف کوئی برائی کا لفظ برداشت نہیں کر سکتے، وہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ فرق اتنا ہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مجبور و محکوم و محتاج سمجھتی ہے وہ خاموش رہتی ہے، تم بالا دست ہوتے ہو اس لیے برملا کہتے ہو: ”تو میری ماں نوں ایہہ کیا سی اج“ یعنی توں اوہدی ماں نوں، اوہدے پئے نوں، اوہدے دادیاں تکر نوں کیا ہاسی۔ کہندار ہند اے روز۔ تے اے تے کوئی گل نہ ہوئی، تیرا تے حق اے ناکہ مینوں وی گالاں دے لیں، تے میرے وڈیاں نوں وی دے لیں۔“<sup>①</sup> لیکن اس نے اگر تمہارے باپ کی جوتی کو جتڑی کہہ دیا ہے تو پھر یہ بخشی نہیں جاسکتی ”بڑی بے عزتی خراب کردتی نا ایہدے پئے دی ایئے۔“<sup>②</sup> بنیاد یاد رکھیے عزیزانِ من! ان کی بھی ایسی تعظیم کیجیے جیسے آپ اپنے ماں باپ کی تعظیم کر رہے ہیں۔ اگر اس کے دل میں اپنی عزت بنانا چاہتے ہیں تو اس کی عزت کیجیے ان کی بھی عزت کیجیے۔ ان کی محبت اس کے دل کے اندر ہے۔ کیا اتنے سے ہی کل چار کلمے پڑھے، وہ وہاں تمہارے ساتھ آگئی تو وہ سارے اس کے اپنے ماں باپ بہن بھائی عزیز رشتے دار سارے آج جتنے بھی تھے وہ غیر اور دشمن ہو گئے، جس کا جی چاہے ان کو گالیاں دیتا پھرے اور یہ کچھ سن کر بھی وہ دل میں برا بھی نہ منائے؟ تم ان سے کتنی بڑی Exploitation (لوٹ کھسوٹ) کرتے ہو، کتنا ظلم کر رہے ہو تم اس کے اوپر! اور پھر کہتے ہو کہ گھر کے اندر ہمارے تعلق جنتی زندگی کے رہنے چاہئیں۔ کبھی دنیا میں ایسے شخص کی زندگی آپ سوچیے۔ آپ سوچیے کہ کسی ایک شخص نے کبھی آپ کے باپ کو

① تم نے میری ماں کو یہ کہہ دیا تھا یعنی تم نے اس کی ماں اس کے باپ اور آباؤ اجداد تک کو یہ کچھ کہہ دیا تھا۔ یہ کچھ روزانہ رہتا ہے۔ پھر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تمہارا تو یہ حق ہے کہ مجھے بھی گالیاں دے لے اور میرے بڑوں کو بھی۔

② اس نے تو اس کے باپ کی ”بے عزتی“ خراب کر دی۔

گالی دی ہو آپ اسے ساری عمر نہیں بھولتے، مرتے وقت اپنی اولاد کو کہتے ہیں کہ ”ایہدے کولوں بدلا ضرور لینا ہیگا اے پتر“ ایسے تیرے دادے نوں گالیاں کڈیاں سن۔“<sup>①</sup> اور تم اس بیچاری کے ماں باپ کو روز گالیاں دیتے ہو اور اس کے بعد توقع یہ کرتے ہو کہ یہ تمہیں بھی پوچھے تو تمہارے ماں باپ کو بھی پوچھے۔ عزیزانِ من! بات میں سے بات نکلتی ہے۔ قرآن نسباً و صہراً کو ایک سطح کے اوپر رکھ کے تمہیں دے رہا ہے: فجعلہ۔ میں کہہ رہا تھا کہ بات تو اس نے اتنی ہی کہنی تھی کہ ایک خاندان پھیل کے پھر قبیلہ کیسے بنتا ہے۔ تم ایسے کیسے بتاتے ہو۔

ہمارے ہاں بیوی کا بھائی شادی سے پہلے بھائی جان اور بعد میں سالہ

قرآن حکیم جاتے جاتے ہی ایک بات کہہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے ہر دو کو ایک سطح کے اوپر رکھا ہے: اپنے آباؤ اجداد کے

والدین کے رشتوں کو اور بیوی کے ماں باپ کے رشتوں کو۔ اس نے نسب اور صھر دونوں یکساں رکھے ہیں لیکن اس معاشرے کا کیا علاج!! پتہ نہیں یہ کم بختیاں ہمارے حصہ میں کہاں سے آئیں۔ معاف رکھیے گا اگر میں اس سطح پہ اتر آؤں۔ اس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بیوی کے بھائی کو سالا کہتے ہیں۔ سالا تو ہمارے ہاں گالی ہے۔ اندازہ لگائیے آپ روز یہ لفظ سنتے ہیں: اوسالے، یعنی معاشرے میں ہمارے ہاں پھر یہ چیز ایسی عام ہو جاتی ہے، کبھی ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں؟ یہ تو خیر آپ سمجھیں گے نہیں، جو ہم نے بچپن ہی سے سنی ہیں: ”اوئے آصھری دا ہووے۔“<sup>2</sup> آپ کو معلوم ہے کہ وہ یہ کیا کہہ گیا ہے یعنی ساس کا بیٹا ہو۔ یہ صھری سس ہوندی اے: صھرا سسر تے صھری ساس۔<sup>3</sup> صھری دا ہووے۔ یعنی میرا سالا لگے۔<sup>4</sup> یہ گالی ہے سالا اور پتہ نہیں کہ یہ کمبخت سارے علاقوں میں یہی کچھ ہے۔ ادھر ہم نے سارے یوپی میں بھی یہی سنا، ویسے تو وہ سسر و سسر کہتے ہیں، وہ بھی وہی کچھ کہتے ہیں یعنی اندازہ لگائیے اس معاشرے کا جس میں جس کو آج یہ بیاہ کے لائے ہیں اسی دن اس رشتے سے پہلے تو وہ جو بھائی صاحب تھے، بھائی جان تھے، ابھی رشتہ ہونا تھا، ”جتیاں گھس جاندیاں ایہدیاں جدوں اے رشتہ لین جاندے“<sup>5</sup> یعنی اس وقت تک وہ بھائی جان تھے، خاطر تواضع ہوتی تھی، کہتے تھے کہ ہم نے ان کی بڑے شریف خاندان میں شادی کی ہے، جونہی اس نے چار کلمے پڑھائے اور وہ بیوی ہو کر گھر میں آئی تو ساتھ ہی اس کا وہی بھائی سالا ہو گیا: اوسالے، عزیزانِ من! ہم تو یہاں پہنچے ہوئے ہیں، کبھی سوچا نہیں

① بیٹا! اس سے بدلہ ضرور لینا۔ اس نے تیرے دادا کو گالیاں بکی تھیں۔

② اب کم بخت! یہ تو صھری کی طرف کا ہے۔

③ یہ صھری ساس ہوتی ہے۔ صھرا سسر اور صھری ساس۔

④ صھری کا بیٹا ہو یعنی میرا سالا لگے۔

⑤ ان کا رشتہ لینے کے لیے چل چل کر ان کے جوتے گھس جاتے۔

ہے۔ پھر گھروں کی زندگی کو کہتے ہیں جنت کیوں نہیں بنتی۔

میں کہتا ہوں، عزیزانِ من! یہ چھوٹے چھوٹے سے نکتے ہیں، میں تو ان نکتوں کے اوپر آنے کے بعد، قرآن پہ نئے سرے سے ایمان لایا ہوں۔ بات وہ کر گیا ہے: نَسَبًا وَ صِهْرًا (25:54) کی۔ یہ کہہ کے آپ کے ہاں کی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی جو ایک بنیادی چیز تھی، اس نے دو لفظوں میں وہ سارا راز کہہ دیا کہ جو نسب و صھر ہیں یہ برابر کے رشتے ہیں، یاد رکھو اور پھر کہا کہ وَ كَانَتْ رُبُكًا قَدِيرًا (25:54) یہ خدا کے مقرر کیے ہوئے پیمانے ہیں، اندازے ہیں، رشتے ہیں، ان کی بنا پر دو خاندان ایک خاندان بنتے ہیں مگر تم نے ان کو قبیلے بنا دیا ہے تو ان کی اس حیثیت میں انسانیت تقسیم ہو جاتی ہے۔ تقسیم کا معیار وہی شریف اور بد معاش کا ہے۔ وہی معیار بلند

سطح کے اوپر ہے جس میں آپ جب مومن اور کافر یعنی Members اور Non-members میں صداقتوں کو ماننے والے اور ان کو جھٹلانے والے بنتے ہیں۔ اس طرح دو ہی کیٹگریز دنیا میں باقی رہتی ہیں، عزیزانِ من! یہاں کہا کہ کیٹگریز دو ہی ہیں باقی یہ ساری تمدنی زندگی کی تمہاری ضرورتیں ہیں جن کے مطابق تم آپس میں ایک ہو جاتے ہو اور اس کے بعد وہ دوسری کیٹگری ہے کہ وَ يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ (25:55) اس کیٹگری میں ان کی کیفیت یہ ہے کہ جنہیں ہم نے کافر کہہ کر پکارا ہے جو صداقتوں کو نہیں تسلیم کرتے ”وہ خدا کے عالمگیر ضابطہ حیات کو چھوڑ کر اپنے اپنے قبیلے کے بتوں کی پرستش، اور اکابر کی اطاعت کرتے ہیں جو ان کے لیے کسی نفع یا نقصان کا اقتدار نہیں رکھتے۔“

### انسان کو انسان پرستی سے نجات قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم ہے

میں یہاں ایک بات عرض کر دوں، آپ اسے ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ قرآن نے آ کر کیا بنیادی تعلیم دی، نبی اکرم ﷺ نے دنیا میں کیا چیز پیش کی جو انقلاب آفریں تھی؟ وہ ایک ہی چیز ہے جس میں انسانوں کو انسان پرستی سے چھڑا دیا۔ یہ ہے باطل کی لم یعنی ایک انسان کا دوسرے انسان پر حکم چلانا۔ یہ وہی ہے جسے ہم پرستش کہتے ہیں مگر وہ پرستش ہی کی بات نہیں یہ بعد و ن کی بات ہے، یہ محکومیت اختیار کرنا ہے۔ یہ انسان کی دوسرے انسان سے محکومیت اختیار نہیں کرنا ہے، یہ تو اس کا عبد ہو جانا ہے، اس کے لیے چونکہ ہمارے ہاں لفظ پرستش آ گیا اسی لیے اسے شخصیت پرستی کہتے ہیں۔ جو قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

### ختم نبوت کی حقیقت نے انسان کو مکمل طور پر آزادی کے تصور سے روشناس کر دیا ہے

حضور ﷺ سے پہلے انبیائے کرام ؑ آتے تھے۔ وہ بہر حال انسان ہوتے تھے ان کی صداقت پر ایمان بھی لانا پڑتا تھا، اس کے اندر ایک انسان کو اس مقام کے اوپر سمجھنے کا کچھ شائبہ تھا۔ ختم نبوت نے اس چیز کو بھی ختم کر دیا۔ عزیزانِ من! اس کے بعد اب نبی بھی نہیں آئے گا، انسان کے سامنے اس نے انسان کی حیثیت ختم کر دی، اسی لیے اس نے کہا تھا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ<sup>1</sup> (3:143)۔ اندازہ لگائیے محمد ﷺ یعنی حضور ﷺ کا مقام ہمارے دلوں کے اندر کتنا زیادہ ہے! کہا کہ وہ خدا کا ایک پیغامبر تھا، آیا اپنا مشن پورا کر کے چلا گیا۔ اس سے پہلے بھی بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلتے گئے۔ لہذا اگر آفائین مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ (3:144) کل کو وہ مرجائے، قتل ہو جائے تم میں نہ رہے تو بس تم یہ کہو گے کہ وہ بات اس کے ساتھ تھی وہ چلا گیا، معاملہ ختم ہو گیا۔ کہنے لگے کہ یہ بات قطعاً غلط ہے، یہ حق تو محمد ﷺ کو بھی حاصل نہیں تھا۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُونِ اللَّهِ (3:79) کسی

انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ خدا اسے ضابطہ قوانین دے، حق حکومت دے، نبوت بھی کیوں نہ دے کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ، خدا کے نہیں، سو اس طرح انسان کو شخصیت پرستی سے چھڑا دیا، انسانوں کو انسان پرستی سے چھڑا دیا، انسان کے سامنے جھکنے سے چھڑا دیا، اس لحاظ سے انسان یا جو شخصیتیں ہیں، وہ ختم ہو گئیں، یعنی وہ شخصیت پرستی نہ رہی۔

### آج ہمارا انگ انگ شخصیت پرستی میں جکڑا ہوا ہے

آج آپ کو پتہ ہے کہ ہم کس مقام پہ ہیں؟ وہ تو ایک نبی یا نبوت ختم قرآن کی تھی۔ ہم نے اس کے بعد قدم قدم پر ایسی شخصیتیں کھڑی کر رکھی ہیں کہ تصور میں بھی ان کی خدائی ہمارے ذہنوں پر مسلط ہے، مثلاً جب آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں امام نے یہ فرمایا ہے تو آپ کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب نہ آپ سوچ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں، نہ اپنی کوئی رائے پیش کر سکتے ہیں، نہ اس کو پرکھ سکتے ہیں، نہ تنقید کر سکتے ہیں، نہ تبصرہ کر سکتے ہیں۔ جو مقام نبوت تھا ہم نے انہیں وہ مقام دیا ہوا ہے: یہ تو فلاں مفسر کی کتاب ہے، فلاں امام نے یہ بات کہی ہے، فلاں محدث نے یہ بات کہہ دی تھی، حضرت صاحب نے فرمایا ہے، مولوی صاحب یہ کہہ رہے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک قدم قدم کے اوپر آپ نے یہ بت کھڑے کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح آج ہمارا انگ انگ شخصیت پرستی میں جکڑا ہوا ہے۔

### تیرا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں؟

یاد رکھیے کہ جب تک آپ انسان اور بندے کے درمیان یہ انسانی بت نہیں توڑیں گے خدا تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہمارے سامنے بت وہی ہیں جو ہندو ورگاماتا کا یا اندر دیوتا کا بت پوجا کرتے ہیں۔ وہ بت تو شے ہی کچھ نہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے؟ وہ تو

① محمد م جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے اسی طرح بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 156)۔

یوں ہٹائے جاسکتے ہیں مگر یہ بت جو انسانوں کے بت ہیں، وہ تو آپ کے قلب و دماغ کے اوپر مسلط ہوئے ہیں۔ آپ کا ایک بات یا ایک لفظ بھی ان کے خلاف زبان سے نکالنا تو ایک طرف رہا، دل کی گہرائیوں میں بھی اگر ان کے خلاف یہ بات گزر جائے تو آپ کانپتے ہیں، ڈرتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا یا حضرت! مجھے معاف کر دیجیے گا، بندہ بشر تھا، بھول گیا تھا۔ آپ کفارے ادا کرتے ہیں، منتیں مانگتے ہیں، جا جا کر سجدے کرتے ہیں۔ انسان انسان کے سامنے، جسے ختم کرنے کے لیے قرآن آیا تھا، جس کے لیے اس نے آپ کے ہاں کی جو سب سے بڑی عظیم پیغمبری کی، نبوت کا Institution تھی، وہ ختم کر دی۔ اب نبی بھی نہیں آئے گا، قطعاً نہیں۔ قرآن نے کتنی بڑی آزادی عطا کی ہے۔ اس نے آکر شخصیت پرستی کے ہر طلسم کو توڑ دیا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ نبی تو پھر بھی ایک آیا کرتا تھا۔ ہم نے

تو قدم قدم پر یہ پھیلا رکھے ہیں، یوں ہزار برس سے پیچھے کی طرف آپ دیکھیے تو یہاں سے وہاں تک آپ کے ہاں یہ انسان ہی انسان کھڑے ہیں۔ آپ اپنے دور کے اندر دیکھیے تو قدم قدم کے اوپر انسان ہیں، کوئی شخص آپ کے سامنے نہ خدا کی کتاب کی سند پیش کرتا ہے، اور نہ عقل و فکر کی ہی کوئی سند پیش کرتا ہے۔ یعنی عقل و فکر سے ہی کوئی بات کہو تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ نہیں ”آپ“ نے یہ فرما دیا ہے، وہ سارے اسے مان رہے ہیں۔ کس حد تک مان رہے ہیں اس کے لیے وہ بات یاد آگئی ہے جس کا ذکر پچھلے ہی طلوع اسلام میں آیا تھا۔ اسے پھر ذرا آپ کے سامنے دہرا دوں، معلوم ہو جائے کہ ہمارے ذہنوں کے اوپر یہ جو خدا ہیں، یہ کتنے سوار ہو چکے ہیں۔

### مردہ لڑکی کا درخت کے ساتھ نکاح

آپ کو معلوم ہے کہ اس میں لکھا ہے کہ یہیں سیالکوٹ کے ضلع میں وہ گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں ایک شخص کی لڑکی فوت ہوگئی۔ لڑکی جوان تھی، شادی ہوئی نہیں تھی۔ جنازہ قبرستان تک لے آئے۔ مولوی صاحب نے فرما دیا کہ صاحب! اسلام میں غیر شادی شدہ جوان عورت کا جنازہ جائز نہیں ہے۔ میں یہ جنازہ نہیں پڑھاؤں گا۔ اب کیا کیا جائے؟ جنازے کے بغیر دفن نہیں کی جاسکتی۔ اب جس کا اس نے نکاح کرنا تھا وہ مرگئی۔ وہ تو میت ہے۔ کسی نے ان سے نہیں پوچھا کہ میاں صاحب! یہ تو آپ دوسروں کے فرمانے کی بات کر رہے ہیں، کہیے آپ کیا کہتے ہیں؟ اب اس مسئلے کا تو حل کوئی نہیں، وہ فوت ہو چکی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ جائز نہیں ہے۔ وہ بتاتے ہیں، نہ کوئی پوچھتا ہے کہ صاحب! اسلام میں کیوں جائز نہیں ہے؟ مگر وہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ کوئی حضرت صاحب کہیں تشریف رکھتے ہیں جن سے آپ پوچھ کے آگئے ہیں۔ یہ کون صاحب ہیں جنہوں نے یہ فرمایا ہے؟ اس کے لیے کوئی سند نہیں، کوئی حوالہ نہیں۔ بس یہ ہے کہ اسلام نے یہ فرما دیا۔ اب انہوں نے یہ کہا ہے اور سب کے سر جھکے ہوئے ہیں۔ اب قبرستان میں جنازہ سامنے لیے ہوئے کھڑے ہیں کہ اب کریں کیا؟ وہ تو کہتے ہیں جنازہ ہی نہیں ہوتا۔ جی! آپ فرمائیے کہ پھر اسلام نے اس کا کوئی حل بھی بتایا ہے؟ کہنے لگے: ہاں حل بتایا ہے، میں ابھی انتظام کر دیتا ہوں، قبرستان میں ایک شیشم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب نے شیشم کے درخت کے ساتھ اس میت کا نکاح پڑھایا۔ شیشم تے اردوچ کیندے نیں، ساڈے تے ٹاہلی کیندے نیں۔ تے ٹاہلی مؤنٹ ہونڈی اے۔ او توں شہتوت دے درخت نال پڑھا۔<sup>①</sup> ان سے کہو کہ صاحب! اب بھی نکاح نہیں ہوا: او کسے ٹاہلے نال پڑھاندے۔<sup>②</sup> عزیزانِ من! آپ کو دنیا کیا کہے گی؟ اپنی طرف سے وہ کہے تو ہم ہیں کہ صاحب! یہ جہالت ہے، بیوقوفی ہے، کہہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اب وہ نکاح تو پڑھا دیا، مگر نکاح تو ایسے نہیں ہو جاتا، وہ تو اس کی گرہ پختہ ہونی چاہیے۔ پختہ گرہ کے لیے اس نے کہا کہ

صاحب! چاولوں کی دیگ پکاؤ۔ لو آجے ساری لم ایہدی۔<sup>3</sup> اس میں یہ ہے کہ وہاں پھر وہ چاول پکائے گئے، تقسیم کیے گئے، پھر نکاح پڑھا گیا، پھر اس کے بعد جنازہ پڑھا، پھر دفن کیا گیا۔ مجھے اس قصے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ٹھیک ہے یہ حماقتیں ہر جگہ ہوتی رہتی ہیں، بات یہ ہے کہ اسلام میں یہ چیزیں نہیں ہے مگر اسلام کی رو سے یہ ایسا کچھ ہو رہا ہے اور کوئی شخص اس کے خلاف نہیں ہے۔ یا للعجب!!

### قرآن حکیم کی بجائے پکی روٹی اور پکی روٹی کی امامت کا نتیجہ

میں عرض کر رہا ہوں کہ وہاں تو بہر حال گاؤں کے لوگ بیچارے ہوں گے۔ ”ٹھیک ہے ملاجی نے کیا ہیگاتے اونان کہہ دتا۔“<sup>4</sup> میں اس کے بعد انتظار کر رہا ہوں۔ اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ کیا ان حضراتِ علمائے کرام میں سے کسی شخص نے بھی اس کے خلاف کچھ کہا ہے؟ کسی نے اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا اور یہ بات تو میں نے ایک Extreme (انتہائی) سی مثال دے دی جو کل ہوا ہے ویسے تو روز ہمارے ہاں یہ قصہ ہوتا ہے، کبھی کوئی صاحب اس سے پوچھتے ہی نہیں ہیں۔ میں بتایا کرتا ہوں کہ بچہ پیدا ہوا ہے، بیٹا ہے، صحت مند ہے، ماں کا دودھ، شیر مادر، حلال طیب ہے۔ حلال طیب کے لیے پہلی مثال ہم دیا کرتے ہیں کہ شیر مادر کی طرح حلال طیب جو دودھ ہے اس کے چشمے جاری ہیں، بچہ بھوک سے رو رہا ہے، وہ دودھ اس کے منہ میں نہیں دیا جاسکتا، جب تک مولوی صاحب آ کے بچے کے کان میں اذان نہ دیں۔ ٹھیک ہے خدا کا کوئی حکم لائے، ہم اس پر ایمان لائے ہوئے ہیں، ہم اس کو ماننے کے لیے مکلف ہیں، مگر وہاں یہ چیز

① شیشم تو اردو میں کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اسے ”ٹاہلی“ کہتے ہیں۔ ”ٹاہلی“ مونث ہوتی ہے (ارے تو!) شہتوت کے درخت سے (نکاح) پڑھا۔

② ارے! کسی ”ٹاہلی“ سے (نکاح) پڑھاتے۔

③ لو بھئی! یہ ہے اس کی ساری لم وجہ جواز!

④ ٹھیک ہے ملاجی نے یہ کہہ دیا تو انہوں نے بھی کہہ دیا۔

نہیں ہے۔ اگر آپ کو کوئی بات ملتی ہے عقل و فکر کی رو سے بھی بات کہی ہے اس کے لیے بڑی سے بڑی سند ہوگی مگر وہ کہیں گے کہ ”جی پکی روٹی وچ لکھیا ہو یا ہیگا جی اے۔“<sup>1</sup> آپ کو یہ بھی پتہ نہیں ہوگا کہ یہ پکی روٹی کیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ مسائل کی پہلی کتاب ہے، اوہدا ناں اے پکی روٹی، تے گل تے مک گئی۔“<sup>2</sup> پکی پکائی روٹی اس کتاب کا نام ہے۔ ہماری تعلیم انہی راستوں سے ہوئی تھی۔ مثلاً یہ مسئلہ کہ ”جے کوئی تینوں پوچھے تیرا ایمان کھلوتا ہے کہ بیٹھا ہو یا تو آکھ: جی او بیٹھا ہو یا اے کھلوتا تے نٹھ جائے گا نا۔“<sup>3</sup> یہ ہے وہ ”پکی روٹی“ اور یہ ہیں اس قسم کے اس کے اندر سارے مسائل اور وہ سند ہوتی ہے۔ آپ سوچیے کہ انسانوں کی عقل و فکر کو ماؤف کرنا ان کے قلب اور دماغ کے اوپر ان چیزوں کو ایسے مسلط کرنا کیا ہے؟ آپ سوچیے کہ اس باپ نے کیا گزر رہی ہوگی جس بیچاری لڑکی کی وہ میت تھی، اس وقت

جب یہ کہا ہوگا کہ یہ دفن نہیں کی جاسکتی، اس کا جنازہ جائز نہیں ہے۔

برادرانِ عزیز! خدا نے یہ انقلاب آفریں کتاب (قرآن) بھیجی تھی کہ انسان پرستی نہ رہے، انسان دوسرے انسان کے فیصلے کے سامنے نہ جھکے۔ انسان پوچھے کہ آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں، اُس کی سند کیا ہے، اس کی دلیل کیا ہے، زیادہ سے زیادہ آپ کہیں گے تو وہ فرما دیں گے کہ فلاں کتاب میں لکھا ہے، فلاں صاحب نے فرمایا ہے، میں نے فلاں مولوی صاحب سے سنا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۖ وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا<sup>4</sup> (25:55)۔ کہنے لگے کہ ان کفار کی یہ ایک عجیب بات ہے، آپس میں یہ روز لڑتے رہتے ہیں، جھگڑتے رہتے ہیں۔ اُن کفار کو تو چھوڑیے ان مولوی صاحبان کے جتنے آپس میں مناظرے ہوا کرتے تھے، مباحثے ہوا کرتے تھے، وہ اب اس شکل میں نہیں ہوتے، اب پولیٹیکل پارٹی کی شکل میں ہوتے ہیں مگر ہو وہی کچھ رہا ہے:

1 جی! یہ ”پکی روٹی“ میں لکھا ہوا ہے۔

2 اس کا نام ”پکی روٹی“ ہے۔ اب بات تو ختم ہوگئی۔

3 اگر تمہیں کوئی یہ پوچھے کہ تمہارا ایمان کھڑا ہے یا بیٹھا؟ تم کہو کہ جی، بیٹھا ہوا ہے۔ اگر کھڑا ہوگا تو بھاگ جائے گا۔

4 یہ لوگ خدا کے عالمگیر ضابطہ حیات کو چھوڑ کر، اپنے اپنے قبیلے کے بتوں کی پرستش اور اکابر کی اطاعت کرتے ہیں، جو ان کے لیے کسی نفع یا نقصان کا اقتدار نہیں رکھتے (لیکن سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ لوگ زندگی کے ہر معاملہ میں قبائلی عصبیت پر بڑا زور دیتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ لیکن) جہاں خدا کی مخالفت کا سوال آتا ہے تمام قبیلے ایک دوسرے کے مددگار بن جاتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص 827)۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں

## مولانا احمد شاہ نورانی مرحوم کا ایک بیان

عزیزانِ من! ان کی آپس میں جو دشمنیاں ہیں، وہ آپ کو معلوم ہیں۔ اس حد تک ان کی آپس میں عداوتیں ہیں کہ آپ نے مولانا شاہ احمد نورانی کا وہ بیان دیکھا ہوگا جو اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ وہ طلوع اسلام میں بھی شائع ہوا ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم شاتمِ رسول کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ شاتم کے معنی ہوتا ہے: گالی دینے والا۔ کون ہے شاتمِ رسول؟ ان کے اپنے فرقے کے سوا، باقی سارے جتنے بھی ہیں، وہ شاتمِ رسول ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم کعبے کے اندر جہاں یہ نجدی ہیں، یہ جو سعودی عربیہ والے



موجودہ حکمران ہیں، یہ جنہلی یا نجدی کہلاتے ہیں (اہل حدیث فرقہ)۔ یہ جو بریلوی لوگ ہیں یہ انہیں بھی شاتم رسول کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس بیان میں کہا ہے کہ ہم تو مکے میں ان نجدی علماء کے پیچھے بھی نماز پڑھنے کو تیار نہیں۔ یعنی آپس میں ایک دوسرے کی یہ کیفیت ہے۔ قرآن عجیب بات کہتا ہے کہ آپس میں تو ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے لیکن جب آپ خدائے واحد کی طرف آواز دیں تو یہ سارے مخالفت کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ عجیب چیز ہے۔ وہاں یہی بات تھی۔ عربوں کے اتنے قبائل تھے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ سو سو سال یہ قبائل ایک دوسرے کے ساتھ جنگ لڑا کرتے تھے۔ خود وہاں کے مذہب پرست طبقہ عیسائی اور یہودی اور مجوسی یہ سارے ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار رہا کرتے تھے اتنی مخالفت ایک دوسرے کی تھی لیکن حضور ﷺ نے جب خدائے واحد کی طرف دعوت دینے کی قرآن کی یہ انقلابی آواز بلند کی ہے یہ سارے ان کے خلاف متحد ہو گئے تھے اور ہر دور میں یہی ہوتا ہے۔

### شب و روز، عمر بھر پرویز کی مخالفت کی وجہ جواز

عزیزانِ من! آپ کو تعجب تو ہوتا ہوگا کہ میں کبھی کبھی درمیان میں 'میں' لاتا ہوں۔ وہ مجھے اس نسبت سے لانا پڑتی ہے کہ پرویز صاحب کی مخالفت آپ دیکھ رہے ہوں گے۔ تمام فرقے، یہ تمام پارٹیاں، ان کے ہاں کے تمام جتنے گروہ، ان کو مخالفت کے لیے یہ ایک ہی شخص مل گیا ہے۔ ان کے آپس میں اتنے اختلافات ہیں لیکن اُسے گالی دینے میں یہ ہر مسجد استعمال کرتے ہیں۔ اس میں یہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے یہ گالی دیتے ہیں؟ کیونکہ یہ خدائے واحد کی طرف دعوت دیتا ہے یہ قرآن کی دعوت دیتا ہے اس کا اور کوئی جرم نہیں ہے۔ عزیزانِ من! عمر کے اس آخری حصے میں بھی عرض کرتا ہوں کہ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے چالیس سال سے یہ میری مخالفت کر رہے ہیں میری ذات کے متعلق اس کے فضل و کرم سے ایک لفظ بھی آج تک نہیں کہہ سکے، صرف یہی کہتے چلے جا رہے ہیں کہ صاحب! یہ تو قرآن کو حسبنا کتاب اللہ کہتا ہے کہ یہ کتاب انسانوں کے لیے کافی ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ ہے جرم کہ یہ قرآن کی بات کہتا ہے۔ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَى رَبِّهِ ظَهِيرًا (25:55) خدا کی مخالفت کے اندر یہ سب ایک دوسرے کے ساتھی ہو جاتے ہیں۔ کہا کہ تم یہ پرواہ نہ کرو یہ مخالف کے قبائل ہیں یہ مختلف مذاہب ہیں یہ ان کے ہاں کے مختلف خاندان ہیں، قبیلے ہیں یہ کچھ نہیں ہیں۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (25:56) تمہیں تو ہم نے یہ ایک مشن دے کر بھیجا ہے کہ ان سے کہو کہ تمہاری موجودہ غلط روش کے نتائج بڑے تباہ کن ہوں گے اچھے راستے پہ چل پڑو گے تو بڑی خوشگوار زندگی بسر کرو گے۔ بس تم یہ کہے جاؤ، مقابل میں کوئی ہو، مخالفت میں کوئی ہو، تمہیں اس سے واسطہ نہیں ہے۔ یہ لوگ قبائلی عصبیت کا شکار ہوں تو ہوا کریں، تمہارا فریضہ یہی ہے کہ تم یہ بات کہے جاؤ اور اس کے ساتھ ایک بات اور میں کہوں کہ اُتَعْبُدُوا اللَّهَ (23:23) تم صرف قوانین و احکام خداوندی کی اطاعت کرو۔

## عقل و فکر کی دعوت عمر بھر نبی کی زندگی کا خاصہ ہوتی ہے

قرآن میں 'عزیزانِ من! حضرت نوح' ♦ سے لے کر حضور نبی اکرم ﷺ تک ہر نبی کا جہاں ذکر آیا ہے اس نے یہ کہا ہے کہ میں تمہیں ایک دعوت دیتا ہوں اور وہ دعوت یہ ہے کہ اُعْبُدُوا اللَّهَ (23:23) محکومیت صرف خدا کے قوانین کی اختیار کرو اور اسی سانس میں یہ ہر نبی نے کہا ہے کہ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ (25:57) میں اس دعوت کے معاوضے میں تم سے کچھ نہیں مانگ رہا ہوں اس دعوت میں میری کوئی ذاتی غرض پنہاں نہیں ہے۔ صاحب! یہ عجیب چیز ہے۔ یعنی یہ اتنی بڑی اہم بات ہوئی کہ پہلے نبی سے آخری نبی تک ہر نبی کے ذکر کی دعوت کا پہلا فقرہ دہرایا گیا اور حقیقت میں وہی دعوت ہے کہ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو اور اسی سانس میں فل سٹاپ بھی نہیں ہے ساتھ یہ ہے کہ میں اس کے بدلے میں تم سے کچھ نہیں مانگ رہا، گویا یہ اتنی بڑی اہم چیز ہے۔ وہی چیز اثر انداز ہو سکتی ہے جس میں آپ کا کوئی ذاتی مفاد نہ ہو جب کوئی آپ کا ذاتی مفاد کچھ نہ کچھ اس کے اندر آیا، تھوڑا بہت پر تو اس کا آجائے گا اور جب آپ یہ کہہ دیں گے کہ میں اس کے بدلے میں تم سے کچھ نہیں چاہتا تو پھر وہ اس کا ذاتی مفاد اس کے اندر قطعاً نہیں رہے گا۔ دیکھیے جو مفاد کہا ہے وہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا<sup>①</sup> (25:57)۔ یہ نہیں ہے کہ میں تم سے کچھ اور مفاد نہیں چاہتا۔ یہ چاہتا ہوں۔ الا کے یہ معنی نہیں کہ میں چاہتا ہی نہیں، تم سے کچھ مانگتا ہی نہیں، کوئی معاوضہ ہی نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے اختیار و ارادہ دل کی رضا مندی سے جو یہ چاہے أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (25:57) وہ اس راستے پہ چل پڑے جو

① میں جو تمہیں صحیح راستے کی طرف دعوت دیتا ہوں تو اس میں میری کوئی ذاتی غرض پنہاں نہیں۔ میں تم سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ تم میں سے جو چاہے اپنی مرضی سے خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے۔ بس یہی میرا اجر رسالت ہے (34:47; 42:13) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 827)۔

اسے خدا کی طرف لے جائے گا، بس میں اس کے سوا تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ اس کے لیے دوسرے مقام یہ جو کہا ہے وہ اس سے بھی بڑے خوبصورت الفاظ ہیں کہ تمہارے خیال میں یہ تو آتا ہی ہوگا کہ بھئی! بہر حال یہ دعوت دے رہا ہے پیغام پہنچا رہا ہے تو اس کے بعد ان کے الفاظ میں ایک پارٹی بنا رہا ہے ایک جماعت بنا رہا ہے۔ اس زمانے میں تو اس سے بڑا صلہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ پارٹی کے زیادہ سے زیادہ ممبر بنیں یا اس کے ساتھ متفق بنیں اس لیے کہ انتخاب سامنے ہوتا ہے۔ وہ جو ہر پارٹی کا ممبر بناتا ہے اصل میں وہ ایک ووٹ لیتا ہے۔ ایک روز ایک مولوی صاحب سے کسی نے کہا تھا کہ صاحب! اس شخص کے پاس اتنی دولت ہے اتنے روپے ہیں۔ تو مولوی کہنے لگا کہ ہمارے پاس بھی بہت روپے ہیں۔ پوچھا کہ وہ کون سے روپے ہیں۔ کہنے لگا: یہ جتنے انسان پھر رہے ہیں اے سارے میرے

روپے پھر دے پئے ہوئے ہے گے۔ او کہن لگا: او تیرے روپے کس طراں نال؟ کیندا: جنے جدوں مرنا اے تے جنازہ پڑھان دا روپیہ دینا اے اتے کھڑے پیر پھرن ڈے ہیگے نیں، بس میں اڈیکناں ای ایں، جنے بندے پھر دے پئے نیں۔<sup>1</sup> یہ پارٹی میں جتنے لوگ آتے ہیں وہ اصل میں ان کا ووٹ ہوتا ہے تو کم از کم یہی سہی۔

### بے لوث عمل قرآن حکیم کا بہترین اصول ہے

عزیزانِ من! کیا بات ہے قرآن کی! اس نے کہا کہ قُلْ (25:57) ان سے کہہ دو کہ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ (25:57) میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ جو تمہارے ذہن میں کچھ آ رہا ہے کہ صاحب! یہ پارٹی بنا رہا ہے اس میں بھی کچھ اپنے لیے مانگ رہا ہوگا۔ نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ مَنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (34:47) تمہارے ذہن میں جو کچھ آ بھی سکتا ہے وہ تمہارے ہی لیے ہے میرے لیے نہیں ہے۔ اگر ایک مضبوط امت اور جماعت بنا لو گے تو تمہارے فائدے کی بات ہے، میں نے الیکشن نہیں لڑنا، مجھے ووٹ نہیں چاہئیں۔ کیا انداز ہے! کہا کہ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ<sup>2</sup> (34:47) اور یہ چیز نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہی متعلق نہیں کہی، عزیزانِ من! قرآن نے ایک اصول دیا ہے اسے ذہن میں رکھیے گا اور وہ ہے بے لوث ہونے کا اصول۔

1 یہ تمام میرے روپے چل پھر رہے ہیں۔ وہ کہنے لگا: ارے بھائی! وہ تیرے روپے کس طرح بنے؟ اس نے جواب دیا: جس نے جب مرنا ہے تو جنازہ پڑھانے کا اس نے روپیہ ادا کرنا ہے۔ یہ تو بس تیاری کے انداز میں ہی چل پھر رہے ہیں اور میں ہوں کہ بس ان سب چلنے پھرنے والے افراد کے انتظار میں تیار بیٹھا ہوں۔

2 (وہ یہ سب کچھ محض تمہاری خیر خواہی کے لیے کر رہا ہے۔ اس میں اس کا اپنا کوئی مقصد پنہاں نہیں ہے) وہ اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگتا۔ وہ معاوضہ تمہارے اپنے ہی لیے ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1001)۔

### کسی لیڈر یا راہنما کے انتخاب کا بہترین اصول لیڈر کا بے لوث ہونا ہے

اسی ضمن میں ایک اور بات سامنے آگئی اگر آپ وہ ذہن نشین کر لیں تو آپ کی جو بیشتر موجودہ الجھنیں ہیں وہ حل ہو جائیں گی، بیشتر مسائل حل ہو جائیں گے۔ قرآن نے کہا یہ ہے۔ سوال ہوا کہ ہم کس کے Followers (متبعین) بنیں، کس کے ساتھ چلیں، کسے Follow کریں، کس کی پارٹی میں شریک ہوں؟ یہ چیزیں ہوتی ہیں، Followe بننا ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے اتباع کا لفظ ہوتا ہے۔ کہا کہ اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ (36:21) اس کے لیے کہا کہ Qualification (صفات) دیکھ لیا کرو۔ ایک تو یہ دیکھا کرو بلکہ دُور سے یہ دیکھا کرو کہ مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا (36:21) تم سے کوئی اس کا معاوضہ تو نہیں مانگ رہا۔

کہا کہ اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا (36:21) دیا نثار بلانے والے کی نشانی یہ ہے: خود وہ صحیح راستے کے اوپر ہو، پہلی بات تو یہ ٹھیک ہے اور دوسری بات وہ بھی میں نے اسی سانس میں کہا یہ دوسری چیز قرآن نے کہی ہے۔ کتنی اہم چیز ہے جو اس نے کہی ہے کہ اس کے ساتھ چلو اس کو Follow کرو: خود صحیح راستے پہ ہو اور تم سے کسی قسم کے کسی معاوضے مطالبے یا صلے کا متوقع نہ ہو۔ یہ ہیں دو خصوصیات۔ جس کے اندر یہ ہوں اسے سمجھو کہ وہ لیڈر ہے۔ لیڈر کے معنی ہی ہیں جس کے پیچھے چلا جائے اسے لیڈر سمجھو اس کو Follow کرو تو گویا یہ چیز جہاں ہر رسول نے اپنے متعلق یہ کہی خدا نے ان کی زبان سے کہلوائی، قیامت تک کے لیے ہمارے لیے بھی یہ ایک نقطہ ہدایت دیدیا کہ کسے Follow کیا جائے کس کا ساتھ دیا جائے؟ جو قرآن کی ہدایت کے اوپر ہو اور اس کے ساتھ یہ کہ اپنے لیے کسی قسم کے صلے اور معاوضے کا متوقع نہ ہو طلبگار نہ ہو اور معاوضے کی شکل تو میں نے کہا ہے کہ یہ روپیہ پیسہ ہی نہیں ہے روپیہ پیسہ کچھ شے نہیں ہے یہ تو لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں اور پھر آپ لوگوں سے کچھ معاوضہ لیتے ہیں۔

### زندگی آرزو کے آبِ حیات سے ہی قائم و دائم ہے

اصول آپ نے سمجھ لیا جو قرآن نے بتایا۔ کہ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ (25:57)۔ عزیزانِ من! دل بے مدعا ہونا بڑی چیز ہے لیکن یہ بھی میں نے غلط کہہ دیا ہے دل بے مدعا ہو ہی نہیں سکتا مدعا ہوتا ہے۔ فرق مدعا اور مدعا میں ہے۔ قرآن نے یہ بات بھی بتادی۔ معاف رکھیے گا وہ رہی گئی تھی ورنہ اس چیز نے پھر ذہن میں خلش پیدا کر دی: مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ (25:57) میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ بات تو یہ تھی کہ میں تم سے معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ نہیں ہے کہ میں اس کا معاوضہ ہی نہیں چاہتا۔ بات یہ ہے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ اِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ (34:47) اس سے مانگتا ہوں جس کا یہ کام ہے۔ اب دل بے مدعا بھی نہ رہا

① اس کا معاوضہ اُسے اُس کے خدا کے ہاں سے ملے گا۔

اور اگر کوئی آرزو دل کے اندر نہیں رہتی تو وہ کجخت دل تو مردہ ہوتا ہے زندگی تو آرزو ہی کا نام ہے۔ تو یہ چیز کہ میں کسی معاوضے کا کسی صلے کا طلبگار ہی نہیں تو یہ بات تو غلط ہو جاتی۔ کتنا دیا نثار ہے یہ داعی کہ اتنی سی جو بات تھی اس کو بھی چھپا کے نہیں رکھا ہے ورنہ کہنا یہی تھا کہ جسے Selflessness (بے لوٹ) کہتے ہیں کہ میں بالکل Selfish (خود غرض) نہیں ہوں بالکل کچھ نہیں مانگتا میں کوئی طلبگار نہیں ہوں۔ کہا کہ نہیں مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ (25:57) تم سے کچھ نہیں مانگتا اِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ (34:47) اس کا اجر خدا سے مانگتا ہوں۔ وہ کون سا خدا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ (25:58)۔

انسانوں کے مرتب کردہ اصولوں کے مقابلے میں خدا کی طرف سے ملنے والے اصول ہمیشہ ابدی ہوتے ہیں

قرآنی قوانین اور عام نظام حکومت میں فرق کیا ہے؟ قرآن کے قوانین کے متعلق تو یہ ہے کہ وہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (6:34) Unchangeable (غیر متبدل) ہیں۔ یہاں بھی آپ نے دیکھا کہ اس نے انسانیت پرستی کو درمیان سے نکال دیا ہے۔ دنیاوی احکام میں کیا ہوتا ہے؟ دنیاوی قوانین ہوتے ہیں کہ ایک حاکم بدلے ایک حکومت بدلی اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ قبلہ نما کی طرح سر کننا شروع کر دیا کہ جو نیا حاکم آیا ہے پتہ نہیں کس قسم کے وہ قانون بنائے گا پتہ نہیں کیسے احکام جاری ہونگے کہ جی انہوں نے تو یہ اتنے پر مٹ جاری کر دیئے تھے لائنس دیدیئے تھے یہ پتہ نہیں ہے کہ بیک جنبش قلم وہ سارے ہی کینسل ہو جائیں گے۔ ہر حکومت کے بدلنے کے بعد آپ دیکھتے ہیں یہ چیز ہوتی ہے۔ چھوٹے سے پیمانے پر تو علاقے کا ایک تھانیدار بدل جائے تو اس وقت بھی یہ ہوتا ہے کہ ”جی کہو جیابند اے جیہڑا ہن آیا ہیگا اے“<sup>①</sup> یعنی انسان کے بدلنے پر یہ سارے پیمانے بدل جاتے ہیں حکومت کے بدلنے پر پیمانے بدل جاتے ہیں حکمران کے بدلنے پر پیمانے بدل جاتے ہیں۔ ہم لوگوں کا تو پوچھو ہی نہیں کہ اس کے بدلنے سے کہاں کیا بدلتا ہے۔ امریکا کا الیکشن ہونے لگ جاتا ہے یہاں کاروبار ٹھپ ہو کے رہ جاتا ہے انتظار کرتے ہیں روزیوں سن سن کے کوئی پارٹی برسر اقتدار آئی ہے اب وہ وہاں کا کونسا صدر بنا ہے یعنی وہاں کی جو تبدیلی ہوتی ہے وہ جس طرح سے زلزلہ کہتے ہیں سات ہزار میل کہیں ہوا اور یہاں آ کے ہمارے مکان گر گئے وہ وہاں کے انتخاب کے اوپر یہاں زلزلے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں کسی کو بھی اطمینان میسر ہو سکتا ہے کہ یہ احکام اچھے ہیں یہ قانون ٹھیک ہیں کیا پتہ ہے کل ہی یہ مرجائے، کل ہی Change (تبدیل) ہو جائے، دوسرا آ جائے اس

① اور تم اُس خدا (کے اہل قوانین کے غیر متبدل نتائج) پر کامل بھروسہ رکھو جو ہمیشہ زندہ ہے، کبھی مرنے والا نہیں (اس یقین محکم کے ساتھ اسی نظام کے قیام کے لیے سرگرم عمل رہو تا آنکہ ہر شخص اس کے درخشاں نتائج دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ وہ خدا جس کا نظام اس قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے فی الواقعہ ہر قسم کی حمد و ستائش کا مستحق ہے (1:1) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 827 تا 828)۔

① کہ جی! یہ بندہ جواب آیا ہے، کیا ہے۔

کے بعد پتہ نہیں کیا ہو؟ ہر وقت یہ دھڑکن لگی رہتی ہے۔ انسان کی بادشاہت کے اندر تو وہ بادشاہ مرے تو دوسرا بادشاہ۔ یعنی ہر وقت یہ چیز رہتی ہے۔ جہاں بھی انسانوں کے بس میں کوئی چیز ہو کسی کا قانون بنانا، کوئی احکام نافذ کرنا، تو اس میں ہر وقت دھڑکار رہتا ہے۔

ہماری تباہی و بربادی کا باعث ”توکل“ کا غلط مفہوم ہے

دنیاوی حکومت میں آپ کسی پہ ہمیشہ کے لیے اعتماد اور بھروسہ نہیں کر سکتے۔ پارٹی بدلی اور اس کے بعد پتہ نہیں پھر کیا ہو۔ یہاں توکل آیا ہے۔ پھر وہی بات آگئی کہ ان لفظوں کے معنوں نے تو ہمیں تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (33:48) جی اسی

کرنے آں یعنی جنوں کچھ نہ کرنا ہووے بیٹھے ہوئے توکل علی اللہ کرن ڈئے ہوئے ہیگے۔<sup>①</sup> توکل کے تو معنی ہوتے ہیں ”جس انداز میں کسی جہاز سے ایک پیراشوٹ والا اپنی چھتری لے کے چھلانگ لگا دیتا ہے، وہ جو اس کا اطمینان ہوتا ہے، اسے عربی زبان میں توکل کہتے ہیں۔“ کتنا بڑا یقین محکم، کامل بھروسہ ہوتا ہے، اپنی اس چھتری کی حکمیت کے اوپر کہ آدھے آسمان سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ یوں بھروسہ رکھ ڈر نہیں۔ کہا کہ صاحب! کیسے بھروسہ رکھوں ہمیں تو روزِ تجربہ یہ ہے کہ ذرا سی وہ کوئی حکومت چلیج ہوئی، کوئی مرا، اور اس کے بعد معاملہ ختم۔ کہتا ہے کہ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ (25:58) اس کے قوانین کے اوپر بھروسہ رکھ، جو ہمیشہ زندہ رہے گا، جو کبھی نہیں مرے گا۔

### خداوند تعالیٰ کے قوانین پر مکمل بھروسے کا نام توکل ہے

عزیزانِ من! بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ خدا نے اپنی دو صفتیں بتائی ہیں: الحی، لا یموت۔ صاحب! تو مجھے کیا کہ تو ہمیشہ زندہ رہے گا، نہیں مرے گا، مجھے کیا ہے؟ ”مینوں تے توں مار دینا اے اک دن۔“<sup>②</sup> آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں بظاہر اس چیز سے، خدا کی ان صفتوں سے، کوئی تعلق نظر نہیں آتا: وہ ہمیشہ زندہ رہے گا، وہ نہیں مرے گا۔ جب ”توکل“ کہا ہے تو اس کے قانون پہ بھروسہ کرو۔ اب اس سے ہمارا تعلق آ گیا۔ اگر کہیں کوئی انصاف والی پارٹی، کوئی برسرِ اقتدار حکمران ایسا ہو جو واقعی انصاف عدل احسان والا ہو اور اس کے متعلق یقین ہو جائے کہ اس نے بدلنا نہیں ہے آپ نے دیکھا کتنا بڑا بھروسہ اور توکل اور اعتماد حاصل ہو جائے گا۔ یہاں تو اتنا سا بھروسہ ہوتا ہے کہ صاحب! کم از کم پانچ سال کے لیے تو یہ ہو گیا۔ یہ جو الیکشن ہے اتنے میں ہی کسی حد تک ایک بھروسہ ہوتا ہے اور اگر وہ ایسا ہو کہ عَلٰی

① جی ہم (توکل علی اللہ) کرتے ہیں یعنی جسے کچھ بھی نہ کرنا ہو، وہ بیٹھے توکل علی اللہ کر رہے ہیں۔

② مجھے تو تو نے ایک دن مار ہی دینا ہے۔

الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ (25:58) اس کے قوانین قابلِ اعتماد اور بھروسے کے قابل ہیں، اس کے اوپر بھروسہ کرو اور اس کے لیے کام کیا کرو وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهِ (25:58) ان قوانین کی رو سے ایسا نظام قائم کرو: وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهِ (25:58)۔ میں نے کہا ہے کہ بس وہ روایتی (Traditional) ترجمہ آپ کیجیے تو پھر آپ قرآن سے گئے۔ یہاں ہے کہ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهِ (25:58) یعنی بقول ان کے خدا کی حمد و ستائش کی تسبیح پھیرتے رہا کرو۔ بس اے کم کردے رہیا کرو تسی۔ تے بے نہ پھیرے چھڈ دیئے وچ؟ کہنے لگا ہے تہانوں پتہ اے الحی الذی لا یموت، اسی مر نہیں گے، اسی جو ندے ہیگے آں۔ دیکھنا کہ اونے کیا کہ اسی جیونے آں۔ چھڈ کے وکھتوں۔<sup>①</sup> مر نہیں گے۔

## لفظ سبج کا قرآنی مفہوم

سبح بحمدہ کا مطلب عربوں سے پوچھیے، محاورہ عرب سے پوچھیے کہ وہ کیا کہتے تھے۔ میں نے کہا ہے کہ سبج کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے پوری توانائیوں سے سرگرم عمل رہنا۔ میں نے کہا ہے کہ عرب گھوڑے کی وہ چال جس میں وہ دونوں پاؤں پورے پھیلا کے مارتا ہے۔ ”اسی تے اک واری گھوڑا دیکھیا سی ساری عمر دوبارہ نہیں چڑھے۔ اک واری چڑھن نال جو کچھ ہو یا پوچھو نہ“<sup>2</sup>۔ وہ عرب اس چال کو کہتے تھے جس میں وہ اپنے دونوں پاؤں پورے پھیلا کے مارتا ہے ”تے کوئی گھوڑے والا بولے تو سہی پئی کی ہوندی اے او چال“<sup>3</sup>۔ اس موٹر سائیکل کے زمانے میں اب گھوڑے کی چالوں کو کون جانے صاحب! وہ عرب اس کو سبج کہتے تھے یا یہ جو تیرنا ہوتا ہے جس میں تیراک پورے بازو سے یوں تیرتے ہیں۔ وہ اسے سبج کہتے تھے۔ کہا کہ یہ کرو۔ وہ جو قرآن کریم میں حضرت یونس کے قصے میں ہے کہ اگر وہ ”سبج“ نہ ہوتا تو وہ وہاں ڈوب جاتا اور قیامت تک وہیں رہتا تو ان کے بقول اس میں یہ آیا ہے کہ اگر وہ یہ سبج نہ پڑھتا کہ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَنَكَ ۖ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (21:87) تو پھر وہ قیامت تک وہیں رہتا۔ اس نے یہ سبج پڑھ لی تو وہ بچ گیا۔ اس لحاظ سے اب یہاں جب بھی کسی نے کوئی بڑی مصیبت آتی ہے تو وہ اس آیت (21:87) کی تسبیح پڑھتا ہے جیسے مثلاً عام طور پر امتحان دے پہلاں تسی دیکھ دے ہونا او چادر اں وچہ جانداں ہیگیاں نہیں۔ سارا سال نہ استانیاں کچھ پڑھایا ہوندا نہ ایناں کچھ پڑھیا ہو یا ہوندا ہیگا۔ او جس ویلے پھر او اندا امتحان تے نظر او اندا پئی آئی مچھی تے لگی نکلن تے او وچھا دینداں استانیاں۔

- 1 بس تم یہ کام کرتے رہا کرو۔ اگر یہ تسبیح نہ پھیریں اسے درمیان میں ہی ترک کر دیں تو؟ کہنے لگا کہ آپ کو معلوم یہ (الحی الذی لا یموت) ہے۔ ہم مر نہیں گئے، ہم زندہ ہیں۔ دیکھنا کہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ چھوڑ کر ذرا دیکھو تو! ہم مر نہیں گئے۔
- 2 ہم نے تو ساری عمر گھوڑا ایک ہی بار دیکھا، دو بار اس پہ سوار نہیں ہوئے۔ ایک ہی بار سوار ہونے پہ جو بیتی اس کا پوچھو ہی نہیں۔
- 3 وہ تو کوئی گھوڑے والا ہی بتائے کہ وہ چال کیا ہوتی ہے۔

اور وہ منگاتی ہیں کھجوروں کی گنگلیں<sup>1</sup>۔ یہ ایک بڑا کاروبار ہے آپ کو معلوم نہیں۔ آپ کو اگر کچھ اور کام نہیں ہے تو یہ کام کیجیے۔ یہ کرائے پہ لیتی ہیں یہ کھجوروں کی گھٹلیاں، وہ بچھ جاتی ہیں پھر چادریں اور پھر وہ لڑکیاں بیٹھ جاتی ہیں اور پھر استانیاں بھی بیٹھ جاتی ہیں۔ خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس دن وہ سر پہ دوپٹہ لے لیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ حضرت یونس ◆ یہی تسبیح پڑھا کرتے تھے اور وہ یہی تسبیح پڑھاتی ہیں: لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَنَكَ ۖ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ<sup>2</sup> (21:87)۔ وہ جناب یہ آ کر یہ جو ہے اس کا ورد ہوتا ہے:

مست رکھو ذکر و فکر صجگا ہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

عزیزانِ من! جن درسگاہوں میں کیفیت یہ ہو کہ امتحان میں محنت سے پاس ہونا نہیں ہے، اس کے دو ہی طریقے ہیں: کچھ ان کو رشوت دو جو امتحان لینے والے ہیں، کچھ اس کو دوسرے کے ہاتھ میں آخری نتیجہ ہے۔ یہ آیا کریمہ کے اور یہ اس آیت سب حنک کے ورد کرانے شروع کر دیئے جائیں، گٹلیں<sup>3</sup> پڑھوانی شروع کر دیں۔ یہ جو بچیاں اور بچے ہیں یہاں سے ذہن میں اس کے علاوہ کیا لے کر نکلیں گے؟ کچھ بھی نہیں۔

### لفظ حمد کا مفہوم

یہاں آیا ہے: سَبِّحْ بِحَمْدِهِ (25:58)۔ عزیزانِ من! قرآن اپنے اس نظام کو حمد کے معنی میں لیتا ہے۔ یہ عربوں کے ہاں کا ترجمہ ہے۔ پتہ نہیں یہ قوم کیا بلا تھی۔ حمد کے معنی ہوتا ہے ”کسی بہت بڑے آرٹسٹ کا ایسا ماسٹر پیس، ایسا لا جواب شاہکار جو نوع انسانی کی منفعت کے لیے بنایا گیا ہو اور وہ ایسا ہو کہ جسے دیکھ کر ہر ایک کی زبان پر بلا ساختہ ”آہا“ آجائے، اسے وہ حمد<sup>4</sup> کہتے تھے۔ اب

1 امتحانات سے قبل آپ دیکھتے ہیں کہ چادریں بچھ جاتی ہیں۔ سارا سال نہ استانیوں نے کچھ پڑھایا ہوتا ہے نہ ان کی طالبات نے کچھ پڑھا ہوتا ہے۔ پھر جب امتحان آتا ہے تو نظر آتا ہے کہ اب مچھلی آئی اور لگی ننگے تو استانیاں چادریں بچھا دیتی ہیں۔ اور کھجوروں کی گٹھلیاں منگوا لیتی ہیں۔

2 تیرے سوا اور کسی کو اس کا اقتدار و اختیار نہیں (کہ وہ مجھے ان مشکلات سے نجات دلا سکے) میں نے جو اس فیصلے میں عجلت کی اور تیرے حکم کا انتظار نہ کیا تو یہ میری زیادتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا فیصلہ ہی ایسا ہوتا ہے جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہوتا ہے۔ (37:139; 68:48) (پرویز: مفہوم القرآن ص 744)۔

3 کھجوروں کی گٹھلیاں۔

4 اس کی مکمل تفریح اور مفہوم کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحہ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2007، ص 78 تا 93)۔

ہم نے اس کا ترجمہ تعریف کیا ہے۔ اس کا ترجمہ تعریف نہیں ہے کیونکہ تعریف کے لیے تو ان کے ہاں لفظ ”مدح“ بھی تھا ”ثنا“ بھی تھا۔ ”مدح“ کا لفظ قرآن میں خدا کے لیے کہیں نہیں آیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مدح بادشاہوں کی ہوتی ہے، اس میں خوشامد کا پہلو ہوتا ہے، اسے خوش کرنا ہوتا ہے۔ یہاں نہ کسی کی مدح ہوتی ہے نہ کسی کو خوش کرنا ہوتا ہے نہ کسی کی خوشامد ہوتی ہے، اس میں تو یہ ہوتا ہے کہ ایک شاہکار آپ کے سامنے آتا ہے، آپ کو معلوم بھی نہ ہو کہ یہ شاہکار کس کا ہے، اسے دیکھ کر بے ساختہ زبان یہ ”آہا ہا“ آجائے تو اسے وہ حمد کہتے ہیں، آپ کو معلوم نہ ہو کہ مونا لیزا<sup>1</sup> کا پینٹر کون تھا، اگر نگاہوں کے سامنے وہ تصویر آئے تو بے ساختہ زبان سے تحسین و آفریں نکلے۔ تو عرب اس کو حمد کہتے تھے۔ کہا کہ اس کے قوانین جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی، اس قسم کے محسوس نظام کی شکل کے اندر متشکل ہوں جو مَا يَنْفَعُ



النَّاسَ (13:17) ہوں یعنی نوع انسانی کے لیے منفعت بخش ہوں کہ جو اس نظام کو دیکھے بے ساختہ کہہ دے کہ سبحان اللہ کیا بات ہے اس نظام کی صاحب! یہ ہے سبح بحمدہ۔

### ذنوب کے غلط ترجمے نے قرآن حکیم کی ساری تعلیم کو ہی بدل دیا

اب آگے دو الفاظ آتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ اس میں دو چار سخت مقام آتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ وَ كَفَىٰ بِهِ ذُنُوبًا عِثَابًا خَيْرًا (25:58)۔ یہ بڑا ہی اہم مقام ہے۔ اس کا ترجمہ کہا جاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کے گناہوں سے خوب واقف ہے۔ بات تو یہ ہو رہی تھی کہ اس کے نظام کو ایسا موجب حمد بنا دیجیے کہ دنیا یہ سب کچھ پکاراٹھے اور یہاں ترجمہ کر دیا کہ خدا اپنے بندوں کے گناہوں کو خوب جانتا ہے۔ ذنب کی جمع ذنوب ہے۔ اس کا ترجمہ گناہ کر دیا: خدا بندوں کے گناہ سے واقف ہے۔ گناہ ہی نہیں وہ تو ہمارا ایمان ہے کہ خدا کہتا ہے کہ ہم تو تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہیں تمہاری نگاہ کی خیانتوں تک سے واقف ہیں۔ ٹھیک ہے وہ تو واقف ہوا۔ یہاں یہ جو ”ذنوب“ ہوا تو یہاں کوئی ایسی اہم چیز بھی نہیں ہے۔ اہمیت اس کی اور جگہ آتی ہے۔ وہ سورۃ الفتح میں ہے۔ وہ ابتدائی مشہور آیات ہیں کہ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ (2-48)۔ ہزار برس سے عزیزانِ من! یہ آیت ہمارے ہاں مذہبی حلقوں کے اندر بحث و تحیص کا محور رہی۔ اس کا ترجمہ یہ کہا جاتا ہے کہ اے رسول! ہم نے تمہیں ایک فتح، فتحِ مبین عطا فرمائی ہے، بہت بڑی فتح عطا فرمائی ہے تاکہ خدا تمہارے وہ گناہ بخش دے جو تم اس سے پہلے کر چکے ہو اور وہ گناہ جو اس کے بعد ابھی تم نے کرنے ہیں۔ آپ غور فرمائیے کوئی تاویل نہیں۔

① مونا لیزا کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2007ء، ص 79۔ (فٹ نوٹ 1)۔

اس آیت کے اندر لکھ لکھا ہے۔ یہ واحد مخاطب کا صیغہ ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے ترجمہ یہ بتایا، ترجمہ ہی نہیں بلکہ اس کے متعلق تفسیریں چلی ہوئی ہیں اب اس کے بعد گروہ بنے۔ وہ گروہ جس نے کہا کہ انبیائے کرام تو معصوم ہوتے ہیں ان سے تو گناہ سرزد نہیں ہوتے اور اب اس آیت کے بعد وہ کیا کریں۔ اب چلے جناب! وہ اس کی تاویل میں۔ کتابوں پہ کتابیں لکھی چلی جا رہی ہیں مگر یہ تاویل بنتی کچھ نہیں ہے۔ مقابلے میں جو دوسرے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ نہیں یہ نہیں ہے۔ وہ سب کچھ کہتے ہیں: سوسنار کی ایک لوہار کی۔ وہ اس ایک آیت کو پیش کر دیتے ہیں۔ آیت میں آپ غور کیجیے گا کہ جو گناہ آپ ﷺ پہلے کر چکے ہیں ان کو بھی بخش دے اور جو اس کے بعد کریں گے ان کو بھی پہلے ہی بخش دے یعنی کرن توں پہلے ہی۔ ① اندازہ لگائیے کہ آپ کے ہاں اس رسول ﷺ کا معاذ اللہ

کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور اس خدا کا بھی (معاذ اللہ، معاذ اللہ)۔

### اس سلسلہ میں مودودیؒ کی تفسیری بیان جو قابلِ صد افسوس بھی ہے اور عجیب بھی

ہمارے دور میں ذرا ایک دلچسپ سی تفسیر آتی ہے۔ مجھے بڑا ہی افسوس ہے کہ مجھے درس میں یہ نام لانا پڑتا ہے۔ اس دور میں ہمارے ہاں کے مفسر مودودیؒ<sup>2</sup> صاحب ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں کبھی بھی درس میں کوئی نام نہیں لیتا۔ خاص طور پہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ اس دور میں ہماری نئی جزییشن کے اوپر کم از کم ان کے ذہنوں کے اوپر ان کے خیالات کا ان کی تفسیر کا بڑا اثر ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اگر زندگی کے کچھ دن دیئے ہیں، توفیق دی ہے، میں کوشش کرتا رہتا ہوں کہ کم از کم ان نوجوانوں کے ذہنوں سے، میں وہ غلط تاثرات کسی حد تک مٹا دوں جو قرآن کے خلاف، دین کے خلاف، ان کی طرف سے پیدا کیے جا رہے ہیں۔ مجھے اس لیے نام لے کر یہ بات کہنا پڑتی ہے، ورنہ میں کبھی بھی یہ نہیں کرتا۔ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے؟ ان کے ہاں کی صورت یہ ہے، ان کا انداز ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ گاندھی جی بھی خوش رہیں، راضی رہے سرکار بھی یعنی وہ طبقہ جو کہتا ہے کہ گناہ کر سکتے تھے ان کی بھی رعایت ہو اور دوسرے وہ کہ جو کہتے ہیں کہ نہیں کر سکتے تھے ان کی رعایت بھی ساتھ رہے۔ یہ رعایت کیسے رکھی جاسکتی تھی؟ ان کی یہ کتاب ہے: رسائل و مسائل حصہ چہارم۔ ان سے کسی نے سوال پوچھا ہے کہ کیا انبیاء کرام ﷺ سے لغزش ہو جاتی تھی؟ کہا: جی نہیں، نہیں ہوتی تھی، میرا خیال یہ ہے کہ انبیاء کرام ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں کام کرتے تھے تو اس بنا پہ ان سے لغزش کا صدور نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلی بات تو یوں دیکھ لیجئے کہ خدا کی نگرانی میں کام کرتے تھے ہر وقت وہ نگرانی کرتا رہتا تھا کہ وہ کوئی غلط قدم اٹھائیں ہی نہیں۔ خدا کی نگرانی کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ پہلے تو یہی دیکھیے کہ

1 کرنے سے قبل ہی۔

2 سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)۔

اپنی طرف سے انبیاء کو جو بہت بڑا کریڈٹ دیا جا رہا ہے وہ یہ دیا جا رہا ہے کہ وہ خدا کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ آپ کا بچہ آپ کی نگرانی میں اگر ادھر ادھر چلتا ہے اور وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھاتا تو اس میں اس کی کیا کارگیری ہے، وہ تو آپ کی نگرانی میں یہ کچھ کر رہا ہے تو چونکہ وہ خدا کی نگرانی میں یہ کرتے تھے اس واسطے ٹھیک ہے کہ ان سے لغزش نہیں ہوتی تھی، خدا ان سے لغزش ہی سرزد نہیں ہونے دیتا تھا۔ اب وہ جو دوسرے ہیں جو کہتے ہیں کہ گناہ کرتے ہیں کہ صاحب! ان کے عقیدے کے مطابق یہ لغزش لغزش ہے۔ اب وہ سامنے آئے کہ ان کے متعلق کیا کہا جائے۔ کہتا ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ انبیاء ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں، ہیں لکھا ہے، تھے لکھنا چاہیے تھا، اس لیے ان سے لغزش کا صدور اس بنا پر نہیں ہوا، صدور تو ہوا ہے اس بنا پر نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کسی وقت ان سے غافل ہو گیا تھا، یہ ہوا

کہ لغزش صادر ہوئی تو یہی آیا کہ وہ تو خدا کی نگرانی میں کام کرتے تھے تو پھر یہ بچہ جو گر پڑا ہے، بچہ گرتا ہے تو اندر سے آواز دیتا ہے: تو کتنے گئی ہوئی سیں، اندھی ہیں، دیکھ دی نہیں بچہ گر گیا۔ او کہن لگی: میں تو ہانڈی ایچ ڈوئی پھیرن لگی ساں، میں اینوں کی کراں؟<sup>①</sup> اس لیے نہیں لغزش سرزد ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان سے کسی وقت غافل ہو گیا تھا بلکہ اس بنا پر ہوا، بڑی توجہ سے سنیے عزیزانِ من! اور کانپ جائیے۔ اس بنا پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ لغزش ان سے صادر ہو جانے دی: کوئی گل نہیں جی کرن دیو۔<sup>②</sup>

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل  
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اللہ نے ان سے وہ لغزش ہو جانے دی تاکہ دنیا پر یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں، خدائی صفات کے حامل نہیں ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے خدا نے ان سے یہ لغزشیں ہو جانے دیں۔ عام طور پر وہ روک لیتا تھا کہ یہ نہ ہو اور کبھی کبھی ہو بھی جانے دیتا تھا اور اس میں کہتے ہیں کہ بہت بڑی حکمت تھی تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ انسان ہی ہے، بشر ہے، خدائی صفات نہیں ہیں، اس میں خدائی صفات ہوتیں تو کوئی لغزش ہی نہ ہوتی۔

عزیزانِ من! آپ نے اس سے غور فرمایا کہ کیا کہا ہے کہ لغزش نہیں ہوتی تھی تو یہ اس وجہ سے تھی کہ خدا نگرانی کر رہا ہے، وہ بھی حضور ﷺ کے اپنے کیریکٹر کی بنا پر نہیں تھی (معاذ اللہ)۔ جو کسی کی نگرانی کی وجہ سے صحیح کام کرتا رہتا ہے، وہ مزدور جس کے سر پر آپ کو دن بھر کھڑا رہنا پڑے کہ وہ کام کرتا رہے تو کیا وہ دیا نندار مزدور کہلاتا ہے؟ نگرانی کی بنا پر اگر کسی سے لغزش نہ ہو، تو کیا اس کو اس کا کریڈٹ جاتا ہے؟ کیا یہ کیریکٹر کہیں گے؟ اور اس کے بعد پھر خدا کی حکمت عالیہ بھی کہ کبھی کبھی وہ ان سے یہ لغزش ہو جانے دیتا تھا، یہ نہیں

① تو کہاں تھی؟ کیا اندھی ہو؟ کیا دیکھتی نہیں ہو کہ بچہ گر گیا ہے؟ وہ کہنے لگی: میں ہنڈیا میں ڈوئی چلا رہی تھی۔ میں اسے کیا کروں؟

② کوئی بات نہیں جی! کرنے دو۔

ہے کہ وہ اس سے بے احتیاط ہو جاتا تھا یا غافل ہو گیا تھا، نہیں، یہ لغزش ہو جانے دیتا تھا، اب جب نہیں ہوتی تھی تو اس کا کریڈٹ ان کو نہیں جاتا، جب یہ ان سے لغزش ہوئی ہے تو خدا کی اس حکمت بالغہ کے اوپر بقول ان کے کہ لوگ کہیں کہ یہ انسان ہی ہے لوگوں کو کیسے یہ پتہ چلے کہ خدا نے ہو جانے دی ہے اس نے خود نہیں کی، اور یہ اس کو کیسے Explain (واضح) کریں کہ صاحب! یہ میں نے نہیں کی اس نے ہو جانے دی ہے، سارے تو اسی کی طرف منسوب کریں گے، جی کہیں گے کہ یہ انسان ہے۔ معلوم ہے یہ کون انسان ہے، کون رسول ہے؟ اسے غور سے سنیے۔

## آپ حضور ﷺ کی چالیس سالہ زندگی آخر کس چیز کی شہادت تھی؟

عزیزانِ من! حضور ﷺ کی چالیس سال کی عمر اس سے پہلے بھی گزری تھی۔ نبوت تو اس کے بعد آئی ہے، وحی تو اس کے بعد آئی ہے، اسلام تو اس کے بعد آیا ہے اس کی پہلی زندگی تو اس طرح اسلام کی نہیں ہے۔ جب دشمن پوچھتے ہیں کہ آپ کے پاس اس دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا ہے کہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں؟ وہ رسول اپنی اس پہلی زندگی کے متعلق کہتا ہے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (10:16) میں نے تو یہ پورا چالیس سال کا عرصہ تمہارے اندر گزارا ہے، میری اس زندگی سے تم پہچان نہیں سکتے کہ یہ سچ کی زندگی ایسی ہوتی ہے یا جھوٹے کی۔ اللہ اکبر! وہ نبوت سے پہلی زندگی کو اپنے دعوے کی صداقت کے ثبوت میں پیش کر رہا ہے اور ان دشمنوں میں سے کوئی ایک بھی یہ کہنے کے لیے انگلی نہیں اٹھاتا کہ ہاں، تمہاری زندگی میں یہ یہ چیزیں ہم نے ایسی دیکھی ہیں۔ آپ ﷺ کی اتنی پاکباز زندگی تھی۔ بعد کی زندگی کے متعلق جب آپ ﷺ نبی ہو گئے ہیں تو بقول ان کے اگر وہ کوئی لغزش نہیں کرتے تو وہ خدا کی نگرانی کی وجہ سے ہے۔ اور پھر لغزشیں ہو رہی ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ ان سے لغزش ہونے دو تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ انسان ہی ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے، خود خدا نے بتایا ہے۔ تمہارے انسان ہونے کا ثبوت ان کو کیسے مل رہا ہے: یہ خود کہہ رہے ہیں کہ یہ انسان کیسا ہے؟ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، ہماری طرح کھانا پیتا ہے، اس کے بال بچے بھی ہیں، سودا سلف خریدتا پھرتا ہے، یہ کس قسم کا انسان ہے؟ اور اس کے جواب میں حضور ﷺ وحی کی زبان میں فرماتے ہیں، خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ تم مجھے سپر نیچرل، سپر ہیومن، کیوں سمجھتے ہو، میں تمہارے جیسا انسان ہوں۔ رسول کے بشر ہونے کے دعوے کے ثبوت میں خدا نے یہ دلیل دی ہے تو ان کے نزدیک یہ دلیل کافی نہیں تھی۔ اصل میں ثبوت اور دلیل یہ تھی کہ ان سے کبھی کبھی گناہ ہو جاتا تھا اور پھر لوگ سمجھتے تو اتنا ہی سمجھتے کہ یہ ایک انسان ہے (معاذ اللہ)۔ پھر لوگ اس کو کس قسم کا انسان سمجھتے؟

عزیزانِ من! یہ ہے وہ اسلام یہ ہے وہ سیرت رسول اللہ ﷺ کی جو ہمارے ان نئے نوجوانوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس معاملے میں معاف رکھے، آپ سوچ لیجیے اس کے باوجود بہت سے دوست کہا کرتے ہیں کہ صاحب! تم تو ان کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہو۔ بتائیے کہ یہ کچھ دیکھنے کے بعد بھی کیا یہ ناموس پیغمبر ﷺ کا تقاضا نہیں ہوتا ہے کہ اس کی تردید میں کہا جائے۔

## ذنب کا مفہوم قرآن حکیم کی روشنی میں

عزیزانِ من! میں یہ باتیں ناموس پیغمبر ﷺ کے لیے زبان پہ لاؤں، یہ بہت ضروری ہے۔ آخر میں کس طرح یہ سب کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے بعد خاموش رہوں! بات پھر یہ ہوئی کہ پھر خدا نے یہ کیا کہا ہے: مَا تَقَدَّمُ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرُ (48:2)۔ یہ اس کا

ترجمہ کرتے ہیں تاکہ بخشے جائیں پہلے بھی گناہ سے اور آنے والے بھی گناہ سے۔ عزیزانِ من! ذنب کا ترجمہ پوچھو عربوں سے کہ بات وہ کیا ہے، ترجمہ وہ کیا کرتے تھے۔ ذنب کے لفظ کے بنیادی معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ یہ جسے آپ مولیشی کی دم کہیں گے وہ دم پیچھے لگی ہوئی، چپکی ہوئی ہے، الگ ہی نہیں ہوتی۔ ہر وہ بات جو کسی کے پیچھے اس طرح چپک جائے کہ وہ جہاں جائے اس کے ساتھ ساتھ جائے، یہ ذنب ہے۔ یہ قوم بلا تھی اسے وہ بنیادی طور پر ذنب کہتے تھے اور اس کے بعد کہتے تھے کہ کسی کے خلاف الزامات، اتہامات، تہمتیں بہتان جو تراش کے چپکا دیئے جائیں اور ایسے طور پر پروپیگنڈہ کیا جائے کہ وہ بیچارہ جہاں جائے وہ اس کے پیچھے چلتا رہے، جیسے مولیشی کی دم چپکی رہتی ہے۔ وہ اسے ذنب کہا کرتے تھے۔ جس کی جمع ذنوب ہے، سارا قرآن بھرا پڑا ہے کہ یہ تیرے متعلق کیا کچھ کہتے ہیں: ساحر ہے، جادوگر ہے، مسحور ہے، کسی نے جادو کر دیا ہے، کاہن ہے، یہ کچھ کرتا پھرتا ہے، اپنا کچھ مقصد ہے، شاعر ہے، اور پھر شاعری کے متعلق بھی ان کا اپنا ایک تصور تھا حالانکہ شاعروں کو وہ اتنا اونچا سمجھتے تھے۔ شاعروں کے متعلق کہتے تھے کہ تَسْرَبُصُ بِهِ رَيْبَ الْمُنُونِ (52:30) فکر کی کوئی بات نہیں ہے، شاعری کی طرح یہ چند دن گرمجوشیاں پیدا کرے گا، زمانے کی گردشیں اسے خود مٹا دیں گی، کیوں فکر کرتے ہو۔ یہ سارے اتہامات جو لگائے جاتے تھے یہ سارے الزامات تھے جو چپکائے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں لفظ بھی چپکا نا ہے، ان کے متعلق ساری عمر یہ کہا۔ اب بات سمجھ میں آئی۔ کہا کہ یہ کچھ کہتے تھے کہ یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، یہ شاعری ہے، مذہبی پیشوائیت ہے، کہانت ہے، محض نظر بندی ہے۔ یہ لوگ یہ کچھ کہتے تھے۔ خدا نے کہا کہ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا (48:1) یہ ایسی عظیم فتح تمہیں حاصل ہوئی ہے کہ لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ (48:2) جتنے الزامات اس سے پہلے لگاتے تھے وہ بھی اس نے دھو دیئے۔ اس کے بعد بھی جو لگائیں گے وہ بھی دھل جائیں گے۔ اس کی وجہ سے فتح عظیم تو دیکھ۔<sup>1</sup> Nothing succeeds like success یہ صلح حدیبیہ کا وقت ہے۔

① کامیابی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔

عزیزانِ من! فتح کے معنی ہیں دروازے کھول دینا۔ یہ لفظ فتح بھی یہاں عجیب ہے جو قرآن نے کہا ہے اگرچہ اس خاص حدیبیہ کے مقام پر جسے ہم یہ میدانِ جنگ میں فتح کہتے ہیں، وہ نصیب نہیں ہوئی تھی بلکہ صلح حدیبیہ کے اندر آنے والی فتوحات کے دروازے کھول دیئے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تمہارے لیے فتوحات کے ایسے دروازے کھولے ہیں کہ اس کے بعد، اور اس سے پہلے، تیرے خلاف یہ جتنے بھی پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے الزامات و اتہامات چپکایا کرتے تھے یہ وہ بھی دھلا دے گی۔ اس کے بعد بھی یہ جو کچھ الزام لگائیں گے وہ سب بھی دھل جائیں گے۔ کہا کہ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ

نِعْمَتُهُ عَلَيْكَ (2-48:1) ہم نے (اے رسول!) تیرے لیے کامیابی و کامرانی کی واضح راہ کشادہ کر دی ہے اور ایک فیصلہ کن انقلاب عنقریب آنے والا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ یہ مخالفین تیرے خلاف جس قدر الزامات تراشتے، بہتان باندھتے اور غلط باتیں تیری طرف منسوب کرتے ہیں یا اس کے بعد کریں گے اُن کے مضر اثرات سے تیری حفاظت کا سامان ہو جائے۔ یہ کامیابیاں تیرے دعوے کی صداقت کی زندہ شہادت بن جائیں گی اور اس طرح ان کے سامنے ان تمام باتوں کا حتمی جواب آ جائے گا جو یہ اس وقت تیرے خلاف کرتے ہیں۔<sup>①</sup> اور یوں اللہ اپنی نعمتوں کا اتمام تیرے اوپر کر دے گا۔ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۖ وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَازِمًا (3-48:2)۔ کیا بات ہے آیتوں کی! تم دیکھو گے کہ کس طرح خدا کی فتح نصرت تمہارے ساتھ ساتھ چلتی ہے کس قدر کامیابیوں پہ کامیابیاں تمہیں نصیب ہو جاتی ہیں۔ ان اتہامات و الزامات کا جواب دینے کا طریقہ یہ تھا، ہم نے جو تمہیں روک رکھا تھا کہ اپنا وقت اور توانائی مت ضائع کرو، ان کو کرنے دو وہ اس لیے تھا کہ حقیقت میں اس کی Rebuttal یعنی تردید یوں ہونی ہے۔ یہ ہے وَ كَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِهِ عِبَادَةً خَيْرًا ③ (58:25) کا ترجمہ۔

سورۃ الفرقان کی آیت 58 تک ہم آگئے 59 ویں سے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

- ① اس سے مراد وہ چھوٹی چھوٹی نادانستہ کوتاہیاں بھی ہو سکتی ہیں جو نظام خداوندی کے مشکل کرنے کے سلسلے میں سرزد ہوں (حوالہ: پرویز: مفہوم القرآن: طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ص۔ 1194۔ فٹ نوٹ 1)۔
- ② اور یوں تو اپنے قافلے سمیٹ زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ پر گامزن رہے گا۔ یعنی خدا تجھے بڑا زبردست غلبہ عطا کر دے گا (اور اس طرح یہ سب دیکھ لیں گے کہ بالآخر حق غالب آتا ہے اور باطل مغلوب ہو جاتا ہے (مفہوم القرآن، ص۔ 1194)۔
- ③ اور اس کے بعد تم اس کی بھی پرواہ مت کرو کہ یہ لوگ تمہارے خلاف کیا کیا تہمتیں تراشتے اور الزامات لگاتے ہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ اس کے بندوں میں سے کون کیا کرتا ہے اور اُس کے خلاف کیا کیا تہمتیں لگتی ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 828)۔

اسی سلسلے میں اب اگلی آیت میں ہے کہ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَسُئِلَ بِهِ خَبِيرًا (25:59)۔ اس خارجی کائنات کو ارض اور سماوات کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے پستیاں اور بلندیاں کہتا ہے۔ کہنے کو تو اس نے سما و اراض کہا ہے بلندی اور پستی خود ہی کہا ہے۔ دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ کائنات میں یہ جو

کرتے تمہیں نظر آتے ہیں یا جو کائنات کے اندر موجود ہیں انہیں تو ہم نے بلند اور پست کہا ہے۔ بظاہر تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ بلند بلند ہے اور پست پست ہے۔ لیکن یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ اس میں کہا کہ یہ بلند اور پست ایک Relative Term (اضافی چیز) ہے۔ ہر بلندی کی ایک پستی ہوتی ہے اور وہ پستی اپنے سے نیچے والے کی بلندی ہوتی ہے۔ ہر سما کی ایک ارض ہوتی ہے قرآن نے کہا ہوا ہے۔ تو یہ جو کرتے اس طرح سے خلا کی پہنائیوں میں تیر رہے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ اگر ایک اونچا ہے اور دوسرا اس سے نیچے ہے تو وہ اس کی ارض بن جاتا ہے اور یہی ارض جو ہے اپنے نیچے والے کی سما ہو جاتا ہے۔ اس لیے بھی اس نے ان کو ہر سما کے لیے ایک ارض کہا ہے ہر ارض کے لیے ایک سما کہا ہے۔ ارض و سموات کے متعلق تو اس نے یہ کہا ہے۔

### کائنات کی ابتدا کے سلسلے میں انسانی عقل و شعور جواب دینے سے عاجز ہے

جہاں تک اس کائنات کی تخلیق کی ابتدا کا سوال ہے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی تو یہ وہ سوال ہے جہاں فکر انسانی کے لیے حیرت کے سوا کچھ نہیں۔ سائنس آج بھی اتنی ترقی کر گئی ہے ٹھیک ہے اس سے آگے بھی جتنا جی چاہے ترقی کرے یہ چیز سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی کہ ابتداء اس کا وجود کیسے عمل میں آ گیا۔ Nothingness کہتے ہیں جسے عدم کہتے ہیں یعنی کچھ موجود نہیں اس سے ایک شے وجود میں کیسے آ گئی اس لیے کہ سائنس تو یہی کہتی ہے کہ کچھ موجود ہوا اس میں کوئی تبدیلیاں پیدا کر کے کوئی نئی چیز بن سکتی ہے۔ یہ خلق ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہی یہ ہوتا ہے کہ مناسب Proportion (تناسب) سے مختلف چیزوں کو ملا کر ایک نئی چیز بنالینا۔ سائنس یہیں تک ہی ہے خواہ ابتدا کے لیے یہ انرجی (Energy) تک کیوں نہ پہنچ جائے لیکن انرجی کو بھی ان کو موجود ماننا پڑتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ یہ انرجی کہاں سے آ گئی۔ چلے جائے پیچھے جتنا جی چاہے پیچھے چلے جائے کوئی مقام تو ایسا آئے گا کہ جس کے پیچھے آپ کو ماننا پڑے گا کہ کچھ نہیں تھا اور یہ وجود میں آ گئی۔ یہ ہے وہ مقام جہاں سب سے بڑا سائنسدان یہی کہتا ہے کہ ہم اس مقام پہنچے ہیں جہاں پہلے دور کا جاہل انسان تھا کہ یہ جو ابتدائی وجود ہے وہ نیست سے عدم سے کیسے پیدا ہو گیا کیسے وہ وجود میں آ گیا اور یہ ہے جہاں قرآن نے بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (2:117) کہا ہے جہاں فَاطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (12:101) کہا ہے یعنی عدم سے وجود میں لانے والا۔ آگے خالق آتا ہے اور وہاں یہ کہا ہے کہ وہاں تم اتنا ہی سمجھ سکتے ہو کہ اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ (19:35) وہ اس کا عالم امر ہے وہ ایک ارادہ ہوتا ہے اور اس ارادے کے ساتھ ہی وہ شے اپنی ابتدائی شکل کے اندر وجود میں آ جاتی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہر بڑے سے بڑے سائنٹسٹ کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ ابتداء کوئی شے عدم سے وجود میں آ جاتی ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس طرح آ جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس شے کو وجود میں لانے والے کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ماننا پڑتا ہے۔ خدا پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ یہ خود بخود یعنی By



chance (اتفاقہ) تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ جو اس میں ابتدائی چیز ہے آپ دیکھیے کہ وہ ایک شے عدم سے وجود میں آتی ہے پہلے سے موجود جو اشیاء ہیں ان میں کوئی دوسری شے نہیں بنتی۔ آگے چل کے پھر یہ جو سلسلہ ہے وہ جاری ہو جاتا ہے اور پھر جاری رہتا ہے۔ وہ جو پہلی چیز ہے اس کے لیے اس نے یہ کہا ہے کہ وہ جو کائنات کو وجود میں لایا ابتدا تو اس کی یہ ہے کہ عدم سے وجود کے اندر وہ پہلا ابتدائی ہیولا (ہیولی) جسے آپ کہہ لیجیے، ازجی کہہ لیجیے وہ تو وجود میں آگئی۔ آج کی سائنس بھی یہ بتاتی ہے کہ پھر آہستہ آہستہ مختلف Stages (مراحل) سے گزرتی ہوئی، مختلف منازل سے گزرتی ہوئی، اس نے یہ مختلف شکلیں اختیار کیں۔

### کائنات کی ابتدا ایک ہیولی سے ہوئی

یہ جو ہماری موجودہ کائنات ہے یہ پہلے ہی ”کن“ (19:35) سے اسی قسم کی نہیں بن گئی تھی بلکہ پہلے اس کا ابتدائی ہیولی وجود میں آیا اور پھر وہ مختلف منازل میں سے بتدریج گزرتی ہوئی، پہلو بدلتی ہوئی جسے تبدیل و تحول کہتے ہیں، اس طرح سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، آہستہ آہستہ اس نے یہ شکل اختیار کی۔ یہ ہے وہ چیز۔ قرآن میں جسے سبتہ ایام کہا گیا ہے تو اس میں ایام کے معنی یہ جو بیس گھنٹے کا دن ہی نہیں ہے۔ اس سے مراد عربی زبان کے اندر منزل، پیریڈ، Era، زمانہ، عہد ہے۔ ان میں سے ہر چیز کے لیے ان عربوں کے ہاں یوم کا لفظ آتا ہے۔ جہاں بھی آپ ٹائم کا کوئی بھی Concept (تصور) لیں گے ان کے ہاں اس کے لیے یوم کا لفظ آئے گا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ کائنات پہلے ہی دن اس شکل میں وجود میں نہیں آگئی تھی، ابتدائی ہیولی سے آہستہ آہستہ منزل بمنزل، بتدریج، ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی یہ اس شکل کے اندر آئی۔

### موجودہ کائنات لمحہ بہ لمحہ پھیل بھی رہی ہے اور سنورتی بھی جا رہی ہے

یہ کائنات اب بھی مکمل نہیں ہوئی بلکہ اس میں اب بھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اب بھی یہ اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ آگے چل کر ابھی اس نے کیا ہو جانا ہے۔ قرآن میں یہ ہے کہ وہ اس میں اضافہ بھی کرتا رہتا ہے اور اسے سنوارتا بھی رہتا ہے۔ اس طرح سے یہ مختلف مراحل و منازل سے گزرتی ہوئی اور آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ متعدد ایام یا ادوار سبتہ ایام کہلاتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (25:59)۔ اس آیت کے عام ترجمے کے اعتبار سے تو اپنے ہاں آپ پھر دیکھیں گے کہ ”پھر وہ خدا عرش پہ بیٹھ گیا“، یعنی اس نے یہ کچھ بنالیا اور بنانے کے بعد پھر وہ فارغ ہو گیا اور عرش پہ بیٹھ گیا۔ اب وہ عرش پہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہ کائنات نیچے جا رہی ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہم عربوں سے اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے معنی پوچھ لیتے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ ساری الجھنیں ان ترجموں نے پیدا کر دی ہیں۔

## ہمارے ہاں کے مفسرین کے نزدیک ”عرش“ کی کیفیت

بقول ہمارے ہاں کے مفسرین کے عرش تخت کو کہتے ہیں۔ تخت اس طرح سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ عام تخت چھوٹے ہوتے ہیں خدا کا تخت بہت بڑا ہوتا ہے۔ فرشتے اس کو اٹھائے ہوئے ہیں اور اگر وہ روایات میں لیں تو پھر تو پوچھو ہی نہیں کہ پھر وہ تخت کہاں بناتے ہیں کیسے بناتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ ترمذی کی حدیث ہے کہ عرش کے متعلق پوچھا گیا کہ یہ کیا ہے۔ نظر آ رہا ہے کہ یہ حدیث حضور ﷺ کی تو نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمارے ہاں کے مفسر آسمان کو شیشے کا ڈل کہتے ہیں۔ اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے کہا کہ یہ ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے پھر اس کے بعد دوسرے آسمان اور تیسرے میں ہے اس طرح سے چھ آسمان ہیں ان کے اوپر ایک سمندر ہے اُس سمندر کی گہرائی بھی پانچ سو سال کے فاصلے کی ہے۔ اس سمندر کے اندر چھ پہاڑی بکرے کھڑے ہیں۔ وہ اتنے اتنے بڑے ہیں کہ سمندر کے اندر یہ سمندر جو پانچ سو سال کی گہرائی کا ہے اس کا پانی ان کے گھٹنوں تک آتا ہے تو اس کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ٹکا ہوا ہے۔

## عرش کے معنی کائنات کا مرکزی کنٹرول ہے

آپ فرمائیے کہ اب آپ کے ہاں کی یہ روایات میں ہیں۔ آپ تو ہنس لیتے ہیں۔ پوچھیے دنیا کے سامنے جب ہم یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو آپ غور کیجیے کہ دنیا اس کے متعلق کیا کہتی ہے اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ نہیں صاحب! وہ حضور ﷺ عالم الناس، علم کی اتنی بلندیوں کے اوپر تھے وہ تو یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے تو ایسا کہنے والے کو طحطا اور بے دین اور کافر اور نامعلوم کیا کیا بنایا جاتا ہے۔ بہر حال میں ثم استویٰ علی العرش کہہ رہا تھا۔ جب ہم بھی کہتے ہیں کہ وہ تخت نشین ہو گیا اس کا تختہ الٹ گیا، تو وہ سچ مچ اس قسم کا کوئی تخت پوش نہیں ہوتا کہ جویوں الٹ جاتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ”اقتدار چھن گیا“۔ عرب اسے صاحب اقتدار کہتے ہیں وہ بھی اقتدار کے لیے عرش کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ وہ صاحب اقتدار کہتے تھے۔ ثم استویٰ علی العرش کے معنی کسی تخت کے اوپر بیٹھ جانے کے نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ کائنات کا مرکزی کنٹرول اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اب یہ کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کارگہ کائنات اس قدر مجیر العقول ہے کہ یہ کسی کے ذہن میں ہی نہیں آ سکتا اور جس نظم و ضبط کے ساتھ یہ چل رہا ہے وہ بھی بڑا مجیر العقول ہے۔ بڑے بڑے سائنسٹ اس کا ایک حصہ بھی نہیں پاسکے۔ نیوٹن<sup>1</sup> کہتا ہے کہ ”ہم علم کے سمندر کے کنارے پہ بچوں کی طرح کوڑیاں چن رہے ہیں“۔ اتنا بڑا سائنسٹ ہے اس کی کیفیت یہ ہے۔ یہ کارگہ کائنات اس نظم و ضبط کے ساتھ جو چل رہا ہے تو اس کے پیچھے ایک قوت ہے اقتدار ہے جو اس کو اس طرح سے چلا آ رہا ہے۔ ذرا سا اس کنٹرول کے اندر Relaxation (نرمی و تخفیف) ہو جائے، ڈھیل پیدا ہو جائے، تو پوچھو نہیں کہ یہ سارا کائنات کا سلسلہ آپس میں ایک دوسرے سے نکل کر پاش پاش ہو جائے۔

اس قدر مجیر العقول سلسلہ کائنات پر کنٹرول کا مالک ہونے کے باوجود وہ الرحمن ہے

یہ استویٰ علی العرش کیا چیز ہے؟ جس کا کنٹرول اس نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا ہے؟ وہ کون ہے جس نے یہ لیا؟ وہ ہے الرحمن۔ اب یہ لفظ یہاں (25:59) میں عجیب چیز ہے۔ اب یہی چیز ہے کہ الرحمن ہے کیا؟ ہے کون؟ یہاں خاص طور پر الرحمن کیوں کہا گیا؟ بات تو اس نے کہی کہ **فَسُئِلَ بِهِ خَبِيرًا** (25:59) اس کی بابت اس سے پوچھ جسے اس کا علم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ علم توحی کے ذریعے سے ہی مل سکتا تھا تو یہی کہا گیا ہے کہ یہ جو صاحبِ وحی ہے اس سے پوچھ یعنی وحی خداوندی سے ہی پوچھ خود خدا سے ہی پوچھ۔ جب وہی جو خداوندی کا محور ہے اس سے پوچھا جائے گا تو وہ توحی سے ہی پوچھنے کی بات ہوگی **فَسُئِلَ بِهِ خَبِيرًا** (25:59) جس کو اس کی خبر ہے اس سے پوچھ کہ الرحمن کیا ہے اور پھر وہ خبر والی بات جو میں نے عرض کیا ہے وہ توحی کے ذریعے ہے وحی کو خود بتانا ہوگا کہ یہ الرحمن کیا ہے اور وحی نے واقعی بتایا ہے کہ الرحمن کیا ہے۔ سوال تو یہی ہے کہ اس نے وحی کو سمجھنے کا جو طریق بتایا ہے اس سے سمجھا جائے تو بات سمجھ میں آئے گی کہ الرحمن کیا ہے۔ کہا ہے کہ اس سے پوچھ جس کو اس کی خبر ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) تو پوچھنے کے لیے اور ہی کچھ کہتا ہے:

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی

تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

(بالِ جبریل)

”پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی“ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ فطرت کی ہر شے صاحبِ منزل ہوتی ہے صحیح راستے پہ جاتی ہے اس لیے اس سے پوچھ۔ وہ کہتا ہے کہ **فَسُئِلَ بِهِ خَبِيرًا** (25:59)۔ پوچھ اس سے <sup>②</sup>۔ بات غور طلب ہوگئی جس میں وہ خود کہتا ہے کہ پوچھ اس سے کہ جس کو اس کی خبر ہے۔ وحی سے پوچھ صاحبِ وحی سے پوچھ۔ لفظِ رحمن یوں تو ہر سورۃ <sup>③</sup> کی ابتدا میں جسے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہتے ہیں

① Newton, Sir Isaac (1642-1727)

② جو وحی خداوندی کی روشنی میں عقل و بصیرت سے کام لیتے ہوئے اسرار و رموز کائنات سے باخبر ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 828)۔

③ سوائے سورۃ التوبہ۔

آیا ہے سورۃ فاتحہ کی ابتدا بھی اس سے ہوتی ہے: **الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** o **الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ** (1:1-2) اس میں رحمن اور رحیم <sup>①</sup> دونوں آتے ہیں۔ آپ ترجمہ دیکھیے: رحیم مہربان، رحمن بڑا مہربان۔ اس سے کیا بات سمجھ میں آئی؟ بات کچھ ایسی تھی جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ **الرَّحْمَنِ فَسُئِلَ بِهِ خَبِيرًا** <sup>②</sup> (25:59) اس الرحمن سے پوچھ پھر بات سمجھ میں آئے گی۔ یہاں بات سمجھ میں یہ آئی کہ وہ رحم کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

## حضرت ابراہیم ♦ کے خاندان کا ذکر خیر اور ان کی خدمات

عزیزانِ من! میں ہر بار کہا کرتا ہوں کہ حضرت ابراہیم ♦ کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا حضرت اسماعیل ♦ تھا۔ اس سے چھوٹے اسحاق ♦ تھے۔ مشیت کے پروگرام کے مطابق، شام اور فلسطین کے سبزہ زار اور وہاں کی عظیم الشان مملکت، تو اس چھوٹے بیٹے حضرت اسحاق ♦ کے سپرد کر دی گئی اور حضرت اسماعیل ♦ جو بڑے بیٹے تھے، انہیں اس وادی غیر ذی زرع میں بسا دیا کہ جہاں سبزی کا بھی نام نہ تھا، روئیدگی کا بھی نام نہیں تھا، کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا۔ یہاں بسا دیا اور اس سارے دوران میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ بنی اسرائیل تھے، جو حضرت اسحاق ♦ کے بعد آئے، حضرت یعقوب ♦ کی اولاد کہلائے۔ بنی اسرائیل میں تو شوکت داؤدی اور سطوت سلیمانی جیسی چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ وہ قوم بڑی بلندیوں پر پہنچی۔ یہ جو عرب میں قوم اسماعیل ♦ ہے، یہاں جو مکے کے ارد گرد بس گئی، ان کی ویسے کوئی تاریخ ہی نہیں ملتی۔ نہ ان میں حکومت آئی، نہ کوئی مملکت ملی۔

## عربی زبان کی وسعت و کیفیت کا تذکرہ

عجیب چیز ہوئی کہ انہیں قوم اسماعیل ♦ کو یہاں بسا دیا۔ پھر کیا ہوا؟ یہ کہ اس سارے دوران میں، جو دو ہزار سال سے بھی زیادہ کا عرصہ گزرا ہے، یہ یہاں کیا کرتے رہے؟ ایک ہی چیز نظر آتی ہے کہ یہ ایسی زبان بناتے رہے جو قرآن کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اس زبان کے متعلق آپ یورپ کے مستشرقین سے پوچھیے، جنہوں نے علم الاسنہ پر تحقیق کی ہے۔ اُن میں ایک رچرڈ مورس بک (Richard Maurice Bucke) بھی ہے۔ وہ اس کے متعلق لکھتا ہے۔ ان لوگوں نے جتنی تحقیقات کی ہیں، ہم نے اتنی تحقیق نہیں کی ہے۔ اس نے اس دور کی دنیا بھر کی ہم عصر زبانوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ اس کے ہزاروں کیا دس ہزارویں حصے کے برابر دنیا

① رحمن اور رحیم کی مکمل تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الفاتحہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2007ء، ص 74 تا 77، 104 تا 116

② اگر تو خدائے رحمن کے نظام ربوبیت کے متعلق فی الواقعہ کچھ جاننا چاہتا ہے تو کسی ایسے شخص سے پوچھ جو (حی خداوندی کی روشنی میں، عقل و بصیرت سے کام لیتے ہوئے، اسرار و رموز کائنات سے) باخبر رہتا ہے۔ نیز جو کچھ تجھے مانگنا ہے اس خدائے رحمن سے مانگ جو جانتا ہے کہ کس شے کو اپنی نشوونما کے لیے کس کس سامان کی ضرورت ہے (55:29)۔ (تمہاری ہر مانگ اس کے نظام کی طرف سے پوری ہوتی۔) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 828)۔

کی کوئی زبان نہیں پہنچ سکتی جو عربوں کی زبان ہے۔ وہ تو تحقیق ہی عجیب و غریب قسم سے کرتے ہیں۔ وہ تو زبانوں سے قوموں کی تہذیب، تمدن، تخیلات اور تصورات، ان تمام کو گنا دیتے ہیں۔<sup>①</sup> انہوں نے اس سے یہ کیا ہے لیکن میں تو صرف زبان کی بات کہہ رہا تھا کہ عربوں نے اس سارے دوران میں اپنی زبان کو اس قدر جلادی کہ وہ اپنے آپ کو بجا طور پر، عرب (یعنی فصیح البیان) اور دوسروں کو عجم (یعنی گونگے) کہا کرتے تھے یعنی یہ ایک زبان بنانے کے لیے لگے رہے۔ اصل میں اس قرآن کریم کو دنیا میں نازل کرنے کی دنیا کو

دینے کی، تیاریاں ہو رہی تھیں اور یہ تو بہر حال زبان میں ہی دیا جانا تھا تو گویا زبان اس کے لیے ایسے چاہیے تھی<sup>2</sup> اور وہ<sup>3</sup> مستشرق کہتا ہے کہ کوئی دوسری زبان اس کے ہم پایہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

اس زمانے میں ایک تو عربوں کی زبان کی وسعت<sup>4</sup> بہت زیادہ تھی جیسے وہ کہتے ہیں کہ اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ ہیں، یہ مرادفات نہیں تھے: اونٹ کہہ لیا تو کیا ہے، شتر کہہ لیا تو کیا ہے۔ بالکل نہیں، عربی زبان میں مرادفات ہوتے ہی نہیں ہیں کہ ایک ہی معنی کے لیے دو لفظ ہوں وہ کہتے ہیں کہ یہ تو زبان کا نقص ہے۔ ہر لفظ میں دوسرے لفظ کے ساتھ کوئی شید کا فرق ہوتا تھا، یہ الفاظ ہم معنی نہیں ہوتے تھے۔ عزیزان من! جب تک یہ نہ پڑھا جائے وہ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ بالآخر یہ اونٹ کے لیے اتنے ہزار لفظ کے کیا معنی ہیں اور پھر ایک لفظ کا معنی دوسرے سے نہیں مل رہا تو اس کی ہر ادراہ انداز کے لیے کچھ الگ الگ چیزیں ہوں گی۔ وہ تو

① ماہرین علم الاسماء کے پیش کردہ نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر تاریخ کے کسی خاص دور میں کسی قوم کی ذہنی سطح کا اندازہ لگانا ہو تو دیکھنا یہ چاہیے کہ اس دور میں اس قوم کی زبان میں کتنے الفاظ ایسے تھے جو تصورات (Concepts) کے مظہر تھے۔

② جو ایک طرف ایسی سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے مستفید ہو سکیں اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُر معنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔ (حوالہ: جیولین کیسلے: نیویارک ٹائمز 22 اگست 1952)

③ یہ اشارہ Julian Huxley (1887-1975) کی طرف ہے۔

④ اس ضمن میں ایک تحقیق یہ بھی ہے۔ ہندی، یورپی (Indo-European) زبانوں میں جس قدر الفاظ مروج ہیں ان کے تصوراتی مشتقاق (Root- Concepts) کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک سو اکیس (121) تک پہنچتی ہے اور تو اور جس زمانے میں سنسکرت ایک زندہ زبان تھی، اور سورج اور آگ کو دیوتا مانا جاتا تھا اُس زمانے میں اس زبان میں سورج کے لیے کل سینتیس (37) الفاظ تھے اور آگ کے لیے پینتیس (35)۔ اس کے برعکس عربوں کو دیکھیے تو ان کے ہاں شہد کے لیے اسی (80) الفاظ، سانپ کے لیے دو سو (200)، شیر کے لیے پانچ سو (500)، تلوار کے لیے ایک ہزار (1000) اور اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ موجود تھے (حوالہ: پرویز (1960)۔ لغات القرآن جلد اول۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص 5)۔

بڑی وسیع چیز ہے، یہ Scientific Language (سائنسی زبان) ہے کہ ساری زبان میں جو Roots ہیں جنہیں مادہ<sup>1</sup> کہا جاتا ہے، وہ ہر لفظ کی جڑ ہے۔ یہ مادے عام طور پر بڑے تین حرفی ہوتے ہیں، تین سے زیادہ حروف والے مادے نسبتاً کم استعمال ہوتے ہیں اور پھر آگے چلتے ہیں۔ اس مادے سے الفاظ بنتے ہیں۔ الفاظ بھی یہ نہیں ہیں کہ انہوں نے کچھ بڑھا دیا اور ہم نے دیکھ لیا۔ دراصل یہ الفاظ Scientific (سائنسی) طریقے سے بنتے ہیں۔ اسے وہ اوزان، وزن یا ابواب<sup>2</sup> کہتے ہیں۔ وزن ان کے ہاں خاص ہوتے ہیں۔ اب

یہ کیا چیز ہے؟ ایک ہی مادے سے ایک وزن کے اوپر جتنے لفظ آئیں گے ان کے اور معنی ہوں گے اور اسی مادے سے دوسرے وزن کے اوپر اگر کوئی لفظ بنے گا تو اس کے اور معنی ہوں گے لیکن شید وہی رہے گا جو اس مادے (Root) کے اندر موجود ہے۔ بہر حال چند لفظوں میں یہ سمجھنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

### لغت کے انداز میں رب العلمین، الرحمن اور الرحیم کا مفہوم

میں یہاں رحمٰن کے متعلق بتا رہا ہوں رَبِّ الْعَالَمِينَ o الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (1:1-2)۔ اس میں رحمٰن اور رحیم کے الفاظ آئے ہیں۔ ان دونوں کا مادہ تو ”رح م“ ہے۔ یہ وہی ہے جہاں سے رحم آیا۔ وہی ہے جس کے معنی ہیں ”اس قسم کی پرورش جو عام اسباب وغیرہ سے الگ ہو“ رحم مادر کے اندر بچے کی پرورش وہی بچہ جب چند مہینوں کے بعد اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی پرورش کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس سے جو انداز اس کا رحم مادر کے اندر ہوتا ہے فوراً بدل جاتا ہے۔ مادہ دونوں کا ایک ہے۔ اب لیجیے ان کی زبان۔ ان کی زبان میں ایک وزن ہے یا مادہ ہے۔ فَعِيلُ کے وزن کے اوپر کسی مادے سے جو لفظ بھی بنے گا اس کے معنی ہوں گے ”بتدریج وہ کام ہونا“ رفتہ رفتہ ہونا“ التزاماً ہونا“ اور پھر ہوتے چلے جانا“۔ فَعِيلُ کے وزن کے اوپر علیم اور کریم اور یہ جتنے ایسے آئیں گے اس میں یہ چیز پائی جائے گی۔

① عربی زبان میں ہر فعل (Verb) مادہ (Root) سے بنتا ہے۔ مادہ (Root) ان اصلی حروف کو کہتے ہیں جن کے بغیر فعل (Verb) کی پہلی شکل وجود میں نہ آ سکے۔ فعل کا مادہ کبھی تین حروف کا ہوتا ہے اور کبھی چار کا۔ اسماء کے مادہ میں پانچ اور چھ حروف بھی ہوتے ہیں۔ تین حرفی مادہ کو ثلاثی کہتے ہیں۔ یہ ثلاثی سے بنا ہے جس کے معنی ”تین“ ہیں۔ عربی زبان میں زیادہ تر ثلاثی افعال ہیں۔ چار حرفی مادہ کو رباعی کہتے ہیں۔ یہ اربعہ سے بنا ہے جس کے معنی ”چار“ ہیں۔ عربی زبان میں رباعی افعال کم استعمال ہوتے ہیں (پرویز: لغات القرآن، جلد اول 1960ء، ص 46)۔

② ہر نئی شکل جو فعل ماضی اور اس کے فعل مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں (زبر، زیر، پیش) سے مل کر بنے ”باب“ کہلاتی ہے۔ ماضی اور مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں کے اعتبار سے ثلاثی مجرد کے چھ ابواب مستعمل ہیں۔ ثلاثی مجرد کے علاوہ ایسے افعال جن میں اصلی حروف تو تین ہی ہوں لیکن ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں ثلاثی مزید کہلاتے ہیں۔ ان کے مختلف ابواب مختلف اوزان پر آتے ہیں جن میں بیشتر استعمال ہونے والے ابواب قرآن مجید میں بارہ ہیں۔ مثلاً باب تَفْعِيلُ ہے۔ اس باب سے مصدر تَفْعِيلُ کے وزن پر آئے۔ جیسے تَكْرِيمُ، تَنْزِيلُ (ماخوذ از پرویز: لغات القرآن، جلد اول 1960ء، ص 46-48)۔

اس آیت کے اندر رحیم آیا۔ رحیم کے معنی ہوئے ”بتدریج“، مسلسل، التزاماً، درجہ بدرجہ، پرورش بہم پہنچانے والا۔“ یعنی ایک سلسلے میں بتدریج۔ رحم مادر کے اندر ایک انداز سے پرورش ہوتی ہے اس میں اس بچے کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ ”رح م“ کا وزن ہے اور اس سے فعلان کا وزن ہے۔ اس فعلان وزن پہ جو لفظ بنے گا اسی مادے سے اس کے معنی ہوں گے ”وہی کام ہنگامی طور پر یکلخت ہو جانا“۔ رحمٰن جو ہے فعلان کے وزن پہ ہے رحیم فَعِيلُ کے وزن پہ ہے دونوں میں جو پرورش کے معنی ہیں وہ بنیادی ہیں وہ موجود ہیں: رحیم اس طرح

کی پرورش جو مسلسل ہوتی چلی جائے ایک انداز سے التزاماً ہوتی چلی جائے اور رحمٰن پرورش کا وہ انداز جو پچھلے انداز سے بدلا ہوا ہو اور ہنگامی طور پر یکلخت وجود میں آجائے۔ عزیزانِ من! رحم مادر کے اندر جو بچے کی پرورش ہوتی ہے ایک مسلسل انداز سے ہوتی ہے جو نہی وہ بچہ پیدائش کے بعد اس دنیا میں آیا اسی وقت جو پہلا سارا انداز ہے یہ بدل جاتا ہے۔ وہاں رحم تھا یہاں یہ رحم آ گیا۔ غور فرمایا یہ زبان کیا ہے!

### دنیا کی کوئی زبان قرآن حکیم کے الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکتی

غور فرمایا کہ پھر اس زبان میں قرآن کیوں اتر اور غور فرمایا کہ اس زبان سے پھر الفاظ کا جو انتخاب کیا ہے وہ خدا نے انتخاب کیا ہے۔ ان کی بنائی ہوئی زبان انتخاب خدا کا! وہ قرآن نہ بنتا تو پھر کیوں نہ بنتا! اس سے پہلے تو یہ چیزیں یونہی ذہنی سی ہی ذہن میں آتی تھیں کہ ہاں اچھا رحمیم یہ ہوتا ہے رحمٰن وہ ہوتا ہے۔ یہ جو میں بار بار کہتا ہوں کہ ترجموں نے جو بات کی ہے تو یہ ان ترجمے کرنے والوں کا نقص نہیں ہے بلکہ ہماری زبان کا نقص ہے۔ ہماری زبان میں الفاظ ہی نہیں ہیں اور ہماری ہی کیا دنیا کی کسی زبان میں الفاظ نہیں ہیں جو قرآن کے الفاظ کے Exact (بویہو) معنی دے دیں مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اب آپ نے سمجھا کہ میں نے قرآن کریم کا ترجمہ کیوں نہیں کیا۔ میں نے ”مفہوم القرآن“ لکھا ہے کیونکہ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا اور پھر جو قرآن نے کہا کہ جوں جوں کائناتی حقائق اور انسان کا علم وسیع ہوتا چلا جائے گا قرآن کی اصطلاحوں کے مفہوم سمجھ میں آتے چلے جائیں گے حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) ہماری یہ آیات یہ نشانیاں جو انفس و آفاق میں ہیں جوں جوں چشم بینا دیکھتی جائے گی قرآن کے حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ رحمٰن و رحیم کا فرق اس سے پیشتر ہمارے سامنے صرف لفظی فرق تھا اس دور میں آ کر ان دونوں کے معنی یوں متمیز ہوئے ہیں عزیزانِ من! کہ انسان وجد میں آ جاتا ہے۔

### سلسلہ کائنات کی تحقیق اور خدا کی رحمیت

سلسلہ کائنات کے متعلق اس دور کے سائنسٹ کی تحقیق یہ ہے کہ ابتداء ایک جرثومے سے کوئی چیز شروع ہوتی ہے جیسے زندگی ایک لائف سیل سے شروع ہوتی ہے۔ پھر وہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آہستہ آہستہ منزل بمنزل آگے بڑھتی ہوئی، شکلیں بدلتی ہوئی، خاصیتیں بدلتی ہوئی، نئے نئے پیکر اختیار کرتی ہے۔ جیسے یہ پہلا جرثومہ لائف سیل آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے انسانی پیکر میں آ گیا۔ یہ سارا سلسلہ التزاماً ہوتا ہے مسلسل ہوتا ہے۔ Progressive Evolution (تدریجی ارتقا) کہتے ہیں۔ ان سائنسدانوں کے ہاں ارتقا کے لیے Evolution کا لفظ ہے۔ یہ کسی چیز کا منزل بمنزل اوپر چلتے جانا ہے۔ اسے انگریزی میں Evolution (ارتقا) کہتے ہیں۔ ڈارون<sup>1</sup> نے اس کا تصور دیا تھا۔ پہلے ایک ہی قسم کا Evolution (ارتقا) سمجھی جاتی تھی ہمارے اس دور میں آ کر یہ آیا کہ

نہیں یہ ایک ہی قسم کی نہیں ہے۔ اس میں ایک قسم تو یہ ہے کہ کوئی چیز Progressively (منزل بمنزل) آگے بڑھتی چلی جاتی ہے بتدریج ہوتی جاتی ہے Gradually ہوتی ہے کڑی سے کڑی ملتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ یہ جو اس طرح سے، Gradually Progressively ہوتی چلی جاتی ہے تو یہ خدا کی رحیمیت ہے وہ اس طرح سے اس کی نشوونما کرتا چلا جاتا ہے لیکن ارتقا کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے۔ ایک دوسری بھی ہے۔

### لائبڈ مارگن کی تحقیق: فجائی ارتقا

اب اس دور میں آگے چل کر ایک نئی تحقیق ہوئی۔<sup>2</sup> اس کا امام لائبڈ مارگن (C.Lloyd Morgan) 1852-1936 ہے۔

① Darwin, Charles Robert (1809-82)۔ اس موضوع پر اس کی کتاب On The Origin of Species بڑی اہم سمجھی جاتی ہے۔ ڈارون نے کہا ہے کہ زندگی نے اپنی ابتدائی نمود نہایت پست سطح سے مختلف انواع (Species) کے ذریعہ کی۔ اس کے بعد ان تمام انواع میں ارتقا کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ارتقا خالصہ میکا کی قوانین کی رو سے ظہور پذیر ہوا۔ ان قوانین میں طبعی انتخاب (Natural Selection) ماحول کے ساتھ توازن (Adaptability to Environment) اور بقائے لاصلح (Survival of the Fittest) نمایاں خصوصیت کے حامل ہیں۔ یاد رہے Survival of the Fittest ڈارون کی اصطلاح نہیں ہے بلکہ ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کی ہے۔

② انواع (Species) میں بعض اوقات اس طرح تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں کہ ”مطابقت بہ ماحول“ (Adaptation to Environment) کا اصول ان کی کوئی توجیہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی بنیادی تبدیلیوں کو جدید ارتقا کی اصطلاح میں Mutation کہا جاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے علم نباتات میں Sports کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی ایک ہی قسم کے بیجوں سے بعض اوقات بالکل مختلف قسم کے پھول پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس انکشاف کا سہرا پروفیسر لائبڈ مارگن (Prof.Lloyd Morgan) (1852-1936) کے سر ہے جس کے نظریہ فجائی ارتقا (Emergent Evolution) نے ارتقائی سائنس میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نظریہ کی رو سے بعض اوقات ایک نوع، علت و معلول (Cause and Effect) کی کئی کڑیاں چھاند کر دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ارتقا کا میکا کی قانون منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر مارگن لکھتا ہے: ”اگر یہ پوچھا جائے کہ تم جس چیز کو فجائی (Emergent) کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اس قدر ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے بنے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہے کہ ان کی خصوصیات سے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کبھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ (Emergent Evolution)“ (حوالہ پرویز (2002)۔ انسان نے کیا سوچا؟ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ۔ ص 109 تا 110)۔

اس نے کہا کہ ایک Emergent Evolution (فجائی ارتقا) ہوتا ہے وہ ہنگامی ارتقا ہوتا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ارتقا میں کڑی سے کڑی ملتی ہوئی چلی آتی ہے مگر ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ درمیان کی کڑیاں گم ہیں اور اس میں سے ایک نئی چیز برآمد ہوگئی، یعنی ان کی تحقیق ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ درمیان کی کڑیاں گم ہو گئیں اور جوئی کڑی ہے وہ کیسے آگئی۔ وہ تو کڑی سے کڑی ملے تو پتہ چلے۔ یہ اس کے متعلق تحقیق کرتے رہتے ہیں کہ یہ چیلنج (تبدیل) ہوا اور اس میں سے نئی چیز پیدا ہوئی لیکن جب یہ درمیان کی کڑیاں ہی گم ہو جائیں اور دوسری نئی چیز جو ہو



وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ چیز ہوتی ہے مگر ہماری سمجھ میں تو نہیں آتی کہ یہ کیسے ہوتی ہے لیکن Evolution (ارتقا) میں یہ چیز ہو رہی ہے اور اس کا نام انہوں نے Emergent Evolution (نجائی ارتقا) رکھا ہے۔ یہ ارتقا کی دوسری قسم ہے۔

### سورۃ رحمن میں لفظ الرحمن کی وضاحت

قرآن نے وہ Gradual Evolution یا Progressive یعنی مسلسل چلا آنے والا ارتقا تھا اس کے لیے تو رحیم کا لفظ استعمال کیا ہے اور جہاں Emergent Evolution (نجائی ارتقا) آتا ہے وہاں الرحمن آ جاتا ہے۔ سورۃ رحمن جہاں سے شروع ہوتی ہے وہ اس کی بڑی بین مثال ہے۔ یہ علم انسانی By Evolution (ارتقا سے) آگے بڑھ رہا ہے لیکن اس میں ایک قاعدہ مقرر ہے ایک سلسلہ مقرر ہے۔ مشاہدہ تجربہ مطالعہ درس و تدریس یہی علم کا سلسلہ ہے۔ انسانی علم اپنی فکر سے غور و تدبر سے اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے پھر اس کے بعد تجربہ کرتا ہے پھر اس کے بعد جو اپنا تجربہ ہوتا ہے اس کا حاصل آگے منتقل کرتا ہے نسل بعد نسل یہ چیز ہوتی چلی آتی ہے۔ علم انسانی یہ ارتقائی منازل طے کرتا کرتا آگے آتا ہے۔ علم انسانی کا یہی سلسلہ ہے لیکن ایک علم خدا کی طرف سے نبی کو ملتا ہے۔ وہ اس سلسلے کا پیدا کردہ علم نہیں ہوتا وہ اس سے یکنخت مختلف ہوتا ہے اس میں اس کی فکر تجربہ مشاہدے مطالعے کو کوئی دخل نہیں ہوتا یہ ہنگامی طور پہ یعنی Emergent ہوتا ہے یہ یونہی یک لخت اچانک اس کو مل جاتا ہے۔ یہ ہے وحی کا سلسلہ۔ یہ وحی کا علم ہے اور کہا گیا ہے کہ الرَّحْمَنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ (55:1-2)۔

### قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت تو قدم قدم پر غور و فکر کی متقاضی ہے

عزیزانِ من! کیا عرض کروں پوچھیے نہیں میں تو پاگل ہو جاتا ہوں یہ خدا کی صفات ہیں۔ یہاں ہے الرَّحْمَنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ (55:1-2)۔ آپ دیکھ رہے ہیں خدا کا الفاظ کا جو انتخاب ہے وہ خود معجزہ ہے۔ جیسا قرآن نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر سوچا کرو یونہی نہ آگے بڑھ جایا کرو۔ ہمارے ہاں چونکہ سورۃ رحمن کے اندر خاص طور پہ ایک موسیقیت آتی ہے تو وہ پوچھو نہیں کہ قاری کس طرح اسے جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں: کوئی گھروں میں اور کوئی ترنم میں ہم تو اتنا ہی جانتے تھے۔ پہلے لفظ کے اندر آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن نے کیا کر دیا ہے! کیا بتا دیا ہے! قرآن نے عام علم انسانی میں اور وحی کی رو سے جو علم ملتا ہے اس میں ایک لفظ الرحمن کہہ کے امتیاز کر کے دکھا دیا۔ قرآن کریم نے کہا کہ الرَّحْمَنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ (55:1-2) اور الرَّحْمَنُ ۝ فَسُئِلَ بِهِ خَبِيرًا (25:59)۔ کہا کہ رحمن کیا ہے؟ فَسُئِلَ بِهِ خَبِيرًا (25:59) پوچھا اس سے جو اس کا واقف ہے جو اس کا علم رکھتا ہے جو اس کی خبر رکھتا ہے۔ وہ خدا ہے اس لیے خدا ہی سے پوچھ: فَسُئِلَ بِهِ خَبِيرًا (25:59)۔

إِسْ فَسْئَلُ بِهِ خَبِيرًا (25:59) کے متعلق ایک اور آیت بھی ہے۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ بات میں سے بات ہی خواہ نکلے، توجی نہیں چاہتا ہے کہ وہ سامنے آجائے اور اسے چھوڑ کر میں آگے بڑھ جاؤں۔ بہر حال ”میر جمیع ہیں احباب، حالِ دل کہہ لے۔“ زندگی کا کیا پتہ ہے جو ذہن میں ہے کہہ ہی دینا چاہیے۔ یہ اسی سورۃ الرحمن میں ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک بوڑھے ہوتے تھے۔ ان کو سورۃ عبد الرحمن کہا کرتے تھے۔ سورۃ الرحمن میں 29 ویں آیت بڑی اہم آیت ہے: يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (55:29)۔ ہمارے ہاں اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ”سماوات اور ارض میں جو کوئی بھی ہے وہ خدا سے سوال کرتا ہے“ اور كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (55:29) کا ترجمہ کیا جاتا ہے ”اور خدا ہر آن میں ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔“

ہمارے ہاں کل یوم ہو فی شان کا کیا جانے والا ترجمہ

كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (55:29) کا عام طور پر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ”خدا ہر آن میں ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔“ یہ تو خدا کے متعلق تصور صحیح نہیں ہے۔ خدا تو ایسی مکمل ذات ہے Personality (شخصیت) ہے اگر اسے آپ Self (ذات) کہنا چاہیں تو وہ Perfection (اکملیت) پہ پہنچا ہو Self (ذات) ہے۔ بہر حال اس کا وہ وجود اس کی وہ ذات، مکمل ترین ذات ہے۔ یہ جو Human Personality (انسانی ذات) ہے جو انسان میں ذات ہے اس ذات کے متعلق سائیکولوجی کی تحقیق Definitions (تعریف) میں یہ کہتے ہیں کہ Personality is changelessness in change<sup>1</sup> کہ شخصیت کا ننانی تغیرات کے اندر ایک

① ”انسانی ذات“ تغیرات کے ہجوم میں عدم تغیر کا نام ہے۔“ یہ نیکولاس باردیو (Nicholas Bardyaev) کے الفاظ ہیں۔ انسانی ذات اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور کسی کل کا جز نہیں ہوتی۔ اس باب میں باردیو لکھتا ہے: ”ایک ذات کا تعلق دوسری ذات سے خواہ وہ ذات ذاتِ خداوندی ہی کیوں نہ ہو جزو اور کل کا تعلق نہیں ہوتا۔ ہر ذات اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور کسی دوسری ذات میں مدغم نہیں ہو سکتی..... انسانی ذات کی انفرادیت خود اس فرد سے بلند درجے کی ہوتی ہے..... موت انسان کا خاتمہ نہیں کرتی، وہ صرف خارجی دنیا کے وجود کا خاتمہ کرتی ہے۔ The Divine and the Human (1) یعنی (Destiny of Man) (2)۔ انسانی ذات کی خصوصیت کے بارے میں برگسان کے الفاظ یہ ہیں: We Change without Ceasing یعنی ہم میں تغیر آتا ہے معدوم ہوئے بغیر (ماخوذ از پرویز: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ، 2002، ص 104 تا 105)۔

ایسی شے ہے جو ان سے اثر پذیر نہیں ہوتی، ہمیشہ غیر متغیر رہتی ہے Self یا ذات کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی نہیں آتی۔

”عالم تغیرات میں تغیر نا آشنا انسانی ذات“ کی کیفیت

پچاس برس پہلے بھی میں نے کسی سے جو کچھ کہا تھا آج بھی میں یہ کہتا ہوں کہ ”ہاں“ میں نے کہا تھا، حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے فزیکل جسم کے متعلق پہلے تحقیق یہ تھی کہ ہر تیسرے سال اس جسم کا کوئی ذرہ بھی جو پہلا ہے باقی نہیں رہتا بالکل نیا ہو جاتا ہے اور اب تو

یہ کہتے ہیں کہ یہ دنوں میں بدل جاتا ہے، جسم کا کوئی پہلا ذرہ باقی نہیں رہتا۔ جب پہلا باقی نہیں رہتا تو جو آپ کہتے ہیں کہ ”میں نے یہ کہا تھا“ میں نے یہ اقرار کیا تھا، میں اس کا ذمہ دار ہوں، تو وہ جو آپ کا جسم تھا، وہ تو اس دوران میں پچاس دفعہ بدل گیا ہوا ہے، کم از کم دس بیس دفعہ تو ضرور بدل گیا ہوا ہے، بیس برس کے بعد ہم کہتے ہیں ”تم نے مجھے گالی دی تھی“ اور آپ کو اس کا وہی احساس ہوتا ہے جو اس وقت گالی کا احساس ہوا تھا۔ اس کا احساس بھی نہیں بدلتا۔ حافظہ بدل جائے لیکن جب بھی وہ چیز آپ کے سامنے آئے گی اس کا احساس بھی آئے گا۔ کسی نے اچھی بات کہی تھی تو اس کا خوش کن احساس ہوگا، غصے والی بات ہوگی تو اس وقت بھی ناراضگی کا احساس ہوگا۔ وہ ”میں“ ہے جس کے احساسات عمر کے بدل جانے سے، زمانے کے بدل جانے سے، جسم کے بدل جانے سے بھی نہیں بدلتے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے؟ وہی کہتے ہیں کہ یہ <sup>①</sup>Changleness in change ہے۔ اس عالم تغیرات میں ایسی شے جو تغیر پذیر نہیں ہوتی۔ اسے ذات کہتے ہیں۔ جب انسانی ذات یا سیلف یا Personality کی یہ کیفیت ہے تو خدا کی ذات جو ہے اس کے متعلق یہ چیز سمجھنا کہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ (55:29) وہ ہر آن میں ایک نئی شان میں ہوتی ہے، یہ تو بڑا ہی غلط تصور ہے۔ خدا ہر آن میں ایک نئی شان میں نہیں ہوتا۔ اس کی تو وحی ہے، اس کے قانون غیر متبدل ہیں، وہ خود تغیر پذیر کیوں ہوگا۔ یہ بات نہیں ہے۔

### قرآن حکیم کے لفظی مسئلہ کا قرآنی مفہوم: احتیاج اور ضرورت

مسئلہ کا ترجمہ بھی سوال کرنا نہیں ہوتا۔ عربی زبان میں ”سوال“ کے معنی ہی احتیاج ہوتا ہے، ضرورت ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی سوال کرتا ہے، ہمارے ہاں بھی یہ معنی ایک سوال کے ہیں۔ ایک تو سوال وہ ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے کچھ پوچھتے ہیں۔ ایک سوالی آتا ہے اصل میں جو آپ بھی پوچھتے ہیں تو آپ کو بھی علم کی احتیاج ہوتی ہے، جو آپ مجھ سے کچھ پوچھتے ہیں تو سوال کے معنی بنیادی طور پر احتیاج کے ہوتے ہیں۔ یَسْأَلُهُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (55:29) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو شے بھی ہے، وہ اپنی نشوونما کے لیے خدا کی پرورش کی محتاج ہے۔ مسئلہ ہے یعنی اس کی محتاج ہے۔ اب کائنات کی اشیا کی اگر یہ صورت ہو کہ ہر ایک کی ایک

#### ① عالم تغیرات میں تغیرنا آشنا۔

ہی ضرورت ہو اور مستقل طور پر وہی ضرورت رہے تو اس کا پورا کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ایک ہی حالت میں اس نے رہنا ہے، ایک ہی اس کی ضرورت رہتی ہے لیکن یہاں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آن میں وہ چیز جو ہے اس کی احتیاج، اس کی ضرورت بدلتی ہے۔ رحم کے اندر جنین کی ضرورتیں اور ہیں اور پیدا ہونے کے فوری بعد اس کی ضرورت بدلتی ہے۔ وہ اب دودھ کو دودھ کی شکل میں پینا چاہتا ہے۔ اس نے یہ سرچشمہ دودھ کے موجود کر دیئے۔ بچہ ذرا اور بڑا ہوتا ہے تو کچھ دانت نکلتے ہیں۔ دانت کے ساتھ وہ دودھ والی چیز بھی ختم کرنا پڑتی ہے

کھانے والی چیز دینی پڑتی ہے۔ معدہ نرم ہے اور نرم معدے کے لیے نرم غذا دینی پڑتی ہے۔ یہ جو معدے اور دودھ میں تعلق ہے کیا کبھی آپ نے اس پر غور نہیں کیا؟ ماں کا شروع میں جو دودھ ہے جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے اندر جو غذائیت ہے وہ شاید پانچ پرسنٹ بھی نہیں ہوتی، باقی پانی ہوتا ہے۔ اس کا معدہ اس سے زیادہ ہضم نہیں کر سکتا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے، عزیزان من! اس کے اندر کی مشینری خود بخود پانی کم کرتی چلی جاتی ہے، غذائیت بڑھاتی جاتی ہے۔ ”آجیہڑا تسی کیندے او نا پنی ذرا کھا نگر میھ دادودھ دئیں میاں، او ہوندا کی اے؟ وہ تو گوالا آپ کالے آتا ہے۔ او جیہدے وچ تے اوہ نلکے والی پانی ہوندی ہیگی اے۔ او پروہنے آگئے گھرتے ماں نے کیا، پنی چاہنا کے لے آ۔ او آ کے کہن لگی نوح: دودھ تے ہے نہیں۔ او کہن لگی: او کوئی گل نہیں، او دیگچی لے آ، تے او ہدے اچ نلکے والی چوہ لے، تھوڑا جیا پانی پاتے، دودھ بنا لے۔“<sup>①</sup> اندر ایک مشینری ہے۔ اس مشینری کے اندر عزیزان من! ہوتا کیا ہے؟ آپ تو قدم قدم پہ سوچیے۔ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے، اس میں غذائیت ہضم کرنے کی صلاحیت زیادہ آتی جاتی ہے اور خود بخود اس دودھ میں پانی کم ہوتا جاتا ہے، غذائیت بڑھتی چلی جاتی ہے، دودھ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے، خود بخود چلا جاتا ہے۔ یہ جواب ہم Artificial (مصنوعی) دودھ دیتے ہیں، ڈبوں کا دودھ دیتے ہیں، آپ کو پتہ ہے کہ ڈبوں کے دودھ کے اوپر ایک چارٹ ہوتا ہے: تین مہینے کے بچے کے لیے اس کا ایک چھچھ اور چار چھچھ پانی کے، چھ مہینے والے کے لیے اس کے دو چھچھ اور دو چھچھ پانی کے، تو گویا وہ دودھ کے چھچھ بڑھتے جاتے ہیں، پانی کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ دو سال کے لیے یہ چارٹ بنا ہوا ہوتا ہے۔

کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہ چارٹ انہوں نے کہاں سے بنایا ہے؟ ماں کے دودھ Examiner (جانچ) کر کے انہوں نے یہ چارٹ بنایا ہے۔ جس رفتار سے ماں کے دودھ میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے اسی رفتار سے یہ اپنے دودھ کا چارٹ بناتے ہیں کہ بچہ دودھ کو یوں ہضم کرے گا۔ انہوں نے تو اس کو دیکھ کے بنالیا ہے، ماں کے دودھ میں یہ تبدیلیاں کس نے پیدا کر دیں؟ دیکھتے ہیں یہ اس کی رحیمیت اور رحمانیت کیا کام کرتی ہے، اور جب وہ بچہ انانج ہضم کرنے کے، کھانے پینے کے قابل ہو جاتا ہے، دودھ کے چشمے ہی سوکھ جاتے ہیں۔

① یہ جو آپ کہتے ہیں کہ بھئی! ذرا کھا نگر بھینس کا دودھ لانا، یہ ہوتا کیا ہے؟ وہ تو آپ کا گوالا لے آتا ہے۔ یہ وہ ہے جس میں نلکے کی ٹوٹی ڈالی ہوتی ہے۔ گھر میں مہمان آگئے تو ماں نے کہا کہ چائے بنا لاؤ۔ بہو کہنے لگی: (اماں) دودھ نہیں ہے۔ اماں نے کہا: کوئی بات نہیں، وہ دیگچی لو اور اس میں نلکے والی دودھ لو۔ تھوڑا سا پانی ڈال لو اور دودھ بنا لو۔

ہر آن قدم قدم پر بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ہر چیز کی نشوونما کرنے والی ذاتِ خداوندی

یہ ہے ایک مثال کہ ہر شے کی نشوونما کا ذمہ تو خدا نے لیا اور اشیا کی صورت یہ ہے کہ ہر آن میں ان کی ضرورتیں بدلتی جاتی ہیں اور وہ ان کی بدلتی ہوئی ضرورت کے مطابق دیتا ہے، جو کچھ بھی وہ سامان نشوونما دیتا ہے۔ بات سمجھ میں آگئی کہ یَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ

وَالْأَرْضِ (55:29) کائنات میں جو شے بھی ہے وہ اپنی نشوونما کے لیے خدا کی محتاج ہے اور ان اشیائے کائنات کی یہ کیفیت ہے کہ کُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (55:29) ہر شے ہر آن میں مختلف احتیاج رکھتی ہے اور وہ مختلف ضرورتیں پوری کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے: کُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (55:29)۔ اس میں ”ہو“ خدا کے لیے نہیں ہے بلکہ کائنات کی چیزوں کے لیے ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ بس انہوں نے ایک دفعہ وہاں سیٹ (Set) کر دیا کہ بس ساری عمر یہی ملتا چلا جائے گا۔ بچے کو اسی قسم کا دودھ اگر ملتا چلا جائے تو بچہ چھ مہینے کے بعد مر جائے۔ مسئلہ کے معنی میں نے کہا ہے ضرورت پوری کرنا ہے اپنی احتیاج بتانا ہے۔

اب سورہ الفرقان کی اگلی آیت ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَنُ (25:60) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اطاعت کرنی ہے جھکنا ہے تو رحمن کے سامنے جھکیے اس کی اطاعت کیجیے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ رحمن کیا ہے اور کون ہے؟ ان لوگوں کی طرف سے اعتراضات تو یہی ہوتے تھے۔ یہ جو عرب ہیں ان کے ہاں اللہ کا یا اللہ کا لفظ موجود تھا۔ یہ اللہ پھر اپنے بتوں کو بھی کہتے تھے۔ یہ چیزیں تو ان کے ہاں موجود تھیں۔ یہ جو صفات تھیں یہ ان کا تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے آہی نہیں سکتا تھا اس لیے ان کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ رحمن نے کیا کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا (25:60) نہیں صاحب! ہم تو اپنے ہی اللہ کی پرستش کریں گے تمہارے بتائے ہوئے رحمن کی نہیں کریں گے۔ دوسری جگہ قرآن نے کہا ہے کہ ان سے کہو کہ بات ان الفاظ کی نہیں ہے اسے تم اللہ کہہ کے پکارو اسے رحمن کہہ کے پکارو اگر ذہن میں تمہارا تصور صحیح ہے تو ان الفاظ سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ اس کے لیے پوچھتے تھے کہ بتاؤ یہ رحمن کون ہے اور وہ یہ تھی چیز کہ قرآن نے کیوں رحیم اور رحمن الگ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ رحمن ان صفات کا حامل ہے۔ تو کہا کہ لفظ کے ہی تغیر سے ان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر ان کے ہاں جو مروج لفظ ہے وہ بول دیجیے تو اس کو تو یہ برداشت کر لیتے ہیں اور اسی خدا کا وہ تصور یا وہ صفت جو تم پیش کر رہے ہو اس سے ان کی نفرت بڑھ جاتی ہے۔ یہ ہے وَزَادَهُمْ نُفُورًا (25:60) اس سے ان کی نفرت اور بڑھ جاتی ہے۔

### انسانوں کی دنیا میں حرمت الفاظ کا مقام بلند اور ان کی اہمیت

کہا کہ اندازہ لگائیے ان کی حماقت کا کہ بات اصل میں خدا کی نہیں کر رہے ان الفاظ کی بات کر رہے ہیں اور جھگڑا سارا اس پہ آ رہا ہے۔ سارے جھگڑے آپ دیکھیں گے عزیزانِ من! کہ الفاظ کی بنا پہ پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اَسْمَاءٌ سَمِيَّتُوهَا اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ (12:40) چند الفاظ ہیں چند اصطلاحیں ہیں کچھ تمہارے بڑے بوڑھوں نے وضع کر لیں کچھ تم نے وضع کر لیں۔ سارے جھگڑے ان اسماء کے اوپر تم کرتے چلے جا رہے ہو۔ الفاظ کو چھوڑو حقیقت کی طرف آؤ۔ ٹھیک ہے رحمن نہیں کہتے اللہ ہی کہو لیکن یہ

تو بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا تصور آتا ہے۔ بات میں فرق یہاں سے پڑتا ہے۔ کہا کہ رحمن وہ ہے: تَبَرَّكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا (25:61) رحمن پوچھتے ہو۔ یہ کہا: کائنات کی پہنائیوں میں پھیلے ہوئے جو اتنے عظیم الجثہ کڑے ہیں، کس نے ان کو بنادیا اور پھر وہ کون ہے جو انہیں اپنے کنٹرول میں رکھے ہوئے ہے؟ کیا یہ بت جن کو تم اپنے الہ بنا رہے ہو، یہ ان کے بنائے ہوئے ہیں جو خود تمہارے کنٹرول میں ہیں؟ یہ بت پرستوں کے متعلق بڑی عجیب چیز ہے۔ بت پہلے موجود نہیں تھا، تم نے اپنے ہاتھ سے گھڑ کر اس کو وجود میں لایا اور یہ تو اپنے وجود کے لیے تمہارا محتاج ہے۔ جس قسم کی شکل تم نے اسے دی، اس قسم کی اس کی شکل ہوگئی۔ تو کیا خدا کو بھی تم اپنے تصور میں ڈھالنا چاہتے ہو؟

### مذہب کی دنیا میں خدا کا تصور اپنا اپنا ہوتا ہے

مذہب میں عزیزانِ من! ہوتا ہی یہ ہے کہ خدا کو انسان اپنے تصور میں ڈھالتا ہے، اسی لیے ہر مذہب کا خدا الگ الگ ہوتا ہے۔ وحی کی رو سے خدا خود اپنے متعلق بتاتا ہے کہ میں کیسا ہوں۔ جن الہوں کو اپنے تصور کے مطابق بنائیں، وہ بت ہوتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ مٹی اور پتھر کے ہی بت ہوں۔ بت پرستی میں ایک بڑا فائدہ ہوتا ہے اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ لوگ پھر یہ بتوں کو کیوں پوجتے جا رہے ہیں۔ بت سے آپ جو جی میں آئے کہتے چلے جائیں، وہ سامنے سے تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ انسان کو اس قسم کا خدا بہت خوش آتا ہے جو خود اس سے کچھ نہ کہے، بلکہ بت بن کے چپکے سے سنتا رہے۔ اپنے ذہن میں آپ نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے اس کو خوش کر دیا، یہ ہم سے راضی ہو گیا ہے اور چلے آئے۔ وہ سامنے سے کچھ نہ کہے، اپنے ذہن میں ہی اس کی تعظیم پیدا کر لی، اپنے ذہن میں اس کا ڈر پیدا کر لیا اور اس کے بعد گئے تو وہ تم سے کچھ نہیں کہتا اور وہ خدا جو قدم قدم کے اوپر تمہیں کہے کہ یہ کرو، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، تو یہ خدا کس کو پسند آتا ہے۔ مذہب والا بت کی قسم کا جو خدا ہے، اسے پسند کرتا ہے تو انہوں نے پھر وہ ہزار برس سے بت بنا رکھے ہوتے ہیں: فلاں امام صاحب، فلاں مفسر، فلاں محدث، فلاں قطب، فلاں صوفی، فلاں اولیاء، فلاں ولی۔ وہ تو اب ہیں ہی نہیں۔ ان سے کچھ نہیں کہتے۔ اپنے ذہن میں ایک بت بنا رکھا ہوا ہے، اس کی پرستش کرتے رہتے ہیں، اس کے حضور نذر نیاز دے دیتے ہیں، خوش ہو جاتے ہیں کہ حضرت صاحب بڑے راضی ہو گئے اور حضرت صاحب ان سے کچھ نہیں کہتے۔ ہر مردہ کی یہ پرستش کرتے ہیں، زندہ کو کبھی نہیں مانتے کیونکہ زندہ تو فوراً پکڑ لیتا ہے، شخصیت پرستی دراصل مردہ پرستی ہے۔

### ان بتوں کی بے کسی کی حالت زار

عزیزانِ من! یہ سب کی سب بت پرستی ہے۔ وہ آگے سے کچھ نہیں کہتے۔ جو مر گئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ تو بیچارے یہ بھی نہیں

کہتے کہ اوبابا! میں نے تو یہ نہیں کہا تھا جو تم میری طرف منسوب کر رہے ہو کیونکہ وہ بیچارہ بت ہے، ہر مردہ بت ہوتا ہے۔ اب میں پھر اُس آیت یعنی (25:61) کی طرف آ گیا۔ کہا کہ بتاؤ کائنات کے عظیم الجثہ کڑے کس کے کنٹرول میں ہیں؟ کس کے اقتدار سے یہ کچھ ہو رہا ہے؟ تمہارے یہ جوالہ ہیں، یہ جو بت ہیں، جن کو اپنے آپ پر اختیار و اقتدار نہیں ہے، انہیں تم نے بنایا، جس شکل میں ڈھالا ڈھل گئے، جہاں تم نے ان کو گاڑ کے رکھا وہاں کڑ گئے، وہاں سے اٹھا کے دوسری جگہ رکھو وہاں جا کے کڑ جائیں گے، سردی ہو، گرمی ہو، بیچارے اتنے بھی نہیں کہتے کہ ”ہائے ٹھنڈ لگدی اے پئی ساڈے تے کپڑا دیو“،<sup>①</sup> ایک یہ ہے الہ تمہارا۔ ایک وہ الہ ہے کہ اس قدر عظیم الجثہ کڑے بھی اس کے کنٹرول میں ہیں۔ کہا کہ ذرا دونوں میں فرق کر کے تو دکھاؤ۔ اب اور آگے بڑھو۔ کہا کہ وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا (25:61)۔ پھر یہ یونہی ”جنوں مٹی دے تھم کیندے نیں“،<sup>②</sup> اس قسم کے کڑے نہیں ہیں۔ دیکھو تو سہی یہ تمہارے لیے روشنی کا سامان ہیں۔ یوں تو یہ کڑے ہی ہیں۔ ان کڑوں میں سورج بھی کڑہ ہے۔ دیکھو تو سہی، سارا کڑہ ارض جو ہے، پتہ نہیں کتنے اور کڑے اس کی روشنی کے محتاج ہیں۔ اگر اس کو بھی اندھا کڑہ بنا دیا جاتا تو زمین روشنی سے محروم ہو جاتی، باقیوں کو تو چھوڑ دیجیے، کوئی روشنی ہمارے ہاں نہ آتی۔ کڑہ بنایا ہے ایک، جس کا تعلق براہ راست زمین سے ہے اور وہ ایسا چمکنے والا کڑہ ہے۔ سراجا کے معنی ہی ہوتا ہے ”چمکنے والا کڑہ“، جسے چراغ کہتے ہیں، روشنی دینے والا۔ کہا کہ کڑے بنائے اور ان میں وہ بھی کڑہ ہے جو روشنی دیتا ہے اور قمر بھی بنایا۔

### چودہ سو سال قبل سورج کی روشنی کے لیے ضیاء اور چاند کے لیے نور کا لفظ استعمال کیا گیا

اب پھر ایک نئی بات آگئی۔ ٹھیک ہے، آنے دیجیے۔ شمس کے معنی سورج اور قمر کے معنی چاند ہیں۔ خدا نے چاند بھی بنایا اور سورج بھی بنایا۔ ٹھیک ہے لیکن خدا سے پوچھنا چاہیے کہ یہ دو الفاظ کیوں استعمال کیے؟ هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا (10:5)۔ روشنی تو دونوں میں ہوتی ہے، سورج میں بھی ہوتی ہے، چاند میں بھی ہوتی ہے۔ ایک ہی آیت میں ایک ہی جگہ شمس اور قمر آیا ہے، روشنی دینے والا ان کو بتایا ہے۔ ایک کے لیے ضیاء کا لفظ ہے، دوسرے کے لیے نور کا لفظ ہے۔ یہ کیا ہے؟ ہم تو کہیں گے کہ شاعری

① اُف سردی سے ٹھہر رہے ہیں ہمارے اوپر کپڑا ہی ڈال دو۔

② جنہیں مٹی کے ستون کہا جاتا ہے۔

ہے اور اس نے اسی لیے کہا تھا کہ یاد رکھو، یہ شاعری نہیں، ہم نے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ رسول کے شانِ شان ہی نہیں کہ وہ شاعری کرے۔ شاعری میں وزنِ بیت کے لیے ایک لفظ زیادہ لکھا جاتا ہے یا وزن کے لیے دو الفاظ الگ الگ رکھے جاتے ہیں۔ کہیں شہد کا لفظ رکھا جاتا ہے اور کہیں انگلیں کا لفظ رکھا جاتا ہے، دونوں میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے یہ شاعری تو ہے نہیں کہ الشمس ضیاء والقمر

نوراً ہو۔ چودہ سو سال پیشتر، عزیزانِ من! عرب کے صحرائیں، تاریک ترین دور میں ایک امی کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں اور آج کے دور کے ماہرین علم الافلاک سے پوچھیے کہ وہ ان دو لفظوں کے متعلق عربی زبان میں کیا کہتا ہے۔ ضیاء کہتے ہیں وہ روشنی جو کسی کی اپنی روشنی ہو اور نور کہتے ہیں وہ روشنی جو اس نے کسی دوسرے سے مانگ کر لی ہوئی ہو۔ اور آج یہ بات سمجھ میں آگئی کہ سورج کی روشنی تو اپنی ہوتی ہے اور چاند سورج کی روشنی کے عکس سے روشن ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے اس کو نور کہا ہے، اُس کو ضیاء کہا ہے۔ اتنا ہی نہیں بات اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ قرآن کریم نے شمس کو ضیاء اور قمر کو نور کہا ہے۔ یہ بنیادی فرق ہے ان دونوں کے معنوں میں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے جو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔

### سورج کے لیے ضیاء اور چاند کے لیے نور کے الفاظ کا استعمال کیوں؟

ہم تو اپنی زبان میں ان دونوں کو ایک ہی معنی میں یعنی روشنی کے معنوں میں استعمال کر لیتے ہیں لیکن جب قرآن دونوں میں الگ الگ لفظ استعمال کرتا ہے تو ہمیں کھڑے ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔ اب اس نے کہا ہے کہ یہ قمر کی روشنی اس کی اپنی نہیں ہوتی، یہ اس نے دوسرے سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک لفظ اور ہے، کیسا دلچسپ لفظ ہے۔ سورۃ الشمس میں کہا کہ وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا (91:1-2)۔ جھوم جائیے عزیزانِ من! شمس یعنی سورج اور اس کی چمک اس کی تابانیاں، اس کی درخشندگی، اس کی Brightness، یہ اس کی اپنی ہوتی ہیں۔ آگے ہے وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا (91:2) کہتے ہیں ”کوئی شخص جو کسی کے پیچھے پیچھے بھیک مانگنے کے لیے چلا جا رہا ہے۔“ سورج کی اپنی تابندگی ہے اور چاند ہے کہ یہ اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے، بھیک مانگتا ہوا کہ ”مجھے روشنی دے دے، مجھے روشنی دے دے۔“ چودہ سو سال پہلے ایک شخص یہ کہہ رہا ہے عزیزانِ من! عربوں کی سرزمین میں اس زمانے میں تو یہ جو ان کے ذہن میں بھی ابھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی، سورج سے مانگی ہوئی ہوتی ہے اور اس مانگنے کے لیے اگلی چیز یہ ہے کہ وہ چاند اپنی اس رفتار سے سورج کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ اندازہ لگائیے اس میں ادبی خوبصورتی بھی کتنی ہے کہ وہ تو اپنی روشنی اپنی جھولی میں لیے آگے آگے جاتا ہے، وہ تو مجسم نور ہے، اور یہ ہے کہ جس کے پاس اپنی روشنی نہیں، اس کے پیچھے بھیک مانگتا ہوا چلا جاتا ہے کہ دیجا بابا، تھوڑی سی مجھے دیجیجا۔ یہ ہے وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا (91:1-2)۔

آپ نے دیکھا ہے کہ شمس کو ضیاء اور قمر کو نور کیوں کہا گیا ہے اور پھر قمر اپنی نورانیت یا روشنی لیتا کس طرح سے ہے؟ سورج سے پیچھے پیچھے جاتا ہے، کٹورہ خالی لیے ہوئے بھیک مانگتا ہوا اس کی روشنی کی۔ سراجا و قمر ا منیرا یعنی اس کے معنی تو چاند کے ہی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ جس کو ”قمار بازی“ کہتے ہیں اس میں ”مقامر“ جواری کو کہتے ہیں اس کے بنیادی معنی دھوکا ہوتا ہے، فریب ہوتا ہے اس



کے معنی جنون کے ہوتے ہیں پاگل پن کے ہوتے ہیں دیوانگی کے ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ابتداءً یہ بات کہاں سے چلی تھی، انگریزی زبان میں بھی یہ جو Lunar (چاند) ہے اسی سے لفظ Lunatic پاگل پن کو جنون کو کہتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ Lunatic ہے۔ اس کے علاج کے لیے مینٹل ہسپتال ہے۔ ابتداءً سے، کہیں سے یہ چیز ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ خواہ شاعری میں آپ دیکھیں یا اگر آپ کو فطرت نے ذوقِ لطیف عطا کیا ہے تو آپ دیکھیں واقعی جو بھرپور چاندنی ہے بڑی جنون افزا ہوتی ہے۔ سورج کی روشنی میں تو وہ روشنی ہوتی ہے مگر چاند کی روشنی کے اندر عجیب قسم کی رعنائی اور کشش ہوتی ہے۔ شاعروں نے اسی Lunar سے ابتدا میں Lunatic بنا کے تو دیوانگی کہا۔ عربوں کے ہاں بھی یہی چیز تھی۔ وہ بھی اس کو جنون یا دھوکے کے معنی میں لیتے تھے لیکن وہ جو دھوکا کے معنی میں استعمال کر کے عربوں نے جوئے کے لیے لفظ ”قمار“ دیا ہے وہ ”قمر“ سے ہے۔ یہ تھی یہ بلا قوم۔ اور اب تو ہمارے سامنے ساری بات آگئی جو ہم چاند سے دھوکا اور فریب کھا رہے تھے۔ اب جو چاند پہ جانے کے بعد اس کے چہرہ زیبائے پردہ اٹھایا ہے تو وہ ایک جلا ہوا کھنڈر نظر آیا۔ یہ سارا دھوکا ہی دھوکا تھا جو وہ ہمیں دے رہا تھا۔ اب پتہ چلا کہ قمر کا یہ لفظ انہوں نے دھوکے کے لیے کیوں رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کیوں رکھنا تھا، جس نے رکھا ہوا تھا سوچے تو سہی کہ کتنا بڑا دھوکا ہے جو دنیا اس سے کھائے چلی جا رہی تھی لیکن عزیزانِ من! بہت سے دھوکے ایسے ہوتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ انسان دھوکے کھاتا ہی جائے بڑے پر لطف دھوکے ہوتے ہیں اس پر سے پردہ نہ ہی اٹھے تو اچھا ہوتا ہے۔ اب یہ چاند جو ہے اس کی وہ جو کھنڈرات کی تصویریں آئی ہیں کہاں وہ چاند جو واقعی انسان میں ایک دیوانگی کی کیفیت پیدا کر دیتا تھا اور وہ جو اس کا اصل روپ سامنے آ گیا ہے وہ تو ٹی وی پہ بھی دکھا رہے ہیں۔ یہ چاند یا میرے اللہ! جی چاہتا یہی ہے کہ یہ پردہ نہ ہی اٹھتا تو اچھا تھا۔ ہمارا جو وہی چاند ہے وہ بڑا محبوب چاند تھا۔ یہ دھوکے بڑے پُر فریب ہوتے ہیں:

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ  
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

(غالب)

پھر جی چاہتا ہے کہ آدمی آنکھ بند کر لے لیکن پھر آنکھ بند کرنے سے تو وہ فریب ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ اب ہمیں کوئی لاکھ کہے کہ ان کھنڈرات کو دیکھنے کے بعد چاند کا وہ پہلا تصور ذہن میں لائیں تو وہ تو پھر نہیں آتا، وہ تو جو فریب مسلسل ہے اسی میں ایک لطف ہوتا ہے۔ ”جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا“۔ خواب میں ایک مراٹھی نے دیکھا کہ اس کے پاس بکری ہے اور ایک خریدار آ گیا ہے۔ یہ سو روپیہ مانگتا تھا، وہ پچاس دیتا تھا۔ سودے بازی شروع ہوئی۔ یہ نوے پہ آیا وہ ساٹھ پہ آیا۔ کچھ فیصلہ ہو نہیں رہا تھا کہ اتنے میں یوں اس نے کروٹ لی، جھٹکا ہوا آنکھ کھل گئی تو آنکھ بند کر کے کہتا ہے کہ ”لیاسٹ پچاھ ای سٹ“۔<sup>1</sup> آنکھ بند کرنے سے پھر وہ فریب نہیں کھایا جاسکتا۔ جب

ایک دفعہ بھی کسی کی آنکھ کھل جائے تو پھر وہ فریب نہیں کھاتا۔

### ثواب کے فریب میں مذہبی پیشوائیت کا کردار

عزیزانِ من! انسان فریب کھاتا ہی اس وقت تک ہے جب تک آنکھ بند رہتی ہے اور فریب دینے والوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی آنکھ نہ کھل جائے کسی طرح سے ہمیشہ کے لیے بند رہے۔ مذہب اور اس کی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ آنکھیں بند کیے رکھوان کی آنکھیں نہ کھلنے پائیں۔ ایک دفعہ آنکھ کھل گئی تو یہ دوبارہ فریب نہیں کھائیں گے۔ یہ جو مذہب میں آنکھیں بند کر کے ثواب کا فریب دے کے ایک Concept (تصور) دیا جاتا ہے اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ یہ کرتے رہو یہ ہمیں دیتے جاؤ یہ ختم دلاؤ یہ پیسے دو۔ کی ہووے گا ایدے بعد؟ اوہانوں ثواب ہووے گا۔<sup>2</sup> پتہ ہی نہیں کہ ہوگا کیا لیکن اگر آنکھ کھل جائے پھر پتہ چل جاتا ہے۔ جو مذہب زدہ ہے وہ آنکھ کھولنا نہیں چاہتا۔ بہتیرا جھنجھوڑ بیدار کرو جگاؤ اور بکری و بچن دی فکراچ ہو ندا اے فیرا کھیں میچ لیندا اے او۔<sup>3</sup> یہ ہمارا دور آیا تھا جس میں زمانے کے تقاضوں نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے مسلمان کو بیدار کرنا چاہا تھا کہ کسی طرح یہ قرآن کی طرف آجائے لیکن ان کی سحر آفرینیاں ایسی تھیں کہ

پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمران کی سحری<sup>4</sup>

سلائے چلے جا رہے ہیں سلائے چلے جا رہے ہیں۔ یہ بھی فریب کھاتا چلا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس فریب میں ایک بڑی لذت ہوتی ہے۔ خواب کے اندر جو سودا ہو جائے نہ کچھ سرمایہ لگانا نہ کچھ کرنا نہ کرنا یعنی مفت میں ہی بکری کے سو روپے مل جائیں وہ بڑی لذت ہوتی ہے۔ انسان یہ نہیں چاہتا کہ یہ لذت چلی جائے۔ کیا بات ہے پھر یاد آ گیا! غالب<sup>5</sup> ہی اپنے انداز میں یہ بات کہہ سکتا ہے:

1 لاؤ پھینکو۔ پچاس ہی پھینکو۔

2 اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس کا آپ کو ثواب ہوگا۔

3 وہ بکری بیچنے کی فکر میں ہوتا ہے پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

4 خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمران کی سحری (اقبال: بانگ درا)

5 مرزا اسد اللہ خان غالب (1797-1869)

بس ہجومِ ناامیدی، خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

مذہب کے تند و تیز نشہ سے انسان خود بھی نکلنا نہیں چاہتا

عزیزانِ من! مذہب میں سعی بے حاصل ہوتی ہے اس میں ایک لذت ہوتی ہے۔ اس لذت کو یہ افیونی نہیں چھوڑنا چاہتا۔  
 ناامیدی کی انتہا سے یہ ہو سکتا تھا کہ یہ طلسم ٹوٹ جاتا مگر وہ خود اسے نہیں توڑنا چاہتا۔ قرآن کسی کو فریب میں نہیں رہنے دینا چاہتا، عزیزانِ  
 من! خدا کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔

### حضرت عمر ♦ کی زبانی مومن کی کہانی

حضرت عمر ♦ (581-644/45AD) کے الفاظ میں، کیا بات تھی اس شخص کی بھی! کہ ایک شخص نے ان کے سامنے یہ کہا تھا  
 کہ مومن وہ ہے جو کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ ♦ نے کہا کہ فقرہ مکمل کرو، آدھا فقرہ کیوں کہتے ہو۔ کہنے لگا: جی، کیسے مکمل کروں؟ کہا:  
 مومن وہ ہے جو نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔ مزید کہا کہ یہ خدا کی صفت ہے: وہ نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا  
 ہے۔ مومن میں اگر خدا کی یہ صفت ہے تو دونوں ہی چیزیں اس کے اندر لاؤ۔ دھوکا نہیں ہوتا، یہ باقی ساری جتنی بھی مذہب کی سحر آفرینیاں  
 ہیں، یہ سب دھوکا ہے، یہ دھوکا دیتے بھی ہیں، دھوکا کھاتے بھی ہیں۔ دھوکے میں سعی بے حاصل کے اندر ایک لذت ہوتی ہے، ہم اسے نہیں  
 چھوڑنا چاہتے، یہ کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ خواب کے اندر وہ سودے ہو رہے ہوتے ہیں۔

قمرًا منیراً سے توبات چلی تھی اور کہا تھا کہ اب انہیں کون بتائے کہ جس خدا نے طبعی کائنات میں روشنی کے لیے فضا میں اجرامِ فلکی  
 اس طرح پھیلا دیئے کہ وہ کہیں ستاروں کی قدیلیں بن کر جگمگاتے ہیں، کہیں سورج کی شمع فروزاں کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور کہیں  
 چاند کے ساغرِ سیس کی صورت میں وجہ تابانی عالم ہوتے ہیں۔ اس نے انسانی عقل و بصیرت کی راہ نمائی کے لیے وحی کی روشنی عطا کر دی  
 ہے۔ وہ بات کر رہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا<sup>①</sup> (25:62)۔  
 تم مایوسیوں اور ناامیدیوں سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے ہو۔ وہ کائنات کے آسمانی کڑوں کی سورج کی چاند کی دن اور رات کی بات  
 اس انداز سے کر رہا ہے کہ وہ جو پھر وہی پنجابی میں اماں جی مرحومہ کی بتائی ہوئی یہ مثالیں ہیں یاد آتی ہیں، کہ اے نی کڑیئے! گل سن، اے

① اور جس خدا نے خارجی کائنات میں ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ رات اور دن ایک دوسرے کے بعد آتے رہیں تاکہ تاریکی کے بعد روشنی کی نمود ہوتی رہے  
 (اس نے انسانی دنیا میں بھی اس کا انتظام کر دیا ہے کہ کوئی قوم ہمیشہ تاریکی میں نہ رہے۔ اس تک وحی کی روشنی پہنچ جائے) تاکہ جو چاہے اس کے ذریعے  
 صحیح راستے کو اپنے سامنے لے آئے اور اس طرح اپنی سعی و عمل کو بھرپور نتائج کا حامل بنالے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 829)۔

نوائیں! توں کن کر۔ گل تیجیوں سناندی پئی۔ اے تے دراصل نوں دے کن اچ گل پانی ہوندی اے اونے۔<sup>①</sup> یہاں کچھ یہ انداز  
 ہے۔ باتیں آسمانوں کی کر رہا ہے، سنار ہا ہے زمین والوں کو۔ کہا یہ ہے کہ ان مایوسیوں میں تم سمجھتے ہو کہ بڑی تاریکیاں ہیں، اندوہ ناکیاں  
 ہیں، ناامیدیاں ہیں، کیا ہماری یہ حالت کسی طرح سے بدل جائے گی؟ کیا یہاں بھی تاریکی روشنی میں بدلے گی؟ کہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہر

روز نہیں دیکھتے کہ رات کی تاریکی کے بعد کس طرح سے سحر کی نمود ہوتی ہے۔ کیا بات ہے!  
آسمان ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش  
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

(اقبال)

افسردہ ستاروں کا ہجوم خورشید کے نکلنے تک ہی ہوتا ہے  
قرآن کیسی عجیب مثال دیتا ہے: او مایوس ہونے کی کون سی بات ہے، کتنی تاریکیاں کیوں نہ ہوں، تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہر رات کی تاریکی کے بعد صبح کی نورانیت آتی ہے۔ تم مایوس کیوں ہوتے ہو، کیا آج ہمارا جو چاند سورج ہے، وہ کہیں اور چلا گیا ہے، ڈوب چکا ہے، نہیں نکلے گا؟ نکلے گا کیوں نہیں؟ ضرور نکلے گا۔ یہ ہے تو غزل کا ہی شعر لیکن ہے بڑا کچوکا دے کر چھٹتا ہوا:

رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر  
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی  
لیکن جس پہ مایوسی طاری ہوتی ہے وہ اسی کو کچھ اور انداز میں کہتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ  
شب ہجراں کے جاگنے والو  
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی

مذہب کی تاریک دنیا میں نورِ سحر کی نوید ہوتی ہی نہیں

مذہب میں کبھی رات کی تاریکیاں سحر سے نہیں بدلتیں، عزیزانِ من! دین میں اگر کسی وقت بھی ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی تاریکیاں چھا جاتی ہیں تو یقیناً وہ ہے کہ اس کے بعد سحر ہو کے رہے گی: آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی۔ تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی؟ سحر تو ہوتی ہے: وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً (25:62)۔ اب یہاں پھر ایک اور لفظ آ گیا۔ اختلاف لیل و نہار بھی تو ہے۔

① اے بیٹی! بات سن۔ اے بہو! کان دھر۔ بات وہ تیسرے کو سنار ہی ہے۔ یہ تو دراصل اس نے بہو کے کان میں بات ڈالنی ہوتی ہے۔

گلشنِ زندگی کی اس خزاں میں بہارِ نو کا سماں اور حیاتِ تازہ کی نوید

یہ خلفہ کیا ہے؟ اس قسم کی مایوسی اور اس کے بعد کس قسم کی امید؟ یہ بالکل وہی کیفیت ہے جو خزاں میں درخت کی ہو جاتی ہے۔ اس میں زندگی کی نمود کی کہیں کوئی علامت اور نشانی تک نہیں ہوتی، کہیں سبزہ اور روئیدگی کا نشان تک نہیں ہوتا، شاخیں خشک ہوتی ہیں لیکن

جب بہار آتی ہے تو انہی شاخوں سے زندگی مسکراتی، تمہقے لگاتی، نمود میں آ جاتی ہے، انہی خشک شاخوں کے اندر سے کونپلیں پھوٹی ہیں، شاخیں سرسبز ہوتی ہیں، غنچے چٹکتے ہیں، پھول کھلکھلاتے ہیں۔ یہ جو خزاں کی خشک شاخوں کے بعد اس میں سے ان غنچوں کی، ان کونپلوں کی، جو نمود ہوتی ہے وہ نئی زندگی کی بشارتیں دیتی ہے، انہیں عرب ”خلفۃ“ کہتے تھے اور یہیں سے پھر ”خلافت“ کا لفظ سمجھ لیجیے کہ کیا معنی رکھتا ہے۔ ملوکیت کی تاریک کی ہوئی خزانیں، اس استبداد کی تاریکیاں یعنی خزاؤں کو لے لیجیے جن میں زندگی کی کوئی نمود یا آثار نظر نہیں آتا تھا، اس کے اندر انسانیت بے برگ و بار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک نیا نظام آتا ہے۔ اندازہ لگائیے قرآن کریم نے اس کو ”استخلاف“ کہا ہے، اس کے بعد بہار نوکھا ہے، جو خزاں کے بعد آتی ہے۔ ملوکیت کے استبداد کے بعد اگر کہیں یہ دین خداوندی آتا ہے تو کہا کہ یہ خزاں کے بعد بہار ہے جو آئی اور اس کے بعد کہا کہ ہم باہر سے نہیں لائے، ان شاخوں کے اندر اس کی صلاحیت موجود تھی۔ وہ صلاحیت ہی نمود سے باہر آئی ہے۔ حقیقت میں اگر کسی شاخ میں اس کی صلاحیت نہ ہو، وہ مردہ ہو چکی ہو، تو وہ کبھی بھی بہار کے موسم میں ہری نہیں ہوتی، عزیزانِ من! اسی لیے اقبالؒ (1877-1938) نے یہ کہا ہے کہ ٹھیک ہے ملت پہ ادبار اور ذلت چھا چکی ہے، اس کا شجر طیب بالکل خزاں دیدہ ہو چکا ہے لیکن اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ

ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

اور ساری نظم<sup>①</sup> میں یہ کہتا ہوا آخر میں یہ کہتا ہے کہ

ملت کے ساتھ رابطہ اُستوار رکھ

پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ

(بانگ درا)

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔ عزیزانِ من! خِلْفَہ یہ ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں لفظ! رات کی تاریکیوں کے بعد صبح کی نورانیاں، وہ کہتا ہے، اسی

① پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ (بانگ درا)

طرح آتی ہیں جیسے خزاں کے بعد بہار کی حیات تازہ کی نمود ہوتی ہے۔ یہ خِلْفَہ کا لفظ اس لیے آیا ہے۔ کہا کہ کیوں گھبراتے ہو: جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً<sup>①</sup> (25:62) لیکن یہ کس کے لیے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

یہ سب کچھ ہوگا لیکن ایک شرط کے ساتھ

ابھی میں نے اس شاخ کے لیے کہا ہے جس میں حیات تازہ کی برومندی کی صلاحیت موجود ہے، مضمحلہ Potentia حالت میں ہے۔ اس کو صرف باہر کے حالات ذرا سا زگار ملنے چاہئیں، تو وہ یوں چمکتے ہوئے باہر آ جاتی ہے بشرطیکہ اس میں یہ چیز موجود ہو۔ لیکن یہ خِلْفَةُ اس کے لیے ہے جو خِلْفَةُ لِمَنْ ارَادَ اَنْ يَذْكُرَ اَوْ ارَادَ شُكُورًا (25:62)۔ یہ خود ارادہ کرے کہ میری کوششیں بھرپور نتائج برآمد کریں۔ جو سورج چڑھنے کے بعد سوتا ہی رہے، اور سمجھے کہ سوتا ہی رہنا چاہیے، اس کے لیے ایک ہی بات ہے کہ سورج چڑھے یا نہ چڑھے۔ جس درخت کی شاخیں مُردہ ہو چکی ہوں، تو مردہ کے متعلق میں مثال دیا کرتا ہوں کہ درخت کے ساتھ لگی ہوئی شاخ خشک ہو جاتی ہے، مگر جو شاخ ٹوٹ کے نیچے پانی میں گر جاتی ہے، وہ گل جاتی ہے۔ خشک شاخ میں تو نمودِ حیات کا امکان ہوتا ہے لیکن لگی ہوئی شاخ میں کبھی نہیں ہوتا۔ مذہب میں یہ شاخیں گل سڑ جاتی ہیں، عزیزانِ من! اور ان میں نمود نہیں ہو سکتی۔ اب پتہ لگا کہ یہ خِلْفَةُ ادھر کیوں کہا تھا۔ خِلْفَةُ لِمَنْ ارَادَ اَنْ يَذْكُرَ اَوْ ارَادَ شُكُورًا (25:62)۔ یہ اس کے لیے خِلْفَةُ بنے گا، جو خود ارادہ کرے کہ میری سعی و عمل نتائج پیدا کرے ورنہ رات کے بعد دن تو ہر ایک کے لیے چڑھتا ہے۔ یہ اس کے لیے خِلْفَةُ بنے گا جو ارادہ کرے کہ خزاں کے بعد اس کے درخت پہ بہار آئے گی۔ مَنْ ارَادَ اَنْ يَذْكُرَ اَوْ ارَادَ شُكُورًا (25:62) جو اس کا خود ارادہ کرے کہ اس کی نمود ہو، اس کو شرف ملے، اس کو عزت ملے۔ ذکر کے معنی شرف و عزت کے ہوتے ہیں۔

### شکر کا قرآنی مفہوم

اب یہاں اَوْ ارَادَ شُكُورًا (25:62) ہے اور شُکُور کا میں نے آپ کو بتایا تھا۔ شکر کے معنی کے لیے وہ بات ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ محاورہ عرب سے پوچھو کہ شکر کے معنی کیا ہیں تب قرآن سمجھ میں آئے گا۔ ساڈے تے ہوندا اے یا اللہ! تیرا شکر الحمد للہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔<sup>2</sup> بس شکر ہو گیا۔ صبر شکر فیرا گے معنی آئے ایہدے۔<sup>3</sup> بس جہاں کچھ نہیں ہو سکتا، وہاں صبر شکر کرو۔

① خدا نے خارجی کائنات میں ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ دن اور رات ایک دوسرے کے بعد آتے جاتے رہیں تاکہ تاریکی کے بعد روشنی کی نمود ہوتی رہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 829)۔

② اے اللہ! تیرا شکر ہے الحمد للہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

③ پھر اس کے بعد اس کے اگلے معنی صبر شکر کے آئے۔

برادرانِ عزیز! بکری کے ایسے تھن، جو دودھ سے اتنے بھرے ہوئے ہوں کہ اُن میں سے دودھ کے قطرے خود ٹپک رہے ہوں، اس قسم کے کسی کے جو بھرپور نتائج ہوتے ہیں جو خود اپنی نمود کر رہے ہوں، ٹپک رہے ہوں، عرب اسے شکر کہا کرتے تھے۔ جو شرف و مجد لینا چاہتا ہے، جو چاہتا ہے کہ اس کی کوششیں بھرپور نتائج برآمد کریں، اس کے لیے یہ رات کے بعد دن کا آنا خِلْفَةُ ہو سکتا ہے۔

یہ تھی رحمن کی بات اور آگے اس میں جتنی آیات ہیں، عزیزانِ من! ان کا آغاز اس سے ہے کہ وَ عِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا (25:63)۔ اور اس سے آگے جو آیات آرہی ہیں وہ مسلسل چلنی چاہئیں، یہ بڑی عظیم آیات ہے۔ ان میں عباد الرحمن کی خصوصیات بتائی ہیں اور رحمن اسی لیے کہا ہے کہ جب حالت یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اس کے اندر جو تغیر واقع ہوگا وہ واقعی ایک ایمر جنسی کے طور پر واقع ہوگا، اس میں ایک انقلاب واقع ہوگا، تسلسل کے ماتحت تو یہ ادبار اور زبوں حالی مسلسل آگے چلے گی۔ اگر اسے عظمت میں، بلندی میں، ثروت میں، بدلنا ہے تو یہ ہنگامی ارتقا ہوگا۔ اس لیے عباد الرحمن کہا ہے اور ان کی خصوصیات قرآن نے آگے بتائی ہیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الفرقان کی آیت 62 تک آگئے، 63 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ



## چودھواں باب: سورة الفرقان (آیات 63 تا 70)



عزیزانِ من! آج مارچ 1978ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 63 سے ہو رہا ہے: (25:63)۔

### عبادت کا مفہوم

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں خدا کی صفتِ رحمانیت کے متعلق کچھ تشریح کی گئی تھی۔ اسی ضمن میں اب یہ بتایا گیا ہے کہ عباد الرحمن کی خصوصیات کیا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عبد کے معنی تو محکوم، اطاعت گزار، فرماں پذیر، قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے والے کے ہیں۔ اس کا مفہوم پرستش نہیں ہے، یہ تو مذہب میں آکر پرستش ہو جاتا ہے۔ دین میں اس کے معنی محکومیت اور اطاعت گزاری کے ہی ہوتے ہیں تو عباد الرحمن وہ ہیں جو قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، جو اس کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نمایاں خصوصیات بتائی گئی ہیں اور یہ سلسلہ اس سورة کے آخر تک چلے گا۔

### علی الارض ہونا کا قرآنی مفہوم

پہلی چیز اس آیت میں یہ بتائی گئی کہ وَ عِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا (25:63)۔ یہ عباد الرحمن کی ایک صفت ہے جو بتائی گئی ہے۔ اس کا عام ترجمہ تو یہی کیا جائے گا کہ جب وہ چلتے ہیں تو بہت عجز اور انکسار سے، جھکے ہوئے، چلتے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ رفتار، گفتار اور کردار ہی کی علامتیں بن جاتی ہیں۔ انسان کے اندرونی جذبات کا اظہار اس کی محسوس جسمانی حرکات سے ہوتا ہے۔ اکثر نا کچھ اچھی بات نہیں ہے، اوجھے پن کی علامت ہوتی ہے۔ یوں بھی یہ بات ہو سکتی ہے لیکن اس میں اس سے ذرا گہرا پن ہے۔ میں ذرا اور آگے چل کر بھی عرض کروں گا کہ صرف اتنے معنی سے تو ہمارے ہاں کا جو تصوف ہے، فقیری و درویشی ہے، وہ اسی قسم کی آیات سے سہارے لے کر ایک خاص ٹائپ پیش کرتی ہے: خدا کے بندوں کا جھکے ہوئے، عاجز، ناتواں ہونا، ان کے اندر اتنا انکسار ہونا کہ اگر کوئی



چار گالیاں بھی دی جائیں تو خاموشی سے سن لے ایک گال پہ طمانچہ مارے تو دوسرا گال سامنے کر دے۔ وہ خدا کے بندوں کا کچھ اس قسم کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ تو انائی، قوت، غلبہ اور اقتدار یہ چیزیں ان کے دین میں ہوتی ہی نہیں ہیں اس کا نام تو تکبر ہوتا ہے اور تکبر کے متعلق جو پہلی چیز ہے وہ سوچتے نہیں کہ خود خدا نے اپنی ایک صفت ”المتکبر“ بھی کہی ہے۔ یہ جو کبر یائی ہے یہ ان کے ہاں ان کے تصور میں بھی نہیں ہوتی۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں ”ہو جا کھ مسیت دا“<sup>1</sup> سب سے بڑی صفت ہوتی ہے یعنی ایسا تنکا کہ ”رڑ کے ای نہ پیراں وچ کسے دے“<sup>2</sup> اور وہ تو شاید آپ کو یاد ہوگا پہلے بھی آیا ہے وہ ہمیں سنایا کرتے تھے کہ وہ پٹھانوں کے علاقہ میں تھے۔ وہ بھی اس طرح سے تصوف میں آگئے تھے تو ان کا یہ سلسلہ تھا کہ

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ  
شرن پڑے رگنا تھ کے سکیں نہ تنکا توڑ<sup>3</sup>  
(وحید خاں)

1 مسبح کا تنکا بن جا، سوکھا ہوا لاغر بے کار جس کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔

2 جس کسی کے پاؤں کے نیچے آئے اُسے معلوم تک نہ ہو۔

3 ”یعنی میں پٹھان تھا اور فوجوں کے منہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگنا تھ جی کے قدم پکڑے ہیں یا بالفاظ دیگر یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود جاری و ساری ہے میں ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دکھ پہنچنے کا احتمال ہے۔ یہ شعر وحید خاں کا ہے جو کہ ایک پنجابی شاعر تھا اور کسی ہندو جوگی کا مرید ہو کر فلسفہ ویدانت (ویدانت اور وحدت الوجود ایک ہی چیز ہے) کا قائل ہو گیا تھا۔ اس تبدیلی خیال و عقیدہ نے اس پہ یہ اثر کیا۔ کاش وحید خاں کو یہ معلوم ہوتا کہ زندگی نام ہی دکھ اٹھانے اور دکھ پہنچانے کی قوت رکھنے کا ہے۔ زندگی کا مقصد زندگی ہے نہ موت۔ (باقی اگلے صفحہ پر) کیا بات ہے صاحب! ان کے ہاں جب یہ اس قسم کی چیزیں آتی ہیں یا ان کے ہاں کا جو خدا کے بندوں کا تصور ہوتا ہے اس کے لیے اس قسم کی چیزیں پیش کرتے ہیں کہ وہ چلتے ہیں تو جھکے ہوئے انکساری سے۔ یہ ٹھیک ہے، پھر نا اچھی چیز نہیں ہے، اکڑنا اچھی بات نہیں ہے لیکن یہاں یہی بات نہیں ہے۔ یہ صرف چلنے کے معنی نہیں ہو سکتے۔

جھکو لیکن وقار کے ساتھ

عباد الرحمن کا يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ (25:63) ہونا آیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہاں ہونا کا لفظ آیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس مادے<sup>1</sup> کے معنی میں کہ جھکاؤ ہوتا ہے۔ اصل میں اس کے معنی ہوتا ہے ”سکون اطمینان“ پھرے ہوئے نہ ہونا، اوچھا پن نہ پیدا ہو جانا، نہایت باوقار طریقے سے ہونا، اور یہاں يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ (25:63) آیا ہے۔ یہاں ایک اور بھی نکتہ ہے۔ عام طور پہ قرآن کریم میں ”فی الارض“ ہی آیا ہے۔ جہاں تک میری نگاہ کام کر رہی ہے۔ یہ چار مقامات ہیں<sup>2</sup> جہاں ”على الارض“ آیا ہے۔ یہ

”علی اور فی“ میں ایک ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ علی کے معنی ہوتا ہے بالاتر ہیں اور ارض کے معنی زمین ہی نہیں ہوتا بلکہ ملک بھی اس کے معنی ہوتا ہے تو یہ جو چیز ہے کہ جب بالاتر میں ملک حاصل ہو جائے تو اس میں وہ اکڑتے نہیں ہیں ان کے اندر تفاخر نہیں آتا، پھرتے نہیں ہیں ان کے اندر اوچھاپن نہیں پیدا ہو جاتا اور ان کے اندر استبداد نہیں آ جاتا بلکہ وہ شاربِ ثمر بار کی طرح جھک جاتے ہیں لیکن جھکنا ہے کبریائی حاصل ہونے کے بعد یہ فقیری اور درویشی کا جھکنا نہیں ہے۔ اس کے متعلق تو سعدیؒ<sup>3</sup> بہت پہلے سے کہہ گیا کہ

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) زندگی تسلسل (Continuity) کا نام ہے جہاں اس میں انقطاع واقع ہوا زندگی ختم ہوگئی۔ جو قومیں اپنی جدوجہد کو مسلسل قائم نہیں رکھتیں وہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔ جو کچھ کسی قوم نے ماضی میں کیا اس کے نتائج اس کے زمانہ حال میں اس کے سامنے آتے ہیں۔ جو کچھ وہ حال میں کرتی ہے۔ اس سے اس کا مستقبل مرتب ہوتا ہے۔ ماضی حال اور مستقبل ایک دوسرے سے الگ زمانے نہیں ہیں۔ ماضی آگے بڑھتا ہے تو حال بن جاتا ہے اور حال سے مستقبل پیدا ہوتا ہے یا یوں سمجھئے کہ جسے حال کہا جاتا ہے وہ ماضی کا مستقبل اور مستقبل کا ماضی ہے اس لیے زندہ قوم ماضی حال اور مستقبل کے تسلسل کو قائم رکھتی ہے۔

(نوٹ: وحید خاں کا یہ شعر مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورة الکہف وسورة مریم میں ص-351 پر سہوایوں لکھا گیا ہے:

ہم تھے پت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ شرم لگے رگھو دیت کے جائے نہ تنکا موڑ

اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں)۔

① ہون اس لفظ کا مادہ ہے۔

② (18:7;22:65;25:63;71:26)

③ سعدی شیرازی (1184-1291)

تواضع ز گردن فرازاں نکوست

گداگر تواضع کند خوئے اوست

ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان میں بڑا فرق ہوتا ہے

تواضع اور جھکنا اسی کو زیب دیتا ہے اسی کے لیے محمود ہے اُسی کا جھکنا قابلِ تعریف ہے جس میں کھڑے ہونے کی کبریائی کی قوت حاصل ہو جسے اقتدار حاصل ہو جو کھڑا ہو جانا جانتا ہو۔ وہ جھکے تو یہ خوبی کی بات ہے اور اگر یہ فقیر آ کے جھکتا ہے سلام کرتا ہے تو وہ اس کی عادت ہوتی ہے عادت ہی نہیں بلکہ اس کے تو مفاد میں ہی یہ ہوتا ہے۔ فقیر اکڑ کر مانگے تو اسے کون دے گا تو یہ درویشی اور فقیری کا جھکنا نہیں ہے۔ حق کو چھوڑ کر دنیا میں کبریائی اور اقتدار حاصل کرنے کو قرآن حکیم نے ”استکبار بغیر الحق“ کہا ہے اس کو معیوب کہا ہے۔ جو مومن ہے وہ تو خدا کی صفت التکبر کا مظہر ہوتا ہے حدودِ بشریت کے اندر کبریائی اس کو حاصل ہوتی ہے۔ قرآن تو مومن کو اَنْتُمْ اَلْاَعْلَوْنَ (3:139) کہتا ہے: ساری دنیا میں تمام انسانوں کے اوپر غالب آیا ہوا۔ وہ تو ان کے اس دین کو اس نظام کو لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ

کُلِّه (48:28) کہتا ہے کہ ”یہ دنیا کے ہر نظام کے اوپر غالب آیا ہو۔“ مومن تو ہوتا ہی اس وقت ہے کہ جب بالائے ہر بالا ترے ہو۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں

مومن بالائے ہر بالا ترے

جتنا بھی اونچا کوئی دنیا میں ہے یہ مومن اس سے بھی زیادہ اونچا ہوتا ہے کیونکہ قرآن نے اعلون کہا ہے۔ یہ Superlative ڈگری ہے دوسروں کے ساتھ مقابلے میں Comparative بھی نہیں ہے اس لیے یہ کہتا ہے کہ

مومن بالائے ہر بالا ترے

غیرت او بر نتابد ہمسرے<sup>①</sup>

اس کی غیرت تو اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی دوسرا اس کا ہمدوش چلے۔ لہذا یہ جھکنا اُس کا جھکنا ہے جس کو یہ برتری حاصل ہو غلبہ حاصل ہو اقتدار حاصل ہو کبریائی حاصل ہو اور پھر وہ جھکے۔ یہ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هُونَاً (25:63)۔ میں وہ چیز کہی ہے۔

### لفظ ہونا صفت محمود کا قرآنی مفہوم

میں نے کہا ہے کہ ہونا کے معنی بھی جھکنا ہی نہیں ہوتا۔ عجیب بات ہے میں نے بار بار کہا ہے اور ہر دفعہ آپ دیکھیں گے کہ میں عربوں کی زبان کے اوپر آتا ہوں۔ زبان پہ تو آنا ہوگا۔ یہ تو خدا نے خود کہا ہے کہ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ (26:195) اس قرآن کو سمجھنا

① دنیا میں کوئی انسان کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو مومن کا مقام اس سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ مومن کی غیرت گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی اور انسان اس کا ہمدوش ہو جائے۔ ہو تو لسان عربی مبین کو سمجھو پھر قرآن سمجھ میں آئے گا۔ ان عربوں کے ہاں یہی جوہوْنَا کی صفت تھی وہ خود اسے اپنے ہاں ان معنی میں استعمال کرتے تھے کہ ”اگر کوئی اپنے ارادے رضا مندی سے خود گردن فرازی کی قوت رکھتے ہوئے جھکتا تھا تو اس کو وہ صفت محمود کہتے تھے اور اگر کوئی دوسرا اس کو جھکاتا تھا تو اس کو وہ ذلت کہتے تھے۔“ یہ عجیب قوم تھی۔ جھکنا تو دونوں ہی جگہ ہوتا ہے۔ ایک جھکنا وہ ہے کہ اقتدار رکھتے ہوئے پھر اپنی مرضی سے اپنے ارادے سے جھکے اور دوسرا جھکنا یہ ہے کہ دوسرے کے استبداد سے جھکایا جائے۔ وہ لفظ تو ایک ہی استعمال کرتے تھے ایک صفت ان کے ہاں محمود ہوتی تھی خود جھکنے کی اور دوسری نہایت مذموم ہوتی تھی اسے وہ ذلت کہتے تھے۔ تو یہ جو وَ عِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هُونَاً (25:63) ہے تو میں نے کہا ہے کہ اس میں ایک تو یہ علی الارض بڑی غور طلب بات ہے۔ میں نے عرض کیا ہوا ہے کہ قرآن کے کسی لفظ سے ایسے نہیں آگے جانا چاہیے۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ جہاں تک میری نگاہ نے کام کیا ہے قرآن کریم میں علی الارض اسی مقام کے علاوہ صرف تین اور مقامات<sup>①</sup> پہ آئے ہیں ورنہ قرآن زیادہ تر فی

الارض کہتا رہا ہے۔ ”علیٰ“ کے اندر ایک بالادستی کی قوت بھی ہوتی ہے تو یہاں یہ ہونا کے معنی وہ جھکاؤ والی بات نہیں ہے بلکہ سکون ہے سکینیت ہے اطمینان ہے وقار ہے اس کے اندر اوچھاپن نہیں ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ جب ملک میں ان کو بالادستی حاصل ہو جاتی ہے تو ان میں وہ اکڑ نہیں ہوتی۔ یہ الفاظ تو میں نے کئی جگہ استعمال کیے یہاں اوچھاپن بھی کہا، اکڑنوں بھی کہا لیکن وہ پنجابی کا لفظ جو اس کے معنی بیان کرتا ہے وہ تو بڑا ہی جامع ہے: اے بھوتر نہیں جاندے۔ یہ ہے اس کا صحیح ترجمہ کہ قوت ہتھ اوندی اے تے بھوتر نہیں جاندے۔<sup>2</sup>

عَبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا (25:63)۔ میں اس کے متعلق مزید تفصیل آگلی آیت میں جا کر کروں گا قرآن نے خود اس کی یہ تفسیر وہاں کر دی ہے یہاں اتنا ہی کہہ کر آگے گزر جاتا ہوں۔ اور آگے ہے کہ وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (25:63)۔ اس کا عام ترجمہ یا مفہوم لیا جاتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب کوئی جاہل ان کے سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اوبا باسلام جاگلوں ہٹ اے ست سلام ساڈے<sup>3</sup>۔ یہ ایک مشہور محاورہ ہے اور اردو میں ہے۔ سات سلام ہوتے ہیں یعنی جس کو دفع کرنا ہو یہ اس کے لیے ہے۔ اس لیے وہ جو جاہل ہیں ان کو وہ پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ اوبا باسلام۔<sup>4</sup>

① (18:7; 22:65; 71:26)

② یہ ”شونٰی“ میں نہیں آ جاتے۔ یہ ہے اس کا صحیح ترجمہ کہ قوت ہاتھ آتی ہے تو ”شونٰی“ میں نہیں آ جاتے۔

③ بابا! معاف کرو، بخشو جاؤ جان چھوڑو ہمارے یہ سات سلام۔

④ بابا! معاف کرو، بخشو۔

یہاں تو جاہل سے بھی حسن سلوک سے پیش آنے کا سبق دیا گیا ہے

جب پہلے سے ہی اس کے ساتھ بات کرنے کا عالم ہے تو یہ بات کیا ہوئی!! تم نے تو انہیں علم سکھانا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ① (2:129)۔ یہ تو تمہارے پیغمبر کی صفت بتائی گئی ہے کہ یہ جو تعلیم دینا ہے تو انہی کو ہی دینا ہے جن کو علم حاصل نہیں ہے اور انہیں اس کی غرض و غایت بتانا ہے جنہیں اس کا علم حاصل نہیں ہے وہ تو جاہل ہیں مگر یہ ہیں جو ان کے متعلق کہتے ہیں کہ جاوئے جا، اپنا کم کر۔ اسی تے عالماں نوں سمجھانے ہونے آں۔<sup>2</sup> یہ ٹھیک بات ہے کہ آج کا لفظ عالم جاہل کا ہی مرادف ہے لیکن یہ بات قرآن کے اندر کی تو نہیں ہے، قرآن کی تعلیم کی تو نہیں ہے۔

قرآن نے جھلون کہا ہے جاہلیت اور اسلام دو دور گنائے ہیں۔ اسلام سے پہلے جو عرب تھا اسے عرب جاہلیہ کہتے ہیں اسے دور جاہلیہ کہتے ہیں۔ وہ ہے تو جہل ہی لیکن وہ ایک مخصوص Term (اصطلاح) بن گئی ہے۔ اسی کی خاص خاص خصوصیات ہوتی تھیں مثلاً

تعصب، اکڑ پن، انتقام، وحشی سا ہونا، درندگی۔ یہ تھیں ان کے ہاں کی یہ خوبیاں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ساتھ ان لوگوں کا ہر روز، ہر وقت معاملہ پڑتا تھا جنہیں آپ جماعت مومنین کہتے ہیں۔ یہ وہی لوگ تھے جن کو انہوں نے تعلیم و تربیت دے کر اس سانچے میں ڈھالنا تھا۔ تو اس قسم کے لوگ اگر سامنے آئیں، ان سے واسطہ پڑے، تو انسان ان کو دھتکار دیتا ہے یا ان کی مخالفت پہ اتر آتا ہے۔ یہاں کہا کہ یہ جو جاہلیت کے لوگ ہیں، یہی تو یہاں کی آبادی ہے، جب جاہلیت کے لوگوں سے تمہارا معاملہ پڑے تو ان کو بھی تم سلامتی کی دعا دیا کرو، ”آؤ میاں! ہمارے ہاں سے تمہارے لیے بھی سلامتی ہے۔“ ان کو دھتکارو نہیں بلکہ قریب لاؤ۔ یہ عباد الرحمن کی کیفیت ہے اور اگلی چیز یہ ہے یہاں سے وہ معنی واضح ہوتے ہیں جو میں نے ابھی عرض کیے تھے جس میں جھکاؤ پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ کیسے ہیں؟

اس جھکاؤ کا وہ مفہوم جو ہمارے ہاں پیش کیا جاتا ہے

قرآن نے کیا بات کہی ہے؟ کہا ہے کہ وَالَّذِينَ يَبْتِغُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا (25:64)۔ چلیے صاحب! انہوں نے تو اس کا یہ ترجمہ کیا کہ ”یہ لوگ ہیں جو ساری رات کبھی سجدے میں رہتے ہیں، کبھی قیام میں رہتے ہیں۔“ یہ کام کرتے ہیں، اس کا نام یہ ہے کہ عبادت کرتے ہیں صاحب! اور عبادت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ کھڑے رہتے ہیں یا وہ نفل پڑھنے میں یہ چیز ہو جائے گی۔ یا وہ کھڑے رہتے ہیں یا وہ سجدے میں ہوتے ہیں۔ بیستون کے معنی کرتے ہیں ”وہ ساری رات اس طرح سے گزارتے ہیں۔“ سوچے کہ یہ

① انہیں اس ضابطہ (کتاب) کی تعلیم بھی دے، اور یہ بھی بتائے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے اور ان پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے (2:231; 17:39; 33:34) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 47)۔

② جاؤ رے بابا! جاؤ اپنی راہ لو۔ ہم تو عالموں کو سمجھاتے ہیں۔

قوم جس کی یہ کیفیت ہو، وہ دنیا میں کسی کام کرنے کے قابل نہیں رہے گی۔

تصوف کی دنیا کا پیش کردہ اسلام

عزیزانِ من! میں پھر کہوں گا کہ جب آپ کے ہاں تصوف آیا ہے تو اس میں یہ بات Fit-in کرتی ہے، موزوں بیٹھتی ہے۔ انہوں نے تو دنیا اور دنیا کی آلائش کو ترک کر دیا، انہوں نے تو کہہ دیا کہ یہ دنیا کفار کے لیے ہے، مومن کے لیے نہیں ہے، ان کے لیے اگلی دنیا ہے، تو یہ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ اب دنیا کے معاملات کو ترک کیا۔ یہ ہو گئے قابلِ نفرت تو پھر دنیاوی معاملات کا تو اس میں سوال ہی نہیں رہتا۔ پھر معاملات کیا باقی رہ گئے؟ یہی ہے کہ پھر نمازیں پڑھ چھوڑیئے، ورد و وظیفہ کر چھوڑیئے، تسبیحاں پھریں۔ یہی چیز باقی رہ جاتی ہے۔ جب دنیا کے آلائش سے الگ ہو جائے تو پھر یہی چیز باقی رہ جاتی ہے، تو جب انہوں نے دین کا حاصل اپنے ہاں یہ لیا: ترک دنیا، ترک آلائش، تو اس کے بعد پھر باقی، یہ پرستش کی چیزیں رہ گئیں، عبادت کے معنی یہ رہ گئے۔ اسی لیے پھر جو تصور نبی اکرم ﷺ کا بھی

ہمارے سامنے پیش کیا وہ بھی تھا کہ حضور ﷺ ساری رات کھڑے رہتے تھے پاؤں سوچ جایا کرتے تھے۔

### سورۃ مدثر میں پیش کردہ سیرت رسول ﷺ

آپ کو یاد ہوگا میں نے چند دروس پہلے سورۃ مزمل<sup>①</sup> کی پہلی آیات پیش کی تھیں۔ یہ سورۃ مدثر اور سورۃ مزمل دوسورتیں ہیں۔ ان میں نظر آتا ہے کہ یہ ابتدائی دور کی سورتیں ہیں۔ یہ بڑی عظیم چیزیں ہیں جو اس کے اندر حضور نبی اکرم ﷺ کے متعلق آئیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سورۃ المدثر کے اندر میں نے یہ کہا ہے کہ المدثر کے معنی اے کملی والے اور کملی میں لپٹنے والے کیے جاتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اسے پھر ہر ادوں کہ مدثر کے معنی ہوتا ہے ”شاخ خزاں دیدہ پہ جب زندگی کی کوئی نمود نہ رہے تو اس کے بعد بہار کے موسم میں جونئی کو نیلیں پھوٹی ہیں یہ ہوتی ہے تدشیر“۔ مدثر کے معنی ہیں کہ یہ جو نظام عالم آج خزاں دیدہ ہو چکا ہے جس میں زندگی کی شادابی کی کوئی کسی قسم کی علامت نہیں ہے اے کہ اس کو بہار نو میں تبدیل کرنے والے! قُمْ فَأَنْذِرْ (74:2) اٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ یہ عظیم چیز ہے صاحب! آپ کسی Historian (مورخ) سے پوچھیے خاص طور سے ہمارے ہاں تو اس دور کی کوئی تاریخ ہے نہیں اس دور کی جو تاریخ لکھنے والے ہیں ان سے پوچھیے۔ وہ بتاتے ہیں کہ عالمگیر انسانیت میں زندگی اور نمود کی کہیں کسی قسم کی کوئی علامت باقی نہیں رہی تھی جب نبی اکرم ﷺ کا ظہور ہوا ہے۔ مدثر کے معنی تب سمجھ میں آتے ہیں۔ بہر حال یہ کر:

① سورۃ مزمل اور مدثر کی تفہیم کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (کمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006ء، ص 280 تا 397۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:3) اور خدا کے نظام کی کبریائی کو قائم کر۔ اس لیے اٹھ۔ یہ قُمْ بڑی چیز ہے تو یہ تو قُمْ ہے یہ اس کے سامنے بڑا عظیم پروگرام تھا یہ اس قسم کی دنیا میں ایک نیا نظام نیا انقلاب برپا کرنا ہے۔ سوچیے عزیزان من! یہ انقلاب کتنا بڑا پروگرام چاہے گا۔ یہ اس کے لیے دن رات کوششیں کریں گے۔ ہوتا یہی تھا کہ دن کو اس پروگرام کو Execute (نافذ) کرتے تھے اور راتوں کو جب ادھر سے فرصت ملتی تھی فارغ ہوتے تھے پھر اس کے متعلق پلاننگ کرتے تھے سوچتے تھے کہ آج جو کچھ کیا ہے اس میں کیا کمی رہ گئی ہے کل جو کرنا ہے اس میں کیا کچھ ہمارے سامنے ہوگا۔ سوچتے تھے بیٹھتے تھے مشورے کرتے تھے پلانز بناتے تھے اسکیمیں اپنے سامنے رکھتے تھے اور چونکہ یہ جذبہ بڑا شوق و اشتیاق کا تھا اس لیے کہ پوری کی پوری سرگرمی عمل سے یہ پروگرام تکمیل تک پہنچ جائے تو راتوں کو بھی کافی رات گئے تک مشوروں کے لیے اتنا زیادہ جاگتے رہتے تھے کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑا کہ يَا أَيُّهَا الْمَزْمِلُ ۝ قُمْ الْيَلَّ إِلَّا قَلِيلًا (73:1-2) ٹھیک ہے راتوں کو بھی یہ کچھ کرنا ہوتا ہے یہ بھی اس پروگرام کا حصہ ہے لیکن تھوڑا وقت لیا کرو اس لیے کہ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا

طَوِيلًا (73:7) دن میں جو پروگرام تمہارا ہے وہ بڑا لمبا پروگرام ہے اسے بھی تو تم نے ہی سرانجام دینا ہے اس لیے رات کو بہت تھوڑے سے وقت کے لیے جاگو۔ اور پھر اس کے بعد اسی سورۃ میں ہے کہ یہ تمہارے جو ساتھی ہیں ان کا بھی خیال رکھو ان میں کمزور بھی ہیں بیمار بھی ہیں انہوں نے روزی بھی کمائی ہے اور کام کاج بھی تم لوگوں نے کرنے ہیں تو اس لیے اس کا خیال رکھو: إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (73:7) دن میں اتنا لمبا پروگرام تم لوگوں کے لیے ہوتا ہے راتوں کو مشوروں کے لیے جاگنا ہے تھوڑے سے وقت کے لیے جاگا کرو۔ اب آپ نے دیکھا کہ یہ درویشی، فقیری اور تصوف کا تو پروگرام ہی نہیں ہے۔

### اہل تصوف کی مصروفیات

دنیا سے قطع تعلق کرنا اب ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب یہ نہیں ہے کہ ویلے نیں۔ ہن کم کی ہووے۔<sup>①</sup> یا یہی ہے کہ تسبیحیں پھیریں۔ یہ جتنے بھی بڑے بڑے صوفیا یا اولیائے کرام ہیں ان کی زندگیاں جا کر دیکھیے ”صاحب! وہ دن رات میں ایک ہزار نفل پڑھا کرتے تھے“ یہ لکھ دیا، کبھی ماپ کے دیکھا ہی نہیں کہ ایک نفل کی جو پوری رکعت ہے اس میں وقت کتنا لگتا ہے اور ہزار نفل پڑھنے میں وقت کتنا لگتا ہے۔ کبھی کسی نے یہ سوچا ہی نہیں اور لکھتے چلے گئے: ”نولکھ ہزاری صاحب! کیا بات ہے!“ ”نولاکھ مرتبہ روزانہ قرآن شریف ختم کیا کرتے تھے۔“ تو ایک بات ظاہر ہے کہ پھر آدمی کام تو اور کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ نولاکھ نہ سہی، نو ہزار سہی یا نو سو ہی سہی تو یہ جو چیز تھی

① وہ لحاظ فرصت میں ہیں انہیں اب کوئی کام نہیں۔

کہ یہ دنیا ان کفار کے حوالے کرو اور آپ پھر اللہ والے یہ کچھ کرنے کے لیے بنو۔ اس کی رو سے یہ سارے ترجمے اور یہ مفہوم ہوتے تھے کہ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا (25:64)۔ ان کے ترجمہ کی رو سے کہ راتوں کو یہ لوگ پھر یا یہ نفل پڑھتے ہوئے کھڑے رہتے ہیں یا سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ سجدے میں چلے جاتے ہیں پھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ساری رات اس طرح سے گزار دیتے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ جو بیستون ہے اس کے معنی ہوتے ہیں ”رات کے سکون میں مشوروں کے لیے جمع ہونا۔“ تو پورا پروگرام سورۃ مزمل کا سامنے آ گیا: مشوروں کے لیے جمع ہونا۔ یہ جو آگے انہوں نے بات کہی ہے کہ سُجَّدًا وَقِيَامًا (25:64)۔ ان کے ترجمہ کی رو سے اس کے معنی یہ کرتے ہیں کہ کبھی سجدے میں ہوئے، کبھی کھڑے ہوئے۔

ان لفظوں کے معنی قرآن سے پوچھیے، انہیں مجاز کے معنوں میں لیجیے جن میں قرآن استعمال کرتا ہے۔ ان کا پروگرام ہے۔ اس پروگرام کے اندر دونوں چیزیں آتی ہیں: کہیں اس پروگرام میں جھکنا ہوتا ہے، سپر اندازی ہوتی ہے اور کہیں ڈٹ کے کھڑا ہونا ہوتا ہے۔

ایک جرنیل کے ایک انقلابی پروگرام والے کے سامنے دونوں چیزیں سوچنی پڑتی ہیں کہ کہاں مجھے کھڑے ہو جانا ہے، کہاں مجھے سپر انداز ہو جانا ہے، کہاں مجھے ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ اب دیکھیے کہ ایک شعر میں اقبالؒ (1877-1938) کیسے اس مفہوم کو واضح کر گیا ہے۔ بات صاف کہہ جاتا تھا یہ شخص:

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر

یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

(اقبالؒ: بال جبریل)

یہ ہے ”سجدا و قیاما“۔ دیکھتے ہیں آپ، یہ شخص سمجھا ہوا تھا۔ یہ سجدہ اور قیام دونوں چیزیں مومن کا شعار ہیں: مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ<sup>①</sup> (48:29)۔ یہ ہیں عباد الرحمن۔ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں ☒ کی کیفیت یہ ہے کہ مخالفین اور سرکشوں کے مقابلے میں آتے ہیں تو وہاں ڈٹ کے کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (48:29) ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت محبت اور پیار سے، جھکاؤ سے ملتے ہیں۔ یہ ہے

① محمد رسول اللہ ﷺ اور اس کے رفقاء کی جماعت حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں، لیکن باہد گر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد ہیں (5:54) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1202)۔

رحمَاءُ بَيْنَهُمْ (48:29) یہ ہے سجدا و قیاما۔ اس کے اندر دونوں چیزیں آ جاتی ہیں بلکہ دوسرے مقام پہ تو أَذِلَّةٌ<sup>①</sup> (5:54) کا لفظ بھی آیا ہے۔ (5:54) بڑی عظیم آیت ہے: يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (5:54) اے ایمان والو! اگر تم دین سے پھر جاؤ گے تو پھر خدا تمہاری جگہ اور قوم لے آئے گا۔ ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ خدا کے ہوں گے اور خدا ان کا ہوگا۔ ان کی یہ صفت بتائی ہے کہ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ (5:54) مخالفین کے مقابلے میں اعزۃ یعنی غلبہ اور اقتدار رکھتے ہوئے اور آپس میں مؤمنین کی جماعت اذِلَّةٌ<sup>①</sup> یعنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جھکتے ہوئے یہ جو أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ (5:54) ہے اس کا ترجمہ کیا ہے: يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (5:54) خدا کے راستے میں جہاد کرنے والے اور لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (5:54) کسی ملامت کرنے والی کی ملامت سے قطعاً نہیں ڈرتے۔ یہ ہے



ان کے ہاں کا قیام اور یہ ہے جو اشد آء علی الکفار ہے یہ ہے ان کا قیام اور یہ جو رحماء بینہم ہے یہ جو اذلة علی المؤمنین ہے یہ ہیں سجدے ان کے یہ ہے آپس میں جھکنا ان کا ایک دوسرے کے ساتھ دوستوں کی محفل میں مگر سرکشوں اور مخالفین کے مقابلے میں یہ اشد آء ان کا قیام ہے یعنی وہ ڈٹ کے کھڑے ہو جاتے ہیں یہ ہیں مومن کی صفات کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

شبستانِ محبت میں حریر و پر نیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تندِ رو کوہ و بیاباں سے

گلستاںِ راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

(بانگ درا: طلوع اسلام)

یہ ہیں مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشْدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (48:29) کے معنی۔ یہ ہیں جو راتوں کو یہ مشورہ کرتے ہیں۔

① ابن لا عربی نے کہا ہے کہ یہاں (5:54) میں اَذَلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ..... رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (48:29) ہیں یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مشفق و ہمدرد۔ اور مخالفین کے مقابلے میں سخت۔ جناح الذل (17:24) نری تواضع اور مہربانی کے لیے آیا ہے (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز لغات القرآن جلد دوم ادارہ طلوع اسلام لاہور 1960ء ص 701 تا 703)

### متصوفانہ نظریاتی زندگی کا نتیجہ

میں نے عرض کیا ہے کہ جب ہمارے ہاں کے تصوف اور مذہب میں دنیا سے نفرت، دنیا سے قطع تعلق یعنی یہ کہ یہ سب کچھ چھوڑ دیا جائے آیا تو پھر اس میں غور، تدبر اور فکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہاں کسی مقام پہ تفکر اور تدبر آتا ہی نہیں ہے۔ تفکر تو وہ کرے گا جس کے سامنے کچھ Problems (مسائل) ہوں گے۔ جن کے سامنے کچھ مسائلِ حیات ہوں گے وہ سوچیں گے کہ ان کو حل کیسے کرنا ہے۔

### قرآنِ حکیم کے نزدیک غور و فکر کی اہمیت

مومن کی صفت جو قرآن نے بتائی ہے، میں نے عرض کیا ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ نے بھی یہ کہا ہے اور وہ ایسی آیت ہے کہ جسے ہر

درو دیوار پہ لکھنا چاہیے کہ قُلْ اے رسول! تم ان سے کہو کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بحث نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی کوئی طول طویل لیکچر دینا چاہتا ہوں۔ اِنَّمَا اَعْظَمُكُمْ (34:44) میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اب کہنے کا یہ انداز ہی دیکھیے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کہنا چاہتا بلکہ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں، وہ سننے کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔ کہا کہ میں تمہارے چلتے چلتے وہ بات نہیں کہنا چاہتا۔ کہا کہ اَنْ تَقُومُوا لِلّٰهِ مِثْلِيْ وَ فُرَادٰی (34:46) تم سارے نہیں تو ایک ایک دو دو چار چار جتنے بھی ہو کھڑے ہو جاؤ، بات ایسی اہم ہے۔ ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ ایسی اہم بات ہے کہ کھڑے ہو کر میری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں، سنو۔ تو سائیکلو جیکلی (نفسیاتی طور پر) پہلے تو ان کو سوچنے پہ آدھا تیار کر لیا، چلتے چلتے جو بات کہی جائے تو وہ ایسی اثر انداز نہیں ہوتی۔ کہا کہ پہلے کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ فرمائیے! کہا کہ ایک بات کہوں گا۔ کہیے کیا کہتے ہیں؟ کہا کہ تَتَفَكَّرُوْا (34:46) سوچا کرو۔

عزیزانِ من! بس ایک بات کہی تھی۔ وہ بات بھی نہیں، وہ تو صرف ایک لفظ ہی کہا ہے: تَتَفَكَّرُوْا (34:46) سوچا کرو۔ تو غور و تفکر تو وہ کرے گا جس کے سامنے کوئی مشکلات آئیں گی، کوئی حل طلب مسائل آئیں گے۔ مسائل تو وہ آنے تھے کہ خود نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جو مملکت قائم ہوئی ہے وہ دس لاکھ مربع میل پر ان لوگوں کی پھیلی ہوئی مملکت تھی۔ جن کو مکے سے گھروں سے نکال دیا تھا، وہ اتنی بڑی مملکت کے مسائل اور پھر قصر و کسریٰ سے ٹکراؤ، وہ تو واقعی ان کو دن کو میدانِ جنگ میں جانا پڑتا ہوگا، راتوں کو بیٹھ کے اگلے دن کے لیے مسائل حل کرنے پڑتے ہوں گے، اور ان کی کیفیت پھر مسائل حل کرنے کی ہوگی (3:190) کہا کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الْاَیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (3:190) ارض و سما کی تخلیق میں دن اور رات کے اختلاف میں صاحبانِ عقل و فکر کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نمایاں علامتیں ہیں، نشانیاں ہیں۔ یہاں اولیٰ الالباب کہا ہے۔ ایک تو عقل ہوتی ہے۔ ایک یہ لفظ لب لباب آپ کے ہاں بھی ہے، جنوں ت کدیا ہو یا کیندے نیں۔<sup>1</sup> عقل مندوں میں سے بھی جو اولیٰ الالباب ہیں، ان کے لیے بہت بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ ہیں کون لوگ؟ ان کے لیے کہا کہ اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَ قُعُوْدًا وَ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ (3:191) یہ وہ صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر ہیں، جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے بیٹھے، لیٹے قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے برعکس آج ہمارے ہاں ذکر کا پایا جانے والا مفہوم

عزیزانِ من! اب ہمارے ہاں تو آپ کو ”ذکر“ کا پتہ ہی ہے کہ جن معنی میں ہمارے ہاں یہ آج کل ہوتا ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد تو ان مسجدوں کے اندر سے پھر آدھی رات تک وہ ”ذکر جلی“ کی آوازیں آتی ہیں، جس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ قلب چلتا ہے۔ کہتے کیا

ہیں پوچھیے اس<sup>2</sup> سے جس نے یہ کچھ کیا ہوا ہے۔ کیسے چلا ہوا تھا قلب آج تک سنبھل ہی نہیں رہا۔ یہاں کہا ہے کہ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ (3:191) وہ کہتے ہیں جی خدا کا ذکر کرتے ہیں: يَذْكُرُونَ اللّٰهَ کون ہیں یہ؟ یہ اولی الالباب ہیں صاحبان عقل و فکر ہیں غور و فکر والے ہیں خدا کا ذکر کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں۔ یہ تو عقل مندوں کی بات ہے اور ہمارے ہاں تو یہ جواہل الجنۃ ہیں جنت میں جو لوگ جائیں گے ان کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ بیوقوف لوگ ہوں گے۔ تو ترجمہ اس کا ”بھولے بھالے“ کر دیتے ہیں۔ گل تے اکوای ہیگی اے۔<sup>3</sup> مگر یہاں کہا ہے کہ اُولٰٓئِیۡ اَلْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیۡنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ (3:190-191)۔ یہ اولی الالباب کھڑے بیٹھے لیٹے ذکر اللہ کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! ذکر کے معنی ہوتا ہے ”سامنے رکھنا“ کسی چیز کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ کیا چیز ہے جو وہ کھڑے بیٹھے لیٹے کرتے ہیں؟ اس کے لیے کہا کہ يَتَفَكَّرُوْنَ فِیۡ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَّ الْاَرْضِ (3:191) وہ تخلیق ارض و سموات کے اندر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ تو اولی الالباب کے معنی آگئے: صاحبان عقل و فکر صاحبان فکر۔ یہاں کہا کہ يَتَفَكَّرُوْنَ فِیۡ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَّ الْاَرْضِ (3:191) انتہائی غور و فکر کے بعد کھڑے بیٹھے لیٹے اس بات کو سامنے رکھتے ہیں غور و فکر کے جو محل ہیں ان کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191) اے ہمارے نشوونما

① جسے بات کا نچوڑ نکالا ہوا کہتے ہیں۔

② یہ اشارہ جی۔ اے۔ پرویز (1903-1985ء) کا اپنی ہی طرف ہے۔

③ تو یہ بات تو ایک ہی ہے۔

دینے والے! تو نے اس سلسلہ کار گہ کا نجات کو تخریبی نتائج کے لیے پیدا نہیں کیا ہے، باطل پیدا نہیں کیا ہے اور اسی وقت دعا ہوتی ہے کہ سُبْحٰنَكَ (3:191) تو اس سے بہت بلند ہے کہ اتنا بڑا کار گہ کا نجات ہو اور تو اس کو باطل پیدا کر دے اس لیے فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) جو ایسا سمجھتے ہیں وہ جہنمی ہیں ہمیں جہنم میں تم نہ پہنچا دینا۔ یہ تو صاحبان عقل و بصیرت کے لیے کہا گیا ہے کہ يَتَفَكَّرُوْنَ فِیۡ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَّ الْاَرْضِ (3:191) یہ ہے الَّذِیۡنَ یَبْتَغُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُبْحٰنًا وَّ قِیَامًا (25:64)۔ یہ لوگ راتوں کو مشورے کے لیے بیٹھے ہیں اور پھر وہاں ان کے موضوع یہ ہوتے ہیں کہ کہاں جھکنا ہے کہاں ڈٹ کے کھڑے ہونا ہے۔ يَتَفَكَّرُوْنَ (3:191) وہاں غور و فکر کرتے ہیں ان معاملات کو اس طرح سے سلجھاتے ہیں۔ یہ ہے ان کا سجدہ اور یہ ہے ان کا قیام یہ ہیں عِبَادُ الرَّحْمٰنِ (25:63)۔ اس تمام تگ و تاز میں ان لوگوں کی وَالَّذِیۡنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۚ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (25:65) یہ آرزو ہر وقت دل میں رہتی ہے اور پھر دعا بن کے لب تک آتی ہے کہ وہ باطل کے نظام کے تباہ کن عذاب سے محفوظ

رہیں جو ہر غلط رویہ انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ ابھی ابھی یہاں یہ آیا تھا کہ جو ارض و سماوات میں فکر نہ کرنے والے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کچھ یونہی باطل پیدا کر دیا اس سے اور بھاگو۔ یہ تو آلائشوں والی چیز ہے، دلدل ہے، کچھڑ ہے۔ یہ چیز ماخلقنا باطل ہے اس کا نتیجہ بتایا گیا ہے کہ جہنم ہے۔ یہ دنیا، یہ کارگہ کائنات پر غور و فکر نہ کرنے والے اسے قابلِ نفرت کہنے والے اس سے دور بھاگنے والے دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل اور خوار اور کمزور اور ناتواں اور محتاج اور بے کس قوم ہوتی ہے۔ یہی تو جہنم ہے۔

### قرآن حکیم انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹتا ہے

یاد رکھیے قرآن نے تین گروہوں میں انسانوں کو بانٹا ہے۔ ایک تو وہ ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِي الْاَرْضِ (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جتنی قوتیں ہیں تمہارے لیے تابع تسخیر کی ہوئی ہیں۔ ان کو مسخر (Harness) کرو۔ مسخر کرنے کے بعد کہا کہ ان کو بالحق استعمال کرو ان قوتوں کا استعمال تم قوانینِ خداوندی کے مطابق کرو۔ اب ایک گروہ وہ ہو گیا جو کائنات کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے اور ان قوتوں کو خدا کے قانون کے مطابق نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لیے صرف کرتا ہے۔ انہیں قرآن جماعتِ مومنین کہتا ہے۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو کائنات کی قوتوں کو مسخر تو کرتا ہے لیکن ان کا استعمال اپنی مرضی، اپنے مفاد، اپنے قوانین کے تابع کرتا ہے، دوسروں کی تخریب کے لیے خود موٹا ہونے کے لیے کرتا ہے۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ لوگ بھی ہیں جن کا کہنا صرف یہ ہوتا ہے کہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا (2:200) بس اس دنیا کے اندر ہمیں سب کچھ ملتے چلے جانا چاہیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان کو دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے تو یہ دنیا اور اس کا مفاد تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ مَا لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلٰقٍ (2:200) مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ تو یہ وہ ہو گئے جنہیں آج اس دور کے Materialist (مادیین) مادہ پرست، سیکولر، مغرب کی قوتیں، جوجی میں آئے کہہ لیجیے۔ اب بہر حال انسانوں کا پہلا گروہ تو وہ ہے جن کو دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں، دوسرا گروہ وہ ہے جن کو اس دنیا کی خوشگواریاں تو حاصل ہو جاتی ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ مَا لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلٰقٍ (2:200) اس کے بعد کی زندگی کے اندر ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ تیسرے وہ ہوتے ہیں کہ جو اس دنیا اور فطرت کی قوتوں کو سب کو قابلِ نفرت قرار دیتے ہیں اور ترک کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے لیے قرآن کہتا ہے ان کے لیے نہ دنیا میں کوئی حصہ ہوتا ہے نہ آخرت میں: خٰزِئِيْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) اس دنیا میں بھی ذلت کی زندگی، قیامت میں بھی ان کے ہاں عذاب کی زندگی۔ یہ تیسرا گروہ ہے جس میں ہم شامل ہیں۔ اس کے بعد یہ خود فریبی ہے کہ نہیں صاحب! ہم تو تسبیح پھیرتے ہیں، ورد وظیفہ کرتے

ہیں، نفل پڑھتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں۔ وہ پوچھتا یہ ہے کہ اب دنیا کے ثواب کے اندر تمہارا کتنا حصہ ہے اور اگر یہاں ذلت و خواری ہے تو وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (17:72) جو یہاں کا اندھا ہے، وہ وہاں کا بھی اندھا ہی ہوگا۔ ہو نہیں سکتا کہ یہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو اور جو عاقبت ہے وہاں وہ معزز اور سرفراز ہو۔ زندگی تو ایک غیر منقطع عمل (Continuous Process) ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ پودا اگتے ہی مرجھا گیا ہو اور اس کے بعد اس کے اندر بڑے شاندار پھل لگیں؟ جو ابتدا میں ہی مرجھا گیا وہ آخر تک مرجھایا ہوا رہتا ہے۔ یہ پہلا انسانوں کا گروہ ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بار خدایا! جہنم کی ذلت اور خواری کی زندگی سے ہم کو محفوظ رکھ۔

### نتائج کی دنیا انسانی اعمال کی ہی پیداوار ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (25:65) جہنم کا عذاب غراماً ہے۔ یہ غراماً<sup>①</sup> عجیب لفظ ہے، انسان جو کوئی عمل کرتا ہے، وہ تو کام کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اور اس کا جو نتیجہ یا خمیازہ Consequence ہے وہ اس کے پیچھے چلتا ہے کہ چل کہاں جاتا ہے۔ اس نتیجے کے ظاہر ہونے تک کے لیے تھوڑا سا مہلت کا وقفہ ہوتا ہے، جس کے بعد اس نتیجے نے اسے پکڑنا ہوتا ہے۔ یہ بھی اس کی بڑی رحمت ہے جو اس نے مہلت کا وقفہ رکھا کہ اگر غلط قدم اٹھ گیا ہے تو کسی وقت احساس ہو جائے تو واپس لوٹ سکتا ہے۔ اس

① اس کا مادہ ”غ ر م“ ہے۔ تاج العروس اور محیط المحیط کے مطابق ”غرام“ وہ مصیبت ہے جو انسان کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہو جائے ایسی مصیبت جس سے چھٹکارہ نہ ہو جو ہر وقت پیچھے لگی رہے جس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہو (ماخوذ از پرویز: لغات القرآن ص 1225) لیے یہ جو اس کا نتیجہ ہے، وہ اس کے پیچھے لگا رہتا ہے لیکن یہ خدا کا قانونِ مکافات اسے اسی وقت نہیں پکڑ لیتا۔ اگر یہ اصلاح کے لیے لوٹا نہیں ہے، اپنی اصلاح نہیں کرتا تو اس کے بعد پھر یہ اس کو جھپٹ لیتا ہے۔ یہ ہے إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (25:65) اس کا عذاب جو ہر وقت پیچھے پیچھے لگا رہتا ہے جس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہے۔

### عذاب سے بچنے کا طریق

آگے قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس سے بچنے کی کیا صورت ہے۔ کہا کہ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا (25:66) جہنم تو وہ عذاب ہے کہ اس کے اندر مستقل طور پر رہنا تو ایک طرف رہا، یوں ہی تھوڑے وقت کے لیے بھی اس میں جو قرار ہے، وہ بھی بڑا عذاب ہے۔ کچھ وقت کے لیے یہ مستقر اور مقام ہے۔ کیا بات قرآن کہہ گیا ہے! ابتدا میں جو تو میں جہنم میں گرفتار ہوتی ہیں، تو وہ مستقر ہی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر سے پھر وہ نکل جائیں لیکن اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر وہ مقام ہی ان کا ہو جاتا ہے۔ وہ بہر حال نہایت بری قیام گاہ

ہے۔ ان کی یہ دعائیں ہوتی ہیں وَ الَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامٌ (25:67) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے، خواہ آپ اس کو انفرادی طور پر لے لیں یا اس نظام میں لے لیں، ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس زندگی کا جو بھی سامان ہوتا ہے اسے مال و دولت کہیے، کچھ بھی کہیے آپ اسے سامانِ زیست کہتے ہیں، متاعِ حیات کہتے ہیں، بہر حال ان کی کیفیت یہ ہے کہ نہ تو وہ اسے اس طرح سے کھلا رکھتے ہیں کہ کسی کی ضرورت سے زیادہ خرچ ہو جائے اور نہ ہی اس طرح کہ کسی کی ضرورت رکی رہے۔ وہ افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

## اسراف کا قرآنی مفہوم

”اسراف“ کا لفظ عربوں کے ہاں بڑے عجیب معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ کنویں کے پانی کی نالیوں میں سے پانی کھیتوں کو سراب کرنے کے لیے جاتا ہے۔ یہ آج کل ہمارے ہاں بھی انکوائری کمیٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اصل میں تو یہ یو این او (UNO) والوں نے اس لیے بنائی ہوئی ہیں کہ یہ جو اس طرح اریگیشن (آب پاشی) ہوتی ہے اُس سے ذرا یہ پتہ چلے کہ پانیوں کے لیے اس کا نتیجہ کیسے نکلتا ہے۔ یعنی یہ دیکھیں کہ کتنے فی صد پانی ضائع ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ جس طریق سے اے جیہڑیاں آڈاں بنالیاں ہوئیاں ہوندیاں،<sup>1</sup> یہ ان کو نالیاں ہی کہتے ہیں، جن سے پانی گزر کر جاتا ہے، ان سے کتنے فی صد پانی ضائع ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا یہ ہے کہ کم از کم کوئی

<sup>1</sup> یہ جوان لیاں بنائی ہوتی ہیں۔

اڑتالیس فی صد پانی راستے میں ضائع ہو جاتا ہے، ادھر ادھر سے لیک (Leak) کرتا رہتا ہے تو وہ وہاں نہیں پہنچتا۔ آپ نے زمیندار کو دیکھا ہوگا، جب کھیتوں کو پانی لگایا ہوتا ہے، وہ ساری رات اپنی کھی مونڈے تے رکھ کے آڈاں دے ارد گرد پھر دار ہندا اے: ایتھوں بند کر او تھوں بند کر۔<sup>1</sup> یہ جو راستے میں ہی پانی کا ادھر ادھر نکل جانا ہے، اسے وہ عرب اسراف کہتے تھے۔ بڑی عجیب قوم تھی صاحب! اسراف کا یہ لفظ ”کھلے رکھنے کے معنی میں تھا۔“

اب ایک تو یہ ہے کہ اس کو یہاں سے کھولا جائے اور وہ کھیت میں پہنچ جائے۔ وہ تو صحیح بات ہوئی اور اگر راستے میں ہی ادھر ادھر وہ بہتا چلا جائے تو آپ دیکھیں کہ یہ وہی ہے جسے آپ ضائع ہو جانا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس مال و دولت، سامانِ زیست آتا ہے تو وہ اسے اس طرح سے صرف نہیں کرتے کہ وہ راستے میں ہی ضائع ہو جائے۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اُسے جس مقام پہ پہنچنا ہے، وہ وہاں ہی جا کے پہنچے اور راستے میں ادھر ادھر نہ ہو جائے اور نہ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ڈیم کے اندر جمع ہوا ہے تو ڈیم کے آگے سے منہ ہی نہ کھولیں، جمع ہونے دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ صحیح صورت یہ ہے کہ اس کو بہتے پانی کی طرح رواں رہنا چاہیے۔ اس کے

برعکس یہ نہ ہو کہ وہ اُسے کھولیں ہی نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے کہ **يَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ** (107:7) رزق کے سرچشموں کو بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات کے لیے کھلا رہنا چاہیے ان کے آگے بند لگا کر ان پر اپنا قبضہ نہیں جمالینا چاہیے۔

عزیزانِ من! سورۃ الماعون میں ہے کہ **وَبَلِّ لِلْمُصَلِّينَ** (107:4)۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کون ہیں جن کے لیے تباہی ہے: **الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ** (107:5) یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کے مقصد کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں **الَّذِينَ هُمْ يُرَآؤُونَ** (107:6) سمجھتے یہ ہیں کہ یہ جو نقل و حرکت دوسروں کو نظر آ جاتی ہے نماز ہے حالانکہ **وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ** (107:7) رزق کے ان چشموں کو جو بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی پیاس بجھانے کے لیے جانا چاہیے تھا اس کے آگے بند لگا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے۔

### قرآن حکیم کا معاشی نظام تو آبِ حیات کے بہتے ہوئے چشمے کی مانند ہے

ایک تو ہے کہ **وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ** (107:7) جس رزق کو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تھا وہ اسے روکتے ہیں اور اس طرح ضرورت مندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں۔ قرآن نے جنت کے ایک چشمے کو سلسبیل کہا ہے۔ تو یہ ہے رزق کا سرچشمہ جو بہتا ہوا چلا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیسے چلا جائے، کبھی کبھار آپ نے دیکھا ہوگا کہ مٹی کا تیل بیچنے والے آتے تھے باہر آواز دیا کرتے

❶ اپنی کسی کندھے پر رکھے ان نالیوں کے ارد گرد چلتا پھرتا رہتا ہے۔ (کام کیا ہے؟ یہ کہ) کبھی ادھر سے (نالی) بند کرے اور کبھی اُدھر سے۔

تھے کہ بی بی جی! مٹی داتیل لے لو پھر آگے گئے۔ سلسبیل ایسا ہی آبِ حیات کا چشمہ ہے جو جاتا ہوا راستے میں آوازیں دیتا جائے کہ پانی لے لو۔ رزق کے چشموں کو روکے نہیں، کھلا رکھے۔ اسراف نہ ہو کہ بے جا مقامات کے اوپر وہ صرف ہونا شروع ہو جائے۔ عباد الرحمن کی یہ چیزیں آتی ہیں۔

### خلافت و ملوکیت میں فرق

حضرت عمر (581-644/45AD) ♦ سے پوچھا گیا تھا کہ خلافت کسے کہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں تو کوئی لمبا چوڑا فلاسفہ نہیں ہوں، یہ بات تو نہیں میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ خلافت یہ ہے کہ پوچھا جائے گا کہ ”تم نے کہاں سے مال لیا اور کہاں خرچ کیا“ بس اتنی سی بات میں جانتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کہنے کی بات کیا رہ جاتی ہے! ”کیسے لیا اور کہاں خرچ کیا؟“ اس میں ساری بات آ جاتی ہے۔ اگر اس کا جواب دے دیا تو خلاف ہے وگرنہ ملوکیت۔ ”کیسے لیا اور پھر صرف کیسے کیا؟“ اپنے لیے روک لینا تو ایک طرف رہا، قرآن تو یہ کہتا ہے کہ جس کو آپ کہتے ہیں بے جا صرف کر دینا کہ اس کھیت تک نہ پہنچے جہاں اس کو پہنچنا چاہیے تھا اور وہ صحیح مقامات کے اندر صرف

نہیں کرتا تو وہ کہتا ہے کہ یہ عباد الرحمن کی صفت نہیں ہے۔ کہا کہ یَسْنَ ذَلِکَ قَوَّامًا (25:67) مومن وہ ہیں جو اس کے بین بین اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں: قواما کہ جس سے زندگی قائم رہتی ہے ضائع ہو جائے جب بھی قائم نہیں رہتی اور اگر اس کو روک لیا جائے تو جب بھی قائم نہیں رہتی۔ یہ ہے قواما۔ پھر کہا کہ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ (25:68) ان کی کیفیت یہ ہے کہ لا الہ کہنے کے بعد صرف الا اللہ ایک خدا کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی اور کو آواز نہیں دیتے۔ یہ ہے توحید۔ الا اللہ کے معنی ہیں ایک خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرو لیکن انسان یہ کر نہیں سکتا جب تک پہلے لا الہ نہ کہے یعنی یہ کہے کہ ”کوئی صاحب اقتدار نہیں اللہ کے سوا میں ہر ایک سے انکار کرتا ہوں۔“ یہ بہت بڑا نعرہ انقلاب ہے۔

### موچی گیٹ لاہور کے باہر اقبالؒ کا لا الہ کہنا

عزیزانِ من! اقبالؒ (1877-1938ء) نے اُس وقت ٹھیک کہا تھا جب ہم لڑکھڑا کر گرنے والے ہو گئے تھے۔ انہوں نے موچی دروازے کے باہر یہ شعر پڑھا:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم

جب میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کہ

دانم مشکلات لا الہ را

مجھے لا الہ کی مشکلات کا پتہ ہے میں کیسے کہہ دوں کہ میں مسلم ہوں۔ لا الہ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ ہر اقتدار کی نفی ہر ایک سے انکار ہر ایک سے بغاوت ہے۔ ابھی یہ پہلا مرحلہ ہے ابھی وہ الا کا ثبت نہیں آیا وہ ایک اللہ کا اقرار تو بعد میں آنا ہے۔ پہلا مرحلہ تو ہر ایک سے انکار کا ہے۔ عزیزانِ من! آپ کسی ایک نصب العین کی طرف اپنا رخ کر نہیں سکتے جب تک کہ آپ باقی ہر طرف سے اپنا رخ نہ پھیر لیں۔

### اسوۂ ابراہیمی ♦ یہ تھا مقام ابراہیمی یہ تھا

عزیزانِ من! یہ چیز تھی جو اسوۂ ابراہیمی ♦ نے ہمیں بتائی تھی کہ اِنِّیْ وَجْهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ<sup>1</sup> (6:80)۔ یہاں کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ مشرک کون نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہے جو یہ اعلان کرتا ہے کہ میں دنیا کی ہر جاذبیت اور کشش سے منہ موڑ کر صرف تیری طرف دیکھ رہا ہوں۔ کہا کہ یوں انسان شرک سے پاک ہو کر (مؤحد) ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر سمت سے منہ موڑ کر اُس ایک طرف رخ کرنا ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے وہ کتنی عظیم چیز تھی مگر ہمارے ہاں وہ کتنی سہل ہو گئی!

### ہر نماز سے پہلے کی جانے والی نیت کا اصل مقصد



آپ کو معلوم ہے کہ جسے ہر نماز کی نیت کہتے ہیں وہ نماز کی نیت یہ ہوتی ہے: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِذِیْ فَطَرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَنِیْفًا (6:79) تے اگے ہوندا اے پئی، کتھے اللہ اکبر کہہ کے اے رکوع اچ نہ چلا جائے، پہلی رکعات جیہڑی اے میری او ماری جائے گی۔<sup>2</sup> اس آیت (6:80) میں لفظ حنیفا آیا ہے۔ حنیف ہوتا ہے: ناک کی سیدھ اس طرح جانا کہ ادھر ادھر دیکھے ہی نہیں، تنکے ہی نہیں۔ یہ ہے اسوۂ ابراہیمی ♦ کہ میں اپنی تمام تو جہات کا مرکز اس بے مثال ذات کو سمجھتا ہوں جو ارض و سما کو عدم سے وجود میں لائی۔ انہی طرح کے لوگوں کے بارے میں کہا کہ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰہًا اٰخَرَ<sup>3</sup> (25:68)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن عباد الرحمن کی یہ خصوصیات بیان کر رہا ہے اور اگلی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ<sup>4</sup> (25:68)۔ ہر انسانی جان کو خدا نے واجب التحريم بنایا ہے۔ یاد رکھو، ہر انسان واجب التکریم ہے، ہر زندگی، ہر جان کا ضائع کرنا

① میں اپنی تمام تو جہات کا مرکز صرف اس ذات بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو اس تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے (اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اس سے نہ ستاروں کو مفر ہے اور نہ چاند اور سورج کو مجال سرتابی) اس لیے میں اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ میرا دو ٹوک فیصلہ ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 305)۔

② اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ کہیں اللہ اکبر کہہ کر یہ رکوع میں نہ چلا جائے۔ اس سے جو میری پہلی رکعت ہے وہ ماری جائے گی۔

③ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے قانون و اقتدار کے ساتھ کسی اور کا قانون و اقتدار تسلیم نہیں کرتے۔ کسی کی اطاعت و حکومت اختیار نہیں کرتے (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 830)۔

④ اور (یہ وہ لوگ ہیں جو) انسانی زندگی کو جسے خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے، کبھی تلف نہیں کرتے، بجز اس کے کہ انہیں حق و انصاف کی خاطر ایسا کرنا پڑ جائے (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 830)۔

خدا نے حرام قرار دیا ہے لیکن الا بالحق حق کی خاطر یہ کیا جاتا ہے۔

## قرآن حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کی قدر و منزلت

قرآن کریم نے کہا ہے کہ اگر کسی کو جرم قتل کی سزا میں قتل کیا جاتا ہے، جان تو وہ بھی لینی ہوتی ہے لیکن وہ جان بالحق لی جاتی ہے، حق کے مطابق لی جاسکتی ہے، اس کے بغیر نہیں اور بالحق قانون خداوندی ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ مومن کسی جان کو تلف نہیں کرتے۔ قرآن کے نزدیک جان کی گراں قدر قیمت ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ جس کسی نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا، یوں سمجھو کہ اس نے تمام نوع انسانی کی جان ماردی۔ اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا جس نے ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا، اور جس نے کسی ایک زندگی کو بھی بچا لیا یوں سمجھو جیسے اس نے پوری انسانیت کو بچا لیا۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کی اتنی قیمت ہے لیکن بالحق اس زندگی کو تلف کیا جاسکتا ہے اور یہ ہے بھی ضروری کہ جس انگلی کا ناسور اتنا زہر آلود ہو جائے کہ وہ زہر باقی حصہ جسم کو بھی تلف کرنے کا موجب بنتا ہو، انگلی کے اتنے حصے

کو کاٹ دینا ہی ضروری ہوتا ہے۔ یہ بات اور جگہ آئے گی تو میں عرض کروں گا کہ قرآن نے اس انسانی زندگی کو تلف کرنا یا قتل کرنا کہاں جائز قرار دیا ہے۔ یہاں اس نے الا بالحق کہا ہے۔ اس کے علاوہ عباد الرحمن کی اور خصوصیات کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کہا کہ وَ لَا يَزْنُونَ (25:68)۔ اس کا عام ترجمہ صرف یہی ہے کہ وہ زنا کے مرتکب نہیں ہوتے۔

### جنسیاتی بے راہ روی قوموں کو مضحک کر دیتی ہے

عزیز برادران! یہ اگلی بات ایسی کہی ہے جس کا اقوام کے عروج و زوال کے ساتھ بڑا ہی گہرا تعلق ہے۔ آج دنیا میں جو تحقیق ہو رہی ہے وہ بتاتی ہے کہ چودہ سو سال پیشتر یہ کچھ کہنے والا کوئی انسانی ذہن نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق یہاں کہا ہے کہ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (25:68) زنا کے مرتکب فرد ہوں یا کوئی قوم ہو اس کا نتیجہ اٹام ہوتا ہے۔ یہ لفظ اٹام ہے اٹم سے ہے اور ہمارے ہاں اٹم کے معنی گناہ کے کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ جتنے معصیت، عدوان، جرائم، اٹم کے الفاظ قرآن میں آتے ہیں گناہ ہی ان کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے: گناہ ہوندا ہے جی۔<sup>①</sup> قرآن نے یہ الگ الگ جو لفظ استعمال کیے ہیں تو حسیا میں نے عرض کیا تھا یہ شاعری نہیں ہے۔ ہر لفظ اپنے مقام پہ ہمالیہ کی طرح محکم ہے۔

یہ اٹام کیا چیز ہے؟ عربوں کے ہاں کارواں کے اندر یہ جتنے بھی اونٹ وغیرہ ساتھ چلتے تھے برابر کے قوی ہوتے تھے۔ اگر وہ اونٹ طاقتور ہوتا تھا تو وہ کارواں کے باقی اونٹوں کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ جس اونٹ یا اونٹنی کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ کمزور ہو جائے، مضحک

① یہ گناہ ہوتا ہے جی!

ہو جائے، ناتواں ہو جائے اور کارواں کے ساتھ نہ چل سکے، پیچھے رہ جائے اسے وہ ناقہ آٹم کہتے تھے اور یہ جو اضحلال پیدا ہو جاتا تھا جو باقی سب کے ساتھ نہ چل سکے باقی اقوام کے ساتھ نہ چل سکے پیچھے رہ جائے وہ تھا جس کو وہ اٹم کہتے تھے۔ یہاں کہا کہ یہ زنا کیا چیز ہے؟ یہ انسان کے جنسی جذبے کی تسکین ہے جسے آپ اختلاط جنسی کہتے ہیں۔ میری بیٹیاں بہنیں معاف رکھیں یہ الفاظ کہنے پڑتے ہیں۔ جنسی جذبے کی تسکین یہ ایک چیز ہے جو انسان کے اندر ہے۔ اب اس کے لیے اس نے حدود مقرر کر دی ہیں اور کہا ہے کہ ان حدود کے اندر رہ کر اس جذبے کی تسکین کی جائے۔ اسے اس نے جائز قرار دیا۔ اس کا نتیجہ اٹم نہیں بتایا۔ اگر اس کے اندر حدود فراموشی ہو جائے تو اس کا نام زنا رکھا جاتا ہے۔ یہ جنسی جذبے پہ کنٹرول نہ ہونا ایک بڑی گہری سی چیز ہے حدود فراموشی وہ چیز ہے جو آج ہمارے ہاں مغرب میں عام ہے، تاریخ انسانیت میں بھی یہ دور گزر رہے ہیں جہاں اس کے اوپر کوئی خاص پابندیاں عائد نہیں کی جاتی تھیں۔

### جنسیات پر ڈاکٹر انون کی تحقیق

آپ کو یاد ہے میں اکثر ایک کتاب کا حوالہ دیا کرتا ہوں۔ انون<sup>1</sup> کی وہ کتاب ہے: Sex and Culture (جنسیات اور کلچر)۔ یہ ہمارے دور کا ایک بہت بڑا محقق ہے۔ اس نے سیکس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنالیا تھا، دنیا کے جو اسی (80) قبائل ہیں، جو ابھی تک تہذیب کے زمانے سے پہلے کی زندگی بسر کر رہے ہیں، انہی اسی (80) قبائل کے اندر رہ کر اس نے ان کی زندگی کی ریسرچ کی اور سولہ (16) مہذب اقوام کے اندر رہ کر اس نے ان کی زندگی پر ریسرچ کی اور اس کے بعد اپنے ریسرچ کا، جو اس کی تحقیق کا حاصل تھا، وہ اس نے اس کتاب کے اندر دیا ہے۔ خود تحقیق کر کے اس نے یہ چیز کہی ہے کہ میری پوری ریسرچ نے اور تاریخی شواہد نے یہ بات بتائی کہ جس قوم نے بھی جنسی جذبے کی تسکین کے لیے حدود اور پابندیاں مقرر کی ہیں اور ان میں سب سے بڑی پابندی یہ ہے کہ وہ ازدواجی زندگی شادی سے قبل عصمت کے اوپر زور دیتی ہے کہ اس کی عصمت شادی سے پہلے برقرار رہے، جس قوم نے بھی اس چیز کو ملحوظ رکھا ہے، وہ دنیا میں سرفرازی، سر بلندی، تہذیب کے بلند ترین مقام پہنچی ہے، اور جس قوم نے جتنی جتنی اس میں ڈھیل دی ہے اتنی ہی وہ زوال پذیر ہوتی ہے اور اس نے لکھا ہے کہ کوئی قوم اگر یہ حدود توڑ ہی دے تو تاریخ بتاتی ہے کہ سو سال سے زیادہ وہ قوم زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ اس مسئلے کو یہ اتنی بڑی اہمیت ہے۔

اب وہ جو کہتا ہے کہ یہ جو حدود توڑنے کے بعد اس جنسی جذبے کی تسکین ہے، وہ قومیں دوسری قوموں کے ساتھ چلنے کے قابل ہی

1 اس کتاب کا حوالہ یہ ہے:

Unwin, J.D, M.C, Ph.D (Cantab) (1934). Sex and Culture. London: Oxford University Press, Humphrey Milford.

نہیں رہتیں، ان میں اضمحلال آ جاتا ہے، کمزوری آ جاتی ہے، ضعف آ جاتا ہے، وہ اپنے کارواں سے پیچھے رہ جاتی ہیں اور قرآن نے اس کو اٹھ کہا ہے، وہ ناقہ آٹمہ ہے جو کارواں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ انون آج لکھتا ہے، یہ اس کے الفاظ ہیں کہ وہ قوم دنیا کی زندہ قوموں کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں رہتی جس کے اندر جنسی جذبے کی تسکین کے لیے اس قسم کی پابندیاں نہ عائد کی گئی ہوں۔ وہ قوم زندہ قوموں کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ قرآن کہتا ہے کہ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (25:68) جو ان پابندیوں کو توڑتا ہے، یاد رکھو! جو قوم ایسا کرتی ہے، اس میں ایسا اضمحلال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کارواں کے ساتھ چلنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔ اس کے قوائے عملیہ مضحل ہو جاتے ہیں اور وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہے۔ یہی کیفیت افراد کی ہوتی ہے۔ یہ کیا بات ہے؟ کیوں ایسا ہوتا ہے؟ اس نے تو تاریخی شواہد ہی دیئے ہیں۔ ہوتا کیوں ہے؟ انسان کے اندر ایک خواہش بیدار ہوتی ہے، وہ اسے پورا کرنا چاہتا ہے۔ اگر تو اس کے سامنے کوئی پابندی نہیں ہے تو پھر کنٹرول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، خواہش پیدا ہوئی اسے پورا کیا۔ اگر سامنے کوئی پابندی ہے، وہ خواہش ہے یا جو جذبہ

ہے وہ بیدار ہو رہا ہے وہ کچھ تقاضا کر رہا ہے اس کے سامنے پابندی ہے کہ یہ یہاں یوں نہیں ہے تو یوں اس کی تسکین ہو سکتی ہے۔

### انسانی جذبات کو کنٹرول کرنے کا طریق ارادے کی مضبوطی میں مضمر ہے

آج کے سائیکولوجسٹ اس چیز کے اوپر پہنچے ہیں کہ اس کنٹرول کے لیے بڑے Strong Nerve (مضبوط اعصاب) کی ضرورت ہوتی ہے، نروس سسٹم (اعصابی نظام) بڑا طاقتور ہونا چاہیے۔ یاد رہے کہ اس کنٹرول کے لیے یہ بڑی گہری چیز ہے۔ انسان کا وہ جذبہ تو اندر سے ایک تقاضا کرتا ہے لیکن سامنے وہاں رکنے کے لیے ایک پابندی ہے یہ جو کشش ہوتی ہے یعنی جذبہ اپنی تسکین چاہتا ہے جبکہ پابندی روکنا چاہتی ہے تو اس حالت میں اسے کون روک سکتا ہے؟ وہ کہ صرف جس کے اعصاب بڑے مضبوط ہوں اور اعصاب تو ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتے ہیں۔ یاد رکھو! جسے ارادہ کہتے ہیں، یعنی بڑا مضبوط ہونا، وہ اعصاب کی مضبوطی ہوتی ہے۔ اگر وہاں وہ ڈھیل دے دیتا ہے پابندی کے اوپر رکتا نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اعصاب کمزور ہو گئے اور اگر بار بار ایسا کرتا ہے بار بار اعصاب کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

### جنسی تقاضے اور طبعی تقاضے میں بنیادی فرق ہے

آپ کو معلوم ہے کہ جو جنسی امراض میں گرفتار ہوتے ہیں ان کا علاج سب سے پہلے کیا جاتا ہے: ان کے اعصاب کو، نروس سسٹم کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ یہ کنٹرول کوئی آسان چیز نہیں ہے اور یہ جو انسانی جذبات کا شدید ترین تقاضا ہے جنسی تقاضا ہوتا ہے۔ انسان اس کے اندر پاگل ہو جاتا ہے یہ فوری بیدار ہوتا ہے اور اس میں اتنی شدت ہوتی ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس جنسی جذبے کے بعد وہ اس قدر گھٹاؤ نے جرائم کر دیتے ہیں یہ اس کی شدت کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! ایک چیز تو ہوتی ہے طبعی تقاضا مثلاً پیاس لگنا۔ یہ جذباتی تقاضا نہیں ہے، بھوک لگنا جذباتی نہیں ہے۔ یہ انسان کی جو فزیکل لائف (جسمانی زندگی) ہے یہ اس کا تقاضا ہے۔ دیکھا قرآن کریم کی عظمت! یہ کھانے پینے کا جو مسئلہ ہے اس میں تو اس نے یہ کہا ہے کہ یہ یہ چیزیں حرام ہیں پابندی ہے ان کے قریب نہ جانا، لیکن کہا یہ کہ جہاں تم دیکھو کہ تمہاری جان پہ بن آئی ہے اس کے بغیر چارہ نہیں ہے، موت ہو جائے گی، تو تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ جان کو بچانے کے لیے یہ حرام چیز کھا لو۔ یہ طبعی تقاضا ہے لیکن جو جذباتی تقاضا ہے یہ جنسی تقاضا جذباتی ہوتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر آپ اس کا خیال نہ کریں تو یہ از خود بیدار ہی نہیں ہوتا۔ بھوک پیاس کی یہ کیفیت نہیں ہے کہ آپ چاہیں تو پیاس لگے اور آپ نہ چاہیں تو پیاس نہ لگے۔ آپ چاہیں نہ چاہیں بڑے سے بڑے کسی کام میں مستغرق ہوں، غرق ہوئے ہوئے ہوں پیاس لگتی ہے، تو وہ تو اندر سے خود لگتی ہے، لگتی چلی جاتی ہے، بڑھتی چلی جاتی ہے، بھڑکتی چلی جاتی ہے، تا نکہ آپ کو وہ تنگ کر دیتی ہے کہ اٹھ کے پانی پیو۔ جنسی جذبے کی یہ کیفیت

نہیں ہے یہ تو انسان خود اس کو بیدار کرتا ہے:

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اس کی کیفیت ہی یہ ہے کہ اس آگ کو خود بنانا پڑتا ہے۔ جب لگ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے: بجھائے نہ بنے۔ انسان کی فرد کی یا کسی قوم کی قوت ارادی یا نروس سسٹم کی وہ چٹنگی جو اس جذبے کے اندر ہے، یہ تو اس کا ایک ٹیسٹ ہوتا ہے اور جو قوم اس جذبے کی تسکین کے لیے کنٹرول یعنی پابندیاں عائد نہیں کرتی، بے باک ہونے دیتی ہے، آپ دیکھیں گے کہ وہ ان کی پوری نسل زندگی کے ہر شعبے میں بے باک اور سرکش ہوتی ہے۔

### مغربی معاشرے میں نوجوانوں کی حالت زار

مغرب میں ہوا کیا ہے؟ وہاں کا نوجوان کسی کے کنٹرول میں ہی نہیں۔ وہ رے تڑا کے بھاگ گیا ہے، وہ سنبھالے سنبھلتا ہی نہیں ہے۔ اس کو اپنے آپ پہ کنٹرول نہیں رہا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ اگر دروازے بند کر دیتے ہیں تو روشن دان میں سے منہ نکال لیتا ہے، انہوں نے شراب بند کی چرس پینی شروع کر دی، راکٹ پینے شروع کر دیئے، یعنی کیفیت ان کی یہ ہو گئی ہوئی ہے۔ اپنے آپ پہ کنٹرول ہی نہیں ہے۔ جس پوری قوم کی یہ صورت ہو جائے تو اسکے افراد کو اپنے جذبات پہ کنٹرول ہی نہ رہے تو وہ قوم دنیا میں کیا کر سکتی ہے۔

### اس زوال کے اسباب معلوم کرنے کے لیے کمیٹیوں کی تشکیل کی ضرورت نہیں

آپ اپنے زوال کے اسباب گنانے کے لیے بھی قومی کمیٹیاں بٹھاتے ہیں۔ کمیٹیاں بٹھانے کی ضرورت کیا ہے؟ اس ایک چیز کو لیجیے۔ قرآن نے کہا تھا کہ اگر جنسی جذبات کے اوپر کنٹرول نہ رکھا جائے پابندیاں نہ رکھی جائیں، تو قوم کی قوتیں مضحل (اثاماً) ہو جاتی ہیں، وہ دوسری زندہ قوموں کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ ہم نے اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ نہیں جی، ہم تو ادھر نہیں جاتے۔ بہت اچھا جی، نہیں جاتے۔ آپ کیا کرتے ہیں؟ چار چار تو بیویاں ہیں، لیکن اس میں بھی ایک بڑی دلچسپ چیز ہے۔ برفو<sup>1</sup> نے ایک کتاب لکھی ہے: The Mothers۔ اس کے اندر اس نے ایک چیز لکھی ہے۔ وہ بھی تحقیق کرتا پھرتا تھا۔ کہنے لگا: میں آپ کو بتاتا ہوں یہ جو Monogamy (وحدت زوج) ہے، یعنی ایک وقت میں ایک بیوی کا رکھنا، تو اس میں کیا تماشا ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے ایک کر دو دیکھا۔ اس کرنے کا کہ یہ میری اکتالیسویں بیوی ہے۔ میں نے کہا کہ اکتالیس بیویاں ایک وقت میں؟ کہنے لگا: جی لا حول ولا

صاحب! میں نے نکاح میں تو ایک وقت میں ایک ہی بیوی رکھی ہے۔ جس طرح سے ہم سال کے بعد کیلنڈر بدل دیتے ہیں، یہ ریلوے ٹائم ٹیبل ہر چھٹے مہینے کے بعد بدل دیتے ہیں، اسی طرح وہ ہر دوسرے تیسرے چوتھے مہینے پہلی بیوی کو ایک دو تین کرتا تھا، نئی بیوی لے آیا۔ آپ کے ہاں بالکل شرعاً جائز ہے چار تو بیک وقت جائز ہیں اور اس کو جب جی چاہے میاں نے ایک دو تین کیا اور وہ بیچاری اپنے ان سارے بچوں کو لیتے ہوئے روتی دھوتی ہوئی کہاں جاسکتی ہے۔ پیکے ای جانا ہوندا اے نافیز<sup>2</sup> اور یہاں نئی نوپلی ایک اور لے آئے۔ جب جی چاہے اس کو نکال دیجیے پھر ایک اور لے آئے۔

### ہمارے ہاں چار چار بیویوں کے علاوہ ان گنت لونڈیوں کی اجازت

اس پہ ہی بس نہیں کیا۔ لونڈیوں کی اجازت آگئی، بلا تعداد، بلا نکاح، تین تین ہزار آپ کے ہاں موجود ہیں۔ یہ جو ہارون رشید وغیرہ خلفاء کہے جاتے ہیں، ذہن میں ان کا نقشہ بڑا مقدس نظر آتا ہے۔ سلاطین کے ہاں تین تین ہزار ایک ایک کے حرم کے اندر لونڈیاں تھیں۔ اس وقت تک یہ کیفیت آپ کے ہاں چلی آرہی ہے۔ آج بھی آپ کے ہاں یہ جو نئے مفسر ہیں، یہ مودودی صاحب<sup>3</sup> کی تفسیر

① Briffault R: The Mothers اس کتاب کا حوالہ بھی ڈاکٹر انون نے اپنی مشہور زمانہ کتاب Sex and Culture (جنسیات اور کلچر) کے ص (438) پر دیا ہے۔ یہ جنسیات کے متعلق ایک بڑی وسیع اور ضخیم کتاب ہے: The Mothers۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب کا حوالہ یہ ہے:

Briffault, Robert. (1919). The Making of Humanity (First Edition). London: George Allen & Unwin Ltd.

② پھر تو اسے اپنے ماں باپ کے ہاں ہی جانا ہوتا ہے۔

③ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1803-1979ء)

اٹھا لیجیے۔ لکھا ہوا ہے کہ جنگ کے اندر جو دشمنوں کی عورتیں گرفتار ہو کر قیدیوں کی حیثیت سے آئیں گی وہ سپاہیوں میں تقسیم کر دی جائیں گی (معاذ اللہ، معاذ اللہ)۔ یہاں لفظ ہے ”استعمال کے لیے“۔ پھر ان لونڈیوں کے متعلق یہ ہے کہ جب جی چاہے آپ ان کو فروخت کر سکتے ہیں، دوسروں کو تحفتاً دے سکتا ہے، تعداد کوئی نہیں، نکاح کی ضرورت نہیں، لیکن اسے زنا نہیں کہا جاسکتا۔

### یہ سور نہیں بکرا ہے

عزیزانِ من! زنا نہ کہنے سے کیا یہ چیز بدل جائے گی؟ سورتوں بکرا کہو گے تے حلال ہو جائے گا؟<sup>①</sup> یہ کیا چیز ہے؟ یہ کیا چیز تھی جسے قرآن نے زنا کہا تھا؟ یہ جنسی جذبے کی تسکین کے لیے ایک حد مقرر کی ہوئی ہے، پابندی عائد کی ہوئی ہے، عزیزانِ من! اقوام کی پابندی کی ایک تو یہی چیز تھی کہ اس کے لیے سوائے سلسلہ نکاح کے ازدواجی زندگی کے، کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ ازدواجی زندگی کے اندر

باہمی انتخاب سے ایک بیوی ہو، اور طلاق یہ چیز نہیں ہے کہ ایک دو تین کیا اور چل ختم کیا یہ نیلام گھر۔

### اصل پردہ تو نگاہوں کو پیداک ہونے سے روکنے کا ہے

قرآن میں دیکھیے زنا پر کتنی پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں۔ کہا ہے کہ شادی سے پہلے کسی عورت کی طرف بھی غلط نگاہ سے نہیں دیکھنا۔ وہ جو اس نے کہا تھا کہ باہر نکلؤ تو نگاہوں کو نیچا کر کے نکلؤ وہ بات یوں نہیں تھی کہ یوں نگاہوں کو نیچا کر کے نکلؤ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نگاہوں کو پیداک مت ہونے دو۔ شادی سے پیشتر دنیا کی ہر لڑکی ہر عورت اس کے نزدیک واجب الاحترام ہے۔ شادی کے بعد صرف ایک بیوی ہے جس کا اس کے ساتھ آپس میں یہ تعلق ہے۔ شادی ہوئی تو جن سے اس سے پہلے نکاح ہو سکتا تھا وہ بھی اس دوران میں اس کے لیے واجب الاحترام اس کی طرف بھی یہ نگاہ نہیں اٹھا کے دیکھ سکتا، یوں زندگی گزارنی ہے۔ یہ تھی جو اس نے پابندی عائد کی تھی۔ تو جس قوم پہ یہ پابندی عائد ہوئی ہو اور وہ پھر بطیب خاطر یہ جو چیز ہے اس کے اوپر کاربند رہے۔ آپ سوچیے کہ اس کی قوت ارادی اور اس کا زور سسٹم کیسا مضبوط ہوگا، یہ بلائیں نہیں تھیں۔

### نبی اکرم ﷺ کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کرام ؓ کی نفسیات کو بدل کر رکھ دیا

یہ عرب وہ تھے جنہوں نے قیصر و کسریٰ<sup>2</sup> کی سلطنتوں کا مقابلہ کر کے ان دونوں قوموں کی بساط پلیٹ کر رکھ دی تھی۔ سوال یہ ہے کہ

① سور کوکبرا کہو گے تو کیا وہ حلال ہو جائے گا؟

② قیصر شاہِ روم (Roman Empire) کا لقب تھا اور کسریٰ شاہانِ ایران کے ہر بادشاہ کا لقب تھا۔

روم اور ایران کی اقوام میں کیا کمی تھی۔ اُن کے اندر یہی کمی تھی کہ انہوں نے جنسی جذبے کے اوپر اتنی پابندیاں نہیں عائد کی تھیں نہ ایران میں تھیں نہ ان رومنز کے اندر تھیں اور یہ عرب وہ قوم تھی جو تیار کی گئی تھی اور معلوم نہیں کہ اس قوم نے وہ جو ایمان لائی ہے اور یہ جو تعلیم و تربیت نبوی ﷺ تھی اس نے ان کے اندر کیا قلبِ ماہیت کر دی تھی کس طرح سے ان کی نفسیات کو بدل دیا تھا۔ یہ وہ قوم تھی جس کے ہاں بیک وقت اتنی بیویاں بھی ان کے ہاں ہوتی تھیں، لونڈیاں بھی ان کے ہوتی تھیں انہی کی یعنی اگلی جنریشن بھی نہیں، انہی کی پھر انہوں نے یہ کیفیت پیدا کی کہ نگاہ کو کہیں پیداک نہیں ہونے دیا، کسی دوسری طرف نگاہ نہیں اٹھنے دی۔

### دورِ نبوت ﷺ کی پہلی نسل کا کردار

جب حضرت عمر ♦ کی فوج اندر گئی ہے تو عیسائیوں نے شہر کے اندر دوکانوں پر نہایت نوخیز خوبصورت لڑکیاں<sup>1</sup> بٹھادیں۔ یہ Sale Girls تھیں۔ ان کے ہاں تو پردہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ تو انہوں نے دوکانوں پر وہ بٹھادیں۔ یہ جو فاتح سپاہی تھے معاف رکھیے گا

جن کو تلنگے کہتے ہیں ان کو اس شہر میں سے گزرنا تھا یہ شہر سے گزر کر باہر آ گئے۔ جب شام ہوئی تو ان میں سے کوئی دیکھنے کے لیے آئے کہ جو جال ہم نے پھینکا تھا اس کا کیا اثر ہوا۔ ان کا کوئی اثر وغیرہ کچھ بھی نہ ہوا۔ ان میں سے ایک سپاہی نے کہا کہ تمہارے ہاں شہر کے اندر یہ کیا کیا چیزیں ہیں جو عام طور پر پکتی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ تم شہر کے بازار سے گزر کر آئے ہو کیا تمہیں معلوم نہیں ہے؟ کہنے لگے: نہیں، جب ہم گزر کر آئے تھے تو پہلے یہ آواز دے دی گئی تھی کہ نگاہوں کو نیچے رکھ کے جانا ہے، تو ہم نے نگاہ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ یعنی اگلی جزیں نہیں، عزیزان من! یہ تھی تعلیم و تربیت نبوی ﷺ۔ یہ وہی قوم تھی۔ جرنیل نے، کمانڈر نے، بھانپ لیا ہوگا کہ یہ کیا جال بچھایا گیا ہے۔ اس نے قرآن کی جو آیت تھی اس کے چار لفظ دہرا دیئے اور ان کی یہ کیفیت ہو گئی کہ انہوں نے پھر دوکان پر چیزیں دیکھنے کے لیے بھی نگاہ اوپر نہیں اٹھائی۔ چلے گئے اور پھر ان سے آ کر پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں ہے۔ یہ ہے وہ چیز۔ یہ قرآن حکیم کی کوئی چھوٹی سی بات نہیں کہ جس فرد یا قوم نے جنسی جذبے کی تسکین کو بے باک کر دیا، وہ تباہ ہو گئی: **يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا** <sup>2</sup> (25:68)۔ یاد رکھیے! انفرادی طور پر بھی آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ بھی اس جنسی جذبے کے اندر بیباک ہوئے ہوتے ہیں ان کی حالت ہمیشہ ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں آپ دیکھیں گے کتنی اور برائیاں ان کے اندر ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے نروس (اعصاب) پر کنٹرول نہیں رہتا۔ یہ ہے اثاماً۔

① یہ مصر کا ایک مشہور شہر ”فرما“ تھا۔ جب پلیس کے معرکہ (18ھ) میں مقوقس نے ایک وفد حضرت عمر بن عاصؓ کی خدمت میں تاثرات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تو واپسی پر رئیس وفد نے کہا کہ ”..... ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے دنیا کی کوئی دلکشی اپنی طرف کھینچ سکتی ہو.....“ (ماخوذ از پرویز: (1987ء)۔ شاہکار رسالت لاہور: ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ۔ ص۔ 212)۔

② اس کے قوائے عملیہ مضلل ہو جاتے ہیں اور وہ زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتی ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص۔ 830)۔

جس کسی نے بھی جنسی جذبے کو بیباک کیا وہ تباہ ہو گیا، دیکھیے برطانیہ کی مثال

جنسی جذبے کو بیباک کرنے سے قوم میں قوتِ ارادی نہیں رہتی، ضبط نہیں رہتا، ضبط کا لفظ تک نہیں رہتا، یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کل ہی اس برطانیہ کی مملکت پہ سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ یہ کوئی ہزار سال کی بات نہیں ہے، ہمارے دیکھنے کی بات ہے۔ بچپن میں ہم یہ پڑھا کرتے تھے کہ اس کی سلطنت میں سورج نہیں غروب ہوتا تھا۔ وہ قوم آج دنیا میں چوتھی پانچویں بھی نہیں، پتہ نہیں کتنی پیچھے رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ جنسی جذبے کے اوپر جو کنٹرول تھا اس کو اٹھالیا۔ یہ ابھی کل کی بات تھی۔ ان کے ہاں ملکہ وکٹوریا (1819-1901 AD) کے زمانے (1837-1901ء) میں جس چیز کے اوپر Leg (ٹانگ) کا لفظ آتا تھا وہ اس کو نگاہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کے ہاں میز کی جو ٹانگ ہوتی تھی Leg of the table تھی وہ اس کو بھی اس طرح سے کپڑا اوڑھا کے رکھتے تھے اور آج تو بات بہر حال کہنے کی ہے ہی



نہیں۔ اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ساری دنیا میں پٹی ہوئی قومیں ہیں۔ ہم تو صدیوں پہلے پٹے تھے وہ بہر حال اب ان کے ہاں پٹے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس جنسی جذبے میں یہاں تک بڑھ گئے ہیں، حیوانات سے بھی آگے چلے گئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں انگینڈ میلا Homo-sexuality (ہم جنسی) کو قانوناً جائز قرار دے دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ڈوب تو رہے ہیں ”جتھے ستیاناس او تھے سو ستیاناس“<sup>①</sup> یہ ہے ثلث ائمان یعنی اضمحلال کا محسوس طور پر سامنے آ جانا۔ يُضْعَفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَ يَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا<sup>②</sup> (25:69)۔ اب یہاں وہ لفظ آیا ہے جس کے عذاب میں یہ قوم گرفتار ہو جائے گی، دنیا میں ذلیل و خوار ہو جائے گی، اس کی یہ کیفیت ہوگی۔

جنسی بے راہ روی کے اس جذبے کے باوجود راہِ راست پر آنے کی گنجائش ہے  
اس کیفیت پر یہاں پھر وہ رکنا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ابدی جہنم نہیں اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنٰتٍ ط وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا<sup>③</sup> (25:70)۔ قرآن ابدی طور پر Condemn (مطور) نہیں

① جہاں پہلے ہی بربادی ہے وہاں اور سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے!

② ان کی یہ حالت اس دنیا میں ہو جاتی ہے اور آخری زندگی میں ان کی تباہیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اور وہ نہایت ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 830)۔

③ جو (فرد یا قوم) اس روش کو چھوڑ کر (تحفظ عفت کی صحیح روش اختیار کر لے) اور پھر ایسے کام کرے جس سے اس کی صلاحیتوں میں نشوونما ہوتی جائے، تو خدا کا قانون مکافات ان کی غلط روش کی پیدا کردہ ناہمواریوں کو خوشگوار یوں سے بدل دیتا ہے۔ خدا کے قانون میں اس کی گنجائش ہے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کو ان کی غلط روش کے نقصان رساں نتائج سے محفوظ بھی رکھے اور ان کی نشوونما کا سامان بھی کر دے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 830)۔

کرتا۔ کہتا ہے کہ اگر ان میں زندہ رہنے کی کچھ تھوڑی سی بھی رمت باقی ہے اور یہ محسوس کر لیں کہ ہم نے غلط قدم اٹھایا تھا، پھر اپنی اس غلطی کا احساس کر کے اس پہ نادم ہوں، پھر لوٹ کے وہیں آ جائیں، جہاں سے غلط قدم اٹھا تھا پھر امنسا کریں یعنی اس حقیقت پہ ایمان لائیں کہ کنٹرول بڑا ضروری تھا، پھر اس کے بعد ایسے کام کریں جو اس کے ہاں کی جو کمیاں واقع ہوئی ہیں، وہ پوری ہوتی چلی جائیں، جو Deficiency (کمی) ہوگئی ہے، اس کو Good (پورا) کیا جائے۔ یہ ہے جس کو عمل صالح کہتے ہیں تو پھر قرآن کہتا ہے کہ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنٰتٍ (25:70) پھر ان کی یہ تباہیاں ہو سکتا ہے کہ خوشگوار یوں کے اندر بدل جائیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک اصلاح کا طریق بڑا غور طلب ہے

یاد رکھیے! قرآن کریم نے معاشرے کے اندر جو برائیاں وغیرہ پیدا ہو جاتی ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے کہا ہے کہ اس کا یہ طریقہ

نہیں ہے کہ اسی لائن کے اندر اور سختیاں کرتے چلے جاؤ، اس کا پروگرام اور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے، ہو سکتا ہے یہ پیدا ہو جائیں لیکن یاد رکھو! اگر ناہمواریاں کسی معاشرے کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں، اگر اس کے اندر یہ خرابیاں آ جاتی ہیں، تو اس کے پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (11:114) جتنی تخریبی باتیں وہاں ہوئی ہیں، اس سے زیادہ اس معاشرے کے اندر تعمیری کام کرو، پھر تخریبی کاموں کے جو نقصان ہیں، ان کی تلافی ہو سکے گی۔ یہ ہے طریقہ، یہ ہے وہ عملی پروگرام: حسنات زیادہ بڑھاتے چلے جاؤ، اس طرح وہ پڑے ہوئے جو کھڈے اور گڑھے ہیں، وہ پورے کرتے چلے جاؤ، تبھی سڑک لیول (ہموار) ہوگی۔ یہ تعمیری کام کرتے چلے جاؤ۔ یہ تعمیری کام جو حسنات ہیں، یہ سیئات کو لے جائیں گی: يُبْدِلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ط وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (25:70) خدا کا قانون مکافات تمہاری غلط روش کی پیدا کردہ ناہمواریوں کو خوشگوار یوں میں بدل دے گا اور تمہاری پھر حفاظت بھی کرے گا، پھر سامانِ نشوونما بھی دے گا۔

سورۃ الفرقان کی آیت 70 تک ہم آگئے۔ اس کے بعد ایک آیت آتی ہے اور میں سمجھتا تھا کہ شاید یہ پورا درس لے جائے۔ وہ میرے نزدیک بڑی اہم آیت ہے لیکن اس سے پہلے ہی وقت ختم ہو گیا۔ اس آیت کو ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



## پندرھواں باب: سورة الفرقان (آیات 71 تا اختتام)



عزیزانِ من! آج مارچ 1978ء کی 31 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الفرقان کی آیت 71 سے ہو رہا ہے: (25:71)۔

سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ عباد الرحمن کی خصوصیات بتائی جا رہی تھیں کہ وہ لوگ جو خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہیں، ان کے اندر کس کس قسم کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ دو لفظوں میں یہی تھا کہ جن کو قرآن نے معروف کہا ہے وہ ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں، جن چیزوں سے قرآن نے منع کیا ہے وہ ان سے رکتے ہیں اور وہ ان میں سے چند ایک کی تفصیل دیتا چلا آ رہا تھا کہ ان سے بھی رکتے ہیں، ان سے بھی رکتے ہیں۔ درمیان میں ایک بات کہی کہ اگر کبھی کبھار ان سے سہو غلطی لغزش ہو جاتی ہے تو اس کا احساس ہونے کے بعد فوراً وہ پلٹتے ہیں: تاب یعنی جس دوراہے سے ان کا غلط قدم اٹھا تھا، پھر واپس وہیں آتے ہیں، اور وہاں آنے کے بعد یہ نہیں کہ بس وہاں آ گئے تو یہ توبہ قبول ہو گئی۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ انہوں نے تو ایک صحیح راستے پر جانا تھا، کسی منزل تک پہنچنا تھا، دوراہے پہ آ کے غلط قدم اٹھا، غلط راستے پہ چل پڑے، کچھ دور جا کر احساس ہوا کہ راستہ منزل تک پہنچنے کے لیے صحیح نہیں ہے، وہاں واپس آنا ضروری ہے جہاں سے غلط

قدم اٹھاتا۔ یہ پہلا قدم (Step) ہے، جو ان کو لینا پڑے گا اور اسی دورا ہے پدا کرتو پھرا گلا قدم یہ ہے کہ جو صحیح راستہ ہے اس کے اوپر چلنا ہوگا۔ محض واپس آجانے سے بات نہیں بن جاتی۔

### تلافی کے لیے تخریبی کام کے مقابلے میں صرف تعمیری کام کرنا ہوگا

جہاں بھی قرآن نے تاب کہا ہے اس کے بعد اس کے ساتھ صلح ہے۔ عمل صالحہا تھ ہے کہ پھر صحیح راستے پہ چلے تو پھر اس نے وہ کہا ہے کہ **وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا** <sup>(1)</sup> (25:71)۔ یہ ہے جو غلط راستے سے پلٹ کر اس صحیح منزل تک پہنچ جائے گا جو خدا نے اس کے لیے تجویز کی ہے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اس صحیح راستے پہ چلنا شروع کرے۔ یہ ہے اصل بنیاد۔ اور اس کے لیے بھی قرآن کریم نے جو معیار بتایا ہے، کچھ لی دفعہ بھی میں نے عرض کیا ہے، اب پھر اس کو دہرا دوں، کہ وہ معیار ہے کہ **إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ** (11:114) اور دوسرے مقامات پہ بھی اس کو دہرایا گیا ہے کہ ”اگر کسی معاشرے میں کسی فرد سے کسی قوم سے کسی نظام سے کسی مملکت سے کہیں کوئی تخریبی کام ہو جاتے ہیں، تو ان کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ اس سے زیادہ تعمیری کام کیے جائیں یعنی اس نقصان کی تلافی کی صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس سے زیادہ اچھے کام کہہ لیجئے، تعمیری کام کہہ لیجئے: قرآن نے اسے حسنت کہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جو سیئات ہو گئی ہیں، ان کے نقصان کی تلافی کی شکل ایک ہی ہے کہ اس سے زیادہ تعمیری کام کیے جائیں۔ وہاں تو **خَفَّتْ مَوَازِينُهُ** <sup>(2)</sup> (101:8) اور **ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ** <sup>(3)</sup> (101:6) کے پلڑے ہیں۔ وہاں تو پلڑے کا جھکاؤ ہے۔ اگر وہ ناہمواریوں یعنی تخریبی کاموں کا پلڑا جھک گیا ہے **فَأَمَّهُ هَٰوِيَةٌ** (101:9) وہ ذلت کی پستیوں میں گر جائے گا، جہاں اس کی یہ حالت ہوگی کہ اس کا دل و دماغ کچھ کام نہیں دے گا اور وہ پریشان حال مارا مارا پھرے گا۔ یہ تو ہم روز دیکھتے ہیں، ترازو سے کوئی چیز تولنی ہوتی ہے تو اگر وہ باٹ والا پلڑا جھکا ہوا ہے اور جنس والا پلڑا اٹھا ہوا ہے، تو اس میں اور جنس ڈالیں گے، تب یہ جھکے گا۔ تو یہ جو دوسری چیز ہے کہ اس میں اس سے زیادہ تعمیری کام کریں گے، تب آپ کے تخریبی کاموں سے پیدا ہونے والے نقصانات کی تلافی ہو سکے گی۔ اسی پہ اگر اور شدید عمل اختیار کرتے چلے جائیں گے، تو ناہمواریاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ تو بہ کے معنی ہی یہ ہیں اور اسی لیے جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ہر تاب کے ساتھ عمل صالح ہے اور اس میں تو ایک اور لفظ بھی آیا ہے۔ جب میں اگلی

① جو شخص بھی غلط روش کو چھوڑ دیتا ہے اور اس کے بعد صلاحیت بخش کام کرتا ہے اس کا ہر قدم قانون خداوندی کی طرف اٹھتا ہے۔ (اور قانون خداوندی اسے بہترین نتائج سے بہرہ ور کرتا ہے۔) (پرویز: مفہوم القرآن ص 830)۔

② جس کا (تعمیری کاموں کا) پلڑا ہلکا ہوگا۔

③ جس کا (تعمیری کاموں کا) پلڑا بھاری ہوگا۔

آیت پر آؤں گا تو وہاں جا کر اس کے متعلق بیان کروں گا کہ اس میں وہ کتنی اہمیت ہے اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (25:70)۔ لیکن یہ بات اگلی آیت کے ساتھ آئے گی۔

وہ اگلی آیت تو آج ایسی آرہی ہے کہ پوچھیے نہیں، کس قدر غور طلب ہے، کس قدر اس کے اندر اہمیت ہے، پھر آگے بتایا کہ ان کی خصوصیات کیا ہیں۔ ان خصوصیات میں ایک چیز یہ بتائی کہ وَ الَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (25:72)۔ ”زور“ عام طور پر فریب کاری کو کہتے ہیں، جھوٹ کو کہتے ہیں، کسی ایک طرف جھک جانے کو کہتے ہیں۔ اصل میں عرب کسی کو کن اکھیوں سے، ٹیڑھی آنکھ سے، دیکھنے کو کہتے تھے۔ صحیح آنکھ سے نہ دیکھنا، بظاہر کسی آنکھ کا کسی اور طرف ہونا، دیکھنا کسی اور طرف۔ یہ اصل میں بڑا غیر محسوس سا فریب ہے۔ تو یہ جو تھا اس میں لا یشہدون ہے یہ شہادت کا لفظ اگر گواہی کے معنوں میں بھی لیا جائے اور قرآن میں یہ آیا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ”وہ کبھی فریب کا رانہ غلط، جھوٹی، منافقانہ، قسم کی شہادت نہیں دیتے، لیکن یہ اتنی ہی بات نہیں ہے۔ یہ جو یشہدون ہے تو یہ کسی مقام پر کسی کا حاضر ہونا ہے۔ یاد رکھیے! جسے شہادت کہتے ہیں اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص عینی شاہد ہو، خود اس نے اس چیز کو دیکھا ہو۔ اسی لیے اس لفظ شاہد سے مشاہدہ ہے۔ یہ ”شاہد“ عربی زبان میں ”غاب“ کے مقابلے میں آتا ہے۔ اگر وہ وہاں خود موجود نہیں ہے، وہ اس کی شہادت نہیں ہے۔ اسلامی قوانین کی رو سے شہادت صرف اس کی ہے جو خود اس واقعہ کا عینی شاہد ہو۔ شاہد کے تو معنی ہی ہوتا ہے اس جگہ موجود ہونا۔ جب شاہد کے معنی موجود ہونا ہو، تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ جس جگہ بھی کوئی فریب کا رانہ کام ہو رہا ہو، اس قسم کی مکارانہ سازشیں ہو رہی ہوں، کوئی اس قسم کی تدبیریں ہو رہی ہوں، وہ وہاں کھڑا بھی نہیں ہوگا، اس مجلس میں نہیں بیٹھے گا، ان کا ساتھ نہیں دے گا، بلکہ ان کو دیکھے گا تک نہیں۔ اگر اس کے لغوی معنی لیے جائیں تو وہ ان چیزوں سے اتنا مجتنب رہے گا اور اگر کہیں بات کہنے کی ضرورت پیش آئے گی تو وہ جو کچھ اس نے دیکھا ہوگا، وہ صحیح صحیح بیان کرے گا، شہادت کبھی ایسی نہیں دے گا کہ جس میں فریب کا ذرا سا شائبہ بھی پایا جائے۔ مومن یہ ہوگا اور شہادت کے متعلق تو جب اس موضوع پر بات آئے گی میں عرض کروں گا۔ قرآن نے جو معیار مقرر کیا ہے پوچھیے نہیں کہ وہ عدل کو کن بلند یوں تک لے جاتا ہے۔ عدل کا دار و مدار شہادت پر ہوتا ہے۔ عزیزان من! یہ جسے ہم عدالتی عدل کہتے ہیں اس میں شہادت کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ مومن شہادت دیتا ہے: **عَلٰی اَنْفُسِكُمْ** <sup>①</sup> (4:135) خواہ وہ شہادت

① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا كُونُوْا قَوِّمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوْ الْوَالِدِيْنَ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا ۗ فَاللّٰهُ اُوْلٰى بِهَمَّا (4:135) اے جماعت مومنین! تم دنیا میں عدل و انصاف کے محافظ و نگران بن کر رہو (5:8)۔ عدل کے لیے ایک بنیادی عنصر سچی شہادت ہے تم شہادت نہ مدعی کی طرف سے دو نہ مدعیہ علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ اور ہمیشہ عدل و انصاف کو مد نظر رکھ کر سچی سچی شہادت دو، خواہ یہ شہادت (اور تو اور) خود تمہارے اپنے خلاف جائے یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں امیر اور غریب میں کوئی امتیاز نہ کرو (حتیٰ کہ دشمن سے بھی عدل کرو 5:8) تم جاہد حق و صداقت سے ہٹ کر ان کے خیر خواہ مت بنو۔ خدا کو ان کی خیر خواہی کی زیادہ فکر ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 222)۔

اس کی اپنی ذات کے خلاف کیوں نہ جائے پھر بھی سچی شہادت دیتا ہے۔ اس سے بڑی چیز اور کیا ہوگی! اگر کہیں بات اپنی ہی ذات کے خلاف بھی جائے تو پھر بھی وہ سچی شہادت دیتا ہے۔

### قرآن حکیم کی تعلیم زندگی کے ایک ایک لمحہ کو محفوظ کرنا چاہتی ہے

عزیزانِ من! اب یہاں کہا ہے کہ **وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا** (25:72)۔ اب یہاں لغو کا لفظ آیا ہے۔ ہمارے ہاں تو لغویات بھی ان معنوں میں آتا ہے۔ یہ لوگ ہر معیوب بات ہی کو لغو نہیں کہتے تھے، وہ تو ہر بے معنی بات، بے مطلب بات، بے کار بات، کو بھی لغو کہتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ جہاں کہیں لغویات ہوں، تو نہ ہی یہ خود کبھی فریب کارانہ شہادت دیتا ہے اور بالفرض اگر **مَرُّوا كِرَامًا** (25:72) کہیں یہ کچھ ہو رہا ہو اور یہ کہیں اس کے پاس سے گزرے تو وہ اس سے **مَرُّوا كِرَامًا** (25:72) نہایت شریفانہ انداز سے اپنا دامن بچاتے ہوئے غلاظت کے ڈھیر سے یوں بچ کر گزر جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر کہیں اس قسم کی بیہودہ یا بے معنی باتیں بھی ہو رہی ہوں، آپ دیکھیے کہ وہ انسانی زندگی کو کتنا قیمتی قرار دیتا ہے کہ یہی نہیں کہ معیوب باتیں بے معنی باتیں ہو رہی ہوں، وہ وہاں سے یوں گزرے گا، وقت تو ضائع ہو رہا ہے، تو انائی تو ضائع ہو رہی ہے، اور زندگی کا تو ایک ایک سانس قیمتی ہے اس لیے وہ بے کار اور بے معنی باتیں بھی اگر کہیں ہو رہی ہیں تو وہاں بھی نہیں کھڑا ہوگا۔ اپنے آپ کو بچاتے ہوئے ان سے الجھے بغیر وہاں سے آگے گزر جائے گا، اس کی یہ کیفیت ہوگی۔

### قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک نہ بھولنے والا واقعہ

عزیزانِ من! اب آگے وہ آیت آتی ہے آپ یقین مانے کہ اب تک قرآن فہمی کے سلسلے میں جو واقعات مجھ پہ گزرے ہیں ان میں سے کئی ایسے ہیں کہ جو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا، ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ میں جب اس آیت پہ پہنچا تو نظر بظاہر بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یوں نظر آیا کہ جیسے کہیں اس کے اندر کوئی طباعت کی غلطی ہے۔ قرآن کے کئی نسخے Consult کیے، دیکھ لیے ان تمام میں آیت اسی طرح سے تھی، آپ بھی دیکھیے، اور مجھ پہ جو گزری تھی، نظر بظاہر دیکھیے کہ آپ پہ بھی وہی گزرے گی۔

وہ آیت یہ ہے **وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخْرُوْا عَلَيْهَا سُومًا وَ غُمِيَانًا** (25:73)۔ ہم تو ایمان کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے جو تماشا لپ بامِ ابھی

(اقبال)

ایمان میں عقل و فکر اور غور و تدبر کا کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ ایمان تو ایمان ہے اور پھر جب ایمان بالغیب کہہ دیا جائے تو پھر تو پوچھو ہی نہیں کہ کہاں چلا جاتا ہے۔ آیت یہ ہے کہ مومن وہ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں، تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں جھک پڑتے۔ وہ جو میں نے کہا کہ مجھ پہ کیا بات گزری تھی۔ بات یہ ہے کہ میں پرانے انداز سے قرآن سمجھتا چلا آ رہا تھا۔ ذہن میں یہ آیا کہ ہم تو ایمان کو یہ سمجھتے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ مومن وہ ہے کہ جب اس کے سامنے خدا کی آیت آ جائے تو اس وقت سوال ہی نہیں ہے کہ وہ کچھ اور سوچے سمجھے فکر کرے، غور کرے، نہیں صاحب! وہ تو اسی وقت اس کے اوپر جھک جائے گا، فوراً جھک جائے گا، تو ذہن میں آیا کہ یہ جو لم یخروا ہے، کہ نہیں جھکے گا، شاید یہاں طباعت کی غلطی ہے۔ ہمارے اپنے تصور کے مطابق ہونا یوں چاہیے کہ مومن وہ ہے کہ جب خدا کی آیات اس کے سامنے آئیں، تو وہ آنکھ بند کیے ہوئے ان کے سامنے جھک پڑے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے اور یہی تھا دل کے اندر وہ پختہ یقین جس کی بنا یہ پہلا رد عمل یہ ہوا کہ یہاں کچھ کتابت کی غلطی ہوگئی۔ کئی نسخے قرآن کے دیکھے وہاں ہر نسخے میں یہی لکھا ہوا تھا، تو کھڑے ہو کر سوچنا پڑا کہ یہ تو بات بڑی اونچی ہے۔ یہاں تو ایمان کا معیار ہی کچھ اور بتایا جا رہا ہے اور وہ ہے احکام خداوندی کو تسلیم کرنے سے پہلے ان پر غور و فکر لازم ہے۔

### ایمان کا معیار وہ ہے جسے قرآن تسلیم کرے

عزیزانِ من! ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ احباب ہر درس بڑی توجہ سے سنتے ہیں، قرآن کی ہر آیت آپ کے لیے وجہ کشش ہوتی ہے لیکن اس آیت کے ضمن میں جو کچھ میں عرض کروں گا، اس کے لیے خاص طور پر میں یہ گزارش کروں گا کہ بڑی ہی توجہ سے اسے سنئے گا، خیال کو ایک لمحہ کے لیے بھی ادھر ادھر نہ جانے دیجیے۔ بڑی اہم بات ہے اور بڑی بنیادی بات ہے۔ قرآن کی رو سے یا اسلام کی رو سے یہ جنہیں ہم ذاتیں گوتیں کہتے ہیں، یہ تو کچھ شے نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پہ میں سمجھتا ہوں کہ مثلاً ایک شخص ہے اس کی ذات اعوان ہے اور وہ ڈاکٹر بھی ہے۔ اس کا بیٹا پیدائشی اعوان ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ذات اور گوت میں تو ہوتا ہی یہ ہے کہ اس میں وہ ذات (Caste) پیدائشی ہوتی ہے۔ اعوان ڈاکٹر کا بیٹا پیدائشی اعوان ہوگا لیکن وہ پیدائشی ڈاکٹر نہیں ہوگا، اسے ڈاکٹر بننا پڑے گا۔ یہ بات صاف ہے ہم جو مسلمان قوم سے متعلق ہیں، تو یہ ٹھیک ہے کہ مسلمان قوم کا بیٹا کوئی فرد قومی اعتبار سے مسلمان ہی ہوگا۔ اعوان کا بیٹا اعوان ہوگا۔ جو اپنی قوم مسلمان لکھاتا ہے، اس کا بیٹا قومی اعتبار سے مسلمان ہے لیکن جیسے اسے ڈاکٹر بننے کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے، تو ڈاکٹر بنتا ہے، ڈاکٹر کا بیٹا ہونے کی جہت سے وہ ڈاکٹر نہیں ہوتا۔ آپ حیران ہوں گے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ اس شخص کو بھی ایمان لانا پڑے گا جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گیا ہے، یہ پیدائش کے اعتبار سے مومن نہیں ہیں، قرآن کریم میں جسے ہم ایمان کہتے ہیں اس کے لیے الفاظ ہیں: امنوا

یومنون - یہ الفاظ Verb (فعل) آئے ہیں یعنی وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، مومن وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں تو اس کے لیے تو کچھ کرنا پڑے گا جیسے وہ جو ڈاکٹر بنتا ہے، جو ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرتا ہے، وہ ڈاکٹر ہوتا ہے، ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کی رو سے ہر انسانی بچے کو خواہ وہ قومی اعتبار سے مسلمانوں کے گھر میں بھی کیوں نہ پیدا ہوا ہو، اسے ایمان اختیار کرنا پڑتا ہے، لانا پڑتا ہے یہ ایمان لانا پڑتا ہے اور اس کا معیار یہ ہے جسے قرآن تسلیم کرے۔

قرآن حکیم کی صداقتوں اور حقیقتوں کو غور فکر کے بغیر تسلیم کرنے سے انسان مسلمان تو ہو سکتا ہے مومن نہیں بن سکتا

یہ کیا ہے؟ یہ کیا بات ہے؟ یہ کچھ صداقتیں ہیں، کچھ حقیقتیں ہیں، کچھ اصول ہیں، کچھ اقدار ہیں۔ ان کے متعلق اسے یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ واقعی صداقت ہے، یہ حقیقت ہے، یہ غیر متبدل Value (قدر) ہے۔ یہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ کیسے کرنا پڑتا ہے؟ یہ جو آیت یعنی (25:73) میں نے ابھی پیش کی ہے کہ یہ نہیں ہے کہ اس کے سامنے یہ چیزیں آئیں اور اس نے آنکھیں بند کیں، کان بند کیے، اندھے اور بہرے کی طرح اس کے سامنے جھک گیا کہ جی، ٹھیک ہے وہ یہ کہتا ہے۔ کہا کہ قطعاً یہ نہیں ہے۔ یہ تو لَمْ یَخْرُوا (25:73) ہے۔

یہ بڑی عظیم چیز ہے کہ وہ اس طرح نہیں جھکتے۔ وہ تو ان صداقتوں کو آنکھیں کھول کے، کان کھول کے، دل اور دماغ کے پورے اطمینان سے، عقل و فراست کی رو سے، غور و تدبر کی رو سے، فہم و بصیرت کی رو سے، جسے آپ ذہنی طور پر پورے شعور سے کہتے ہیں ان صداقتوں کے متعلق یقین حاصل کرنا ہے کہ یہ واقعی ابدی صداقت ہے۔ پھر سن لیجیے کہ یہ غور و تدبر کی رو سے ماننا ہے، اندھے بہرے بن کے نہیں، یونہی نہیں مان لینا۔ یہ ہر فرد اس طرح سے کرے گا۔ جو فرد اس طرح سے قرآن کی حقیقتوں پر یقین رکھے گا کہ یہ واقعی سچی بات ہے، اسے کہیں گے یہ ایمان لایا ہے۔ اس کے لیے قرآن من یؤمن کہتا ہے۔ یعنی جو ایمان لایا۔ اب یہ مومنین کے حلقے کے اندر داخل ہوا۔ اعوان ڈاکٹر کے گھر میں پیدا ہونے والا پیدا انسی اعتبار سے اعوان تو ہو گیا اور وہ جو ڈاکٹروں کی Association (انجمن) ہے، اس کا ممبر بننا اس وقت ہے جب اس نے ڈاکٹری کا علم حاصل کیا ہو، اور وہ سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہو۔ جب یہ ہوا تو پھر وہ ڈاکٹروں کی انجمن میڈیکل ایسوسی ایشن کا ممبر بنا پھر اسے ایک سرٹیفکیٹ ملا، پریکٹیشنر ہونے کا بھی۔ اس کے لیے یہ کچھ اس نے کیا ہے، تو یہ جو چیز ہے جسے ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والا کہتے ہیں اس کے لیے بھی ہر بچے کو یہ کرنا پڑے گا، ہر فرد کو یہ کرنا پڑے گا، ڈاکٹر کے بیٹے کو ڈاکٹر بننا پڑے گا۔ اگر وہ نہیں بنتا تو وہ تو اس Association (انجمن) کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ یہ کفر اور ایمان کے معنی بھی یہ ہیں۔ مومن یا ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو مومنین کی Association (انجمن) ہے وہ اس کا ممبر اس صورت میں بن سکتا ہے جب اس طرح سے ایمان لائے



اور جو اس طرح سے ایمان نہیں لاتا، وہ ان کا ممبر نہیں بنتا، وہ کفر کے اندر ہے کہ وہ Non-member (غیر ممبر) ہے۔ کافر کے معنی Non-member (غیر ممبر) ہوتے ہیں، یہ گالی نہیں ہے، یہ ایک Factual Statement (واقعاتی بیان) ہے، واقعاتی چیز ہے کہ ایک ممبر ہوں، اس Association کے ایک Non-members ہوں۔ تو اس کا ممبر بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ کچھ کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ٹھیک ہے قومی اعتبار سے تو آپ اسے مسلمان کہہ سکتے ہیں، ایمان تو وہ نہیں لایا، مومن تو وہ نہیں ہوا۔ اس کی تو پہلی شرط ہی یہ ہے۔ اب یہ بات سمجھ میں آئی کہ مومن وہ ہیں جو آیات خداوندی کے سامنے بھی اندھے بہرے بن کے نہیں جھکتے، غور و تدبر کے بعد ان صد اقتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

### ایمان لانے کا مطالبہ ایمان والوں سے کیا جا رہا ہے

اب یہ دیکھیے کہ جب یہ بات آئی تو اس چیز کے لیے میں نے پھر قرآن میں تلاش کیا کہ بات تو یہ بڑی اہم ہے۔ میرا خیال ہے آپ نے بھی شاید پہلی دفعہ ہی سنا ہوگا کہ قرآن اس کی ایک مقام پہ نہیں، متعدد مقامات پہ وضاحت کرتا ہے۔ یہ حوالے بڑے اہم ہیں اے کاش! آپ میری بات ماننے اور قرآن کے نسخے آپ کے ہاتھ میں ہوتے، پھر وہ بات زیادہ خوبصورتی سے سمجھ میں آتی، وضاحت سے سمجھ میں آتی (4:136) میں مخاطب کن کو کیا جا رہا ہے؟ کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (4:136)۔ کہیں ترجمہ دیکھ لیجیے۔ کہا کہ اے ایمان والو! اس کا یہ ترجمہ بڑا آسان ہے، یہ کچھ مشکل الفاظ نہیں ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (4:136) اے وہ لوگو! امنوا، ایمان والو! ترجمہ میں تو یہ بات آگئی: امنوا، وہ جو ایمان لائے ہو، اس کا ترجمہ ہو جائے گا۔ اب پتہ ہے آگے کیا ہے؟ کہا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهِ (4:136) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر، اور اس کی کتاب پر۔ سن رہے ہیں آپ! میں کہہ رہا ہوں کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ (4:136)۔ عزیزانِ من! يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (4:136) قرآن خود کہہ رہا ہے۔ وہ تو سیدھی بات کہی جا رہی ہے کہ جب آپ خود کہہ رہے ہیں: اے وہ امنوا، جس کو ہم آپ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ ہیں جو ایمان لے آئے ہو۔ پھر آگے اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) کہا ہے۔ یہ کیا ہے؟ پہلے آپ نے خود ان کو یہ کہہ کے پکارا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (4:136)۔ تو وہ مخاطب کرتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (4:136)۔ اے گریجو! بی اے پاس کیا کرو۔ ارے! کیا کہہ رہے ہو آپ؟ اے گریجو! پہلے کہہ رہے ہیں، پھر کہہ رہے ہیں: بی اے (B.A) کیا کرو۔ عزیزانِ من! قرآن کے یہ وہ مقامات ہیں جہاں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اور میں کیا عرض کروں مہینوں نہیں، برسوں کھڑا ہونا پڑتا ہے کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ نظر آیا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (4:136) تو وہ ہے جس معنی میں ہم آپ سارے مسلمان ہیں۔ مسلمان کا لفظ تو قرآن میں ہے

نہیں عربی زبان کا یہ لفظ ہی اس Construction (ترکیب) میں نہیں ہے۔ مسلم تو ہے، مسلمان تو عربی زبان میں آتا نہیں۔ اس زبان میں یہی لفظ ہے۔ ترجمہ اس کا یوں ہونا چاہیے کہ اے وہ جو مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے ہو! اب بات صاف ہو گئی، اب یٰٰیہا الذِّینَ اٰمَنُوْا اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) الجھن نہ رہی۔

اب آپ آئیے اس کے اوپر کہ اے وہ جو اعوان باپ کے گھر میں پیدا ہونے سے اعوان کہلاتے ہو! تلوار زنی بھی سیکھو۔ بات یوں ہوگی۔ یٰٰیہا الذِّینَ اٰمَنُوْا اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) حکم ہے۔ پہلا وہ ہے کہ جو تم خود اپنے آپ کو کہتے ہو یٰٰیہا الذِّینَ اٰمَنُوْا (4:136) تو وہ یوں کہہ دیا کہ جیسا تم کہتے ہو ہم بھی تمہیں وہی کہہ کے پکارتے ہیں۔ عبد الرحمن بھی تو تم نام رکھتے ہو، ہم بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد پوچھتے ہیں کہ ہو تم رحمن کے ہی عبد اسی کے غلام ہو اسی کے محکوم ہو، تو یوں ہوگا کہ اے عبد الرحمن! الرحمن کی عبودیت اختیار کر۔ بات یوں ہوگی: یٰٰیہا الذِّینَ اٰمَنُوْا اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ وَ الْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَلَ عَلٰی رَسُوْلِهِ وَ الْکِتٰبِ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (4:136)۔ یہاں یٰٰیہا الذِّینَ اٰمَنُوْا (4:136) کہنے کے بعد وہ سارے جو اجزائے ایمان ہیں بتائے گئے ہیں اس کے بعد قرآن حکم دے رہا ہے کہ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ (4:136)۔ ایک اور حوالہ بھی لکھ لیجیے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔ وہ حوالہ ہے (57:28) کا۔ یہاں پہلے قرآن نے کہا کہ یٰٰیہا الذِّینَ اٰمَنُوْا (57:28)۔ پھر وہی بات آئی کہ یٰٰیہا الذِّینَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ (57:28) اے وہ جو اپنے آپ کو مومن کہتے ہو! اتقوا اللہ: خدا کا تقویٰ اختیار کرو۔ یہ بات دوسری جگہ آئے گی کہ یہ تقویٰ اختیار کرو لیکن خیر کہہ سکتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ تقویٰ پہ زور دیا ہوا ہے: یٰٰیہا الذِّینَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ (57:28)

قرآن حکیم انسان کو علی وجہ البصیرت ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے

عزیزانِ من! اس کے آگے ہے کہ وَ اٰمَنُوْا بِرَسُوْلِهِ (57:28) رسول پر ایمان لاؤ۔ یہ وہی بات ہے: وہاں وہ تمام اجزاء تھے، یہاں رسول پہ ایمان ہے، تو ہم جو اپنے آپ کو اس زمرے میں شمار کرتے ہیں یعنی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، قرآن کے الفاظ میں جنہیں خدا یا یہاں الذین امنوا کہہ کر پکارتا ہے، ہمیں حکم دے رہا ہے کہ ایمان لاؤ، یہ نہیں کہہ رہا کہ ذرا سوچو ایمان لائے ہو یا نہیں، بلکہ حکم دے رہا ہے کہ ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو خدا کا حکم ہے، کیا ہم نے کبھی اس حکم کی بھی پیروی، اطاعت اور پابندی کی ہے، کیا ساری عمر کبھی سوچا بھی ہے کہ یہ بھی ایک حکم ہے؟ حالانکہ یہ تو بنیادی حکم ہے۔ اتنا ہی نہیں ہے قرآن تو دنیا بھر کے ان لوگوں کو جنہیں ہم آپ بھی مسلمان نہیں سمجھتے، ہم اپنے آپ کو تو بہر حال مسلمان کہتے ہیں، یہ حکم دیتا ہے اور کون کون لوگ، یہودی عیسائی، مجوسی ہیں، جنہیں کہتا ہے کہ اِنَّ الذِّینَ اٰمَنُوْا وَ الذِّینَ هَادَوْا وَ النَّصْرٰی وَ الصَّبِیْنِ (2:62)۔ یہ پھر وہی لفظ ہیں۔ عام ترجمہ آپ کو بتا دیا جائے گا کہ وہ

لوگ ہیں جو ایمان لے آئے یعنی مومن تو پہلی چیز ان الذین امنوا ہوا وہ لوگ جو ایمان لے آتے ہیں اور یہودی اور نصرانی اور مجوسی یا صابئین ستارہ پرست وغیرہ تو یہودی نصرانی مجوسی وغیرہ ہو گئے کہ وہ یا یہا الذین امنوا میں نہیں آتے۔ یہاں پہلے کہا ہے کہ ان الذین امنوا وہ لوگ جو یہودی اور نصاریٰ ہیں اور اس کے بعد ہے کہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (2:62) ان پہ خوف و حزن نہیں ہوگا۔ ان میں سے جو بھی ایمان لائے گا وہ تو باقیوں کی طرح آپ کو اس زمرے میں شامل کر رہا ہے۔ یاد رکھیے اگر یہ تصور کریں کہ ان الذین امنوا کے معنی یہ ہو گئے وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ وہ ہیں جو ایمان لے آئے ہوئے ہیں پھر اس کا یہ کہنا کہ امنوا یا من امن کیا ہوا؟ آپ سوچیے بات کہاں جاتی ہے۔ خدا کی طرف سے منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ باقیوں کے ساتھ اس قسم کی بات کہے گا۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح سے اور لوگ، کوئی عیسائیوں کے گھر میں پیدا ہوا، کوئی یہودیوں کے پیدا ہوا، کوئی پارسیوں کے گھر میں پیدا ہوا، ان سے ہم سب آپ ان سے کہتے ہیں کہ ایمان لاؤ۔ ان میں سے کوئی ایمان لاتا ہے تو ہم کہتے ہیں آج مسلمان ہوا، الحمد للہ ہم اسے مسلمان کرتے ہیں۔ وہ مسلمان ہوتا ہے۔ ہم تو ساری عمر ایسا نہیں کرتے جبکہ وہ ہمیں بھی کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ..... مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (2:62) جو بھی ان میں سے ایمان لائے گا۔

انگریزی میں ایمان کا ترجمہ Faith (فیتھ) کرنا غلط ہے

عزیزانِ من! محض مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے تو ایمان لانے والا نہیں ہو سکتا۔ قرآن کے الفاظ موجود ہیں تو ایمان لانے کے لیے پہلی شرط کیا ہوگئی؟ وہی کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِآيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُْمِيَانًا (25:73) فہم و شعور کی رو سے، عقل و بصیرت کی رو سے، دیکھ بھال کر، سمجھ سوچ کر اس چیز کو پھر صحیح ماننا کہ واقعی خدا نے جو کہا ہے وہ ایک حقیقت ہے، یہ محض مان لینا نہیں ہے۔ میں جو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ ایمان کا ترجمہ Faith (فیتھ) ہے ہی نہیں۔ یہ ترجمہ غلط ہے۔ یہ عیسائیت کے الفاظ ہیں جو ہمارے ہاں آگئے ہوئے ہیں۔ ایمان کے معنی ہی Conviction (کن وکشن) ہیں، من اٰمَن کے معنی ہی ہیں:

One who is convinced of these facts

عزیزانِ من! سوچیے اس کیٹگری (قسم) کے اندر ہم میں سے کوئی بھی آتا ہے۔ اور پھر توقعات ہم کر رہے ہیں ان نعماء یعنی خوشگوار یوں کی جو مومنین کا حصہ ہوتی ہیں۔ یہی چیخ رہے ہیں کہ وہ Appointment (تقرری) جو ڈاکٹروں کے لیے تھی، مجھے کیوں نہیں ملی، میں تو ڈاکٹر کا بیٹا ہوں۔ یہ تو جو ڈاکٹر بنتا ہے اس کو ملتی ہے۔ اس کے لیے ایک ریفرنس لکھ لیجیے۔ وہ ہے (5:69)۔ عزیزانِ من! اب جو بات سامنے آ رہی ہے یہ تو پوچھو نہیں کہ اس نے مجھے کتنے عرصے تک ورطہ حیرت میں رکھا۔ اسی سلسلہ میں

اقبال<sup>1</sup> (1877-1938) کے الفاظ میں ”پھر کوئی مشکل مقام آیا“<sup>1</sup> قرآن نے بایہا الذین امنوا کے متعلق کہا تھا کہ امنوا (من امن) کہ ان میں سے جو کوئی بھی ایمان لاتا ہے۔ کس پہ ایمان لاتا ہے؟ قرآن پہ ایمان لاتا ہے۔

### قرآن حکیم کے نزدیک نبوت کے لیے انتخاب کا معیار

قرآن حضور نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا۔ پہلے انتخاب خداوندی یہ ہے کہ خدا اس دور کے پورے انسانوں میں سے ایک فرد کو منتخب کرتا ہے۔ یہ وہ ہوتا ہے جس کا سینہ وحی جیسی صداقتوں کا مہبت بنتا ہے۔ وہ بڑی عظیم شخصیت تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے قصے میں یہ کہا ہے کہ یہ تو شاعری ہے جو تم کہہ رہے ہو کہ ”آگ لینے کو جائیں اور پیغمبری مل جائے۔“ لیکن پیغمبری یوں نہیں ملا کرتی۔ وہ اس قصے میں ہے کہ وہاں جب پیغمبری ملی ہے تو حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ شکر یہ جناب کا، بہت بڑا احسان مجھ پہ کیا ہے کہ ادھر میں آیا ہوں اور تو نے مجھے پیغمبری دی۔ کہنے لگے: موسیٰؑ! یہ آج کی بات نہیں ہے، یہ تو جب سے تم پیدا ہوئے ہو اس زمانے سے ہم پیغمبری دینے کے لیے تمہیں تیار کر رہے تھے<sup>2</sup> تو گویا اس قسم کا وہ فرد ہوتا ہے اور واقعی وحی جیسے عظیم حقائق کا مہبت بننے کے لیے عزیزانِ من! پوچھ نہیں کہ اس قلب کی کیا کیفیت ہونی چاہیے۔

### ایک رسول کو بھی عقل و شعور کے تحت وحی خداوندی پر ایمان لانا پڑتا ہے

قرآن اس پہ نازل ہو رہا ہے وہ دوسروں تک پہنچا رہا ہے دوسروں کو اسکی دعوت دے رہا ہے کہ اس کو صحیح تسلیم کرو۔ اس پہ نازل ہو رہا ہے کیا ذہن میں یہ بات آئی جو میں کہہ رہا ہوں؟ اس سے بڑا تو مومن کوئی نہیں ہو سکتا لیکن آپ حیران ہو گئے قرآن کہتا ہے کہ اَمَنْ الرُّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ (2:285) رسول بھی اس کے اوپر ایمان لاتا ہے جو خدا کی طرف سے اس پہ نازل کیا جاتا ہے۔ (اللہ اکبر! اللہ اکبر)۔ عزیزانِ من! سر پکڑ کے بیٹھ جانے والی بات ہے یا نہیں؟ کس کی نگری (قسم) میں وہ شامل کر رہا ہے اَمَنْ الرُّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَ الْمُؤْمِنُونَ (2:285) مومن جس طرح سے ایمان لا کر مومن بنتا ہے رسول بھی اسی طرح سے ایمان لاتا ہے۔ کس پہ ایمان لاتا ہے؟ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ (2:285) جو اس پر اس کے رب کی طرف سے نازل ہوتا ہے عزیزانِ من! لایئے ساری دنیا کے عقل و شعور کے مالکوں کو اور مذاہب کی کتابوں کو اور ان سے کہیں کہ کہیں سے یہ نکل نکال کے بتائیں۔ بات کیا ہوئی تھی؟ وحی کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (53:3) اس میں رسول کی اپنی عقل و فکر کا کوئی دخل

① مجھے آہ و فغان نیم شب کا پھر پیام آیا تھم اے رہو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا (بالِ جبریل)

② ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005۔

نہیں ہوتا، وہ اس کی فکری تخلیق نہیں ہوتی، وہ اس کے اوپر Objectively (خارج سے) نازل کیا جاتا ہے دیا جاتا ہے اس کے قلب میں القا کر دیا جاتا ہے اس میں اس کی عقل و فکر کا دخل نہیں ہوتا اور یہ جو کہا ہے کہ امن الرسول تو ایمان کی تو اس نے پہلے شرط بتائی کہ وہ عقل و فکر کی رو سے ایمان لایا جاتا ہے۔ وہ چیز جو رسول کو وہی طور پر ملی تھی جس میں اس کی فکر کا کوئی دخل نہیں تھا رسول بھی اس کے اوپر پھر دوبارہ اپنی عقل و فکر کی رو سے ایمان لاتا ہے۔ اَمِنْ الرَّسُولِ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَ الْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ اَمِنَ بِاللّٰهِ (2:285) میں یہ سب آتے ہیں: اَمِنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهِ وَ رُسُلِهِ (2:285)۔ رسول اس بات پہ بھی ایمان لاتا ہے کہ میں اس کا پیغام ہوں، یہ اس کا پیغام ہے یہ اس کا کلام ہے یہ اس کی وحی ہے یہ صداقتیں ہیں، یہ حقیقتیں ہیں۔ وہ ان پر بھی فکر و شعور اور علم و بصیرت کی رو سے ایمان لاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (6:163) لو بھی! سب سے پہلے میں مسلمان ہوتا ہوں۔ یہی کہنا پڑتا ہے یعنی وہ رسول یہ کہتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (6:163) سب سے پہلے میں خود اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ اور اَمِنْ الرَّسُولِ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ (2:285) وہ اس پر ایمان لاتا ہے جو اس پہ نازل کیا گیا ہے۔ ہم تک تو وہ صرف پہنچاتا ہی ہے اس پہ تو وہ نازل ہوتا ہے۔

وحی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ قلبِ نبوی پر باہر سے نازل ہوتی ہے

عزیزانِ من! اس ایک ٹکڑے نے وحی کی حقیقت کو بھی ایسا واضح کیا ہے کہ یہ کہیں اور نہیں ہو سکتا۔ یہ جو اس پہ نازل ہوا ہے اس میں اس کی اپنی عقل و فکر کا کوئی دخل نہیں تھا اس لیے محض اس کے نازل ہونے سے اس کا اس پر ایمان نہیں ہو جاتا۔ اس اعتبار سے رسول اور جس تک قرآن پہنچتا ہے اس کو وہ ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ قرآن اس کے پاس ہے قرآن کی صداقتیں اس کے پاس ہیں اس کو بھی اس قرآن کی ان آیات کے اوپر اس طرح جیسا اس نے کہا ہے ایمان لانا ہوتا ہے: اَمِنْ الرَّسُولِ (2:285) رسول بھی اس طرح سے ایمان لاتا ہے۔ عزیزانِ من! کیا آپ نے کبھی اس سے پہلے یہ سنا بھی تھا؟ یہ آیت تو میں (معاذ اللہ) اپنی طرف سے نہیں پڑھ رہا، یہ سورۃ البقرۃ کی آخری سے پہلی آیت ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو خدا تعالیٰ پر اور قرآن پر ایمان لانے کا اعلان کرنا پڑا تھا

یہ آیت وہ ہے جسے عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ نمازوں میں جماعتوں میں امام وغیرہ یہ آخری آیات پڑھا کرتے ہیں۔ اَمِنْ الرَّسُولِ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَ الْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ اَمِنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهِ ..... (2:285)۔ یہ آیتیں آپ روز سنتے ہیں لیکن کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ یہ بات کیا ہے۔ یہ اتنی ہی بات نہیں ہے ایک اور جگہ یہ بھی ہے یعنی یہی نہیں کہ رسول اپنے دل میں ایمان

لے آتا ہے اور اس طرح سے مومنین کی صف میں ہی شامل ہو جاتا ہے۔ یہ اتنا ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! کہا یہ جاتا ہے کہ قُلْ (42:15) اے رسول! اعلان کرو ان سے کہہ دو خدا رسول کو حکم دے رہا ہے کہ قُلْ (42:15) یہ کہو۔ کیا کہو؟ اَمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ (42:15) جو خدا نے مجھ پہ کتاب نازل کی ہے میں اس پر خود ایمان لایا ہوں۔ کہا کہ اس کا یہ اعلان کرو۔ اَمِنْ الرّسول کہہ کے یہی نہیں کہا کہ خدا نے کہہ دیا ہے کہ رسول بھی ایمان لے آیا ہے، چلو ٹھیک ہے جی: اسی جو کہہ دتا ہے۔<sup>①</sup> کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ بس تم قُلْ (42:15) اعلان کرو کہ اَمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ ۚ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ (42:15)۔ کیا کہوں یہ پوری کی پوری آیت ہی عجیب و غریب ہے لیکن میں اپنے آپ کو اتنے ٹکڑے تک ہی محدود رکھوں گا کہ یہ بڑا ہی اہم موضوع ہے۔ پھر تھوڑا سا پیچھے چلیے۔

اعوان یا پٹھان یا سید کے گھر میں پیدا ہو جانے سے جو ہم اعوان پٹھان یا سید ہو گئے وہ تو ٹھیک ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ بھی ہمارا ایک ذہن کا تصور ہے، کچھ اور بات نہیں ہے نہ اعوان نہ پٹھان نہ سید کچھ بات ہی نہیں ہے۔ بہر حال وہ تو ہو گئے۔ ہم نے مان لیے۔ پھر کیا اس کے بعد ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر خود ہی بن گیا؟ مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے ہم اس قوم کے فرد تو بن جاتے ہیں جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ صابنین وغیرہ کی طرح ہمیں بھی ایمان لانا پڑے گا۔ ہم کس باغ کی مولیٰ ہیں۔ عزیزانِ من! جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے جس ذات اقدس و اعظم پر قرآن نازل ہوا ہے اس کے متعلق خدا کی شہادت ہے: اَمِنْ الرّسول (2:285)۔ اس کا اعلان یہ ہے کہ اَمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (42:15) میں بھی ما نزل اللہ پر ایمان لایا ہوں اور یہ کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (6:163) میں یوں مسلم ہوا ہوں۔ یہ جو ایمان لانا ہے اس کے لیے سوال یہ ہے کہ کس طرح سے یہ ایمان لایا جاتا ہے۔

قرآن حکیم پیدائشی مسلمان کا نہ ایمان قبول کرتا ہے اور نہ اُسے مومن تسلیم کرتا ہے

اب پھر وہ آیت آگئی جو آج کے درس میں ہمارے زیر غور ہے کہ وَ الَّذِینَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِآیٰتِ رَبِّہِمۡ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْہَا صُمًّا وَّ غُمًّا (25:73) وہ اس پہ آنکھیں بند کر کے نہیں گر پڑتے، آنکھیں کھول کے، کان کھول کے، بصیرت اور سماعت اور عقل و ہوش کی رو سے ان کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جو ایسا کرتا ہے وہ پھر مومنین کے حلقے میں داخل ہوتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا، تو ٹھیک ہے، مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا مسلمان تو ہے۔ قرآن نہ اس کا ایمان تسلیم کرتا ہے نہ اسے مومن تسلیم کرتا ہے۔ یہ جو فتوے لگتے ہیں، یہ تو فقہ کی باتیں ہیں۔ عزیزانِ من! فتویٰ لگانے والے سے بھی کبھی پوچھو کہ تم بھی ساری عمر اس طرح سے ایمان لائے ہو۔ اب اگلے قدم پہ آئیے۔ عقل و ہوش کی رو سے، فہم و فراست سے، غور و تدبر کے بعد سب کچھ دیکھ بھال کے یہ قرآن کی صداقتوں کو صحیح مان لیا، ٹھیک ہے تو بس کام ہو گیا یہی

مقصد ہے قرآن کا۔ ہم نے مان لیا کہ یہ صحیح ہے، یہ غلط ہے۔ عقل و فکر کی رو سے، تجربے مشاہدے کی رو سے، بھی اس کو یقین کی حد تک مان لیا کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے، تو کیا یہ کافی ہو گیا؟

کیا عقل و شعور سے ایمان لے آنا کافی ہے؟

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ یہ ذہنی طور پر ہو گیا، ہم نے اس کو Intellectually (عقلی طور پر) سمجھ بھی لیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ذہنی طور پر کسی چیز کو سمجھ لینا قرآن کا مقصد تھا؟ کیا یہ مقصد تھا کہ صاحب! یہ فلاسفر ہو جائیں اور یہ ذہنی طور پر سمجھ لیں کہ ہاں صاحب! بالکل ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں، دلائل بھی دیں، دوسروں سے بحثیں بھی کیں، بڑی بڑی کتابیں بھی لکھیں، اسلام کی صداقتوں کے لیے دلائل اور براہین کے انبار بھی لگا دیں، تو کیا اس کا مقصد یہی ہے؟ جی نہیں، آپ کہیں گے کہ پہلی ہی منزل کچھ کم نہیں تھی۔ تم نے یہ کیا کیا؟ عزیزانِ من! میں نے آپ سے یہ نہیں کیا، خود میں بھی تو اسی میں شامل ہوں:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم  
کہ دامن مشکلات لا الہ را

(اقبال)

میں تو خود کانپ اٹھتا ہوں جب کبھی بھی میں یہ کہنے لگتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ تو کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا کہ واقعی ایمان لے آیا ہوں لیکن بہر حال ذہنی طور پر تو صحیح ہے، وہ تو آپ سمجھتے ہیں کہ میں ساری عمر چالیس سال سے یہ کچھ لکھتا رہا، قرآن کے حقائق کی تائید میں دلائل و براہین ہیں، یہ ساری بیسیوں کتابیں لکھ دیں۔ سب کچھ ہوا، تو کیا مومن ہو گیا؟ قرآن کہتا ہے کہ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا (49:14) یہ اعراب یہ بدو یہ صحرائی لوگ یہ کہتے ہیں کہ آمَنَّا (49:14) ہم ایمان لے آئے۔ قُلْ لَّمْ تُوْمِنُوا (49:14) ان سے کہو کہ یہ مت کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا (49:14) یہی کہو کہ ہم نے تسلیم کر لیا ہے، ہم اس کے سامنے جھک گئے ہیں، وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (49:14) کیونکہ ایمان ابھی دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا۔ خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے کے لیے بھی پہلی منزل تھی کہ وہ عقل و فکر کی رو سے ان صداقتوں کو صحیح تسلیم کرے۔ یہ فکری اور عقلی چیز پہلی شرط تھی۔ ہم تو اس پہلی شرط پہ ہی رک گئے، اس پہ تو ہم میں سے ایک بھی پورا نہیں اترتا۔ ایک یہ چیز ہو گئی ہے۔

ایمان کا دماغ سے قلب تک کی رسائی حاصل کرنا بھی لازم ہے

عقل و فکر کے طور پر، ہم نے یہ مان بھی لیا لیکن وہ کہتا ہے کہ اپنے آپ کو ابھی بھی ایمان والے نہ کہو، کیوں نہ کہو؟ کیونکہ ایمان تمہارے دماغ تک تو ہے، تمہارے دماغ سے تمہارے قلب پر ابھی نازل نہیں ہوا۔ یہ تو قلب کے اندر جانے والی بات ایک اور تھی۔

عزیزانِ من! آج یہ بات سمجھ میں آتی ہے جب یہ علم النفس یا سائیکولوجی اس دور میں آئی ہے کہ دماغی طور پر کسی چیز کو مان لینا، انسان کی سیرت و کردار پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

## نفسیاتی تبدیلی کے بغیر سیرت و کردار کی پختگی ممکن ہی نہیں

بڑے بڑے مفکر ہیں، بڑے بڑے فلاسفر ہیں۔ ان کی کتابیں اٹھا کے دیکھیے۔ یہ جتنی بھی اقدار (Values) اور Truth (صدقت) اور اخلاقیات ہیں، ان کے اوپر پوچھو نہیں کیسے کیسے انہوں نے مفکرانہ انداز سے دلائل دیئے ہیں، کتنی بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں! ان کی زندگی کو جھانک کے دیکھیے تو جو کچھ فکری طور پر کہہ رہے ہیں اس کا کہیں ذرا نشان بھی ان کی سیرت کے اوپر نظر نہیں آتا، کیا ہوا؟ ایمان دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا۔ قرآن کے الفاظ عجیب ہیں۔ اس میں یہاں دماغ اور دل کا خود ہی فرق کر کے بتادیا، فکری طور پر جو کچھ کہا ہے وہ دل میں نہیں اترتا اور قرآن یہ کہتا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (13:11) جب تک کوئی قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا کرتی، اپنے قلب کی تبدیلی پیدا نہیں کرتی، اس کے حالات میں کبھی تبدیلی نہیں پیدا ہو سکتی۔ جو چیز قوم کے لیے کبھی وہی چیز ایک فرد کے لیے ہے۔ جب تک اس کے دل کے اندر تبدیلی نہیں آتی، جب تک اس کا دل نہیں بدلتا، جسے آپ یوں کہہ لیجئے کہ جب تک یہ دل نہیں بدلتا، اس وقت تک اس کی سیرت اور کردار نہیں بدل سکتا، خواہ فکری طور پر اس نے قرآن کے حقائق کو لاکھ سمجھ لیا ہو۔ سقراط<sup>1</sup> نے تو یہی کہا تھا کہ

Knowledge is virtue.

”کسی چیز کا سمجھ لینا ہی نیکی ہے“ یہ اس نے غلط کہا تھا۔ جو نالج ہے، جو کسی چیز کے متعلق علم ہو جانا ہے، یہی Virtue (نیکی) نہیں ہے۔ یہ تو صرف سمجھ لینا ہے کہ یہ Virtue (نیکی) ہے، یہ خیر ہے، وہ شر ہے، یہ صحیح ہے، وہ غلط ہے، یہ صرف سمجھ لینے والی بات ہے۔ انسان کا سیرت و کردار ان چیزوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن اب جو بات آگے آئی وہ سمجھنے کی ہے۔

## قلب کی تبدیلی کی ایک عملی مثال

آئیے ایک مثال سے بات سمجھتے ہیں۔ ایک شخص جانتا نہیں ہے کہ یہ جو پاؤڈر سا ہے، یہ سٹکھیا ہے یا یہ مصری، پیسی ہوئی چینی ہے۔ وہ یہ جانتا نہیں ہے۔ وہ سٹکھیا پھا تک لیتا ہے، موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ تو نہ جانتا تھا۔ اس کے برعکس جو خود کشی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ سٹکھیا ہے، مہلک ہے، بلکہ اس سے زیادہ بڑھ کر تو کوئی دوسرا جانتا ہی نہیں ہے کیونکہ اس نے ابھی یہ کام کرنا ہے یعنی اس کو مرنا

<sup>1</sup> سقراط (C. 469-399 B.C.)



ہے۔ اسے یہ یقین ہے کہ یہ جو چیز ہے اس سے موت واقع ہو جائے گی۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہو، بلکہ یہ ہو کہ پتہ نہیں یہ وہی مصری نہ ہو یا آج کل دے اعتبار داناں کتھے نقلی سکھیا ای نادین ڈئے ہوں، سکھیا وی تے اصلی نہیں ملدا۔<sup>①</sup> لیکن یہ جو آج آپ کو نقلی، جعلی، ملاوٹی مل رہا ہے، ملاوٹ تو ہر چیز میں ہو رہی ہے، تو وہ خود کشی کرنے والا پہلے اس کا یقین کرے گا کہ واقعی یہ اصلی سکھیا ہے۔ تو سکھیا کے مہلک ہونے پر فکری طور پر جتنا یقین اس خود کشی کرنے والے کو ہوتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں ہوتا اور اس کے باوجود وہ سکھیا پھانک لیتا ہے، جاننے کے باوجود کہ یہ مہلک ہے، اس سے ہلاکت ہوگی۔ کیوں پھانکتا ہے؟ وہ زندگی پر اپنی موت کو ترجیح دیتا ہے، اسے زیادہ پسند کرتا ہے۔

اب آگے بات یہ آئی کہ یہ فکری بات نہ ہوئی۔ فکری طور پر تو میں نے کہا ہے کہ ابھی اس نے دیکھا ہے کہ اس سے تو موت واقع ہو جائے گی یقینی طور پر موت واقع ہو جائے گی۔ یہ جو چیز ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اوپر موت کو ترجیح دیتا ہے، یہ قلب کی چیز ہے، جذباتی چیز ہے، وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا، موت کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اب ہمارے سامنے اگلا قدم آ گیا، اسے تو ت فیصلہ کہتے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ آگئی کہ وہ فکری طور پر عقل و فہم کی رو سے، تجربے مشاہدے کی رو سے، یہ یقین کرے کہ یہ سکھیا ہے، یہ ہلاکت آفریں ہوتا ہے۔ سکھیے کے مہلک ہونے پر ایمان لائے۔ اگلی بات ہے کہ اندر ایک فیصلہ کرنے والی قوت ہے، وہ فیصلہ کرے کہ سکھیا نہیں کھانا، اس سے موت واقع ہو جائے گی۔ کون یہ ایسا فیصلہ کرے گا؟ وہ جو موت کے مقابلے میں زندگی کو ترجیح دے گا۔ صرف جاننا کچھ نہیں ہے۔ وہ جو غالب (1797-1869ء) نے کہا تھا، وہ بڑی پتے کی بات کہہ گیا ہے:

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کسی عمل کے لیے طبیعت کا مائل ہونا: یہ سیرت کی تبدیل پر موقوف ہے

یہ جو طبیعت کا ادھر آنا ہے، یہ جو ہے، یہ جاننا ہوں فکری بات نہیں ہے اور اس نے بڑا صحیح کہا ہے کہ جاننا ہوں، ثواب طاعت و زہد، خود کشی کرنے والا جاننا ہے کہ یہ مہلک ہے اس سے موت واقع ہو جائے گی، پر طبیعت ادھر نہیں آتی، اور ہمارا مفکر قرآن اقبال (1877-1938) کہہ گیا کہ

خرد نے کہہ بھی دیا 'لا الہ' تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

(ضربِ کلیم)

① آج کل کے لحاظ سے کہ یہ کہیں جعلی سکھیا ہی نہ دے رہے ہوں، اصلی سکھیا بھی تو دستیاب نہیں ہے۔

حالانکہ خرد کی رو سے لا الہ کہنا قرآن خود کہتا ہے کہ لا الہ اسی کا قابل قبول ہے جو خرد کی رو سے کہتا ہے لیکن اگلی بات جو ہے یہ اس بات پہ آیا ہے جو قرآن نے ان سے کہا ہے کہ ابھی اپنے آپ کو یہ مت کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں کیونکہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ<sup>①</sup> (49:14)۔ اس<sup>②</sup> نے یہ کہا کہ

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود

جب یہ جان کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے تو پھر جان کچھ اور ہو جاتی ہے اور

جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

(جاوید نامہ)

جب جان کچھ اور ہو جاتی ہے تو یہ دنیا بدل جاتی ہے۔

### قلب کے بدل جانے سے دو جہانوں اور دو جانوں کی متضاد کیفیت

خود کشی کرنے والے کے لیے دیکھیے جان دوسری ہو جاتی ہے، جہان اور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ دوسرا شخص خود کشی نہیں کرنا چاہتا، اس کا جہان اور اس کی جان اور ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں کے کس طرح دو متضاد جہان ہیں۔ یہ جہان اس کے نزدیک ایسا ہے کہ جتنی جلدی اس سے چھٹکارا ہو جائے وہ اس کو پسند کرتا ہے، کوشش کرتا ہے، بھاگتا ہے، دریا میں جا کر چھلانگ لگاتا ہے، یہ جہان ہمارے لیے جو مرنا نہیں چاہتے ہیں، پوچھو نہیں، ایک ایک سانس کے لیے ڈاکٹروں کو، سینکڑوں ہزاروں روپے دیتے ہیں، کہ چار سانس ہی زیادہ آجائیں۔ دونوں جہان مختلف ہو گئے۔ کس سے مختلف ہوئے؟ اندر سے ایک چیز کے بدلنے سے۔ کیا بدلتا ہے؟ یہ کہ تم کس کو زیادہ ترجیح دیتے ہو، کس کو زیادہ پسند کرتے ہو؟ یہاں یہ بات آگئی کہ وہ موت کو زیادہ پسند کرتا ہے، ترجیح دیتا ہے جبکہ ہم زندہ رہنے کو پسند کرتے ہیں، اسے ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے دونوں کا سنکھیے کے متعلق جو علم ہے وہ دو مختلف نتائج پیدا کر رہا ہے۔ وہ اس کے حسبِ مشا نتیجہ پیدا کر رہا ہے جبکہ ہم اس سے باز رہتے ہیں تو وہ ہمارے حسبِ مشا نتیجہ پیدا کر رہا ہے۔ سوال یہی ہے کہ تم دونوں میں سے کس چیز کو زیادہ پسند کرتے ہو۔ آئیے دیکھیں، قرآن کیا کہتا ہے۔ جہاں تک معلومات کا تعلق ہے، علم حاصل ہونے کا تعلق ہے، سقراط (C.469-399B.C) کے الفاظ میں، نالج (Knowledge) کا تعلق ہے، قرآن یہ کہتا ہے کہ اس کے متعلق بھی خود نہ فیصلہ کیا کرو، تمہاری محدود عقل آپ نہیں فیصلہ کر سکتی، وحی تمہیں یہ بتائے گی کہ کون سی چیز تمہارے لیے فائدے مند ہے، کوئی نقصان دینے والی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم صدیوں کے

① ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا۔

② یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

تجربات و مشاہدات کے بعد یہ دیکھیں کہ یہ سنکھیا ہلاکت آفریں ہے وحی پہلے دن یہ کہہ دیتی ہے کہ دیکھو یہ سنکھیا ہے اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ بس وحی یہ کرتی ہے وحی یہ علم دیتی ہے: **وَ عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ عَسَىٰ اَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ** (2:216) ہو سکتا ہے کہ تم اپنی عقل و فکر کی رو سے کسی چیز کو اپنے لیے بہت اچھا سمجھو لیکن درحقیقت وہ تمہارے لیے نقصان رساں ہوتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے لیے نقصان رساں سمجھو درحقیقت وہ تمہارے لیے فائدہ رساں ہوتی ہے۔ یہ تو یہی ہے کہ بچے کو کڑوی دوائی ہم پلایا کرتے ہیں وہ بھاگتا ہے روتا ہے: چھڑاں ماردا جنوں کیندے ہیگے نیں۔<sup>①</sup> وہ نہیں جانتا کہ یہ اس کے لیے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ ہے۔

### صرف وحی ہر دور استوں کا تعین کرتی ہے

تو بات یہ ہوئی کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ صرف وحی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ یہ چیز تمہارے لیے فائدہ مند ہے اور یہ چیز تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔ اب تمہارے اندر وہ خیر والی چیز ٹیکے (Injection) سے داخل نہیں کی جاسکتی نیز وہ خیر والی چیز تمہیں شر سے از خود نہیں بچا سکتی۔ تمہیں اس کے لیے وحی کے مطابق چلنا ہوگا۔ اس نے تو تمہیں اس کے متعلق صرف بتایا ہے کیونکہ **وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ** (2:216)<sup>②</sup>۔ یہ اسی آیت کا اگلا ہی ٹکڑا ہے۔ کیا بات ہے! بات ساری یہاں علم کی ہے: تم خود اس چیز کو نہیں جانتے خدا جانتا ہے۔ اس نے بات تمہیں بتادی۔ اب تم اور وہ ایک سطح کے اوپر آ گئے اور اس سے زیادہ وہ خود کچھ نہیں کرتا۔ آپ نے جان لیا کہ یہ شر ہے یہ خیر ہے۔ آپ نے جان لیا کہ یہ سنکھیا ہے یہ مصری ہے۔ وحی نے بتا دیا تم نے خود تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ سنکھیا واقعی ماردینے والی چیز ہے۔ وحی نے یہ کیا۔ یہاں تک آپ پہنچ گئے۔ اب اگلی بات ہے کہ موت کو زیادہ پسند کرتے ہو ترجیح دیتے ہو یا زندگی کو۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چیز ہم مجبوراً کسی کے اوپر عائد نہیں کرتے کہ تم اس کو ترجیح دو اس کو ترجیح نہ دو۔ ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ فائدہ مند ہے یہ نقصان دہ ہے جو جی چاہے راستہ اختیار کر لو۔ دیکھیے یہ جو لفظ میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ کون سی چیز ہے جس کو تم زیادہ پسند کرتے ہو یہ ہم علم حاصل ہونے کے بعد کی بات کر رہے ہیں۔ وحی نے دو چیزوں کا علم دے دیا۔ اب اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ دیکھو فیصلہ تم کرو کہ کس چیز کو زیادہ پسند کرتے ہو۔ اب ٹائی (Tie) پڑ رہی ہے دو متضاد کششیں سامنے ہیں: زندگی اور موت۔ یہ جو اقدار خداوندی یا اصول حیات ہیں ان کے مقابلے میں یہ متاع دنیا ہے جو یونہی حاصل ہو جاتا ہے جس طرح سے جی چاہے لوٹ لو۔ دو چیزیں اپنے سامنے آ گئیں ان دو میں ٹائی (Tie) پڑ گئی۔ اب قرآن کہتا ہے کہ **قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاؤُكُمْ وَ اَبْنَاؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيرَتُكُمْ وَ اَمْوَالٌ اِقْتَرَفْتُمُوهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسْكَنٌ تَرْضَوْنَهَا** (9:24) اے رسول! ان کو بتا دو ان سے کہہ دو کہ اگر

① جسے بدکنناؤرنا یا خوف کھانا کہتے ہیں۔

② اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تمہارے ماں باپ تمہارے بیٹے بیٹیاں اولاد تمہارے بھائی بہن تمہاری بیویاں بیویوں کے لیے ان کے شوہر تمہارے اہل خاندان تمہاری مال و دولت جس کو تم اس طرح سے اکٹھا کرتے رہتے ہو سمیٹتے رہتے ہو تمہاری تجارت کا روبا جس کے مندا پڑنے سے تم اتنا ڈرتے ہو تمہارے یہ محلات یہ کوٹھیاں یہ بنگلے جن کو تم اتنا پسند کرتے ہو سارا کچھ گنا دیا۔ اس دنیا کی ان چیزوں میں یہی کچھ گنا یا جاسکتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ساری چیزیں اس قابل ہیں کہ یقیناً ان کو حاصل کرو لیکن اگر أَحَبَّ إِلَيْكُمْ (9:24) تم ان چیزوں کو زیادہ ترجیح دو مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ (9:24) اللہ اور رسول اور اس کے راستے میں جہاد کے مقابلے میں ان چیزوں کو اگر تم زیادہ پسند کرو انہیں ترجیح دینے لگ جاؤ یعنی تم زندگی کے مقابلے میں موت کو ترجیح دے دو یہ دیکھیے أَحَبَّ إِلَيْكُمْ (9:24) احب خود بتا رہا ہے کہ تم زیادہ پسند کرتے ہو اس چیز کو ترجیح دیتے ہو ہاں اگر تم ان چیزوں کو اللہ اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد پر ترجیح دینے لگ جاؤ تَوَفَّرَ بَصُورًا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ (9:24) پھر تھوڑا سا انتظار کرو۔ سنبھلا اندر جانے دیجئے نتیجہ ظاہر ہو جائے گا۔ اے سنبھلیا کی پڑیا ہاتھ میں لینے والو! یہ اس لیے ہم نے بنایا تھا کہ اسے دوائی کے طور پر استعمال کیا جائے ڈاکٹر آخری توانائی جسم کے اندر پیدا کرنے کے لیے اس کا ایک ڈراپ دے لیکن اگر تم یہ جانتے بوجھتے کہ اس کی اتنی خوراک تمہیں مار دے گی اور تم زندگی کے مقابلے میں موت کو زیادہ ترجیح دیتے ہو تو وہ ٹھیک ہے ہم تو تمہیں روکیں گے نہیں ہم نے تمہیں صاحب اختیار پیدا کیا ہے پھانک لو اور اس کے بعد کہا ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے دو تین منٹ ٹھہر جاؤ ہمیں کہنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ أَحَبَّ إِلَيْكُمْ (9:24) تم نے خود ہی ان کو دوسری چیزوں پر ترجیح دی ہے۔

### وحی کی عطا کردہ سرفرازیاں

آپ نے غور فرمایا کہ ایمان کیا کرتا ہے۔ ایمان عقل و فکر کی رو سے قرآن کی Values یا اقدار کو انسانی زندگی کے لیے مدد و معاون نشوونما کا ذریعہ آئندہ زندگی کی منازل طے کرنے کے لیے ارتقائی منازل کی سیڑھیاں خوشگواریاں سرفرازیاں یہ سارا کچھ بتاتا ہے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ کچھ ملے گا ان کو چھوڑ دو گے تو ذلت اور خواریاں دنیا بھر کی تمام مکت و زبوں حالیاں یہاں بھی آخرت میں بھی تمہارے حصے میں آئیں گی۔ وہ تم کو اس چیز کا علم دے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان اقدار کو علم و بصیرت کی رو سے ماننا کہ ان کے اتباع سے یہ ہوگا ان کے خلاف جانے سے یہ ہوگا اب یہ ہوا آپ کا ذہنی ایمان۔

### اقدار خداوندی کے تحت انسانی اختیار و ارادے کی آزادی

اب آگے یہ بات آئی کہ جب سفر حیات میں ٹائی Tie پڑ جائے۔ ایک طرف یہ چیزیں ہوں دوسری طرف کوئی قدر ہو۔ قدر یہ ہے

کہ دوسرے کے مال کو کسی طرح سے بھی غلط طریقے پہ حرام طور پر ناجائز طریقے سے فریب کاری سے چھوڑ بھی نہیں۔ یہ ہوئی وہ قدر۔ ایک طرف یہ اتنی بڑی Attraction (جاذبیت) کہ کوئی دیکھ نہیں رہا، پکڑے نہیں جاسکتے، کچھ صورت نہیں ہے ذرا سیالوں ایک سیکنڈ کے لیے ذرا جھوٹ بولا، فائل کے اوپر دو لفظ یوں لکھے یہ سارے کا سارا آ گیا۔ یہ دو چیزیں آپ کے سامنے آ گئیں۔ اب سوال ہوا أَحَبُّ إِلَيْكُمْ (9:24) کا کہ تم ان میں سے کس کو ترجیح دیتے ہو؟ کہا کہ یہ وہ چیز ہے۔ اب تم اس صورت میں کس قدر (Value) کی حفاظت کو ترجیح دو گے؟ وہ جو تم ذہنی طور پہ ایمان لائے تھے، کیا وہ تمہارے جذبات پر اثر انداز ہو گیا ہوا ہے؟ اگر تمہارے جذبات اس قالب کے اندر ڈھل گئے ہیں تو تم جس طرح زندگی کو ترجیح دینے والا سنکھیے سے دور بھاگتا ہے آگ سے دور بھاگتا ہے، تم ان تمام کششوں سے دور بھاگ جاؤ گے کیونکہ تم اقدارِ خداوندی (Divine Values) کو ترجیح دیتے ہو۔ اب یہ جو ترجیح دینے والا عمل اس طرح سے ہے یہ ہے عملِ صالح۔ اس سے اس نے ایمان کے بعد عملِ صالح کیا، صلاحیت بخش کام کیا، زندہ رہنے والا کام کیا۔ ابھی میں زندہ رہنے والی بات کرتا ہوں۔

### کسی قدر (Value) کی نافرمانی کے سلسلہ میں ایمان کی تجدید اس کی باز آفرینی

پچھلی آیت (25:70) کے اندر توبہ والی آیت کے اندر میں نے کہا تھا کہ ایک غلطی تو وہ ہے کہ سنکھیا اتنا کھالیا کہ موت ہی واقع ہو گئی۔ ایک غلطی یہ ہے کہ وہ سنکھیا غلطی سے تھوڑا سا کھالیا گیا، اس کو نقصان تو کچھ ہوا لیکن یہ جانتے ہوئے کہ یہ سنکھیا ہے اس کی پہلی شرط کے لیے کہا کہ إِلَّا مَنْ تَابَ (25:70) جس کو احساس ہو جائے کہ اوہ غلطی ہو گئی، لغزش ہو گئی۔ اس کے بعد ہے کہ وَ أَمِنْ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (25:70)۔ درمیان میں یہ ہے کہ یہی نہیں کہ اس کے بعد اس چوراہے کے اوپر واپس آ گیا اور اس کے بعد آ کے اس نے صحیح کام کیا: اَمِنَا۔ یہاں تو یہ اور بات ہو گئی کہ جب بھی انسان کسی Divine Value یا قدرِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس وقت اس کے اندر ایمان نہیں رہتا، جب وہ پھر اس سے باز آتا ہے اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے اس کی (Return) ریٹرن (مراجعت) ہوتی ہے: مَنْ أَمِنَ۔ تو اس کے بعد پھر اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ کہے کہ اوہ میرے ایمان کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں ایسا نہ کروں۔ یہاں اَمِنَ ہے۔ پھر اپنی باز آفرینی کے لیے واپس آنے کے لیے کہا ہے جسے آپ توبہ کہتے ہیں، یعنی کتنی باریک بات ہے کہ جب تم نے اس کی خلاف ورزی کی ہے، تو سچی بات یہ ہے کہ اس وقت تمہارے اندر یہ ایمان نہیں تھا۔ توبہ بات ٹھیک ہے، خود کشی کرنے والے کے اندر یہ ایمان نہیں ہوتا کہ موت کے مقابلے میں زندگی زیادہ قیمتی ہے۔ اگر آخری وقت میں بھی وہ چھلانگ لگانے سے ذرا پہلے بھی اس کو اس چیز کا احساس ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مانتے ہو کہ زندگی زیادہ اچھی ہے: اَمِنَ وہ کہتا ہے توبہ وہی کر سکتا ہے جو پھر اس چیز کو

اس بات کو Review کرے کہ نہیں یا زندگی زیادہ قیمتی ہے۔ ایمان تو یہ چیز ہے۔

### ایمان ہر آن اپنی قوت کا اظہار چاہتا ہے

اس پہ مجھے یاد آ گیا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی وہ حدیث کتنا چمکتا ہوا گوہر ہے جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی انسان زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا ایمان اس کے سامنے باہر کھڑا ہوتا ہے۔ خوب سمجھائی ہے بات! کہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ یہی نہیں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے یہ سائن کر دیا اور مان لیا اور ساری عمر کے لیے ایمان والی بات ہو گئی۔ آپ جب بھی اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس وقت آپ کا صداقت کے اوپر محکم یقین نہیں ہوتا۔ سہو سے، نسیان سے، ہو جانا کچھ اور بات ہے لیکن یہ جانتے بوجھتے ہوئے پھر اگر اس کا ارتکاب ہوتا ہے تو اس وقت آپ نہیں کہہ سکتے کہ میرا ان صداقتوں کے اوپر ایمان تھا۔ تو عزیزانِ من! ایمان کی تو یہ قوت ہو گئی۔ محض مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے ایمان نہیں ہوتا، ایمان قرآن کی صداقتوں کو علی وجہ البصیرت، عقل و فکر، غور و تدبر کے بعد ماننے سے ایمان آتا ہے لیکن یہ ایمان ذہنی ایمان ہے۔ اس کے بعد صورت یہ ہے کہ قلب کی گہرائیوں میں یہ ایمان اس طرح سے اترے کہ ہر وہ چیز جو اس کے خلاف جاتی ہے اس کے متعلق آپ سمجھیں کہ یہ میرے لیے مہلک ہے، میرے لیے موت کا پیغام ہے، یہ تین چیزیں اکٹھی ہوں گی تو پھر اس شخص کو مومن کہا جائے گا، پھر ایمان اس کے دل میں داخل ہو جائے گا۔

### اہل ایمان کی ایک حسین دعا

عزیزانِ من! اب اگلی آیت مجھے بار بار پکار رہی ہے۔ مومنوں کی بات ہو رہی تھی کہ یہ لوگ جب قوانین خداوندی پر بلا سوچے سمجھے عمل نہیں کرتے، تو زندگی کے دوسرے معاملات کے فیصلے بے سوچے سمجھے کیسے کریں گے؟ اور بات ہو رہی تھی کہ صاحب! یہ خود کرتے ہیں اور ان کی ایک دعا بھی ہے۔ یہ بڑی حسین دعا ہے: یا اللہ! باہر کے معاشرے میں تو تم نے ہم کو بتا دیا کہ یہ کرو اور یہ کرو۔ اس کے بعد وہاں سے پلٹ کے اب شام کو گھر آئیں، تو وہ گھر ایسا دے و الذین یقولون رَبَّنَا هَبْ لَنَا (25:74) یا اللہ! ہم نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کی ہے ہم نے اس گھر کو تیرے قواعد کے مطابق اچھا رکھنے کے لیے سب کچھ جو کچھ ہو سکتا ہے کیا ہے۔ اس کے باوجود کچھ اور باتیں ایسی ہیں جن پہ ہمارا یقینی کنٹرول ہوتا ہے۔ یہ ہب لنا وہی طور پہ ملنا بغیر معاوضے کے کوئی چیز دے دینا ہے۔ کیا حسین دعا ہے! کہا کہ یا اللہ! میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے یہ کچھ کرنے کے لیے اس گھر کے اندر بڑی کاریگری کی ہے۔ میں نے اپنی طرف سے بہت کچھ کیا ہے، بہت سے عناصر ابھی ایسے بھی ہیں کہ ان کے اوپر کچھ پورا کنٹرول نہیں ہے۔ میری دعا یہ ہے کہ تو اپنی طرف سے اسے پورا کر دے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس گھر کو کیا بنا دے؟ کہا کہ هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيَّتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ (25:74) یا

اللہ! اس گھر میں بسنے والی بیوی اور بچے میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائیں۔

### انسان کی کامیابی کا راز گھر کی ٹھنڈک میں مضمر ہے

عزیزانِ من! معاشرے میں صحیح کام وہ کر سکتا ہے جس کے گھر کے اندر اس کو ٹھنڈک ملتی ہو۔ یہاں اگر سکون اور سکینت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ باہر کی دنیا میں بھی بندے داپتر بن کے رہندا اے<sup>①</sup>۔ اگر اس کو یہاں یہ چیز نصیب نہیں ہوتی تو یہ وہ اضطراب ہے، یہ وہ جہنم کی آگ ہے جو باہر بجھ نہیں سکتی، اسی لیے ہب لنا کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میری کوششوں سے کچھ ہوگا، اس میں کچھ تیری توحید کا بھی دخل ہے، تو وہ عطا فرما، بلا مزد و معاوضہ عطا فرما کہ یہ بیوی اور بچے میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائیں۔

### اس ٹھنڈک کے حصول کا طریق

برادرانِ عزیز! وہ تو اسی صورت میں ہوگا کہ تم آگ لے کر اندر نہ جاؤ۔ اگر انہوں نے تمہارے لیے برف کی سل رکھی ہوئی ہے اور تم آگ کا شعلہ لے گئے ہو تو وہ برف پہلے ہی پانی بن جائے گی۔ تم آگ کا شعلہ نہ لے کر جاؤ، پھر وہاں کی برف تمہیں دونوں طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے گی۔ اگر یہاں سے جہنم کی آگ اندر لے کر جاؤ، اور وہاں سے یہ توقع کرو کہ وہ برف تمہیں ٹھنڈک دے گی، خالی ان کی برف ٹھنڈک نہیں دے سکتی۔ عزیزانِ من! یہ تو دونوں طرف سے ہوتا ہے۔ یہ چیز یہاں کروا جَعَلْنَا لِّلْمُتَّقِينَ اِمَامًا (25:74) اور باہر کی دنیا میں جب پھر ہم جائیں تو یہی نہیں کہا کہ مجھے متقی بنا۔ متقی کے معنی یہ ہوتے ہیں: زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنے والا۔ یہ بڑی چیز ہے، بڑی جامع اصطلاح ہے۔ دعا تو یہ ہے کہ جو متقی بننا ہے قرآن کہتا ہے کہ نہیں، یہ دعا یہ ہے کہ متقین کے لیے امام بنادے۔ یہ امام کیا ہوتا ہے؟ وہ ہمیں اتنا ہی پتہ ہے: اوجیہڑا اگے کھلوتا ہوا ہوندا ہیگا<sup>②</sup>۔ یہ بات نہیں ہے۔ عزیزانِ من! متقین کا امام یہ نہیں ہے کہ اوناں دا بہت وڈا سارا بنادے۔ او میرے کچھے کھلوتے رہن، میں اوہناں دے اگے کھلوتا رواں<sup>③</sup>۔ امام یہ نہیں ہوتا۔ معمار جب دیوار بناتے ہیں تو ان کے پاس بڑا سادہ سا ایک آلہ ہوتا ہے اُسے ساہول (Plumb line) کہتے ہیں۔ اس کے نیچے اس کی ڈوری ہوتی ہے۔ وہ آلہ ایک لٹوسا ہوتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ اس ڈوری میں لٹکایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس لٹوسے ہر وقت دیکھتا ہے کہ دیوار سیدھی جا رہی ہے۔ وہ لٹوتا دیتا ہے کہ درمیان میں کہیں کجی یا ٹیڑھ پن تو نہیں آ گیا۔ کہتا ہے کہ میری زندگی کو ایسا بنادے کہ

① انسان بن کر رہتا ہے۔

② وہ جو (نماز میں) آگے کھڑا ہوا ہوتا ہے۔

③ ان کا بہت بڑا بنادے کہ وہ میرے پیچھے کھڑے رہیں اور میں ان کے آگے کھڑا ہوں۔

میری زندگی اور سیرت کو دیکھ کے دوسرے اپنی زندگیوں کی پیمائش کر لیں کہ ان میں کہیں کچی تو نہیں آرہی۔ صحیح زبان میں اس کو لیڈر کہیں گے۔ ہمارے ہاں اس کے لیے لفظ ہی امام (Leader) ہوتا تھا۔ اسلامی اصطلاح میں آپ کو یہ پتہ ہے جو سربراہ مملکت ہوتا تھا اس کو امام کہتے تھے۔ امام کے یہ معنی نہیں ہوتے تھے کہ وہ نماز میں جماعت کراتا تھا۔ وہ ہوتا یہ تھا کہ اس کی جو سیرت تھی وہ اس سا ہول (Plumb line) کا کام دیتی تھی کہ جس سے دیوار کا سیدھ پن اور ٹیڑھ پن ماپا جائے۔ ہر وقت دیکھا جائے کہ کہیں یہ اینٹ غلط تو نہیں لگ گئی۔ امام یہ ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا** (25:74) اور یہ عباد الرحمن کی خصوصیات آرہی تھیں کہ معاشرہ میں ان کی پوزیشن ایسی ہو کہ جو لوگ غلط روش زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہیں ان کی امامت (لیڈر شپ) ان کے حصے میں آئے۔

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ **أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا** (25:75) یہ ہیں وہ لوگ جن کے اندر یہ خصوصیات ہیں کہ یہ لوگ نظام خداوندی کے قیام اور استحکام کے لیے نہایت استقامت اور ثبات کے ساتھ سرگرم عمل رہے ہیں۔ یہاں لفظ بجزوٰن آیا ہے یعنی انہیں یہ چیز مفت نہیں مل رہی ان کو ان کے ایمان کا ان اعمال کا بدلا دیا جا رہا ہے یہ ان کا فطری نتیجہ ہے کیا ہے نتیجہ ان کا؟ **الغرفة**۔ یہ ایک لفظ ہے جس میں یہ بتا دیا گیا ہے۔

### ہر قسم کی نعمتوں سے بھرپور زندگی

قرآن جانے عربوں کی زبان پہ قرآن کے انتخاب پہ! ایک لفظ ہے عزیزانِ من! **الغرفة**۔ ان کے ہاں **الغرفة** کا لفظ استعمال ہوتا تھا ”اس قسم کی زندگی اس قسم کی نعمت ایک تو جس میں بلندی پائی جائے یہ اوپر جو اوپر کی منزل کا بالا خانہ ہوتا تھا، **غرفة** وہی ہوتا ہے۔ بلندی پائی جائے تیزی پائی جائے تیز رفتار اونچی جو چلنے والی ہوا ہے اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ اس میں سیرانیت کی خصوصیت ہوتی تھی۔ جو پانی سے بھری ہوئی ہوتی تھی اس کو بھی یہ کہتے تھے۔ کہا کہ جن کی سیرت و کردار میں یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں اب سوال یہ ہے کہ ان کی اس سیرت و کردار کا بدلا کیا دیا جائے گا؟ یہ بدلہ **الغرفة** ہے یعنی بلندیاں تیز رفتاریاں۔ اور قرآن نے کہا ہے کہ پانی سے زندگی ہے۔ یہ جتنی مدحیات چیزیں ہیں وہ بھرپورندیوں کی طرح ان کے ساتھ رواں دواں چلیں۔ مگر یہ یونہی نہیں مل جائیں گی۔ اس کے لیے کہا ہے کہ **بِمَا صَبَرُوا** (25:75)۔ یہ ان کی استقامت کی وجہ سے زندگی بھر مستقل مزاج رہنے سے ملیں گی۔ یہ ان کی استقامت سے ہوگا اور پھر زندگی کی جو اگلی منزل آئے گی ان کے لیے یہی منزل جس میں یہاں وہ جو معاشرہ یہاں قائم کریں گے **يُلْقُونَ فِيهَا تَحْيَةً وَ سَلَامًا** (25:75) اس میں ہر طرف سے ان کے لیے نوید جاں فزا ہوگی: تحیہ یعنی زندگی کی نوید ہوگی۔ **تَحْيَةً** کے اس ایک لفظ میں قرآن نے ساری بات کہہ دی لیکن عزیزانِ من! ٹھہریئے ابھی ساری بات نہیں کہی۔ یہ زندگی ہے۔ و **سَلَامًا** ہے



یعنی بھرپور زندگی مکمل زندگی: سلماً کے معنی صرف سلامتی نہیں ہوتا، اس کے معنی صرف Peace نہیں ہوتا، وہ تو ایک Negative چیز ہے۔ یہ سلماً ہے، میں نے کہا ہوا ہے کہ جسے مرغِ مسلم کہتے ہیں، جس میں سے کوئی چیز نہ کم ہوئی ہو، زندگی اور ایسی بھرپور زندگی کہ جس میں کوئی کمی نہ واقع ہوئی ہو، یہ ان کو دیں گے۔ خَلِيدِينَ فِيهَا (25:76) وہ اس میں رہیں گے۔ حَسَنَتْ مُسْتَقَرًّا وَ مُقَامًا (25:76) ٹھہرنے کی جگہ بھی نہایت عمدہ، جہاں مقام کرنا ہے، وہ بھی بڑا حسین۔

اس کے بعد یہ جو مخالفین ہیں ان کے لیے اب یہ اس سورۃ کی آخری آیت آگئی کہ قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا (25:77) یہ جو مخالفین ہیں ان سے تم یہ بات کہہ دو کہ اگر مخالفت کرتے رہو گے تو خدا کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا، تمہارا ہی کچھ بگڑے گا، تم نے ان صداقتوں کی تکذیب کی، تم کہتے رہے کہ سکیھا ہلاکت آفریں نہیں ہوتا، ہم کہتے رہے ہلاکت آفریں ہوتا ہے، تم نے کہا کہ نہیں ہوتا۔ تم نے جھٹلایا ہے۔ ہم نے کہا کہ اسے پھانکتے ہو تو پھانک لو اور اس کے بعد ہے کہ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا (25:77) پھر دیکھو گے کہ تم سے موت چپکتی کیسے ہے۔ اس لیے اے رسول! ان مخالفین سے کہہ دو کہ یہ ہے میری دعوت۔ اگر تم اس دعوت میں میرا ساتھ نہیں دیتے، تو نہ دو۔ میرا نشوونما دینے والا تمہاری ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کی میزان میں تمہاری مخالفت کا پورا جتنا بھی وزن نہیں۔ تم اس دعوت کی تکذیب کرتے ہو تو اس سے اُس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس سے تم خود ہی تباہ ہو گے۔ اور یقین رکھو کہ وہ تباہی تمہارے سامنے آ کر رہے گی۔

سورۃ الفرقان کی آخری آیت بھی عزیزانِ من! آج آگئی۔ اس کے بعد آئندہ درس میں اگلی سورۃ الشعراء آئیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

